رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ

ماہنامہ

نئے افق

کراچی



قیمت =/50 روپے



0314-8250376

نئے اُفق



مدیر اعلیٰ
مشتاق احمد قریشی
مدیر
عمران احمد
مدیر معاون
اقبال بھٹی
مدیر خصوصی
طاہر احمد قریشی
مہتمم
نورالدین



جلد	39
شمارہ	06
جون	2015



رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رُکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر
رُکن چیمبر آف کامرس



پاکستان (فی پرچہ)	..........50 روپے
پاکستان (سالانہ)	..........600 روپے

اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242

aanchalpk.com
aanchalnovel.com
naeyufaqonlinemagzine
aanchalpk.com/blog
onlinemagazinepk.com/recipes

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

دفتر کا پتا 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

خط وکتابت کا پتہ: "آنچل" پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 کیلئے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

افسر بے کار خاص کیوں ......؟

اسلام آباد کے ہمارے ایک شناسا نے پوچھا ہے کہ یہ افسر بہ کار خاص او، ایس ڈی حضرات کا کیا ایسا خاص کام ہوتا ہے کہ دیانت دار ذمہ دار قسم کے افسران کو یا نہ پسندیدہ افراد کو او ایس ڈی بنا کر ان کی اہلیت و ذمہ داری کے برخلاف انہیں ایسی خاص الخاص ڈیوٹی سونپی جاتی ہے جس میں کرنے کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ انتہائی ذمہ دار افراد کو بے کار بٹھا کر قومی خزانے پر بوجھ ڈالا جاتا ہے۔ ان کے خیال میں او ایس ڈی ایسے دیانت دار افراد کو بنایا جاتا ہے جو اپنے سے اوپر والوں کی مرضی و منشا کے خلاف چلنے کی جرأت رکھتے ہوں یا کسی وقت ان کے کاموں میں کسی طرح سے رکاوٹ بن یا ڈال سکتے ہوں یا بدعنوانی، کرپشن میں اپنے سے اوپر والوں کا آلہ کار بننا پسند نہ کرتے ہوں اور پھر حکمرانوں کی پسند ناپسند کا مسئلہ بھی ہے یا کسی اہم اور آمدنی والی پوسٹ پر کسی اپنے خاص آدمی کی پوسٹنگ کا معاملہ ہو یا کسی ایم این اے یا ایم پی اے کے کسی فرمائشی، سفارشی کو اس جگہ لگانا ہو اس سے قطع نظر کہ وہ شخص اس ذمہ داری کا اہل ہے بھی یا نہیں۔ ''اندھا بانٹے ریوڑیاں اپنوں اپنوں کو۔'' ملک و قوم کی کسے فکر ہے بس اپنا الو سیدھا ہونا چاہیے۔ ملک یا قوم کا بیڑہ غرق ہوتا ہے تو ہوتا رہے بس اپنا بیڑہ پار ہونا چاہیے۔

موجودہ حکمران جو نئے انتخابات کے بعد برسر اقتدار آئے ہیں اور کل فوجی آمریت کے خلاف نعرہ زن رہے ہیں۔ آج سول بلکہ شخصی آمریت کا شکار ہیں۔ اب نئے فارمولے کے تحت حکومت چل رہی ہے۔ فوجی جمع سول برابر ہے نئی آمریت کے اور نئی آمریت بہت جلدی میں معلوم ہو رہی ہے کہ جتنا کچھ سمیٹا جا سکتا ہے جلد از جلد سمیٹ لیا جائے پھر جانے یہ خوش نصیبی اور یہ سنہری موقع ملے نہ ملے اور پھر کل کس نے دیکھا ہے اور موقع بھی تو بار بار نہیں ملتا۔ اتنی مدت انتظار اور مصیبت جھیلنے کے بعد تو اقتدار ملا ہے اسے بھی اگر ملک و قوم کے نام پر دوسروں کی ہمدردی اور بھلائی میں ضائع کر دیا جائے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ماضی کی طرح لینے کے دینے ہی پڑ جائیں پھر یہ بھی اپنی جگہ درست ہی ہے کہ کل کس نے دیکھا ہے نو نقد تیرہ ادھار سے بہتر ہوتے ہیں۔ وہ تو بلی کے بھاگو چھنکا ٹوٹ گیا ہے جو بھی ہاتھ لگے تھیالو، کہاں کی پارٹی، کہاں کی حکمرانی۔ یہ سب تو آنی جانی چیزیں ہیں۔ جانے کب پیروں تلے سے زمین ہی سرک جائے۔

اللہ نے دو کان اس لیے نہیں دیے کہ دونوں سے سنا جائے اور سمجھا جائے یا سن سنا کر خوف زدہ ہوا جائے۔ دو کان تو اس لیے دیے گئے ہیں کہ ایک سے سن، دوسرے سے اڑا اور عقل و فہم اس لیے دی گئی ہے کہ صرف اپنے مفادات، اپنی ذات کے لیے سوچو اور اس پر عمل کرو۔ دراصل ایسے ہی لوگ جو اپنے مفادات کا خیال کرنے والے ہوتے ہیں وہی اپنے سے اوپر والوں کے لیے بھی مفید و کارآمد ہو سکتے ہیں کیونکہ انہیں کچھ نہیں کرنا پڑتا صرف ریٹ میں ہی اضافہ کرنا ہوتا ہے۔ باقی تو کام خود بخود ہوتا رہتا ہے۔ رہی دشمنوں، حریفوں اور مخالفین کی بات تو ان کا تو کام ہی ہر بات میں ٹانگ اڑانا، کیڑے نکالنا ہے۔ ایسے لوگ تو اس مقولے پر عمل پیرا ہوتے ہیں دنیا کہنے کے لیے دریا بہنے کے لیے ہی ہوتا ہے اور نہ کوؤں کے کوسے سے ڈھور مرتے ہیں۔ ہم تو اس بات کے قائل ہیں۔ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔ وہ جب فرعون مصر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کرا سکتا ہے تو اس کے لیے کیا ممکن ہے کہ وہ ان لوگوں سے اچھا کام لے۔ سب اقتدار و اختیار تو اللہ کا ہی ہے وہی احکم الحاکمین ہے۔ ساری بادشاہی اسی کی ہے اچھے برے حکمران تو عوام یعنی ہمارے اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں دعا کیجیے کہ اللہ سب اچھا کرے۔ سب کی خیر ہو۔ سب کا بھلا ہو۔ ملک کا قوم کا اسلام کا بول بالا ہو۔ سب کی شکایتوں کو دور کرنے والا وہی مالک الملک ہے۔ ادھر اُدھر کہیں نہیں دیکھنا چاہیے۔ اپنے اپنے گریبانوں میں جھانکیے اور دوسروں کی اصلاح کی توقع سے پہلے خود ہمیں اپنی اصلاح کر لینی چاہیے۔ اللہ ہمیں ہمارے حکمرانوں کو سیدھی سچی راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

گفتگو

عمران احمد

''حضرت محمود بن لبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ خطرہ شرک اصغر کا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ''شرک اصغر'' کیا ہے؟ آپ نے فرمایا ''ریا'' (یعنی دکھاوے کے لیے کوئی کام کرنا۔'' (احمد)

عزیزان محترم...... سلامت باشد۔

جون کا شمارہ حاضر مطالعہ ہے۔

گزشتہ ماہ ہمارے ایک دوست نے واقعی ہمیں جھنجوڑ دیا تھا ابھی میں تھکا نہیں تازہ دم ہوں۔ بس ذرا لکھنے کا رجحان تبدیل ہوگیا تھا بہرحال اب آپ کو میری جھلک ہر ماہ نئے افق میں نظر آئے گی۔ پرچے میں تبدیلی کا عمل آپ کی آرا، مشوروں کی روشنی میں کچھ تبدیلیاں مزید کریں گے۔ اب ہم نے قارئین کے اصرار پر خوب صورت خط پر پانچ سو روپے انعام رکھا ہے اسی طرح خوشبوئے سخن اور ذوق آگہی میں بھی خوب صورت تحریروں پر بھی پانچ، پانچ سو روپے انعام دیا جائے گا۔ امید ہے قارئین اب اس میں بھرپور انداز میں شرکت کریں گے ہماری قارئین سے خصوصاً پرانے اور مستقل قارئین سے التماس ہے کہ وہ ہماری رہنمائی کا سلسلہ جاری رکھیں۔

عمر فاروق ارشد...... فورٹ عباس۔ السلام علیکم! ہزار ہا مایوسیوں اور تفکرات کے گھنے بادلوں میں گھرا ہوا مئی کا نئے افق یاسیت بھرے ماحول میں موصول ہوا میں اس بار تبصرہ بلا تمہید اور بے لاگ کروں گا کیونکہ محترم مشتاق احمد قریشی صاحب براہ راست ہم سے مخاطب ہوئے ہیں سب سے پہلی بار میں یہ کہنا چاہوں گا کہ سب رسائل کے معیار اور اتار چڑھاؤ کا معاملہ ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے اور میگزین کے قارئین خامیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی اپنے تبصروں کے ذریعے بروقت کردیتے ہیں۔ مجھے آپ کا یہ طرز عمل انتہائی عجیب لگا کہ امریکا سے ایک کال آئی موصوف نے آپ پر اور رسالے پر تنقید کی اور آپ نے اسے اتنا سنجیدہ لے لیا کہ پورے میگزین میں اکھاڑ پچھاڑ اور تبدیلیوں کا عندیہ دے دیا۔ آپ تھوڑی دیر کے لیے تصور کریں کہ سیکڑوں لوگ ہیں جو ہر ماہ نئے افق کی پسندیدگی اور اس کے معیار پر اطمینان کا اظہار کرتے ہیں اب اگر کوئی ایک آدھ شخص اٹھ کر شدت کے ساتھ تنقید کرے تو ضروری نہیں کہ وہ سب کچھ واقعتاً ہی ویسا ہو جیسا اس کی نظر میں ہے زمینی حقائق کچھ اور بھی ہوسکتے ہیں جن کو تنقید کرنے والے کی نظر شاید نہ دیکھ سکی ہو۔ میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ نئے افق میں حقیقتاً کچھ سنگین نوعیت کی غلطیاں ہورہی ہیں جن کو دور کرنا نہایت ضروری ہے لیکن آپ نے جو بات کی کہ نمایاں تبدیلیاں کی جائیں گی اس بات سے مجھے اختلاف ہے نئے افق کو کسی بھی تبدیلی کی بالکل بھی ضرورت نہیں بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ جو غلطیاں مسلسل دہرائی جارہی ہیں ان کا سدباب کیا جائے۔ میں کچھ کی نشاندہی کرنا چاہ رہا ہوں۔ محترم قریشی صاحب اور ادارے کے دیگر ذمہ داران سے دردمندانہ اپیل کروں گا کہ ان پر غور کیا جائے۔

(۱) کمپوزنگ کی غلطیاں ہر ماہ ہوتی ہیں اور جا بجا ہوتی ہیں کہانی ہو یا غزل یا پھر کسی مظلوم قاری کا تبصرہ ہو ہر چیز کا حسن بگڑ کر رہ جاتا ہے۔ باوجود بار بار توجہ دلانے کے اس چیز پر کوئی ایکشن نہیں لیا گیا اور یہ خامی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔

(۲) میگزین کی بائنڈنگ کرتے وقت بعض اوقات مسائل پیدا ہوتے دیکھے گئے ہیں جیسا کہ اس مرتبہ ہوا۔ صفحات آگے پیچھے لگائے جانے کی وجہ سے عجیب و غریب قسم کے عجوبے وجود میں آتے ہیں۔

(۳) کہانیوں کے اسکیچز نہ بنانے کی تو جیسے ادارے نے قسم کھا رکھی ہے اسکیچز کہانیوں کا تاثر بنانے میں مدد کرتے ہیں اور رسالے کی سج دھج بھی بڑھ جاتی ہے۔ مگر آپ نے انہیں غائب کر کے مزید ایک زیادتی کر ڈالی ہے۔

(۴) نئے افق کے معیار پر حرف لانے والی دوسری بڑی چیز گزشتہ دنوں چند فحش لغو ناول اور کہانیوں کا شائع ہونا ہے۔ اگر آپ پچھلے چند ماہ کے شماروں کا جائزہ لیں تو یہ بات آپ پر بخوبی عیاں ہو جائے گی کہ دانستہ یا نا دانستہ طور پر آپ اس غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ بطور مدیر اعلیٰ و نگراں اعلیٰ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میگزین میں کیا چھپ رہا ہے اور کیوں چھپ رہا ہے ان چیزوں کی پڑتال کرنا محترم قریشی صاحب کا فرض اولین ہے لیکن اس سے چشم پوشی برتی گئی جس کا نتیجہ معیار کی گراوٹ کی صورت میں نکلا۔

(۵) حالیہ دنوں میں آپ نے ایک غلطی یہ کی کہ مستقل سلسلوں کی ذمہ داری بھائیوں سے لے کر خواتین کو عنایت کر دی ان دونوں سلسلوں کا معیار بہتر ہونے کے بجائے بری طرح گرنا شروع ہو چکا ہے۔ محترمہ نوشین صاحبہ نے بجائے نئے شاعروں کی حوصلہ افزائی اور اپنی انتخابی ذمہ داری احسن انداز میں سنبھالنے کے، الٹا اپنا ہی کلام جلوہ افروز کرنے کا آغاز کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اخلاقی طور پر یہ چیز زیب نہیں دیتی۔ آپ اپنے کلام کے لیے آنچل کا انتخاب کر سکتی ہیں۔ نئے افق میں آپ کو دوسروں کی امانتوں کا امین بنایا گیا ہے۔ اس لیے آپ کی کوشش ہونا چاہیے کہ اس ذمہ داری سے نیک نیتی کے ساتھ عہدہ براں ہوں۔ محترم قریشی صاحب، پیارے بھائی عمران اور مدیر معاون اقبال بھٹی صاحب میں آپ سے یہ امید رکھتا ہوں کہ میری ان گزارشات کو نئے افق کی بہتری اور سربلندی کے لیے انتہائی سنجیدگی سے لیا جائے گا۔ کیونکہ ہمارے لیے یہ بات کسی صورت قابل قبول نہیں کہ نئے افق کے معیار پر کوئی قدغن لگے، دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆ محترم ارشد صاحب آپ کی تنقید سر آنکھوں پر، مگر آپ نے میری گزارشات کو دھیان سے نہیں پڑھا۔ وہ فون کال تو محض علامت اور اشارہ تھی جس نے مجھے دوبارہ پرچے کی جانب راغب کیا ورنہ میں بالکل نئے افق سے لاتعلق ہو چکا تھا۔ آپ نے جن چیزوں کی جانب اشارہ کیا ہے، ہم بتدریج اس میں تبدیلیاں لانے اور بہتر کرنے کی کوشش کریں گے۔

محمد عمران...... فیصل آباد۔ السلام علیکم! پہلی بار آپ کی بزم میں شریک ہو رہا ہوں امید ہے کہ آپ حوصلہ افزائی کریں گے میرے پاس ایک بے بس مجبور حالات کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ایک نوجوان کی آپ بیتی ہے میری خواہش ہے کہ اس کہانی کو آپ نئے افق میں شائع کریں۔ آپ کو خط لکھنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ یہ کہانی کم و بیش دس سال کے عرصے پر محیط ہے اور میرے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ میں یہ آپ بیتی یکمشت آپ کے پاس بھیج سکوں اور یہ ممکن بھی نہیں ہے اگر آپ اجازت دیں گے تو میں پہلی قسط آپ کو بھیج دوں گا۔ اگر آپ اچھی اخلاقی اور معیاری سبق آموز کہانیوں کو اپنے ڈائجسٹ میں جگہ دیتے ہیں تو یہ کہانی ہر لحاظ سے آپ کے معیار پر پورا اترے گی۔ اپنے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ اگر آپ دلچسپی کا

اظہار کریں تو مجھ سے میرے ایڈریس پر یا پھر بذریعہ موبائل رابطہ کر سکتے ہیں۔ اجازت چاہوں گا اس امید پر کہ آپ مجھ سے ضرور رابطہ کریں گے۔

[illegible] عمران صاحب، خط لکھنے کا شکریہ، آپ نے بار بار ''آپ کا ڈائجسٹ'' کا لفظ استعمال کیا ہے جس پر [illegible] اعتراض ہے۔ یہ ڈائجسٹ آپ کا ہے ہمارا نہیں۔ دوسرے آپ کہانی کی سمری لکھ کر بھیج دیں تا کہ ہمیں آپ کی تحریر کا اندازہ ہو سکے کہ آپ کیسا لکھتے ہیں اس کے بعد ہی ہم کچھ فیصلہ کر سکیں گے۔

دستگیر شہزاد...... ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ میرے اپنے بھائی عمران قریشی صاحب السلام [illegible] تو اس قبل اور نسیم سکینہ صدف کی ''اناڑی'' لے کر آپ سے مخاطب ہونے کی خوشی حاصل کر [illegible] بھائی اللہ آپ کو اور سب اہل خانہ کو زندگی کی سچی خوشیاں دے۔ اس وقت میرے جو بھی [illegible] عمران صاحب کی خدمت میں میرا نیاز مندانہ سلام، خدا آپ کو اور اہلخانہ کو [illegible]

[illegible] مل چکی ہیں ان شاء اللہ آئندہ ماہ کی اشاعت میں آپ [illegible]

انجم ھارون ساحلی ... لاہور۔ [illegible] آپ اہل خانہ وادارہ کے دیگر احباب [illegible] خوشی کی بات ہے کہ آپ نے اس پر توجہ [illegible] 1986 سے نئے افق کا قاری ہوں اور 2001ء سے نئے افق [illegible] شامل ہوں۔ پہلی تحریر ''[illegible]'' دسمبر 2001ء میں شائع ہوئی اس پرچے میں آپ کی تحریر سنہری چھو موجود ہے جون 2006ء میں اولین صفحات پر ناول ''زندہ لاش'' شائع ہوا جسے بے حد پسند کیا گیا۔ نئے افق اور نیا رخ کے پرانے ضخیم ابن صفی نمبرز ہمارے لیے قیمتی اثاثہ کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں اگست 1981ء کا خاص نمبر بھی شامل ہے جس میں اظہر کلیم کی دوستانہ وارننگ کے نتیجے میں آپ نے جولائی کی تپتی دوپہر میں جا کر بیگم ابن صفی صاحبہ سے ملاقات میں انٹرویو لیا تھا۔ اس کے علاوہ فن کے استاد ابن صفی سے آپ کی پہلی ملاقات کا احوال بھی میرے پاس موجود ہے۔ نومبر 1983ء کے نیا رخ میں اظہر کلیم مرحوم کا طویل انٹرویو موجود ہے۔ انٹریو سے قبل بات چیت کے عنوان سے آپ کی ادارتی گفتگو خطوط کے ساتھ موجود ہے۔ انٹرویو کا ابتدائیہ خان آصف نے لکھا تھا۔ اس تمہید کا مقصد نئے افق سے مزاج شناس ہے۔ نئے افق کے پرانے نمبرز میں ہر طرح کی تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ لیکن ان میں جرم وسزا، ایکشن، سسپنس، تھرل سے بھر پور تحریریں نمایاں ہوتی تھیں۔ گزشتہ کچھ برسوں میں اگر نئے افق میں کمی واقع ہوئی ہے یا سابقہ معیار محسوس نہیں کیا گیا تو اس کا سبب کئی پرانے اور معروف لکھنے والوں کی قطع تعلقی ہے۔ جس میں سید احتشام، شکیل صدیقی، یعقوب جمیل مرحوم، محمد بدر منیر صاحب شامل ہیں۔ یہ حضرات بہت اچھی تحریریں لاتے تھے۔ میں نے اور محمد یعقوب بھٹی صاحب نے اکٹھے ہی لکھنا شروع کیا تھا اب وہ بھی دوبارہ غائب ہو گئے ہیں۔ اس میں عمران صاحب کا کیا قصور ہے۔ جہاں تک نئے افق کے سابقہ معیار کا مسئلہ ہے گاہے بگاہے اس کی طرف توجہ دلاتا رہا ہوں۔ آپ نے نئے افق کی اصلاح کے لیے تجاویز طلب کی ہیں اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ معیاری تراجم جرم وسزا، ایکشن، سسپنس تھرل پر مبنی دیے جائیں۔ معاشرتی کہانیوں کے انتخاب میں احتیاط کی جائے کہانیوں کو تصاویر کے ساتھ شائع کیا جائے اور ٹائٹل کسی مرکزی کہانی کے مطابق آرٹسٹ سے بنوایا جائے کمپوزنگ کی

اغلاط پر توجہ دی جائے۔ اسی کے ساتھ اجازت چاہوں گا اللہ حافظ۔
☆ انجم، یاد آوری کا شکریہ آپ نے جو تجاویز دیں وہ درست ہیں ان شاء اللہ آپ اس پر عمل ہوتا ہوا دیکھیں گے۔

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔ محترم جناب عمران احمد صاحب، سلام شوق امید ہے رب العزت کے فضل سے آپ اپنے رفقا کے ساتھ خیریت سے ہوں گے۔ ماہ مئی کا نئے افق میرے پیش نظر ہے۔ ٹائٹل اس قدر خوب صورت ہے کہ مصور کی تعریف نہ کرنا بہت زیادتی ہوگی بھائی مصور آپ کو اتنا اچھا سرورق تخلیق کرنے پر مبارک باد۔ دستک میں جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے جو کھری کھری سنائی ہیں ان کے کسی ایک لفظ سے بھی انکار ممکن نہیں۔ عمران بھائی کہاوت ہے کسی ملک کا بے اولاد بادشاہ جب مرنے لگا تو لوگوں نے پوچھا کہ آپ کے بعد ہم بادشاہ کسے بنائیں گے تو اس نے کہا میرے دفنائے جانے کے بعد صبح سویرے فصیل شہر سے باہر نکلنا جو شخص بھی تمہیں ملے اسے اپنے ملک کا بادشاہ بنا لینا۔ جب عمائدین شہر نے فصیل شہر سے نکل کر دیکھا تو ایک گوڈری پوش نظر آیا تو انہوں نے اس سے کہا کہ بادشاہ سلامت تشریف لائیے۔ آج سے آپ ہمارے بادشاہ ہیں اس کے ہزار انکار کے باوجود انہوں نے اسے نہلا دھلا کر شاہی لباس پہنایا اور تخت پر بٹھا دیا۔ اس نے کہا کہ دیکھو یہ میری گوڈری سنبھال کر رکھنا اور ساتھ ہی حکم صادر فرمایا کہ محفل رقص وسرور سجائی جائے اور حلوے کی دیگیں پکائی جائیں اور پھر یہ کام روز کا معمول بن گیا یہ دیکھ کر پڑوسی ملک نے حملہ کر دیا اور دارالخلافہ تک پہنچ گیا۔ بادشاہ سلامت کو اطلاع ملی تو اس نے اپنی گوڈری طلب فرمائی جب پیش کی گئی تو اس نے خلوت میں لباس بدلا اور گوڈری پہن کر دربار سے نکل کھڑا ہوا اور جاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ہم تو چلے اب تم جانو اور تمہارا دشمن جانے۔ میرے منہ میں خاک کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے حکمرانوں نے اپنی اپنی گوڈریاں چھپا رکھی ہیں اور خدانخواستہ ملک پر کوئی وقت پڑنے پر وہ اپنی اپنی گوڈریاں سنبھال کر ان ملکوں کو سدھار جائیں گے جہاں انہوں نے اپنی دولت جمع کر رکھی ہیں۔ خدا کرے قیامت تک ایسا نہ ہو گفتگو کے آغاز کی حدیث مبارک کاش حاسد لوگ پڑھ لیں اور اسی سے کچھ سبق حاصل کریں۔ گفتگو کے شروع میں محترم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب ہم قارئین سے مخاطب ہیں جو کچھ آپ نے فرمایا وہ بہت خوش آئند ہے۔ محترم قریشی صاحب میں بنیادی طور پر ایک شاعر ہوں میں اپنے پسندیدہ سلیکشن خوشبوئے سخن کے بارے میں عرض کروں گا کہ اس کے دو صفحات کو گزشتہ کی طرح چار کا کیا جائے اور غزلوں اور نظموں کے انتخاب کو بہتر بنایا جائے باقی آپ اتنے منجھے ہوئے مصنف اور مولف ہیں کہ اس کے معیار کو بلند کرسکیں گے۔ گفتگو میں پہلا خط پیاری بہن عالیہ انعام الٰہی کا ہے اس نے جریدہ پر تبصرے سے پہلے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ لائق صد ستائش ہے انہوں نے جس پیارے انداز میں کچھ لوگوں کو یاد فرمایا تعریف کے قابل ہے۔ کاش وہ لوگ دوبارہ محفل میں لوٹ آئیں اور محفل کی رونق کو دوبالا کردیں۔ کراچی کی محترمہ زریں قمر صاحبہ نے بڑے پیارے انداز میں پرانے ساتھیوں کو صدا دی ہے۔ جناب ابن مقبول احمد صدیقی کے خط میں دو جگہ صیغہ مونث استعمال ہوا ہے۔ ''سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔'' مجھے آپ کے تبصروں کا انتظار رہے گا آئندہ اور بہتر طریقے سے لکھنے کی کوشش کروں گی۔'' اس سوال کو حل فرمادیجیے۔ محترم ریاض بٹ آپ بڑے خوب صورت خط کے ساتھ محفل میں تشریف لائے بھائی آپ کی کہانی شامل اشاعت نہ ہو تو صرف آپ کو ہی دکھ نہیں بلکہ ہم جیسے قارئین بھی اس بات کو بڑا محسوس کرتے ہیں۔ اب تو کوئی نہ کوئی نمبر نکل رہا ہے آپ بھی اس کے

مطابق لکھنا شروع کر دیں۔آپ کی صلاحیتیں آپ کو ضرور کامیاب فرمائیں گی۔خوشبوئے سخن کے مختصر ترین سلیکشن میں جو مواد بھی ہے خوب ہے اس بارے میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس سلیکشن کو ایک صفحے تک محدود کر دیا جائے اور ہر ماہ یہ صفحہ کسی ایک شاعر کو دے دیا جائے اس سے ایک تو کسی قسط وار ناول کے قیمتی صفحات میں ایک صفحے کا اضافہ ہو جائے گا دوسرے تبصرہ نگاروں کو کسی ایک شاعر کو داد دینے میں آسانی ہوگی۔ ایک بار عمل کر کے تو دیکھیں باقی اس بار شمارہ خوب ہے اور آپ لوگوں کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

☆ بھائی ریاض یاد آوری کا شکریہ،آپ نے بڑی خوب صورت کہاوت بیان کی ہمارے ملک میں ایسا ہی ہو رہا ہے ابن مقبول صاحب بڑے ہی نفیس دمی ہیں ہماری ان سے بات ہوتی رہتی ہے۔ان کے خط میں مونث کا صیغہ کیوں استعمال ہوا ہم اس مسئلہ کو ضرور دیکھیں گے۔

عبدالمالک کیف...... صادق آباد۔ سلام نئے افق کے سبھی چاہنے والوں کو جن کے دم سے افق کی حسین محفلیں پر رونق رہتی ہیں جن کی محبتیں ایسی کہ ہر ماہ بے چینی سے انتظار کیا جاتا ہے کچھ غیر حاضری لمبی ہوگئی تھی کچھ حالات کی ستم ظریفی کہ لکھنے کو دل ہی نہ کر رہا تھا اور کچھ جب سے نئے افق کے مارکیٹ میں آنے کی ٹائمنگ کی وجہ سے بھی تبصرہ لکھنے کا نظام درہم برہم ہو گیا۔اس کے بعد چاہ کر بھی تبصرہ نہ لکھ پایا کیونکہ نئے افق تک پہنچنے کے لیے ہر ماہ کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں وہ مجھے ہی معلوم ہے۔سو جب بھی اس تک رسائی ہوتی ہے سامنے کا ٹائم رفو چکر ہو چکا ہوتا ہے۔خیر اب کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ان شاء اللہ سیٹ اپ ہو جائے گا۔بہر حال اپنے ماہ غیر حاضر رہا تو ایک سبق ضرور دیکھا کہ پاس رہو تو یاد بھی آتے ہیں، ناز نخرے بھی اٹھائے جاتے ہیں اور دور جانے سے بھول ہی جاتے ہیں لوگ۔اس عرصے میں کچھ دوستوں نے یاد کیا ان کا شکر گزار ہوں اور ان کو بھی اللہ پاک خوش رکھے جن کو ہمارا ایک دم نئے افق سے غائب ہو جانے پر احساس بھی نہ ہوا کہ بندہ کدھر گیا؟اور آج سب کچھ بھلا کر تبصرہ لکھنے بیٹھا ہوں تو بھی وجہ یہ ہے کہ نئے افق مئی 2015ء کے پہلے خط میں ایک بہن نے یاد کیا تو سوچا اس بار لڑائی کرتے ہیں لکھنے کی تو حاضر خدمت ہے تبصرہ،آپ بیتی نمبر کا ٹائٹل بہت [illegible] ٹائٹل کا گہرا کلر بہت پیارا تھا۔مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک ہمیشہ کی طرح بہت ہی اہم [illegible] ان کے عوام کے ساتھ ہیں کہ اندھیروں کے بعد سویرا ہی اجالے لے کر آتا ہے۔ [illegible] عمران احمد صاحب کی بات سے دل خوش ہوا کہ آئندہ ماہ سے نئے افق میں تبدیلیاں رونما ہوں گی۔یہ نئے افق اور قارئین کے لیے خوش آئند بات ہوگی۔عمران صاحب کہیں تبدیلی کے چکر میں ہم جیسے نئے لکھنے والوں کی تحریروں کو ہر ماہ ''کک'' نہ لگا دینا آپ، پہلے ہی بہت ساری تحریریں غائب ہو چکی ہیں۔خطوط میں پہلا خط بہن عالیہ انعام کا تھا جس کے خط میں دکھ درد کی آمیزش تھی۔عالیہ بہن زندگی ایسی کشتی ہے جس میں دکھ،سکھ،غم،خوشی،سبھی ایک ساتھ محوِ سفر ہوتے ہیں سو آپ امید کا دامن تھامے رکھیں اللہ آپ کو انشاءاللہ خوشیوں سے نوازیں گے۔دن بدلتے دیر نہیں لگتی جس انسان کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ہم آپ کے جذبات کی قدر کرتے ہیں یاد کرنے کا شکریہ۔تبصرہ بہت ہی باریکی سے کیا اور یہ تبصرہ مئی 2013ء میں لکھے آپ کے تبصرے کا عکس لگا۔دوسرا خط زریں قمر کراچی سے آپ نے دل سے یاد کیا آج ہم بھی حاضر ہو گئے ہیں۔اب آپ نے مجھے یاد کیا یا احمد علی کیف کو بہر حال بڑی مہربانی بشیر احمد بھٹی صاحب پیٹرول سستا ہو رہا ہے آپ نئے افق کی قیمت کیوں بڑھانے کی بات کر رہے ہو،رحم کرو،...... ریاض حسین قمر منگلا ڈیم کبھی ہمیں بھی یاد کر لیا کیجیے آپ کے تبصرے جاندار ہوا کرتے ہیں سلام قبول فرمائیے۔ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب

کیسے مزاج شریف ہیں جناب کے۔ میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں اہم تبدیلیوں میں ایک یہ بھی تبدیلی شامل کریں کہ خوشبوئے سخن کے صفحات بڑھائیے اور محفل شعروسخن دوبارہ شروع ہونا چاہیے۔ ابن مقبول صاحب مبارک ہو آپ کے دو دو خط ایک ساتھ چھپنا شروع ہوگئے ہیں یہ بھی تبدیلی ہے اور یہ بھی تبدیلی ہے کہ ڈائجسٹ میں 15 صفحے کے بعد 14 آ رہا ہے صفحات میں ردوبدل ہوگیا ہے۔ عمر فاروق ارشد اور ریاض بٹ کے تبصرے صفحہ نمبر 14 پر تھے ریاض بٹ صاحب پرانے اور اچھا لکھتے ہیں ان کی کہانیاں نئے افق کی جان ہوتی ہیں اور عمر فاروق ارشد بھی لکھنے کا گر جانتے ہیں اچھی اٹھان جا رہی ہے ان صاحب کی بھی۔ آخر میں حسین نیوز ایجنسی کے پپو بھائی کی اہلیہ کے انتقال کی خبر شائع ہوئی تھی اللہ پاک ان کو صبر جمیل عطا کرے اور رخسانہ اکبر کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے، آمین۔ اقرا پڑھ کر اپنے دل سے زنگ اتارنے کی تھوڑی سی کوشش کی۔ ہم اپنی ذات کو سجانے سنوارنے میں اس قدر محو رہتے ہیں کہ اپنی روح تک کو آلودہ کر رہے ہیں زمانے کی ان بے ہودہ رسومات کو تو اپنا لیتے ہیں جب فقط دکھاوا ہیں مگر اپنی اصل تعلیمات جو آخرت کو سنوارنے کا سبب بنیں گی ان سے کوسوں اور ہیں۔ اللہ پاک ہمیں سیدھی راہ دکھائے۔ اتنے عرصے لکھنے سے فرصت نہ تھی مگر نئے افق سے ناتہ ویسا ہی رہا مطالعہ برابر چلتا رہا تھا۔ آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سارے سلسلے بہترین جا رہے ہیں۔ دلچسپ نمبر کے لیے ایک اسٹوری بھیجی تھی اور یقین تھا کہ وہ سلیکٹ ہوگی مگر افسوس آپ نے شائع نہ کی ہائے داوے وہ کس کھاتے میں گئی؟ نوشاد عادل کی ''ہدف'' اچھی جا رہی ہے۔ مگر چھوٹی چھوٹی اسٹوریز اہمیت کی حامل اور اچھوتے موضوع پر مبنی ہوتی ہیں زور قلم اور زیادہ ہو۔ زرین قمر کی باغ عدن میں جو غزہ کی تباہ حالی کا نقشہ کھینچا گیا اس نے رونگٹے کھڑے کر دیے کس قدر ظلم ہو رہا ہے وہاں بچوں اور عورتوں پر۔ شریف احمد کی کہانی شکاری بلاشبہ سنسنی خیز تھی۔ بلاعنوان محمد سلیم اختر نے جس طرح بھائی بہن کی محبت اور غربت کی تصویر کھینچی اپنی مثال آپ تھی۔ باقی قلندر ذات چھائی ہوئی ہے۔ مصنف کے قلم کی گرفت ابھی تک مضبوط جا رہی ہے ہر کردار کو اپنی جگہ فٹ رکھا ہوا ہے باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ ''اپریل فول، دائرہ، توبہ، برائے فروخت، حقیقی مسیحا (مجید احمد جائی سے جواب عرض کے توسط سے پہچان ہے نئے افق کے لیے بہترین اضافہ ہیں ویل مجید احمد جائی) بچولیا، میں ابھی زندہ ہوں، جرم وسزا، امید ہے اچھی کہانیاں ہوں گی کیونکہ نئے افق کی سلیکشن ہمیشہ عمدہ رہی ہے۔ فلسطین کی پہلی قسط عمدہ تھی یہ کہانی جگت سنگھ کی جگہ بہترین ہے۔ باقی ذوق آگہی اور خوشبوئے سخن میں نوشین اقبال اور سباس گل صاحبہ کو موسٹ ویلکم اس بار بھی دونوں کیٹگریز میں سلیکشن ٹاپ کی تھی۔ شاعری میں ریحانہ سعیدہ کی نظم، نوشین اقبال نوشی، عرشیہ ہاشمی کی نظم، عامر زمان عامر کی غزل اچھی لگیں۔ امید ہے میرے آنے کے بعد دوسرے معروف اور گمشدہ لوگ بھی ان شاء اللہ واپس آ کر گفتگو کی رونق بڑھائیں گے۔ ناظم بخاری، سرور شاذ، ناز سلوش، محمد فاروق انجم، سلمٰی کنول، حماس انمول عوامی، سہیل عمران، عبدالرؤف عدم، آکاش بخاری، اسد ارشد، اللہ دتہ عابد، اصغر علی ناصر، محترمہ این شاہین صاحبہ، شجاع جعفری، محمد اسلم جاوید، فقیر محمد بخش صابر، طاہرہ جبیں تارا، شہنی ارشاد، سلمٰی غزل، عصمت اقبال عین اور جو نام ذہن کے گوشے سے نکل گئے ہیں سب سے التجا ہے کہ وقت بہت اہم ہے اور مشکل سے ہی نکلتا ہے مگر نکالنا پڑتا ہے سو آپ لوگ بھی پلیز وقت نکال کر جلدی سے آجائیں۔ اگلے ماہ تک کے لیے اللہ حافظ۔

☆ کیف صاحب جیتے ہوئے خوب صورت خط کا شکریہ کوشش کا وعدہ رہا آئندہ ایسی غلطیوں کا ارتکاب نہ ہو جس سے آپ اور دیگر قارئین کو ذہنی کوفت کا سامنا کرنا پڑے۔ امید ہے آپ ہر ماہ ہماری رہنمائی کرتے

رہیں گے۔

راولپنڈی سے محمد الیاس جعفری رقم طراز ہیں، مشتاق صاحب برسوں بعد آپ کا اس طرح قارئین سے مخاطب ہونا اچھا لگا۔ لگتا ہے آپ کے اندر کا ادیب جاگ گیا ہے دیر سے سہی مگر بیا کا تو وہ کیا کہتے ہیں صبح کا بھولا اگر گھر لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ آپ کو جس نے بھی فون کر کے کھری کھری سنائی درست سنائی دین کی طرف آپ کا رجوع ہونا اچھی بات ہے ہر شخص دین کے راستہ پر چلنا چاہیے۔ آپ نے اس دوران جو کچھ لکھا وہ نئی اور پرانی نسل کے لیے نافع ثابت ہو رہا ہے لیکن میرے محترم ادھوں کو سستی اور پاکیزہ تفریح فراہم کرنا بھی تو نیک عمل ہے۔ بلکہ میرے نزدیک صدقہ جاریہ ہے جو آپ نے نجانے کیا سوچ کر بند کر دیا تھا خیر اب آپ نے کسی بھی وجہ سے واپسی کا اعلان کر کے اپنے چاہنے والوں کا دل خوش کر دیا ہے امید ہے اب پرچے کا رنگ وروپ تبدیل ہوگا گو صاحبزادے عمران احمد نے بھی اچھی کوشش کی تھی لیکن تجربہ پھر تجربہ ہوتا ہے جہاں تک تجاویز کا تعلق ہے نئے افق میں تراجم کم سے کم بلکہ بالکل غائب ہوتے جا رہے ہیں آپ اس میں اضافہ کریں ماشاء اللہ آپ بھی بہت اچھا لکھتے رہے ہیں۔ کم از کم ہر ماہ آپ ایک انگریزی ناول ضرور دیا کریں خواتین کی کہانیاں آنچل میں زیادہ بہتر رہتی ہیں۔ نئے افق کو اس سے پاک رکھیں۔ کہانیوں کے [illegible] اور تراشوں کی کمی پر بھی توجہ دیں اچھے خاص طور پر اساتذہ کا کلام بھی ضرور [illegible] کا رنگ ڈھنگ بدلنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔

[illegible] صاحب [illegible] اندر کا للھاری کبھی سویا نہیں، دینی اور دیگر موضوعات پر میری [illegible] اس بات کا [illegible] ہوں ہاں البتہ نئے افق اور آنچل سے خود کو ذرا الگ کر لیا تھا کہ نئے خون کو موقع ملے۔ گو اب بھی نئے افق کی ادارت عمران احمد ہی کریں گے البتہ اب میں انہیں مشورے اور معاونت فراہم کرتا رہوں گا۔ تبدیلی آپ کو نظر آ جائے گی۔



مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں' صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔
☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔
☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔
☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔
☆ ''گفتگو'' کے لیے آپ کے ارسال کردہ خطوط ادارہ کو ہر ماہ کی 3 ' تاریخ تک مل جانے چاہیے۔
☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔ 7 ' فرید چیمبرز' عبداللہ ہارون روڈ' کراچی۔

نوٹ: 1:00 تا 2:30 نماز ظہر اور کھانے کا وقفہ ہوتا ہے لہٰذا اس دوران دفتر ٹیلی فون کرنے سے گریز کریں

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

یہ سب الفاظ یا ان کے ہم معنی الفاظ ہمیشہ صرف اطلاقی شان میں بولے جاتے ہیں اور صرف ایک کم عقل انسان ہی اس غلط فہمی میں مبتلا ہوسکتا ہے کہ سماعت‘ بصارت اور گرفت کی کوئی دوسری صورت ان محدود اور مخصوص قسم کی سماعت‘ بینائی اور گرفت کے نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح نور کے لئے یہ خیال کرنا وہ ایک ایسی شعاع ہے جو کسی چمکنے والے جرم سے نکل کر آنکھ پر منعکس ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کا مصداق اس محدود معنی میں نہیں ہے بلکہ مطلق معنی میں ہے‘ یعنی اس عظیم تر کائنات میں صرف وہی ایک اصل ”سبب ظہور“ ہے باقی یہاں تاریکی اور ظلمت کے سوا کچھ بھی نہیں۔

ویسے تو نور کا لفظ علم کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کے برعکس تاریکی جہالت اور ظلمت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اس معنوں میں بھی کائنات کا نور ہے کہ تمام حقائق کا علم اور راہ راست کا علم مل سکتا ہے تو اس کی ذاتِ عالی سے ہی مل سکتا ہے۔ اس سے فیض حاصل کئے بغیر جہالت کی تاریکی اور ضلالت کے سوا کچھ ممکن نہیں۔

تشریح کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ اگر اللہ نہ ہوتا تو نہ آسمان ہوتا نہ زمین ہوتی نہ زمین وآسمان میں نور ہوتا نہ ان میں کسی کو ہدایت نصیب ہوتی۔ پس وہ اللہ تعالیٰ ہی آسمان وزمین کو روشن کرنے والا ہے‘ اس کی کتاب قرآنِ مجید نور ہے‘ اللہ کے رسول آخرالزماں (بہ حیثیت صفات) نور ہیں۔ یعنی ان دونوں کے ذریعے زندگی کی تاریکیوں میں انسان رہنمائی اور روشنی حاصل کرتا ہے۔ جس طرح چراغ اور بجلی کے بلب سے انسان روشنی حاصل کرتا ہے۔ حدیث مبارکہ سے بھی اللہ تعالیٰ کا نور ہونا ثابت ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے ”پس اللہ‘ اس کی ذات نور ہے‘ اس کا حجاب نور ہے‘ اور وہ ہر ظاہری اور معنوی نور کا خالق ہے۔ اس کا عطا کرنے والا اور اس کی طرف ہدایت کرنے والا صرف ایک اللہ ہے۔ (الیسر التفاسیر)

اللہ نور السمٰوٰت والارض:۔ ”اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔“ یہ بڑی ہی عجیب آیت ہے اس میں اللہ تعالیٰ اپنی ذاتِ مبارک کے بارے میں ارشاد فرما رہا ہے اس کی ذاتِ عالی شان ہی زمین وآسمانوں کا نور ہے۔ آیتِ مبارکہ کا حکم اپنی خوش گوار حیرت انگیز روشنی سے پوری کائنات کو منور کر رہا ہے۔ انسان غور وفکر کرے تو اس کے تمام اعضاء اس کی روح‘ سوچ وشعور اس کا دل ودماغ اس کا باطن روشن روشن ہوجائے۔ یہاں تک اسے ساری کائنات پرنور اور چمکدار ہوتی نظر آنے لگے۔ جب انسان کی نظریں اور اس کے نظریات اس نورِ الٰہی سے منور ہوتے ہیں تو تمام حجاب تمام پردے سرکتے چلے جاتے ہیں اور ہر چیز نور کے سمندر میں تیرتی چلی جاتی ہے اور ہر چیز کی کثافت دور ہوجاتی ہے۔ اور انسان حقیقی خوشی اور لذت سے آشنا ہوجاتا ہے۔ اور یوں نظر آتا ہے کہ پوری کائنات کل کی کل نورِ مطلق ہے‘ اور ہمہ گیر نور کے لئے کوئی حدود قیود نہیں ہیں۔

اس نورِ الٰہی سے ہی کائنات کا قوام (مادہ) اور نظام قائم ہے۔ کائنات کا جوہر اور وجود اسی نور سے ہے۔ یہی نور کائنات میں اٹل ناموس کی تخلیق کرنے والا ہے۔ انسانوں نے اس عظیم حقیقتِ نورانی کے ایک بہت ہی محدود حصے کا ادراک حال ہی میں حاصل کیا ہے۔ انسان نے جب مادہ کو توڑا یعنی ایٹم کو توڑا تو اس ایٹم کے بکھرنے کی وجہ سے مادہ ناقابل گرفت نوری شعاعوں کی شکل اختیار کر گیا۔ (آج ہم نے جو جوہری طاقت حاصل کی ہے وہ مادہ یعنی ایٹم کو توڑ کر فرسودہ کر کے حاصل کی ہے) یہ شعاعیں کیا ہیں یہ نور ہی نور ہیں ان شعاعوں کے مادّے اور قوام سے ہی نور نکلا ہے۔ ایک ذرہ یعنی مادّے کا آخری یونٹ‘ ذرہ کیا ہے یہ کہرباہ اور الیکٹرون ہیں جو ایٹم کے ٹوٹنے کے وقت محض روشنی کی شکل اختیار کر لیتے

ہیں۔مادہ جتنا زیادہ توڑا جائے گا اس سے اتنی ہی زیادہ روشنی پیدا ہوگی جو جوہری قوت کا مظہر ہوتی ہے۔

یہ انسانوں کے لئے ایک ایسی مثال ہے جو انسان کے محدود ادراک کے لئے ایک قطعی غیر محدود ذات کے تصور کو قریب کرتی ہے ایک نہایت ہی چھوٹے نور کی مثال کو پیش کیا جاتا ہے جس کو انسانی تصور سمجھ سکے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اصل نور کا ادراک انسانی تصور کے لئے ممکن ہی نہیں ہے اس لئے آیتِ مبارکہ میں نور کی ایک چھوٹی سی مثال پیش کی گئی ہے تاکہ انسان سمجھ سکے کیونکہ انسانی ادراک نور کے اُن آفاق کا نہ احاطہ کرسکتا ہے نہ حدود کا۔

جیسا کہ آپ ان سطور سے قبل پڑھ چکے ہیں کہ طاق سے کائنات کو تشبیہہ دی گئی ہے جس میں نور کا چراغ سجا ہوا ہے۔طاق اس جگہ کو کہا جاتا ہے جس میں چراغ رکھا جاتا ہے تاکہ اس کی روشنی سے پورا کمرہ منور اور روشن ہوسکے۔طاق میں رکھا ہوا چراغ ایک شفاف اور ایسے چمکتے ہوئے فانوس میں محفوظ ہے جس کی چمک ستاروں جیسی ہے۔فانوس جہاں روشنی کو منبع نور کو ہوا سے بچاتا ہے وہیں اس کے نور کو اپنی شفافیت سے خوب منعکس بھی کرتا ہے اس طرح نور صاف ہوجاتا ہے اور اس کی نورانیت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔اللہ تعالیٰ انسانی سوچوں سے پوری طرح آگاہ ہے اس لئے ہی یہاں ایسی تمثیل پیش کی گئی ہے جس سے انسانی فہم وادراک پوری طرح آشنا ہے یہ سب اس لئے نہیں کہا یا بتایا جارہا کہ انسانی سوچ وفکر اس چھوٹے سے نمونے تک ہی محدود ہوکر رہ جائے۔اس چھوٹے سے چراغ کی مثال تو اس حقیقت کی طرف ایک اشارہ کے لئے اختیار کی گئی ہے۔

اور یہ چراغ زیتون کے تیل سے روشن کیا جاتا ہے اس کی روشنی دیگر تمام تیلوں سے زیادہ صاف شفاف اور تیز ہوتی ہے ہوتا ہے دیگر تیلوں کی طرح زیتون کے تیل میں کثافت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے زیتون کو اور زیتون کے درخت کو جو تقدس حاصل ہے اس کا ذکر قرآن میں اور جگہ بھی آیا ہے یہاں اس کی طرف صرف اشارہ ہے کہ ایک تقدس مآب درخت کے مقدس پھل کا تیل بھی اتنا ہی مقدس پاک وصاف ہوگا ظاہر ہے اس کی روشنی بھی ایسی منور اور صاف ہوگی۔زیتون کا وہ درخت جو طور سینا (جس کی قسم رب کائنات نے سورۂ التین میں کھائی ہے) پر پیدا ہوتے ہیں اُس کا تیل جو اپنی خوبی وخواص میں ہر طرح سے استعمال کے لئے بہترین ہے چاہے وہ کھانے کے لئے استعمال ہو یا جلانے کے لئے استعمال ہو۔اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کے اس ادنیٰ سے نمونے زیتون کے درخت میں ایسی خوبیاں جمع فرمادی ہیں کہ اس کا پھل اس کی لکڑی غرض ہر چیز کارآمد اور مفید بتائی جاتی ہے۔اس سارے بیان سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کا اظہار ہورہا ہے۔اس درخت کا تیل ہر قسم کی کثافتوں سے آلائشوں سے پاک وصاف شفاف ہوتا ہے کہ وہ بھڑ کنے کے لئے تیار رہتا ہے۔آگے چل کے اللہ تعالیٰ نے مزید وضاحت کے ذریعے اس کی خصوصیات کے بارے میں پیدا ہونے والے ابہام کو یہ کہہ کر دور کردیا کہ یہ کوئی مخصوص درخت نہیں ہے یہ نہ مشرقی ہے نہ مغربی اور نہ یہ محدود اس کا تیل مشخص (یعنی تشخیص کیا ہوا) یہ اپنی نوعیت کا کوئی اور ہی تیل ہے۔اس تیل میں خود بخود دھڑک اٹھنے کی خاصیت ہے اگرچہ اسے آگ نہ بھی لگائی جائے تب بھی وہ جل اُٹھتا ہے یعنی اس میں نورانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔نور علیٰ نور ہے۔لفظ نور علیٰ نور سے انسانی ذہن خود بخود ذاتِ باری تعالیٰ کے اعلیٰ نورانیت کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔

(جاری ھے)



انداز

محمد عارف

محترم اسرار ناروی جو دنیائے ادب میں ابن صفی بی اے کے نام سے مشہور ہیں' لفظ میں اس لیے استعمال کیا کہ بدقسمتی سے ہمارے معاشرہ میں بہت سے ناول نگار ایسے ہیں جنھیں آج کی نسل جانتی تک نہیں اور پرانی نسل بھی انہیں فراموش کرچکی ہے لیکن ابن صفی ایسی شخصیت ہیں جن کی تحریریں نہ صرف اب تک زندہ ہیں بلکہ ان کے پچاس سال قبل لکھے گئے ناول بھی آج کل کے بہت سے نامور لکھنے والوں سے زیادہ تعداد میں فروخت ہوتے ہیں۔ہم برملا کہہ سکتے ہیں کہ حضرت علامہ اقبال اور غالب کے بعد ابن صفی مرحوم واحد شخصیت ہیں جن پر سب سے زیادہ لکھا گیا اور لکھا جارہا ہے۔ آئیے نئی دہلی بھارت کے اردو بک ریویو کے ایڈیٹر محمد عارف اقبال کا ایک مضمون پڑھیے جو انہوں نے بطور خاص نئے افق کے لیے تحریر کیا۔

اردو دنیا کے عظیم ادیب ابن صفی کی خدمات کے بارے میں اردو دنیا کے تجربہ کار ادیب ونقاد اور موجودہ محققین کی جانب سے ابھی تک کوئی ایسی تحریر منصۂ شہود پر نہیں آئی ہے جس کی روشنی میں اندازہ ہو سکے کہ ابن صفی کی طویل ادبی زندگی کی یافت کیا ہے؟ یہ سوال اُن لوگوں کے لیے خاص ہے جن کی ساری دَوڑ دھوپ اردو ادب کے حوالے سے قائم ہے۔ ان میں وہ حضرات بھی شامل ہیں جو ابن صفی کو بڑا ادیب تو مانتے ہیں، ان کی تحریروں سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں لیکن بڑے ادیب کی خدمات پر کچھ لکھتے ہوئے ان پر کپکپی طاری ہوجاتی ہے۔ دوسری طرف اردو دنیا میں بزرگ کہے جانے والے ادیب وشاعر ونقاد اپنے خودساختہ ادبی خول سے نکلنے کے لیے تیار نہیں۔ ایک ڈیڑھ بزرگ ادیبوں نے شاید اسی میں عافیت محسوس کی ہے کہ اگر پیشے سے کوئی انجینئر ابن صفی پر تحقیق کرے تو اس کی پیٹھ کو تھپتھپادیں۔ نوجوان محقق بھی خوش ہوگیا اور اردو میں ان پر جانب داری کا الزام بھی عاید نہیں کیا جاسکتا۔ بات صرف ابن صفی کی نہیں بلکہ ان کے بعد اردو فکشن کے حوالے سے عوام میں مقبول ان مصنفوں کی بھی ہے جن کی حق تلفی ہورہی ہے اور جنھوں نے اردو کی آبیاری میں اپنی زندگی کے بیش قیمت لمحات نذر کردیئے۔ ان کی تحریروں کو ادب کی کسوٹی پر پرکھنے کا کام تو نقادوں کا ہے لیکن کیا یہ بات عجیب نہیں کہ اردو شاعری میں پابند نظم اور غزل کے علاوہ بیسیوں تجربات کرنے والے تو اردو ادب کے خادم کہے جاتے ہیں لیکن نثر میں اردو ادب کو نئے تجربے سے آشنا کرنے والے اور صد فیصد کامیاب

ادب کو ادب سے پنہائی باہر کردیا جائے۔
ادب کے چند باشعور نقادوں نے ادیب کی صفت بیان کرتے ہوئے اس کے اندر سماجی، تہذیبی اور تاریخی شعور کو لازمی قرار دیا ہے۔ گویا ادیب نہ صرف زبان و بیان پر قدرت رکھتا ہے بلکہ اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے سماج، تہذیب اور تاریخ کا گہرا شعور بھی رکھتا ہو۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ابن صفی نے اپنے دور میں جس موضوع یا موضوعات پر قلم اٹھایا، کیا وہ موضوعات ہمارے سماج، ہماری تہذیب، ثقافت اور تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس نکتہ نظر سے اگر ان کے تمام ناولوں اور انشائیوں کا مطالعہ کیا جائے تو یقینی طور پر یہ انکشاف ہوگا کہ ابن صفی نے اردو ادب کو بیش بہا عصری علوم سے مالا مال کردیا ہے۔ واضح ہو کہ ہر شاعر یا ادیب اپنے عہد کی نمائندگی کرتا ہے۔ غالب اور میر سے لے کر محمد حسین آزاد، اقبال، سرسیّد اور الطاف حسین حالی تک اردو ادب اپنے ارتقائی دَور سے گزرتا رہا ہے۔ زبان و ادب کا یہی ارتقائی سفر اسے زندگی کی حرارت بہم پہنچاتا ہے۔ مثال کے طور پر غالب ایک عظیم شاعر تھے لیکن ان کی حیات میں ان کی پذیرائی نہ ہوسکی۔ اقبال بھی ایک عظیم شاعر اور بنیادی طور پر وہ مفکر اور دانشور تھے۔ انہوں نے کئی معرکتہ الآرا لکچرز دیے لیکن اس حوالے سے اقبال خواص تک محدود رہے۔ جب انہوں نے فارسی اور اردو شاعری کو اظہار کا وسیلہ بنایا تو دیکھتے دیکھتے وہ مقبول عام شاعر ہوگئے۔ خواص کے ساتھ عوام نے بھی ان کی اردو شاعری میں اپنے دل کی آواز محسوس کی۔ مقبول عام شاعر ہوتے ہوئے بھی اقبال کی فکری و علمی حیثیت برقرار رہی اور ان پر سیکڑوں تحقیقی مضامین اور مقالے لکھے گئے جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ سرسیّد نے اردو میں مضمون نگاری کی ابتدا کی اور انشا پردازی کو نیا اسلوب بخشا۔ مقفّی و مسجّع عبارتوں سے گریز کرتے ہوئے سادہ اسلوب پر توجہ دی۔ انہوں نے اپنے عہد میں تقریباً ہر موضوع پر قلم اٹھایا اور اردو زبان و ادب کے ارتقا میں کلیدی کردار ادا کیا۔ سیاسی، مذہبی و صحافتی علوم کے اعتبار سے اگر مولانا ابوالکلام آزاد کا منفرد اسلوب ہے تو دوسری جانب مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کا علمی و صحافتی انداز بھی منفرد ہے۔ ان کی چند شہرہ آفاق کتابوں میں الجہاد فی الاسلام، پردہ، رسالہ دینیات اور خلافت وملوکیت کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ 1920ء اور 1930 کے دوران میں لکھی گئی مولانا کی تحریریں اپنے عہد میں منفرد اسلوب کی حامل ہیں۔ انہوں نے قرآن مجید کے اردو ترجمہ میں بھی اردو زبان و ادب کے ارتقائی عمل کا خاص طور سے خیال رکھا ہے۔ ان کی تحریریں بامحاورہ ہوتی تھیں اور اپنی تحریر میں وہ ادبی اسلوب پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ اپنے ''ترجمہ قرآن مجید'' کے ''عرض مترجم'' میں لفظی ترجمے پر نقد کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

''پہلی چیز جو ایک لفظی ترجمے کو پڑھتے وقت محسوس ہوتی ہے وہ روانیٔ عبارت، زورِ بیان، بلاغتِ

زبان اور تاثیر کلام کا فقدان ہے۔'' اسی مضمون میں آگے لکھتے ہیں:

''رہی ادب کی وہ تیز و تند اسپرٹ جو قرآن کی اصل عبارت میں بھری ہوئی ہے، اس کا کوئی حصہ ترجمے میں شامل نہیں ہونے پاتا۔ وہ اس چھلنی کے اوپر ہی سے اڑ جاتی ہے۔ حالانکہ قرآن کی تاثیر میں اس کی پاکیزہ تعلیم اور اس کے عالی قدر مضامین کا جتنا حصہ ہے، اس کے ادب کا حصہ بھی اس سے کم نہیں ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ مولانا مودودی نے پہلی بار قرآن مجید کی اردو میں آزاد ترجمانی کی اور کہا کہ ''اسلوب بیان میں ترجمہ پن نہ ہو بلکہ عربی مبین کی ترجمانی اردوئے مبین میں ہو۔''

اردو زبان و ادب کی خدمت سماج کے مختلف فن اور موضوع پر دسترس رکھنے والے ادیبوں، شاعروں، دانشوروں، مفکرین اور علمائے دین نے کی ہے۔ جس فن اور موضوع پر بھی انہوں نے قلم اٹھایا اردو زبان و ادب میں اضافہ ہی کیا۔ اردو زبان میں اگر گزشتہ ایک صدی کے سات آٹھ منتخب قرآن مجید کے اردو تراجم کی فرہنگ تیار کی جائے تو ہزاروں الفاظ اپنے قدیم اور جدید مفہوم کے ساتھ جمع کیے جاسکتے ہیں۔ افسوس کہ اردو کے چند مخصوص فکر کے حامل ادیبوں نے اردو زبان کو بھی اپنی مخصوص سوچ اور ذاتی اغراض تک محدود کر دیا۔ جس کی وجہ سے اردو زبان و ادب کا ارتقائی عمل ٹھہر گیا۔ آزادی کے بعد اردو کے سکہ بند ادیبوں اور نقادوں نے اردو ادب سے مذہب کو خارج کرنا شروع کر دیا اس کے ساتھ ہی انہیں اقدار (Values) سے بھی اُبکائی آنے لگی۔ ایسی صورت میں اردو زبان و ادب کا رواں بہتا پانی ایک تالاب میں گرنے لگا۔ اردو کے وہ ادیب جن کو اپنی زبان اور ادب سے حقیقی محبت تھی انہوں نے زبان و ادب کے ارتقائی عمل کو بحال رکھنے کے لیے نئی راہیں نکالیں اور نئی اصناف کی بنیاد ڈالی۔ چنانچہ اردو میں دوسری زبان کے علوم کے شستہ تراجم کے ساتھ فکشن کے تراجم بھی ہوئے۔ پھر طبع زاد نثری تخلیقات کا دور شروع ہوا۔ ''جاسوسی ادب'' کے ساتھ سماجی اور رومانی ادب کے تجربات بھی کیے گئے۔ فکشن کے انداز میں تاریخی ادب کے حوالے سے کئی بڑے لکھنے والے مقبول عام مصنف منظر عام پر آئے۔ نسیم حجازی، مائل ملیح آبادی، عنایت اللہ التمش، اسلم راہی، مولانا صادق سردھنوی کے علاوہ عادل رشید، رضیہ بٹ، ہاجرہ نازلی، شکیل جمالی، سراج انور، گلشن نندہ، اظہار اثر، اکرام الہ آبادی اور موجودہ دَور میں محی الدین نواب، ایم اے راحت وغیرہ کی تخلیقات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان ادیبوں اور مصنفوں نے اردو زبان و ادب کی ایسے دَور میں آبیاری کی جب اردو زبان پُر آشوب دور میں سسکیاں لے رہی تھی۔ ادب کی راہ سے محبانِ اردو کے تعلیمی و تفریحی ذوق کا سامان مفقود تھا۔ اردو کے موجودہ دورِ انحطاط میں بھی چند مقبول عام ادیب و تخلیق کار اردو زبان و

ادب کی حقیقی ترقی اوراس کی آبیاری میں سرگرم عمل ہیں۔

ابن صفی کا شماران کمیاب مصنفوں میں ہوتا ہے جنہوں نے سوچ سمجھ کراور منصوبہ بند طریقے سے اردو زبان وادب کی آبیاری کا بیڑہ اُٹھایا۔اس وقت ان کے سامنے بھی عام انداز سے سوچنے والے اور صرف اپنے ''روشن مستقبل'' پرنظر رکھنے والے ادیبوں کی کمی نہ تھی۔ان کا تو اُٹھنا بیٹھنا ہی ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ تھا۔شاعری کے ساتھ انشا پردازی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔لیکن ان کے نزدیک بیک وقت دو مسئلے تھے۔اول اردو زبان کا تحفظ،دوم اردو زبان وادب سے عوام کو جوڑنا۔اس سلسلے میں ان کے اختراعی ذہن نے روایتی اسلوب اور رجعت پسندی سے گریز کرتے ہوئے یوروپ کے بعض مصنفوں کے طرز پر اردو میں ایک منفرد صنف دریافت کی۔اس صنف کے وہ امام ہی نہیں بلکہ موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ابن صفی کے بعد کئی اچھے لکھنے والے اردو دنیا میں یقیناً پیدا ہوئے لیکن ان کی راہیں الگ ہیں۔ابن صفی کا یہ بھی اعجاز ہے کہ ان کی تحریروں کو پڑھ کر اسکول اور یونیورسٹی سطح کے اساتذہ پیدا ہوئے۔ادیب،شاعراورافسانہ نگار بھی منظر عام پر آئے۔یہ امر باعث حیرت ہے کہ پچاس ساٹھ سال قبل کے چند معروف بڑے تخلیق کار کو بھی آج لوگ بھول چکے ہیں۔اس کے برعکس ابن صفی کے تمام ناول کل کی طرح آج بھی تازہ محسوس ہوتے ہیں اوران کی مانگ میں اب بھی مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔

اس بات کو عالمی ادبی تناظر میں معروف نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے یوں بیان کیا ہے:

''میری نسل (یعنی وہ نسل جو دوسری جنگ عظیم کے بعد فوراً پروان چڑھی) کے سامنے انگریزی کے جو مقبول ترین ناول نگار تھے،ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کا نام آج لوگوں کو یاد ہو،اس کے ناول کا مقبول ہونا تو دور کی بات ہے۔تاریخی اہمیت کے جاسوسی افسانہ اور ناول نگاروں میں ایڈگر ایلن پو (Edgar Allan Poe) اور آرتھر کانن ڈائل (Arthur Conan Doyle) کے نام کچھ لوگوں کو یاد ہیں۔کانن ڈائل کی جاسوسی تحریریں پڑھنے والے بھی کچھ لوگ آج موجود ہیں،بہت نہ سہی۔لیکن ایڈگر ایلن پو کے جاسوسی افسانے اب صرف کتابی اہمیت رکھتے ہیں حالانکہ کئی اعتبار سے وہ کانن ڈائل سے بہت بہتر تھا۔

ان لوگوں کو چھوڑ دیجئے،ہمارے زمانے کی مقبول ترین جاسوسی ناول نگار (اس نے ایک ڈراما بھی لکھا جو کئی سال تک مسلسل لندن کے تھیٹر میں کھیلا جاتا رہا) یعنی اگاتھا کرسٹی (Agatha Christie) کی بات کیجیے،ایک زمانے میں اس کا ہر ناول دس اور بیس لاکھ کی تعداد میں صرف انگریزی میں چھپتا تھا،غیر زبانوں کے تراجم کو تو چھوڑیے۔لیکن آج چند ہی لوگ اگاتھا کرسٹی کا نام جانتے ہیں۔اس کے ناولوں کے نام اور بھی کم لوگ جانتے ہیں اوران کو پڑھنے والے آج ان ناولوں

کے نام جاننے والوں سے بھی کم ہوں گے۔

ایسی صورت میں کیا یہ بات غیر معمولی نہیں کہ ابن صفی کے پڑھنے والے آج بھی کثیر تعداد میں ہیں حالانکہ انہوں نے پہلا ناول کوئی ساٹھ برس پہلے لکھا تھا اور ان کے انتقال کو آج تیس برس سے اوپر ہو گئے۔ اب یا تو ہم اردو پڑھنے والے بالکل غیر ترقی یافتہ اور اعلیٰ تعلیم سے بے بہرہ ہیں یا ابن صفی میں کوئی بات (یا کئی باتیں) ایسی ہیں جو اب بھی ہمارے دل اور ذہن کو متاثر کرتی ہیں۔''

(ابن صفی: مشن اور ادبی کارنامہ، صفحہ نمبر 82، 201383)

شمس الرحمٰن فاروقی کے مذکورہ وضاحتی سوال کی روشنی میں مزید کئی سوالات ذہن میں کچوکے لگاتے ہیں۔ ایک بات واضح ہے کہ کم سے کم گذشتہ چالیس برسوں میں اردو ادب کے ''اعلیٰ تعلیم یافتہ'' حضرات ''غیر ترقی یافتہ'' محسوس ہوتے ہیں یا کم سے کم ان کا تعلیمی پس منظر غیر ترقی یافتہ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج اردو کے بیشتر پروفیسر حضرات بین الاقوامی سطح پر کم ترین علمی درجے پر نظر نہیں آتے۔ سینٹرل یونیورسٹی کے چند سینئر طلبا کا احساس ہے کہ شعبہ اردو کے بیشتر اساتذہ اس لائق نہیں کہ یونیورسٹی میں پڑھا سکیں۔ اس پر دیگر یونیورسٹیوں کے شعبہ اردو اور پھر ملک میں اردو زبان کے مجموعی انحطاط کے سلسلے میں قیاس کیا جا سکتا ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں کے شعبہ اردو کے بیشتر پروفیسروں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ادب میں سماجی، تہذیبی اور تاریخی شعور کوئی اہمیت رکھتا ہے۔ اس ضمن میں بزرگ نقاد ڈاکٹر تنویر احمد علوی مرحوم بے حد حساس تھے۔ لیکن اب ان کے درجنوں شاگرد بھی اس شعور سے نابلد نظر آتے ہیں۔ اردو کے کسی بھی شہ پارے کو مذہبی اور کٹر پسندی کہہ کر مسترد کر دینے کا رجحان عام ہو گیا جسے علمی بے بصیرتی کا نام ہی دیا جا سکتا ہے۔ یہ وہی پروفیسر حضرات ہیں جو مفکر اور دانشور بن کر غالب اور اقبال کو سمجھنے کا دَم تو بھرتے ہیں لیکن ان کی ایک تحریر بھی غالب یا اقبال کی تفہیم میں معاون نظر نہیں آتی۔ اردو ادب میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی خدمات کو کیوں کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن طرفہ تماشہ یہ ہے کہ یونیورسٹیوں کے اردو کے شعبوں میں ان حضرات کو سیاسی اور مذہبی دائرے میں محصور کر دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ تو محض چند معروف نام ہیں ورنہ اردو دنیا میں سیکڑوں علمی حضرات ہیں جن پر اردو محققین کو کام کرنے کی ضرورت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو دنیا میں ابن صفی کی تخلیقات کی روشنی میں صرف دو ہی کتابیں ''سائیکو مینشن'' اور ''رانا پیلس'' شائع ہوئی ہیں۔ ان کے مؤلف و مرتب ہیں پاکستان کے معروف محقق، تاریخ داں اور اقبالیات کے شناسا خرم علی شفیق۔ انہوں نے بجا طور پر ابن صفی کو علامہ اقبال کا ''مردِ بزرگ'' قرار دیا

بات انہوں نے پورے وثوق کے ساتھ کہی ہے۔علامہ اقبال کے الفاظ میں:

اس کا انداز نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

خرم علی شفیق کی تحقیق کے بعض پہلو اور خیال سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن ابن صفی کی تخلیقات پر ان کی تحقیق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔انہوں نے بجا طور سے لکھا ہے:

''جب ہم ابن صفی کی طرف دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں جب 'ادب عالیہ' لکھنے والے بڑے ادیب معاشرے کی اخلاقی اقدار پامال کر رہے تھے،ابن صفی ہی وہ سب سے بلند آواز تھی جو قانون کے احترام اور اخلاقی اقدار کے دفاع میں بلند ہوئی۔دوسرے جاسوسی ناول نگاروں اور ابن صفی کے درمیان اتنا بڑا فرق ہے کہ ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ ابن صفی کو آرتھر کانن ڈائل، اگاتھا کرسٹی، مارس لیبلانک، ارل اسٹینلے گارڈنر، آین فلیمنگ، جیمز ہیڈلے چیز اور دوسرے تمام جاسوسی ناول نگاروں سے بالکل الگ کر دیں اور ان کے درمیان کسی قسم کا موازنہ کرنے سے گریز کریں۔'' (سائیکومینشن، صفحہ نمبر 8، 2011)

خرم علی شفیق نے ابن صفی کے تمام ناولوں کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔انہوں نے موجودہ دَور کے ادیبوں اور نقادوں کی آسانی کے لیے نثری ادب میں ابن صفی کے فنی اور ادبی پس منظر اور ان کی تخلیقات کا تہذیبی و تاریخی اعتبار سے جائزہ لیتے ہوئے ان کی اہم خصوصیات کی درجہ بندی اس طرح کی ہے:

۱...ابن صفی کی پہلی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ محض چٹخارے دار کہانیاں نہیں لکھ رہے تھے (جیسا کہ ''ادب عالیہ'' والے کر رہے تھے) ابن صفی کے پاس ایک واضح مشن تھا اور اصلاحی ادب کے سب سے بڑے مبلغ کے طور پر سر سیّد احمد خاں، محمد علی جوہر اور علامہ اقبال کی فکری جانشینی کے مستحق صرف وہی تھے نہ کہ ''ادب عالیہ'' کے وہ علمبردار جو اُن بزرگوں کے تصورات اور نظریات سے اعلانیہ طور پر باغی تھے۔

۲...ابن صفی کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ علمی حوالوں کی جس قدر بہتات ان کے یہاں پائی جاتی ہے اور ان حوالوں کے درمیان جتنا تنوع ہے، وہ نہ صرف کسی دوسرے جاسوسی ناول نگار کو نصیب ہوا بلکہ اردو میں 1963ء کے بعد اُبھرنے والے کسی بھی ادیب کے حصے میں نہیں آیا۔

۳...تیسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے معاشرے کی جیسی نمائندگی کی، ویسی کوئی اور نہیں کر سکا...انہوں نے اپنے پڑھنے والوں کی رائے کو اہمیت دی۔

۴...ابن صفی کی چوتھی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ان سے بہتر نثر شاید (مرزا غالب اور محمد حسین آزاد کو چھوڑ کر) اردو میں کسی اور نے نہیں لکھی۔ اگر اقبال کی شاعری کو الہامی شاعری کہا جاتا ہے تو ابن صفی کی نثر کو الہامی نثر کہا جا سکتا ہے۔

۵...ابن صفی کی پانچویں امتیازی خصوصیت مستقبل بینی ہے، جس کے بغیر کوئی ادیب، بڑا ادیب نہیں بن سکتا مگر جس سے بیسویں صدی کے ادیب محروم ہیں۔

(''ابن صفی کا ادبی نصب العین'' بحوالہ ابن صفی: مشن اور ادبی کارنامہ، صفحہ 19'20، مطبوعہ 2013)

خرم علی شفیق نے جس محققانہ انداز میں ابن صفی کی پانچ اہم خصوصیات بیان کی ہیں ان میں ''مستقبل بینی''، یعنی ان کی تحریروں میں Futuristic Approach انہیں یقینی طور پر اردو کا عظیم ادیب قرار دینے کے لیے کافی ہے۔ اس سلسلے میں خرم علی شفیق نے واضح طور پر لکھا ہے کہ بیسویں صدی کے ادیب ''مستقبل بینی'' کی اس صفت سے محروم رہے۔ خرم علی شفیق اس ضمن میں مزید وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

''بیسویں صدی میں ایسے ادیبوں کی کمی نہ تھی جنہوں نے مستقبل کے بارے میں بڑی تاریخی پیشین گوئیاں کیں۔ ان میں آئرلینڈ کے شاعر ڈبلیو بی ییٹس کی نظم 'دی سیکنڈ کمنگ (1919) اور انگریزی ناول نگار جارج آرویل کا ناول ''نائنٹین ایٹی فور' (1948) مشہور ہیں۔ مگر 'نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے'، ابن صفی ان سے مختلف ہیں کیوں کہ انہوں نے مستقبل میں پیدا ہونے والے مسائل کی صرف نشاندہی نہیں کی بلکہ ان کے حل بھی پیش کیے۔ یہ امتیاز علامہ اقبال کے بعد کسی دوسرے ادیب کو حاصل نہیں ہوا تھا۔ یہ ابن صفی کی تحریر کا ایسا پہلو ہے جس کی طرف گذشتہ ایک دو برسوں میں اردو اور انگریزی کے اخبارات میں کئی لکھنے والوں نے توجہ دلائی....'' (سائیکومینشن، صفحہ نمبر 10)

یہاں اس امر کا اظہار ناگزیر ہے کہ خرم علی شفیق سے بہت پہلے معروف ادیب و نقاد اور مفکر ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ابن صفی کی تحریروں کے پہلے باضابطہ نقاد ہیں جنہوں نے عمران سیریز کے مطالعے کے دوران میں تنقیدی حاشیے لکھے۔ ممتاز ادیب و ناول نگار اور ماہنامہ نئے افق، کراچی کے ایڈیٹر مشتاق احمد قریشی نے ڈاکٹر ابوالخیر کشفی اور ابن صفی سے اپنے گہرے تعلق کا اظہار اس طور کیا کہ 2009 میں ایک کتاب ''دو بڑے: ابن صفی اور ڈاکٹر ابوالخیر کشفی'' مرتب کی۔ اس کتاب میں انہوں نے عمران سیریز کے 18 ناولوں پر ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کے تنقیدی حاشیے مع اقتباسات پیش کر دیئے ہیں۔ عمران سیریز کے یہ ناول ہیں: خوفناک عمارت، چٹانوں میں فائر، پُراسرار چیخیں، بھیانک آدمی، نیلے

پرندے، سانپوں کے شکاری، رات کا شہزادہ، دھوئیں کی تحریر، لڑکیوں کا جزیرہ، پتھر کا [illegible]
بازار، قبر اور خنجر، کالے چراغ، خون کے پیاسے، الفانسے، درندوں کی بستی، گمشدہ شہزادی [illegible]
تحریروں میں ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے جہاں ان کی ادبی تخلیقی صلاحیتوں اور اردو پر ان کی گرفت کی [illegible]
دہی کی ہے وہیں ان کے حسِ مزاح اور طنزیہ پیرائے کو بھی اجاگر کیا ہے۔ اس کی تعارفی تحریر میں مشتاق
احمد قریشی نے ابن صفی کے بارے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی یہ رائے بھی لکھی ہے کہ "اردو
زبان پر اس شخص (ابن صفی) کا بڑا احسان ہے۔" ڈاکٹر کشفی کے بقول: "ابن صفی کے ہاں اختصار ہے،
ان کے مکالموں میں برجستگی اور ظرافت ہے۔ یہ ظرافت کہیں زبان کی ہے، کہیں خیال کی اور کہیں
صورتِ حال کی..." (دو بڑے، صفحہ 16)

ابن صفی کی ادبی خدمات کے حوالے سے اپنی بات کو سمیٹتے ہوئے انتہائی ادب کے ساتھ اردو کے ان محققین، اسکالرز اور ادیبوں و شاعروں سے التماس ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ اس بات پر غور کریں کہ اردو زبان و ادب سے ہماری عملی وابستگی کیسے ہوگی؟... کیا ہم اردو کی ترقی کے روایتی انداز اور ادب کی روایتی تفہیم سے اوپر اٹھ کر سوچنے اور عملی اقدام کے لیے تیار ہیں؟ اردو زبان کا بنیادی وصف اس کے رسم الخط اور اس کے صوتی آہنگ میں ہے۔ اگر ان دونوں نکتے پر ذہن مرکوز کرتے ہوئے اردو زبان کو زندگی کے ہر شعبہ حیات میں متعارف کرانے کا آغاز کر دیا جائے تو کوئی سبب نہیں کہ اردو زبان پھر اپنے عروج کی طرف گامزن ہونے لگے۔ لیکن آج کے ادبا اور نقادوں کو اپنے رویے میں بنیادی تبدیلی لانی ہوگی۔ اس سلسلے میں راقم کی گزارش ہے کہ ابن صفی کی تحریروں کا ازسرِنو مطالعہ کیا جائے۔ ان تحریروں کو تعلیمی نصاب میں شامل کیا جائے۔ زبان و ادب اور تاریخ و تہذیب کے دائرے میں ابن صفی کی تحریروں کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن یہ کام آج کا وہ نقاد ہی کر سکتا ہے جو مروجہ اور روایتی اصولِ تنقید کے چوکھٹے سے باہر نکل کر اردو کی حقیقی ترقی اور ادب کی عملی توسیع کو اہم سمجھتا ہو۔



ڈبل گیم

ڈاکٹر ایم اے قریشی

جنگ عظیم دوم کو ختم ہوئے 70 سال ہونے کو آئے ہیں مگر اس کی تلخ اور خوشگوار یادیں آج بھی ایک نسل کے ذہنوں میں تازہ ہیں۔ اس جنگ نے کروڑہا لوگوں کو متاثر کیا اور دنیا کا نقشہ تک تبدیل کر کے رکھ دیا۔ جہاں اس جنگ نے لاکھوں انسانوں کو موت کی گہری وادیوں کا شکار بنا دیا وہیں بیشتر قوموں کو آزادی کی نوید سحر سے بھی آشنا کیا۔ گو نئی نسل کے لیے اس کے قصے اب افسانوی سے بن گئے ہیں لیکن اس کے باوجود دنیا بھر میں اس کے واقعات کو بڑی دل چسپی سے پڑھا جاتا ہے۔

جنگ عظیم دوم میں جرمنی کی شکست کا سبب بننے والا ایک واقعہ۔ ایک جاسوس کی روداد' وہ اپنے وقت کے لیے موت سے آنکھیں چار کر رہا ہے۔





آئرلینڈ کے دارالحکومت ڈبلن کی اس سڑک پر دونوں جانب سرخ اینٹوں سے بنے ہوئے وکٹورین طرز کے اونچے اونچے مکانات تھے' جنگ کی وجہ سے سڑکوں کے لیمپ بجھے ہوئے اور مکانوں کی کھڑکیوں پر پردے پڑے تھے۔

کرسٹوفر نے ایک درخت کی آڑ سے اس عمارت پر آویزاں بورڈ کو پھر غور سے پڑھا۔ یہ جرمنی کا سفارت خانہ تھا۔ ایک جانب جرمنی کا سرکاری نشان اور دوسری جانب سواستیکا بنے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا پتھر تولا۔ اس کا وزن لگ بھگ ایک سیر رہا ہوگا۔ سامنے والے کمرے کی فرانسیسی کھڑکی کا شیشہ اتنا بڑا تھا کہ اسے نشانہ لینے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ شیشہ ٹوٹنے اور پتھر کے فرش پر لڑھکنے کی آواز زوردار تھی۔

کرسٹوفر درختوں کی آڑ لیتا ہوا واپس بھاگ گیا۔

پتھر کے ساتھ اس نے ایک خط باندھا تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ اس کا تعلق برٹش فوج سے ہے اور وہ برطانیہ کے فوجی راز جرمنی کو فروخت کرنا چاہتا ہے۔ اس نے ملاقات کی جگہ اور وقت تجویز کرتے ہوئے لکھا تھا ''تنہا آنا۔''

اگلی صبح وہ مقررہ وقت سے کچھ دیر قبل جنگل میں پہنچ کر چھپ گیا اور پھر اس نے پانچ جرمنوں کو جنگل میں داخل ہوتے دیکھا ''تو وہ تنہا نہیں آیا۔'' اس نے گہری سانس لی۔

وہ کرسٹوفر کی جانب بڑھتے رہے۔ اب وہ پانچوں پھیل کر نیم دائرے کی شکل میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ان میں سے دو آگے بڑھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈال رکھے تھے۔ جن میں یقیناً ریوالور تھے۔ باقی تین جرمن کچھ فاصلے پر رک گئے۔ دونوں جرمن اس کی طرف بڑھتے رہے اور وہ قدرے پریشان نظر آنے لگا۔ ایک جرمن دبلا پتلا طویل القامت تھا جب کہ دوسرا بھاری بدن کا۔ پتلے شخص کا چہرہ عادی مجرموں کی طرح سفاک اور نحوست زدہ تھا اور وہ گردوپیش پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا جب کہ موٹے شخص کی حرکات وسکنات میں سکون اور ٹھہراؤ کی سی کیفیت تھی۔ کرسٹوفر کے خیال میں یہی باس تھا۔

سرخ بالوں والا موٹا اس کے نزدیک پہنچ کر بولا۔ ''اگر تم بُرا نہ مانو تو ہم تمہاری تلاشی لے لیں؟'' اس کا لہجہ نرم اور دوستانہ تھا۔

''لے لو! میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے اور ویسے بھی میں تمہارا دوست ہوں' بھلا دوستوں سے ملاقات کے وقت بھی کوئی ہتھیار ساتھ لاتا ہے۔''

پتلا شخص آگے بڑھا۔ اس نے بڑے ماہرانہ انداز میں کرسٹوفر کا جسم ٹٹولا اور پھر اطمینان ہونے کے بعد پیچھے ہٹتے ہوئے موٹے سے جرمن زبان میں کچھ کہنے لگا۔

''روڈلف بروشر! ویسے تم مجھے روڈی کہہ سکتے ہو۔'' موٹے نے اپنا تعارف کروایا۔

''میرا نام اسمتھ ہے۔'' کرسٹوفر نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرا اصلی نام نہیں ہے لیکن تم مجھے اسی نام سے پکارو گے۔ میری ہدایت کے خلاف پوری فوج لے کر آئے ہو۔ اگر مجھے قتل کرنا چاہتے ہو تو پہلے میری پوری بات سن لو۔ اس میں تمہارا ہی بھلا ہے۔''

بروشر مسکرایا۔ ''بہت خوب مسٹر اسمتھ! کہو...... میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

''میں شاہی بحریہ میں سگنل کور میں کام کرتا ہوں۔ میرے فرائض کوڈ حل کرنا ہیں اور اس کی وجہ سے معمولی ملازم ہونے کے باوجود مجھے ٹاپ سیکورٹی کلیرنس حاصل ہے۔''

''تمہارا ایس ڈی او کون سا ہے؟'' بروشر نے پوچھا۔ اس کا مطلب تھا تمہارا اسگنلز۔ ڈسٹری بیوٹنگ

آفس کون سا ہے۔ دراصل وہ کرسٹوفر کا امتحان لے رہا تھا۔

''میں پرنس گیٹ میں کام کرتا ہوں۔ نمبر ۹ کمبائنڈ آپریشن ہیڈ کوارٹر میں۔''

بروشر کے چہرے پر اطمینان کی ایک جھلک نمودار ہوئی۔

''کیا تم تعطیل پر ہو؟''

''ہاں سات دن کی چھٹی پر ہوں۔''

''تمہیں میرا ایڈریس کیسے معلوم ہوا؟''

''بڑے بھائی تمہارے سفارت خانے کا ایڈریس کوئی خفیہ ہے کیا؟ بس میں نے سفارت خانے میں ایک خط بھیجا' مجھے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی ملاقات کے لیے ضرور آئے گا۔ ویسے مجھے تمہارے ناموں کا علم نہیں تھا۔''

''تم کیا چاہتے ہو؟''

کرسٹوفر نے کھنکار کر اپنا حلق صاف کیا۔ وہ کچھ نروس نظر آ رہا تھا۔

''دراصل بات یہ ہے کہ میرے مشاغل کچھ ایسے ہیں جن کا بوجھ میری معمولی تنخواہ برداشت نہیں کر سکتی۔ ایک معمولی اہل کار کی تنخواہ ہوتی ہی کتنی ہے اور پھر [illegible]نگ کی وجہ سے ہر چیز کی قیمت آسمان سے باتیں [illegible]رہی ہے۔ بہرحال...... میں تمہیں اپنے بارے میں [illegible] تفصیلات نہیں بتاؤں گا کیونکہ میں کسی مشکل میں [illegible] پھنسنا چاہتا اور تمہیں بھی اس سے غرض نہیں ہونا [illegible] میں کون ہوں۔ میں تمہیں ٹاپ سیکرٹ دفاعی [illegible] کرنا چاہتا ہوں' خریدو گے؟''

''[illegible] اطلاعات کیا ہیں؟''

''[illegible] مفت میں کیوں بتا دوں' پہلے معاملہ [illegible]''

''[illegible] پہلے بتاؤ' اپنے وطن سے غداری کرتے ہوئے تمہارا ضمیر ملامت نہیں کرتا؟'' بروشر اس نوجوان کے بچکانہ انداز پر مسکرایا۔

''بادشاہ اور ملک...... قوم و وطن...... یہ سب خرافات ہیں بڑے بھائی...... فضول باتیں۔ اصل چیز دولت ہے دولت...... دولت کے سامنے کسی کی کوئی حیثیت نہیں۔''

بروشر گہری نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔

''دیکھو روڈی! ہو سکتا ہے تمہیں شک ہو کہ برطانوی انٹیلی جنس نے غلط اطلاعات فراہم کرنے کے لیے مجھے بھیجا ہے' اگر ایسی بات ہے تو تمہارا شک بالکل بے بنیاد ہے۔ ہاں' تم میرا امتحان لے لو' میری اطلاعات کی اچھی طرح چھان بین کر لو پھر جب میرے فراہم کردہ راز درست ثابت ہو جائیں تو مجھے رقم ادا کر دینا اگر میں تمہیں غلط باتیں بتاؤں تو جب میں تم سے رقم وصول کرنے آؤں تو تم مجھے ٹھکانے بھی لگا سکتے ہو لیکن مسٹر روڈی! راز تو میں فراہم کر دوں گا تمہیں' اس کے عوض مال بھی تگڑا وصول کروں گا۔''

''چلو یہ بتاؤ تمہارے پاس راز کون سا ہے؟''

''ایک فرانسیسی بندرگاہ پر اتحادیوں کا حملہ ہونے والا ہے۔''

''ہمارے مقبوضہ علاقے پر......'' بروشر چونک پڑا۔

''کون سی بندرگاہ ہے وہ؟''

اس بارے میں ابھی تک پیغام موصول نہیں ہوا ہے۔ وہ پہلے بھی دو مرتبہ منصوبے میں تبدیلی کر چکے ہیں لیکن اب اس منصوبے کو آخری شکل دی جا رہی ہے۔''

''مسٹر اسمتھ! کسی ٹھوس بات کے بغیر تو یہ اطلاعات بالکل بے کار ہیں۔''

''سب کچھ ہو جائے گا یہ بتاؤ مجھے معاوضہ کتنا ملے

گا؟“
”تمہارے خیال میں کتنے پاؤنڈ مناسب رہیں گے؟“
”دس ہزار پاؤنڈ! پانچ پانچ سو کے نوٹوں کی شکل میں۔“
”اور یہ رقم اس وقت ادا کی جائے گی جب ہمیں تمہارے فراہم کردہ راز درست ہونے کا یقین ہو جائے گا۔“
”بالکل بالکل!“
”یعنی تمہیں ہم پر اعتماد ہے‘ عجیب بات ہے۔“
”کیوں نہیں۔ معاملہ بالکل سیدھا ہے اگر تم پہلی بار ہی رقم ادا نہیں کرو گے تو آئندہ تمہیں مزید راز نہیں ملیں گے اور دیکھو! جب تم لوگ برطانیہ پر قبضہ کرلو تو مجھے اپنی کٹھ پتلی حکومت میں کوئی بڑا سا عہدہ بھی دلوا دینا......اوں......کسی ملک میں سفیر بنا دینا۔“
دبلا پتلا جرمن بڑے غور سے یہ مذاکرات سن رہا تھا۔ اچانک اس نے جرمن زبان میں بروشر سے بات شروع کردی۔ وہ دونوں بہت دیر تک محوِ گفتگو رہے پھر بروشر نے کرسٹوفر سے کہا۔
”ہر کنسکی تم سے مطمئن نہیں ہے۔ اسے تم پر شک ہے۔“
”جہنم میں جائے۔“
کنسکی نے فوراً جیب سے بھاری سا پستول نکال لیا اور بھدے لہجے میں انگریزی زبان میں بولا۔
”مسٹر اسمتھ! زیادہ بکواس مت کرو‘ چلو ہمارے ساتھ۔“
”اوہ!“ کرسٹوفر بوکھلا گیا۔ ”مسٹر روڈی! یہ مجھے کہاں لے جا رہا ہے۔“
”فکر مت کرو۔“ بروشر اطمینان سے بولا۔ ”تمہیں آرام سے رکھا جائے گا۔ اس دوران ہم تمہارے بارے میں مکمل انکوائری کریں گے‘ تمہیں اس کے احکامات پر عمل کرنا ہی ہوگا۔“
”لیکن میں تو صرف سات دن کی چھٹی پر ہوں۔ دو دن گزر چکے ہیں‘ اب مجھے پانچ روز بعد ڈیوٹی پر پہنچنا ہے۔“
”فکر مت کرو‘ اس وقت تم واپس چلے جاؤ گے اگر کسی وجہ سے نہ جا سکے تو تمہیں سڑک پر حادثہ پیش آجائے گا اور اسپتال میں داخل کردیے جاؤ گے اور تمہارے دفتر کو مطلع کردیا جائے گا۔“
”لیکن......لیکن دیکھو تمہیں میرا نام تک معلوم نہیں اور درخواست کس کی بھیجو گے۔“
”جب تک ہمیں ہر بات کا علم ہو چکا ہوگا‘ بس اب چلے چلو۔“

❁......☆......❁

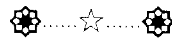
بیڈ روم آرام دہ تھا لیکن کھڑکیوں کو باہر سے بند کردیا گیا تھا اور شیشے بھی تاریک تھے۔ یہ مکان ڈبلن کے مضافات میں کسی جگہ واقع تھا‘ چاروں طرف کھیت تھے۔
اس دوران کرسٹوفر کو بروشر یا کنسکی کی صورت نظر نہیں آئی۔ ہاں تین تنومند جرمن اس پر مسلط تھے۔ ان میں سے ایک ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول سکتا تھا۔ ان کا رویہ کرسٹوفر کے ساتھ دوستانہ تھا۔ وہ چاروں تاش کھیل کر وقت گزارتے رہے۔
اڑتالیس گھنٹے بعد اسے بروشر کی شکل نظر آئی۔
”تم آرام سے تو ہو نا؟“
”بھلا کبھی جیل میں بھی کوئی آرام سے رہ سکتا ہے۔“ کرسٹوفر نے منہ بنایا۔ ”شاید میں نے تم سے رابطہ قائم کرکے غلطی کی ہے۔ سال میں یہ میری پہلی چھٹی تھی اور اسے بھی تم یوں غارت کیے دے رہے ہو۔ ارے اس وقت تو میں لندن میں حسیناؤں کے جھرمٹ

میں مزے لوٹ رہا ہوتا۔ اگر صورت حال یہی رہی تو میں قیمت بڑھانے پر مجبور ہو جاؤں گا۔

"تمہیں زیادہ دن یہاں نہیں رہنا پڑے گا۔ ہم نے اطلاعات بھیج دی تھیں۔ کل تک تمام تفصیلات موصول ہو جائیں گی۔"

"تمہارا ساتھی کنسکی کہاں مر گیا؟"

"مجھے کیا پتا۔" بروشر نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔ جرمن انٹیلی جنس ایب وہیر اور ایس ایس کے کارکن ایک دوسرے سے سخت خار کھاتے تھے۔ دراصل ایب وہیر امیں انٹیلی جنس کے پیشہ ور لوگ تھے جب کہ ایس ایس غنڈوں بدمعاشوں اور جرائم پیشہ افراد کا ٹولہ تھا۔ بروشر کمرے سے جا چکا تھا۔



کرسٹوفر، چرچل سے اپنی ملاقات کے بارے میں سوچنے لگا۔ کوئی دس برس قبل اس کی ملاقات چرچل سے ہوئی تھی۔ اس وقت کرسٹوفر کی عمر بمشکل آٹھ برس رہی ہوگی۔ چرچل محض پارلیمنٹ کا ایک رکن تھا اور بیش تر وقت کینٹ کاؤنٹی میں اپنی وسیع و عریض جائداد پر گزارتا تھا۔ کرسٹوفر کی والدہ نے برطانیہ میں ایک مکان کرائے پر لے کر وہاں رہائش اختیار کی تھی۔ کرسٹوفر کا والد برطانیہ کا ایک مشہور سرجن تھا۔ لیکن میاں بیوی میں ناچاقی کے بعد حال ہی میں طلاق ہوگئی تھی۔ اس علاقے میں رہتے ہوئے کرسٹوفر کی چرچل سے دوستی ہوگئی۔ وہ ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے تھے اور وہ اسکول کی چھٹیوں کے زمانے میں جب گھر آتا اس کا بیش تر وقت موٹے اور ہنس مکھ لینڈ لارڈ کے ساتھ گزرتا۔ وہ دونوں اکٹھے جنگل کی سیر کرتے اور اس ذہین بچے کی باتیں سن کر چرچل بہت محظوظ ہوتا۔

لیکن پھر جنگِ عظیم شروع ہوگئی۔ اس وقت کرسٹوفر بہ مشکل پندرہ برس کا تھا۔ جنگِ عظیم شروع ہوتے ہی چرچل کو لارڈ آف دی سی مقرر کر دیا گیا اور وہ جنگ میں حصہ لینے کے لیے چلا گیا۔ اسی دوران چرچل نے ایک خفیہ انٹیلی جنس کی داغ بیل ڈالی۔ اس تنظیم کا کوئی نام نہیں تھا۔ کوئی ہیڈ کوارٹر نہیں تھا پھر بھی لندن کی بے شمار عمارتیں اس کے زیرِ تصرف تھیں۔ اس تنظیم کا سربراہ انکل جان تھا اور نائب سربراہ کرنل مٹکاف۔

اسی دور میں چرچل نے کرسٹوفر کو ذاتی طور پر کچھ خفیہ کام کرنے کے لیے کہے جو اس نے انکل اور کرنل مٹکاف کی سربراہی میں انجام دیے۔ وہ لوگ ایک دوسرے کو کوڈ ناموں سے پکارتے تھے۔ انکل جان کا کوڈ نام "آوَل" تھا۔ کرنل مٹکاف "ونی پوہ" تھا۔ چرچل کو "ٹیگر" کہا جاتا تھا اور کرسٹوفر کرئیٹن کا خفیہ نام موقع کی مناسبت سے کرسٹوفر رابن یا بحریہ کا لیفٹیننٹ پیٹر ہملٹن ہوا کرتا تھا۔

پھر بعد میں جب چرچل وزیرِاعظم بن گیا تو اس نے کرسٹوفر کو باقاعدہ تربیت دلوائی اور اب کرسٹوفر ایک بے حد تجربہ کار سیکرٹ ایجنٹ تھا۔ ۱۹ برس کی عمر میں وہ برطانیہ کے لیے گراں قدر خفیہ کارنامے سرانجام دے چکا تھا۔ تاہم اسے یہ کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ آوَل، ونی پوہ اور ٹیگر کی تنظیم میں اس کے علاوہ اور کتنے کارکن ہیں۔

اس مشن کے بارے میں چرچل نے کہا تھا۔

"کرسٹوفر! تم ایک امیر کبیر سرجن کے بیٹے ہو جو کہ ایک حقیقت ہے لیکن تمہارا چال چلن بے حد خراب ہے اور تم آوارہ گرد ہو۔ معمولی ملازمت کی چند پونڈ آمدنی تمہارے شوق پورے نہیں کر سکتی چنانچہ تم دولت کے لیے جرمنوں کو خفیہ راز فراہم کرو گے۔ تم غدار ہو بس اب تم جاؤ۔ آوَل اور ونی پوہ تمہیں باقی باتیں سمجھا دیں گے۔"

آوَل اور ونی پوہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ بحریہ کے سگنل میں کوڈ حل کرنے کا کام کرتا ہے۔ وہاں اس کا

ریکارڈ بے حد چالاکی سے تیار کرلیا گیا تھا۔ مشن کے بارے میں انھوں نے کہا کہ فرانس کے ساحل پر آخری حملہ کرنے سے قبل وہاں جرمنی کی اصل قوت کا اندازہ لگانا ہے تاکہ جب ہم اصل حملہ کریں تو کسی غلط فہمی میں مارے نہ جائیں۔ اگر ہم خاموشی سے خفیہ طور پر حملہ کرتے ہیں تو جرمن اپنی پوری قوت کے ساتھ مزاحمت نہیں کرسکیں گے۔ ہاں اگر انہیں پہلے سے مطلع کردیا جائے تو وہ ہمیں اپنی پوری قوت کے ساتھ منتظر ملیں گے۔ اس طرح اس حملے میں اگرچہ ہمارے بیش تر سپاہی مارے جائیں گے لیکن ان کی یہ قربانی ہماری آخری فتح کی راہ ہموار کردے گی۔ کرسٹوفر رابن' اب تمہارا کام ہے کہ تم غدار بن کر جرمنوں کو اتحادیوں کے اس حملے کی اطلاع دو۔ یہ لو' تفصیلات رٹ لو۔''



طیارہ چھوٹا تھا لیکن اس کے انجن بے حد طاقت ور تھے۔ کچی زمین پر اتر کر وہ دور تک چھلانگیں مارنے کے انداز میں دوڑتا رہا اور بالآخر رک گیا۔

کرسٹوفر کو تین چار جرمنوں نے دبوچ رکھا تھا۔ بروشر اور کنسکی بھی موجود تھے۔ کنسکی کے ہاتھ میں لمبی سی نالی والا بھاری ریوالور تھا۔ ان لوگوں نے کرسٹوفر کو کچھ بتائے بغیر قید خانے سے نکال کر ایک کار میں ٹھونسا تھا اور پھر اس جگہ لے آئے تھے جسے وہ خفیہ ائرپورٹ کے طور پر استعمال کرتے ہوں گے۔ اب وہ طیارے میں سوار ہورہے تھے جس پر فرانس کا نشان بنا ہوا تھا۔ کنسکی وہیں رہ گیا جب کہ بروشر اور دو جرمن کرسٹوفر کے ساتھ تھے' طیارہ فوراً ہی پرواز کرگیا۔

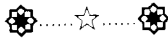
''ہم کہاں جارہے ہیں؟'' کرسٹوفر نے پوچھا۔

بروشر نے سرد نظروں سے اسے دیکھا۔ ''فی الحال ہماری منزل خفیہ ہے۔'' پھر قدرے توقف کے بعد وہ کرسٹوفر سے طنزیہ انداز میں بولا۔ ''تمہارے دوست پیار میں تمہیں کس نام سے پکارتے ہیں! کرسس...... یا کیٹ......؟''

کرسٹوفر نے ایک طویل سانس لی تو ان لوگوں نے شاہی بحریہ کے دفتر سے اس کے متعلق خفیہ معلومات حاصل کرلی تھیں۔ وہ تمام باتیں جو آوَل نے فائل میں لکھوائی تھیں۔ جرمنوں کا جاسوسی نظام بے حد فعال اور مضبوط ہے۔ کرسٹوفر نے سوچا۔

''ہم برلن جارہے ہیں کیا؟'' بالآخر اس نے سکوت توڑا۔

بروشر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور اثبات میں سر ہلادیا۔ کرسٹوفر کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ برلن ۱۹۴۳ء میں یہ نام بڑا خوف ناک تھا۔



ایک بلند و بالا عمارت میں کرسٹوفر کو اسٹینو کے کمرے میں انتظار کرنے کے لیے کہا گیا اور بروشر ''باس'' کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ چند لمحوں بعد کرسٹوفر کو بھی اندر طلب کرلیا گیا۔ یہ بہت بڑا کمرہ تھا۔ دیواروں کے ساتھ بڑے بڑے صوفے رکھے تھے۔ عقبی دیوار پہ دنیا کا ایک بہت بڑا نقشہ آویزاں تھا۔ طویل و عریض میز کے عقب میں ایک دبلا پتلا شخص بیٹھا تھا۔

''میرا نام ایڈمرل کنارس ہے اور میں جرمن انٹیلی جینس ایب وہبرا کا چیف ہوں۔'' اس نے چھوٹتے ہی کہا اور پھر یک بیک جرح کے سے انداز میں بولا۔ ''تم جوان لڑکے ہو۔ اس گندے کام میں کیوں پڑنا چاہتے ہو۔ وطن سے غداری کرنا کوئی اچھی بات نہیں۔''

''کنارس! یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے؟''

کنارس نے جرمن زبان میں بروشر سے کچھ کہا اور وہ خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔ چند لمحے کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ پھر کنارس بولا۔

''ہم نے تمہارے بارے میں مکمل تحقیقات کرلی ہے اس حد تک تمہاری بات درست ہے کہ تم جو شخص ہونے کا دعویٰ کرتے ہو وہی ہو۔''

''مسٹر! میری ہر بات درست ہے۔''

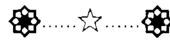
''یہ وقت بتائے گا۔'' ایڈمرل کنارس نے سر ہلایا۔ ''لڑکے ہم نے تمہارے لیے ایک کوڈ نام رکھا ہے۔ خرگوش! ٹھیک ہے؟''

''میری بلا سے خرگوش رکھو یا بلی۔ جب تک مال مل رہا ہے سب کچھ ٹھیک ہے۔''

''تم نے دس ہزار پاؤنڈ کا مطالبہ کیا ہے اور رقم کی ادائیگی بھی تم نے اس بات سے مشروط کردی ہے کہ تمہاری اطلاعات درست ثابت ہونے پر ادا کی جائے' ٹھیک ہے ہم راضی ہیں۔ اب مجھے حملے کے بارے میں تمام تفصیلات سے آگاہ کرو۔''

کرسٹوفر نے ایڈمرل کنارس کے عقب میں دیوار پر لگے ہوئے دنیا کے نقشے پر نظر ڈالی۔

''اتحادی رود بار انگلستان عبور کرکے ڈاپئی کے مقام پر ۱۹ اگست کو آئیں گے۔''



۱۹ اگست کو وہ لوئی ڈاپئی پہنچ چکے تھے۔ کرسٹوفر ایک قیدی کی مانند ان کے ہمراہ تھا۔ اس وقت وہ وہاں پر ایب وہیرا کی مقامی شاخ کے دفتر میں موجود تھے۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں غدار سمجھوں یا لالچی۔ بہرحال میں نے تمہاری اطلاعات پر یقین کرلیا ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ اب سے آٹھ گھنٹے بعد ڈاپئی پر اتحادیوں کا حملہ ہوگا لیکن ہم نے بھی تیاریاں مکمل کرلی ہیں۔ بڑے خفیہ انداز میں۔ اس چالا کی سے کہ نہ تو مزاحمتی گروپ کو اور نہ اتحادی جاسوسوں کو اس کی بھنک مل سکے۔ گزشتہ چار دن سے ہمارے فوجی اور فضائیہ کے ہوا باز مختلف علاقوں میں اپنی اپنی ڈیوٹی دینے کے بعد شام کو سادہ لباس میں چھپ چھپ کر یہاں پہنچتے رہے ہیں۔ اگر تمہاری اطلاع درست ثابت ہوئی تو یقین کرو ہم اتحادی حملہ آوروں میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑیں گے۔''

اور رات کو سمندر کے نزدیک ایک پختہ مورچے میں بیٹھے ہوئے کرسٹوفر کا ذہن مختلف وسوسوں کا شکار تھا۔ فرض کرو کسی وجہ سے حملہ ملتوی ہوگیا تو اس کا کیا بنے گا؟ فائرنگ اسکواڈ؟ گلوٹین یا پھانسی! جنگ کے دوران جاسوسوں کا روایتی انجام یہی ہوتا ہے۔

یہ مورچہ ساحل سے ذرا فاصلے پر تھا۔ ان کے پاس خصوصی قسم کی دوربینیں تھیں جو رات کے اندھیرے میں بھی دن کے اجالے کی طرح کارآمد تھیں۔ نزدیک بھاری توپیں تھیں' جرمنوں نے دفاع کا پورا پورا بندوبست کررکھا تھا۔ عقب میں جنگی طیارے تیار کھڑے تھے۔ سامنے چاروں طرف ٹینک پھیلے ہوئے تھے اور ساحل جرمن فوجیوں سے بھرا پڑا تھا۔

اور پھر اچانک ہی حملہ شروع ہوگیا۔ گولیاں اور توپیں چلنے کی آوازیں خاصے فاصلے سے آرہی تھیں۔ عین اسی لمحے فیلڈ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ کنارس نے فون اٹھایا اور جرمن زبان میں گفتگو شروع کردی۔ اس کی نرم

کون...... کس مقام پر بچھڑ گیا

ہم سے
کچھ یاد نہیں
یاد رہا تو بس اتنا
کہ جو بچھڑ گیا
ایک بار
وہ پھر دوبارہ
ملا نہیں

کاجل شاہ...... خانیوال

اور دوستانہ نگاہیں کرسٹوفر پر جمی ہوئی تھیں۔ اس دوران طیارے فضا میں بلند ہوئے اور بھاری توپ خانے سے گولہ باری شروع ہو چکی تھی۔ دھماکوں میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ وہ اپنا منہ کرسٹوفر کے کان کے قریب لا کر چلایا۔

''شاباش لڑکے! تم نے کمال کر دیا۔''



''تم خیریت سے تو ہو نا؟'' آوَل اس کے لیے پریشان نظر آ رہا تھا۔

کرسٹوفر نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا کر اپنے کندھے پر رکھا ہوا تھیلا اتارا اور اسے آوَل کی میز پر الٹ دیا۔ میز پر کرنسی نوٹوں کا ڈھیر لگ گیا۔

''پورے دس ہزار ہیں۔ پانچ پاؤنڈ کے نوٹوں کی شکل میں۔''

آوَل نے ایک نوٹ نکالا اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا رہا۔ پھر سورج کی روشنی میں اسے غور سے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ مایوسی سے سر ہلاتا ہوا واپس آیا۔

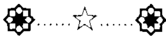
''کاغذ' روشنائی' چھپائی' واٹر مارک...... سب کچھ بہترین ہیں لیکن جعلی نوٹ پھر جعلی ہوتا ہے۔''

ونی پوہ کرسٹوفر سے مخاطب ہوا۔ ''شاید تم جاننا چاہو کہ اس حملے میں ہمارا کتنا نقصان ہوا؟ دس ہزار فوجی بھیجے گئے تھے جن میں سے صرف تین ہزار واپس آ سکے ہیں۔ ان میں زخمی بھی شامل ہیں۔''

کرسٹوفر نے مرنے والے فوجیوں کے لیے اپنے دل میں رحم کے جذبات محسوس کیے۔

''انہیں قربانی کا بکرا بنایا گیا تھا۔ میں اپنے ضمیر پر بوجھ محسوس کر رہا ہوں۔''

آوَل اس کی طرف غور سے دیکھتا ہوا بولا۔ ''محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ ہمیں ان فوجیوں سے محبت تھی اور ہم دنیا کی تباہ کن ترین جنگ میں حصہ لے رہے ہیں۔ تم پیشہ ور ایجنٹ ہو۔ جذبات میں مت آؤ' تمہارا اگلا مشن تیار ہے۔ دس ستمبر کو ہم ناروے پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس حملے میں چار مقامات پر فوجیں اتاری جائیں گی۔ یہ لو...... یہ تفصیلات چند گھنٹوں میں رٹ لو۔'' اس نے کاغذوں کا ایک پلندہ کرسٹوفر کی طرف بڑھا دیا۔



ڈبلن میں ریل سے اتر کر کرسٹوفر نے ٹکٹ چیکر کو اپنا ٹکٹ دیا اور اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔ لندن سے اس نے بروشر کے نام جو خط پوسٹ کیا تھا وہ اسے مل چکا ہوگا اور وہ ملاقات کی جگہ پر پہنچ جائے گا۔ اس بارے میں کنارس اور بروشر نے اسے تفصیلی طور پر تمام باتیں سمجھا دی تھیں۔ اس مرتبہ بروشر تنہا آیا تھا۔

''تم پھر کچھ فروخت کرنے آئے ہو۔''

''ہاں بڑے بھائی! اس مرتبہ بڑا عمدہ مال لایا ہوں لیکن قیمت ذرا زیادہ ہے ۲۵ ہزار پاؤنڈ۔''

''مال اچھا ہو تو رقم کوئی مسئلہ نہیں۔''

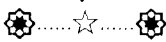
''ہاں!'' کرسٹوفر نے دل میں سوچا۔ بھلا جعلی رقم بھی کوئی مسئلہ ہوتی ہے۔

پھر اس نے ناروے پر حملے کی تمام تفصیلات بتانا شروع کر دیں۔ بروشر ایک نوٹ بک میں انہیں لکھتا گیا۔ درمیان میں کبھی کبھار وہ کوئی سوال بھی پوچھ لیتا تھا۔ بالآخر اس نے نوٹ بک بند کر کے جیب میں رکھی۔

''مجھے امید ہے کہ ہائی کمان یہ اطلاعات پا کر بے حد خوش ہوگی۔''

''بڑے بھائی! تمہاری ترقی کے امکانات بھی روشن ہو رہے ہیں کیا؟''

بروشر مسکرایا۔ ''ہو سکتا ہے۔''



آ وَل کمرے میں کرسٹوفر کا منتظر تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور خوش ہو کر بولا۔

''انہوں نے تمہاری اطلاعات پر یقین کر لیا ہے اور ان کی روشنی میں اقدامات بھی شروع کر دیے ہیں۔ دراصل ہٹلر کو پہلے ہی یقین تھا کہ ہم ناروے پر حملہ کریں گے۔ تمہاری اطلاعات سے اس یقین کی تصدیق ہوگئی چنانچہ اب وہ ناروے میں زبردست مورچہ بندی کر رہے ہیں اور ان کا بحری بیڑہ عین اس مقام پر موجود ہے جہاں ہم چاہتے ہیں۔''

''تو یہ چکر تھا میں تو سمجھ رہا تھا کہ اس مرتبہ میں پھر ہزاروں محبّ وطن فوجیوں کو موت کے منہ میں دھکیل رہا ہوں۔''

''فوجی اپنا فرض سر انجام دے رہے ہیں اور تم اپنا..... اس فرض میں ان کی جان بھی جا سکتی ہے اور تمہاری بھی۔'' آ وَل قدرے تیز لہجے میں بولا۔ ''بہرحال! آج پانچ ستمبر ہے۔ تم بروشر کو ایک اور خط روانہ کر دو جس میں لکھنا کہ معاملہ بے حد اہم نوعیت کا ہے اور پھر تم ڈبلن میں اس سے ملاقات کرو گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جرمنوں کی نظروں میں تمہاری قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہو جائے تم انہیں بتاؤ گے۔''

اس ڈیل کے بارے میں اسی جنگل میں کرسٹوفر بروشر کو بتا رہا تھا۔

''بڑے بھائی! معاملہ بڑا خطرناک تھا۔ اس لیے تمہیں تکلیف دی۔ اس دفعہ کا مال مفت سمجھو' پچھلی ... ہی میں۔ دراصل انگریز بڑے چالاک لوگ ... انہوں نے ناروے پر حملے کے احکامات جاری ... تھے اور بظاہر تیاریاں بھی اسی حملے کی ہو رہی ... لیکن یہ سب کچھ ایک فریب تھا' بس یوں سمجھو ... بات اچھی تھی۔ مجھے اتفاقاً ہی حقیقت کا علم ... دراصل بحیرۂ روم میں شمالی افریقہ پر ہوگا۔ اسے چرچل تمہارا کمزور پہلو سمجھتا ہے۔''

''حملہ دس تاریخ کو ہی ہوگا؟''

''نہیں..... آٹھ کو.....!''

''یعنی کل؟'' بروشر بوکھلا گیا۔

''ہاں! مجھے بھی پانچ تاریخ کو معلوم ہوا۔''

''شمالی افریقہ میں کس مقام پر ہوگا؟'' بروشر بے حد گھبرا چکا تھا۔

''اس بات کا مجھے یقین سے علم نہیں ہے۔ اندازہ ہے کہ طبروق یا کاسابلانکا پر ہو یا ہو سکتا ہے طرابلس پر حملہ ہو جائے۔ دراصل انہوں نے تمام مقامات کے خفیہ نام رکھ دیے ہیں میں ابھی تک ان کے حقیقی ناموں سے آگاہ نہیں ہو سکا ہوں۔ ہاں! یہ حملہ بہت بڑا ہوگا۔ اس میں اتحادیوں کی تین ٹاسک فورس حصہ لیں گی' ان کی کمان آئزن ہاور کے ہاتھ میں ہے۔ حملہ طلوعِ آفتاب کے وقت ہوگا۔''

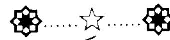
کرسٹوفر کو علم تھا کہ ان تینوں مقامات پر حملہ نہیں ہوگا لیکن حملہ کہاں ہوگا؟ یہ اسے بھی معلوم نہیں تھا۔ فیلڈ میں کام کرنے والے ایجنٹوں کو حقیقی صورت حال کبھی نہیں بتائی جاتی۔ وہ بروشر کو تفصیلات نوٹ بک میں درج کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔

''حملے کا خفیہ نام آپریشن ٹارچ ہے اور وہ اس کے لیے روانہ بھی ہو چکے ہیں۔''

''لیکن..... اب اتنی سی دیر میں کیا ہو سکتا ہے؟'' بروشر مردہ آواز میں بولا۔ ''بہرحال دیکھو کیا ہوتا ہے؟ میں فوری طور پر وائرلیس کے ذریعے یہ اطلاعات برلن بھیجتا ہوں۔''

کرسٹوفر دل ہی دل میں مسکرایا۔

وائرلیس! کیسے بھیجو گے بچو!'' اس نے سوچا۔ ''آئندہ چوبیس گھنٹوں تک تمام فریکوئنسیاں پوری قوت سے جام کر دی جائیں گی۔''



جرمنی کی قوت کا شیرازہ بکھرتا جارہا تھا اور اسے پے در پے مختلف محاذوں پہ شکست ہورہی تھی۔ ان حالات میں اتحادیوں نے آخری اور کاری وار لگانے کی منصوبہ بندی مکمل کرلی۔

دوسری جانب آوَل اور ونی پوہ بھی اپنے نامعلوم ماتحتوں کے ساتھ سرگرم عمل تھے۔ اس وقت ونی پوہ کرسٹوفر سے کہہ رہا تھا۔

''برخودار! تمہاری ضرورت پیش آ گئی ہے۔ اتحادیوں کے حملے کا تمام تر منصوبہ مکمل ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ان کے مقابلے میں فان رنڈ اسٹینڈ کے دس آرمر ڈویژن ہوں گے اور اس کے ٹائیگر اور پینتھر ٹینک۔ تم جانتے ہی ہو کہ ان کی سات انچ موٹی چادر سے ہمارے شرمن ٹینکوں کے گولے آر پار بھی نہیں ہوسکتے یہاں محکمہ خفیہ کا کام شروع ہوتا ہے کہ وہ جرمنوں کو اس مقام سے ہٹا کر دور لے جائے تاکہ ہمارے فوجیوں کو فتح میں آسانی رہے ورنہ ہم شکست کھا جائیں گے۔ اس کام کے لیے ہم نے اپنے تمام ایجنٹوں کی خدمات حاصل کرلی ہیں جو برلن پر جھوٹی سچی خبروں کی بارش کررہے ہیں تاکہ جرمن الجھن میں پڑے رہیں کہ ہمارا اصل حملہ کہاں ہوگا؟ اب تمہاری ضرورت بھی پیش آ گئی ہے۔ چلو وزیراعظم تمہارے منتظر ہیں۔''

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں اس انڈرگراؤنڈ عمارت میں پہنچ گئے جہاں وزیراعظم کا خفیہ آفس قائم کیا گیا تھا۔ ونی پوہ نے دروازہ کھولا لیکن اندر چرچل کسی سے بات کررہا تھا۔ کرسٹوفر کو چند الفاظ سنائی دیے۔ اسے ہر قیمت پہ زندہ واپس لانا ہے سمجھے۔ وہ مجھے بے حد عزیز ہے میں اس سلسلے میں کوئی ناکامی برداشت نہیں کروں گا۔''

چرچل کی بات ختم ہوتے ہی ونی پوہ نے اعلان کیا۔

''جناب لیفٹیننٹ ہملٹن! باریابی کا منتظر ہے۔''

''ٹھیک ہے اسے اندر بھیج دو اور تم جاسکتے ہو۔''

ونی پوہ کرسٹوفر کو اندر داخل ہونے کا اشارہ کرتے ہوئے خود واپس چلا گیا۔

چرچل وزیراعظم کی روایتی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میز کے دوسری جانب ایک اور شخص تھا۔ اس نے بڑے چھجوں والا ہیٹ پہن رکھا تھا اور اوور کوٹ کے کالر کھڑے تھے۔ اس نے کرسٹوفر کی جانب پشت کررکھی تھی۔ چرچل نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''کیسے ہو بیٹے؟'' کرسٹوفر کی آنکھیں بھرآئیں۔

''ٹھیک ہوں انکل ونسٹن!''

''نہ..... نہ..... اس کی طرف مت دیکھو۔ یہ شریف آدمی جان کا خطرہ مول لے کر یہاں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ زندگی میں تمہاری اس سے کبھی ملاقات نہ ہو لیکن اگر کبھی ملاقات ہوگئی اور اس نے ضرورت محسوس کی تو یہ اپنی شناخت کے لیے یہ کوڈ ورڈز ادا کرے۔ بہادرانہ معرکہ' الفاظ کو یادرکھنا۔''

''بہتر انکل!''

''اگر تمہیں اس شخص سے کوئی احکامات موصول ہوں تو ان پر اسی طرح عمل کروگے جیسے یہ حکم میں نے دیا ہو۔ اب تم آنکھیں بند کرکے کھڑے ہوجاؤ۔''

کرسٹوفر نے وزیراعظم کے حکم کی تعمیل کی۔ اسے کرسی کھسکنے کی آواز سنائی دی اور ایسے لگا جیسے وہ شخص بغور کرسٹوفر کا چہرہ دیکھ رہا ہو پھر وہ کرسٹوفر کے پاس سے ہوتا ہوا گزر گیا۔ دروازہ کھلا اور وہ باہر نکل گیا۔

''ٹھیک ہے آنکھیں کھول لو اور بیٹھ جاؤ۔''

چرچل اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا اور عقبی دیوار پر دوبارہ انگلستان کی بندرگاہوں اور ساحل کے بڑے سے نقشے کے سامنے پہنچ کر بولا۔

''ہم نے دشمن پر آخری اور کاری ضرب لگانے کے

لیے فرانس کے ساحل نارمنڈی کے پانچ مقامات کا انتخاب کیا ہے۔ مغربی ساحل پر دو مقامات ہیں جنہیں ہم نے اوٹاہا اور اوماہا کے کوڈ نام دیے ہیں۔ وہاں امریکی حملہ کریں گے۔ وسط میں اور مشرقی ساحل پر گولڈ جونو اور سورڈ پر برطانوی اور کینیڈین فوجیں حملہ کریں گی۔ فوجیں اس ساحل پر چیر برگ کے مشرق میں اتاری جائیں گی۔ حملے کے متعلق فیصلہ کرلیا گیا ہے۔ جون کے پہلے ہفتے میں ہوگا' بس چھ ہفتے باقی رہ گئے ہیں۔"

"جی سر......!"

"ہم اصل حملے کے بارے میں دشمن کو مغالطے میں رکھنا چاہتے ہیں۔ جب ہم نارمنڈی پر ابتدائی حملہ کریں گے تو جرمن اس دھوکے میں رہیں گے کہ ہمارا اصل ہدف کوئی اور مقام ہے جب کہ نارمنڈی پر حملہ محض توجہ ہٹانے کے لیے کیا جارہا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ رومیل اپنی بیش تر جنگی مشینری کیلے کے مقام پر رکھے اور وہیں جنرل پٹین کے حملے کا منتظر رہے۔ فتح کا صرف یہی طریقہ ہے اس دوران ہم پیراشوٹ کے تین ڈویژن' دشمن کے عقب میں اتار دیں گے۔ وہ ریلوے لائنیں' سڑکیں اور پُل وغیرہ تباہ کردیں گے اس طرح رومیل بعد میں بھی اپنی خوف ناک جنگی مشینری ہمارے خلاف استعمال نہیں کرسکے گا۔"

"منصوبہ اچھا ہے۔"

"ہوں......اور دیکھو میں نے تمہیں حقیقی منصوبے سے آگاہ کردیا ہے بس اسے خود تک محدود رکھنا اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم جرمنوں کو کیا اطلاعات فراہم کرو گے۔ تمہیں ان کو یقین دلانا ہے کہ ہمارا اصل ہدف کیلے ہے' جس پر جنرل پٹین دوور کی راہ سے حملہ آور ہوگا۔"

"وہ یقین کرلیں گے۔ اب وہ مجھ پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔"

"کرسٹوفر میں وطن کے نام پر تم سے یہ کام کرنے

باتیں یاد رکھنے کی

✦ خواب اور خوشبو دونوں ہی آزاد ہیں' دونوں قید نہیں ہوسکتے میرے خواب اور تمہاری خوشبو۔

✦ دنیا میں بہترین انسان وہ ہے جس کے لیے کوئی روئے اور بدترین انسان وہ ہے جس کی وجہ سے کوئی روئے۔

✦ درگزر کرنا اور معاف کرنا سیکھو کیونکہ تم بھی اپنے پروردگار سے یہی امید رکھتے ہو۔

انتخاب: احمد عباس...... لاہور

کے لیے نہیں کہوں گا بلکہ یہ کام میں اس چھوٹے سے لڑکے کو کہہ رہا ہوں جس کے ساتھ میں نے برسوں بڑا خوش گوار وقت گزارا ہے۔" پھر اس نے بڑی محبت سے کرسٹوفر کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ کہیں تمہیں موت کی وادی میں تو نہیں دھکیل رہا میں......"

"جناب! موت تو اس کھیل کا ایک حصہ ہے۔" کرسٹوفر مسکرایا۔



آؤل کہہ رہا تھا۔

"سفوک ایسکس اور کینٹ میں ہر چیز نقلی ہے۔ فوجیوں کے نقلی کیمپ بنائے گئے ہیں۔ ہوائی اڈے طیاروں سے بھرے پڑے ہیں جو سب کے سب لکڑی کے بنے ہوئے ہیں لیکن جرمنی کے جاسوس طیاروں سے اصلی ہی نظر آئیں گے۔ ہماری فوج کا اصل اجتماع جنوب میں ہورہا ہے جہاں سے نارمنڈی پر حملہ کیا جائے گا لیکن ہم چاہتے ہیں کہ وہ کیلے کے مقامات پر اپنی پوری طاقت کے ساتھ ہمارے حملے کے منتظر رہیں۔ جرمنی میں ہٹلر کو یقین ہے کہ ہم نارمنڈی پر حملہ کریں گے لیکن اس کے تمام جرنیل اس سے متفق نہیں

ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہم کیلے پر حملہ کریں گے کیونکہ اس کے لیے ہمیں صرف ۳۰ میل کا فاصلہ طے کرنا پڑے گا جب کہ نارمنڈی کے لیے ۹۰ میل کا فاصلہ بنتا ہے۔ بہرحال تمہاری بریفنگ تو جاری رہے گی۔ فی الحال تم ذرا میرے ساتھ چلو۔“

”کہاں؟“

”ایک ڈینٹسٹ کے پاس۔“

”ڈینٹسٹ......؟ لیکن میرے دانتوں میں تو کوئی تکلیف نہیں ہے۔“

”مقصد وہیں چل کر بتاؤں گا۔“

انتظارگاہ میں وہ دونوں تنہا تھے۔ آؤل کہہ رہا تھا۔

”یہ بے حد عمدہ ترکیب ہے اور جرمنوں کی اپنی ایجاد ہے۔ ہم اسے ”ٹی کیپسول“ کہتے ہیں۔ خودکشی کا بہترین طریقہ ہے۔ انسان چند سیکنڈ میں زندگی سے نجات حاصل کرلیتا ہے۔ میں تمہیں اس کا طریقۂ کار سمجھا دیتا ہوں۔ یہ کیپسول مصنوعی دانت کے خلا میں رکھا جاتا ہے‘ تم اپنی زبان سے اس دانت کو بآسانی اکھاڑ سکتے ہو۔ کیپسول منہ میں آ گرے گا بس اسے دانتوں سے چبا کر توڑ دو اور اس کا محلول پی جاؤ۔“

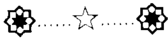
”یہ محلول کیا ہوتا ہے؟“

”سائنائیڈ! اس زہر کا نام سنا ہی ہوگا تم نے‘ اب پتا نہیں کہ تکلیف ہوتی ہے یا نہیں لیکن موت فوری طور پر واقع ہوجاتی ہے۔ اگر کبھی صورت حال بالکل بگڑ جائے تو تم اس کو استعمال کرلینا۔“ پھر یک دم آؤل نے موضوع بدل دیا۔ ”ارے ہاں! ایک بات تو میں تمہیں بتانا ہی بھول گیا۔ تمہارا دوست ایڈمرل کنارس انٹیلی جنس کی سربراہی سے برطرف کردیا گیا ہے۔“

”اچھا! کیا وہ اب جیل میں ہے؟“

”نہیں! بس اسے ایب وہیرا سے ہٹا کر معاشی بہبود کے کسی دفتر میں تعینات کردیا ہے۔ رین ٹراپ تو اسے سزائے موت دلوانا چاہتا تھا لیکن ہٹلر نے اس کی جان بخشی کردی ہے۔ بہرحال کنارس کی ذات سے تو ہمیں کوئی غرض نہیں۔ تاہم اس کے بعد جرمن انٹیلی جنس میں وسیع پیمانے پر اکھاڑ پچھاڑ ہوئی ہے۔ اب ایک مشترکہ انٹیلی جنس سروس قائم کردی گئی ہے۔ ایب وہیرا کے علاوہ نصف درجن ایجنسیاں اس میں شامل ہیں اور یہ نظام والٹر شلن برگ کے تحت ہے۔ اس کا تعلق ایس ایس سے ہے۔ اب ڈبلن میں تمہارا دوست بروشر خودمختار نہیں رہا‘ کنسکی اس کا باس ہے۔“

”یہ بُری خبر ہے۔“



جنگل کے سناٹے میں کرسٹوفر کو ان کے آنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ یقیناً ایک سے زیادہ تھے اور انہوں نے اپنی آمد کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی پھر وہ دونوں کرسٹوفر کی نظروں کے سامنے آ گئے۔

آگے آگے بروشر تھا۔ وہ پہلے کی نسبت بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ اس کا جسم بھی پھیل چکا تھا۔ کنسکی کا ہاتھ جیب میں تھا شاید پستول کے دستے پر۔ کرسٹوفر نے سرد لہجے میں کہا۔

”تیسرے ساتھی کو بھی بلوالو۔ اسے کیوں چھپا دیا ہے؟“

”کیا بکواس کررہے ہو؟ کون تیسرا؟“ کنسکی غرایا۔

”وہ جو کہیں چھپ گیا ہے۔ اسے کہو اپنی صورت تو دکھادے۔“ کنسکی کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ وہ آنکھیں نکال کر غرانے ہی والا تھا کہ کرسٹوفر جلدی سے بول اٹھا۔ ”میں تو ڈی ڈے کا منصوبہ فروخت کرنے آیا تھا لیکن تمہارے تیور دیکھ کر میں اپنا ارادہ بدل رہا ہوں۔“

''مہا نیال نے اس کی بات مان لو۔'' بروشر نے انگریزی زبان میں کنسلی سے کہا۔ کنسکی اپنا ہونٹ چباتا ہوا چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے سر موڑ کر جرمن زبان میں چلانا شروع کردیا۔ چند لمحوں بعد ایک سانڈ نما جرمن بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے پستول تان رکھا تھا۔ کنسکی نے زور سے ڈانٹ کر کوئی حکم دیا۔ اس نے فوراً پستول جیب میں رکھ لیا۔

کرسٹوفر کا ہاتھ جیب میں تھا' وہ بولا۔

''اس مرتبہ میں بھی خالی ہاتھ نہیں آیا۔'' پھر وہ بروشر سے مخاطب ہوا۔ ''میں تم سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ دونوں آہستہ آہستہ اندر بڑھنے لگے۔ کرسٹوفر بے حد چوکنا تھا۔ ادھر کنسکی غصے میں کھول رہا تھا اگر اس کا بس چلتا تو وہ کرسٹوفر کو کچا چبا جاتا۔ کوئی پچیس تیس گز کے فاصلے پر کرسٹوفر رک گیا۔

''کرسٹوفر! اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔'' بروشر دھیمے لہجے میں بولا۔ ''کنسکی سے کچھ نہیں چھپایا جاسکتا۔ ہمارے جاسوسی نظام کا ڈھانچہ بدل گیا ہے۔ مجھے ہر بات کی رپورٹ اس کو دینا ہوگی۔ اب یہاں پر وہ باس ہے اور ایڈمرل کو بھی ہٹادیا گیا ہے۔''

''کنارس کی چھٹی ہوگئی بڑے بھائی۔''

بروشر نے افسردگی سے سر ہلا دیا۔

''یہ تو بڑی افسوس ناک خبر سنادی' تم نے بڑے بھائی! لیکن دیکھو' مجھے اس سے غرض نہیں کہ انچارج تم ہو یا کنسکی۔ معاملات تو صرف تم سے طے کروں گا اور تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ اس مرتبہ میں کتنی بڑی چیز لایا ہوں۔ یوں سمجھو جرمنی کی فتح کی چابی لایا ہوں اپنے ساتھ۔ مجھے اتحادیوں کے حملے کے بارے میں تمام اطلاعات حاصل ہوگئی ہیں۔ بڑی محنت کرتا رہا ہوں تمہارے لیے۔ کئی مہینے لگے جب کہیں جا کر تمام باتیں معلوم ہوئیں۔ اس مرتبہ تین لاکھ پاؤنڈ سے ایک پیسہ کم نہیں لوں گا۔''

''تین لاکھ پاؤنڈ.....؟'' بروشر حیرت سے بڑبڑایا۔ ''کیا دنیا میں اتنی مہنگی بھی کوئی چیز ہوسکتی ہے؟''

''جرمنی کی فتح اس سے مہنگی نہیں بڑے بھائی! میرے پاس تمام تفصیلات ہیں۔ تاریخ' وقت' جگہ..... کس ساحل پر حملہ ہوگا' کتنی فوج استعمال ہوگی۔ جہاز' طیارے' ٹینک..... ان سب کی پوزیشن اور تعداد اور پھر جنگی منصوبہ' غرض کون سی بات ہے جو میرے پاس موجود نہیں ہے۔ یوں سمجھ لو کہ اتحادیوں نے جرمنی کی مکمل شکست کا سامان کرلیا ہے۔ اگر شکست سے بچنا چاہتے ہو تو صرف تین لاکھ پاؤنڈ خرچ کرلو اور مزے سے جنگ جیت لو لیکن دیکھو! اس مرتبہ میں نقد رقم نہیں لوں گا۔ سوئٹزرلینڈ کے کسی بینک میں میرا خفیہ نمبروں والا اکاؤنٹ کھلوا کر اکاؤنٹ بک مجھے دے دو اور ساری اطلاعات خرید لو۔''

''میں نے تو اپنے افسروں سے کہا تھا کہ تمہیں جعلی کرنسی دینا بہت بڑی حماقت ہے۔''

''خدا غارت کرے' تمہارے افسروں کو۔ مجھ غریب کو لوٹ لیا۔ اصلی اطلاعات کے عوض جعلی نوٹ تھمادیئے۔ قسم سے بڑے بھائی کئی مرتبہ جعلی کرنسی چلانے کے جرم میں پکڑے جانے سے بال بال بچا۔ بڑی مشکل سے ان نوٹوں کو بیس فیصد کے عوض فروخت کرکے جان چھڑائی۔''

''شاید اسی لیے تم نے کافی دنوں سے ہمیں معلومات فروخت نہیں کیں۔''

''یہ بھی ایک وجہ تھی لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ میں ڈی ڈے کا منصوبہ حاصل کررہا تھا بس اس مرتبہ بینک میں تین لاکھ پاؤنڈز جمع کروادو اور اطلاعات لے لو۔''

''لیکن بغیر کسی ٹھوس بات کے میرے افسر کیسے راضی ہوسکتے ہیں؟''

"دیکھو! جب دو تاجروں میں مال کا لین دین ہوتا ہے تو مال دکھایا جاتا ہے۔ میں بھی اپنے مال کا نمونہ دکھا دیتا ہوں۔ تمہارے افسر میری اطلاعات کی چھان بین کرلیں تو میری سچائی پر یقین ہوجائے گا۔ نمونہ یہ ہے کہ کل رات کو برطانوی بحریہ کے دو کمانڈوز فرانس میں بےلوکس کے ساحل پر چوری چھپے جاکر وہاں کا جائزہ لیں گے۔ تم لوگ ان پر نظر تو رکھنا لیکن ان سے کوئی تعرض نہ کرنا ورنہ اتحادی ہوشیار ہوجائیں گے۔ اب تو مطمئن ہونا؟"

"ڈی ڈے کا منصوبہ کیا ہے؟"

"یہ تو اکاؤنٹ بک میں تین لاکھ کی رقم دیکھ کر ہی بتاؤں گا۔"

"لیکن خفیہ نمبروں والے اکاؤنٹ میں تو بہت وقت لگے گا۔"

"فکر مت کرو! ابھی وقت ہے۔ بہت زیادہ تو نہیں لیکن پھر بھی کافی وقت ہے بس تم فوری طور پر کام شروع کردو۔ میں ٹھیک اڑتالیس گھنٹے بعد تمہیں یہیں ملوں گا۔ اس دوران تم اکاؤنٹ بھی کھول لو اور میری اطلاع کی تصدیق بھی کرلو۔"

"کرسٹوفر! یہ بے حد معمولی اطلاع ہے' محض اتنی سی بات پر میرے افسران اتنی بڑی رقم پر راضی نہیں ہوں گے۔ کوئی بات بتاؤ جس کی بنیاد پر میں کنسکی کو اور انہیں راضی کرسکوں۔"

"اچھا بڑے بھائی! تم سے پرانے تعلقات کا لحاظ رکھنا ہی پڑے گا۔ بڑے حملے کا انچارج پٹین ہے اور حملے میں چار ہفتوں سے کم وقت رہ گیا ہے۔ اصل وقت کیا ہے؟ باقی باتیں تین لاکھ کے اکاؤنٹ کے بعد......"

"پٹین؟" بروشر جلدی سے بولا۔ "اس کا مطلب ہے ہمارے شبہات درست تھے پھر تو حملہ بھی کیلے پر ہی ہوگا۔ کیوں؟" وہ کرسٹوفر کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔

"بڑے بھائی! مفت میں تو مزے نہ لوٹو۔ مال پانی خرچ کرو۔"

بروشر کی حرکات نے کنسکی کو چوکنا کردیا۔ وہ اور اس کا ساتھی اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال رہے تھے۔ کرسٹوفر نے فوراً اپنا ریوالور نکال کر ہوا میں لہرایا۔

"اس طرح بزنس نہیں ہوا کرتا۔" اس نے کنسکی کی جانب اشارہ کیا پھر الٹے قدموں واپس ہوتا ہوا بولا۔ "ٹھیک اڑتالیس گھنٹوں بعد' یہیں...... اور ہاں بالکل تنہا آنا۔" وہ جنگل میں گم ہوگیا۔

اور پھر ٹھیک ۴۶ گھنٹوں بعد وہ اسی جگہ پر موجود تھا۔ دو گھنٹے پہلے وہ اس لیے آیا تھا کہ اس کے خلاف کوئی جال تو نہیں بچھایا جارہا لیکن اسے جنگل میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ اسے یقین تھا کہ ملاقات خطرناک نہیں ہوگی کیونکہ ڈی ڈے کے بارے میں اطلاعات حاصل کرنا تو جرمنوں کی دلی خواہش تھی جو کرسٹوفر کے ذریعے بلا دقت پوری ہورہی تھیں۔ اب تک ان لوگوں کو برلن سے ہدایت بھی موصول ہوچکی تھیں۔

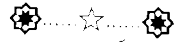
بروشر مقررہ وقت پر آیا تھا اور وہ واقعی تنہا تھا جنگل میں بالکل خاموشی طاری تھی۔ کسی کے چلنے پھرنے کی آہٹ بھی نہ تھی۔

"وہ رضامند ہوگئے ہیں۔" اس نے چھوٹتے ہی کہا لیکن اس کی آواز سے جوش وولولہ مفقود تھا اور اس کی وجہ بھی فوراً سامنے آگئی۔ "شرط یہ ہے کہ تمہیں فرانس چلنا پڑے گا اور حملے کے اختتام تک وہیں رہنا پڑے گا۔ جیسے ڈاپپی کے معاملے میں ہوا تھا۔"

"نہیں! اس وقت کنارس تھا اور وہ قابل اعتماد انسان تھا لیکن میں کنسکی جیسے لوگوں پر بھروسہ نہیں

ماتا۔'' کرسٹوفر واپس مڑا اور جنگل میں اندر کی جانب چلنے لگا۔
''ٹھہرو...... کرسٹوفر ٹھہرو...... بات تو سنو......''
بروشر بوکھلا گیا۔
''تم خود سودا توڑ رہے ہو۔'' کرسٹوفر رک کر بولا۔
''دیکھو کوئی تو راہ نکالی جاسکتی ہے۔ مسئلہ تمہارے تصور سے بھی کہیں زیادہ اہم ہے۔ میں تمہیں یونہی کیسے جانے دے سکتا ہوں۔ اس معاملے میں تو ہٹلر خود دلچسپی لے رہے ہیں اور انہوں نے کہا تھا......''
اچانک چھٹی حس نے کرسٹوفر کو خبردار کر دیا۔ اس نے فوراً اپنا ریوالور نکالا۔ ایک درخت کے تنے سے اس نے اپنی پشت لگائی اور چاروں طرف کا بغور جائزہ لیا۔ ہر سو خاموشی تھی...... جنگل بالکل ویران معلوم ہوتا تھا لیکن اس کی چھٹی حس......
''ادھر آؤ!'' اس نے درشت لہجے میں بروشر سے کہا۔
''کیا؟'' وہ حیرت زدہ رہ گیا۔
''میں کہہ رہا ہوں ادھر آؤ۔'' وہ ریوالور تان کر کھڑا ہوگیا۔
بروشر کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ اس کا اندازہ درست تھا۔ اس نے فوراً چیتے کی طرح چھلانگ لگائی اور بروشر پر جاپڑا۔ ایک بازو اس کی گردن میں ڈال کر اس نے بروشر کا گلا دبایا اور منہ میں ریوالور ٹھونس دیا۔
''ان گدھوں کو آواز دے کر باہر بلاؤ۔''
''کن کو......؟'' یہاں تو میرے علاوہ اور کوئی نہیں ہے؟''
''میں اتنا بے وقوف نہیں، جلدی سے انہیں آواز دو ورنہ......؟'' کرسٹوفر نے بازو کا حلقہ تنگ کر کے ایک جھٹکا دیا۔ ذرا زیادہ زور لگانے پر بروشر کی گردن بھی

ٹوٹ سکتی تھی۔
بروشر نے زور زور سے جرمن زبان میں چیخ و پکار شروع کردی لیکن جواباً چاروں طرف خاموشی طاری رہی۔ بروشر نے کہا۔
''دیکھا! یہاں کوئی بھی نہیں، ہوتا تو جواب نہ دیتا۔''
ابھی اس کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ سامنے سے کنسکی آتا نظر آیا۔ وہ درختوں کے درمیان کچھ فاصلے پر تھا اور غالباً اس کے دونوں ہاتھوں میں پستول تھے اور پھر سامنے سے کئی جرمن اور نکل آئے۔ ان کی تعداد چھ یا سات ضرور رہی ہوگی۔ کرسٹوفر نے بروشر کو دبوچے رکھا۔
''انہیں وہیں ٹھہرنے کے لیے کہو، ہم واپس ہورہے ہیں۔''
بروشر نے چلّا کر کنسکی سے کچھ کہا اور پھر کرسٹوفر نے بروشر کو اپنے ساتھ پیچھے گھسیٹنا شروع کردیا۔ کبھی وہ ریوالور اٹھا کر جرمنوں کو دکھاتا اور پھر بروشر کے پہلو سے بھڑا دیتا۔
کنسکی بھدی انگریزی میں چلّایا۔ ''اسے چھوڑ دو...... اگر تمہیں مارنے کی ضرورت پڑی تو ہم اس کی جان کی پروا بھی نہیں کریں گے۔''
کرسٹوفر خاموش رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اسے ہر حال میں زندہ پکڑنے کی کوشش کی جائے گی۔ چنانچہ وہ بروشر کو گھسیٹتا رہا۔ کنسکی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا اور باقی جرمن اِدھر اُدھر پھیل گئے تھے۔
کرسٹوفر نے اپنے فرار کی پہلے سے پیش بندی کر رکھی تھی۔ لگ بھگ ایک سو گز پیچھے گھنی جھاڑیوں میں اس کی موٹر سائیکل پوشیدہ تھی۔ بوڑھا بروشر اس مشقت سے ہانپ رہا تھا۔ کرسٹوفر بولا۔
''مجھے یقین ہے تمہارے یہ گدھے اس مرغی کو ہلاک نہیں کریں گے جو جرمنی کے لیے سونے کا انڈا دینے والی ہے۔ اب اگلی مرتبہ ہماری ملاقات اس جنگل میں نہیں ہوگی اور تم تنہا نہ آئے تو میں تمہیں بے دریغ بھون ڈالوں گا۔ مجھے کوئی خفیہ ٹیلی فون نمبر بتاؤ۔''
''3246!'' بروشر پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔
''تو پھر آج رات نو بجے وہاں موجود رہنا۔ میں اگلی ملاقات کے لیے جگہ بتاؤں گا۔'' کرسٹوفر نے مڑ کر دیکھا۔ جھاڑیوں میں ایک درخت سے لگی ہوئی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ اسے اپنے ذہن کی رسائی پر فخر ہونے لگا۔ اس نے ان دیکھے حالات کے باوجود فرار کی تیاری پہلے سے مکمل کرلی تھی۔ موٹر سائیکل کے قریب پہنچ وہ بروشر سے بولا۔
''کک مار کر اسے اسٹارٹ کرو اور جب اسٹارٹ ہوجائے تو دور ہٹ جانا۔ سمجھے! باقی باتیں آئندہ ملاقات پر۔''
بروشر نے کک مار کر موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور پھر فوراً دور ہٹ گیا۔ کرسٹوفر نے جلدی سے موٹر سائیکل کا ہینڈل سنبھالا اور پھر عین اسی لمحے اس پر آسمان ٹوٹ پڑا۔
کرسٹوفر تو یہی سمجھا تھا کہ اس پر آسمان ٹوٹ پڑا ہے لیکن دراصل یہ کنسکی کا سانڈ تھا جو موٹر سائیکل والے درخت کی شاخوں میں چھپا بیٹھا تھا اور اب موقع ملتے ہی کرسٹوفر کو چھاپ لیا تھا۔
کرسٹوفر کا سر گھوم رہا تھا۔ موٹر سائیکل گر کر بند ہوچکی تھی۔ اس دوران کنسکی اور باقی جرمن بھی بھاگتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ گرتے وقت کرسٹوفر کا ریوالور نہ معلوم کہاں جا گرا تھا۔ تمام تر تیزی کے باوجود قسمت اسے دغا دے گئی تھی۔
کنسکی کے چہرے پر خباثت آلود مسکراہٹ تھی۔
''کھیل ختم ہوگیا چلو لڑکو، ہاتھ پیر باندھ کر اسے اٹھالو۔''



لمر پر زوردار ٹھوکر لگی اور کرسٹوفر فٹ بال کی مانند ...ساتا ہوا کمرے کے وسط میں پہنچ گیا۔ وہ کچھ دیر فرش پر پڑا اپنی سانسیں درست کرتا رہا پھر یک بیک اسے احساس ہوا کہ وہ کمرے میں تنہا نہیں اور کمرہ بھی قید خانہ نہیں۔ اس نے آنکھیں کھولیں، سب سے پہلے اسے اپنے چہرے کے بالکل قریب اونچے بوٹ کا جوڑا دکھائی دیا پھر سبز وردی اور کالی پیٹیاں۔ یہ ایس ایس کی یونیفارم تھی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اور ناقابل برداشت درد کے جھماکے اٹھ رہے تھے۔ ایک آنکھ سے دنیا سرخ نظر آرہی تھی، شاید آنکھ کی کوئی شریان پھٹ گئی تھی۔

کشتی پر کنسکی نے اسے انتہائی بے رحمی سے مارا تھا اور جب وہ فرش پر گر پڑا تھا تو شاید کوئی شخص کنسکی کو روکنے کی کوشش کررہا تھا، یہ ایک ماہی گیر کی لانچ تھی اور کھلے سمندر کی جانب سفر کررہی تھی۔ سانڈ نے اسے قابو میں کررکھا تھا اور کنسکی گن گن کر بدلے لے رہا تھا پھر کھلے سمندر میں ایک آبدوز ابھری اور وہ سب اس میں منتقل ہوگئے تھے۔

کرسٹوفر نے آنکھیں کھول کر کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ آبدوز نہیں بلکہ کسی عمارت کا کمرہ تھا تو گویا وہ لوگ اسے فرانس یا جرمنی لے آئے ہیں۔

پھر اس نے وردی والے شخص کی طرف نظر اٹھائی۔ یہ ایس ایس کا کرنل تھا۔ اسے زوردار چکر آیا اور وہ زمین پر گر پڑا۔ وہ بے ہوش ہوچکا تھا۔

دوبارہ ہوش آنے پر وہ خود کو بہتر محسوس کررہا تھا لیکن اس کے جسم میں جابجا ناقابلِ برداشت درد تھا۔ کولہوں اور رانوں میں جیک لوٹ کی ضرب سے شدید تکلیف تھی اصل تکلیف سر میں تھی۔ کنسکی فٹ بال کی طرح اس کے سر پر جیک بوٹ سے ٹھڈے لگاتا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے سر میں کوئی رگ پھٹ کر اس کا خون آنکھ میں جمع ہوگیا تھا۔

خاصی دیر بعد اس نے پھر آنکھیں کھولیں۔ وہ کسی دفتر میں ایک صوفے پر پڑا ہوا تھا۔ اسے طبّی امداد فراہم کی جاچکی تھی، کمرے کے دوسرے سرے پر ایک آفس ٹیبل تھی، جس کے پیچھے کوئی افسر بیٹھا تھا۔ دو باوردی کارپورل اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ ایک جانب ایس ایس کا وہی کرنل تھا، اس کا اشارہ پاتے ہی سفید کوٹ میں ملبوس ڈاکٹر آگے بڑھا۔ وہ کرسٹوفر کا معائنہ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ گویا ڈاکٹر صاحب نے اس پر مزید تشدد کی اجازت دے دی تھی۔

''میرا نام کرنل البرٹ لیپ ہے۔'' وہ آگے بڑھ کر بولا۔ ''اب کیسی طبیعت ہے؟''

''بڑی تکلیف ہے۔''

''تمہارے زخم زیادہ خطرناک نہیں ہیں، محض وقتی تکلیف ہے، جلد ٹھیک ہوجاؤ گے۔ کنسکی کو ضرور سزا دی جائے گی۔ اس نے جو کچھ کیا یہ اس کے فرائض میں شامل نہیں تھا۔''

''دیکھیے کرنل! میں نے بروشر اور کنسکی دونوں کو واضح الفاظ میں بتادیا تھا اور آپ کو بھی بتارہا ہوں، مجھے سوئس بینک کی اکاؤنٹ بک دے دو، میں تمام اطلاعات فراہم کردوں گا پھر بھلا تشدد کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''ہاں میں تم سے متفق ہوں۔ لو...... لو...... دیکھو۔'' اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ کرسٹوفر کو اپنا ہاتھ اٹھانے میں پوری قوت صرف کرنا پڑی۔ وہ حیرت انگیز طور پر نقاہت کا شکار تھا اور تکلیف الگ جان لے رہی تھی۔

یہ سوئٹزرلینڈ کے ایک بینک اکاؤنٹ کی بُک تھی، خفیہ نمبروں والی۔

''تو گویا رقم جمع ہو چکی؟'' کرسٹوفر نے خوش ہو کر پوچھا۔

''ہاں' خود دیکھ لو اور تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ دراصل یہ سب کچھ سہواً ہو گیا۔''

''ہاں سہواً ہو گیا۔'' کرسٹوفر نے سوچا تو وہاں آبدوز تمہارے باپ کو لینے کے لیے کھڑی ہوئی تھی۔'' تاہم وہ بولا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے اگر آپ کوئی ایسا شخص مہیا کر سکیں جو انگریزی زبان میں ڈکٹیشن لے۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے بینک بک پر نظر ڈالی۔ ایسی کتاب تو کسی بھی پریس سے طبع کی جا سکتی ہے جو لوگ بہترین جعلی نوٹ چھاپ لیتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب چھاپنا کون سا مشکل کام ہوگا۔ تاہم اس نے کتاب میں بے حد دلچسپی کا اظہار کیا۔ صفحات الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے مہر اور دستخط بڑے غور سے دیکھے۔ اکاؤنٹ کے صفحے پر لکھا تھا۔ ''تین لاکھ پاؤنڈ اسٹرلنگ'' لیپ اس شخص سے محوِ گفتگو تھا۔ جو اس دوران حاکمانہ شان سے اکڑ کر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ غرور سے اس کی گردن تنی ہوئی تھی اور ماتھے پر بل پڑے ہوئے تھے۔ وہ گستاپو کا نمائندہ تھا۔ اس نے فون اٹھا کر کچھ کہا اور فوراً ہی کمرے میں ایک خوبرو جرمن عورت داخل ہوئی۔

''یہ ڈکٹیشن لے گی۔'' لیپ نے کرسٹوفر سے کہا۔

کرسٹوفر نے سر سے پیر تک اسے بغور دیکھا۔ بے حد متناسب اعضا والی خوش شکل عورت تھی۔

''بلبل! تمہاری انگریزی کیسی ہے؟''

''فرسٹ کلاس!'' وہ اٹھلا کر بولی۔ ''برلن میں پانچ سال تمہارے سفارت خانے میں اسٹینو رہ چکی ہوں۔''

''اچھا تو پھر شروع ہو جاؤ۔''

وہ نوٹ بک اور پنسل سنبھال کر شارٹ ہینڈ میں نوٹس لینے کے لیے تیار ہو گئی۔ گستاپو کا نمائندہ تحقیر آمیز نگاہوں سے کرسٹوفر کو گھور رہا تھا۔ اس کی کمر پر ایک بریں گن جھول رہی تھی۔ اس کا سر گنجا تھا اور کانوں کے اردگرد بالوں کی ایک جھالر سی تھی۔ کرسٹوفر نے اپنے دل میں اس کے لیے شدید نفرت اور کراہت کے جذبات محسوس کیے۔ وہ کرسٹوفر کو اس طرح گھور رہا تھا جیسے ابھی پھاڑ کھائے گا۔ کرسٹوفر نے نظریں ہٹائیں' خوب صورت اسٹینو کی صحت مند پنڈلیوں کو گھورتا ہوا بولنے لگا۔

''اصل حملہ کیلے پر ہوگا اس کی سربراہی پٹین کرے گا۔ حملے کے لیے 7 یا 8 جون کا انتخاب کیا گیا ہے۔ انگلستان کے جنوبی ساحل پر آپ کو بے وقوف بنانے کے لیے انہوں نے جعلی یونٹ جعلی فوجی تنصیبات حتیٰ کہ لکڑی کے بنے ہوئے جعلی طیارے پھیلا دیئے ہیں۔ مقصد آپ کو دھوکا دینا ہے کیونکہ کیلے پر اصل حملہ کرنے سے قبل اتحادی نارمنڈی پر حملہ کریں گے۔ آپ نارمنڈی کے دفاع کے لیے اپنی ساری فوج جھونک دیں گے اس طرح اتحادی مزے سے کیلے پر حملہ کر کے آپ کو شکست دے دیں گے۔ یاد رکھیے نارمنڈی پر جعلی حملہ ہوگا' اصل ٹارگٹ کیلے ہے اور......''

''ہمیں بھی یہی شبہ تھا۔'' لیپ بولا۔

''آپ کا شبہ بالکل درست ہے لیکن یاد رکھیے کیلے پر حملے سے قبل آپ کو دھوکا دینے کے لیے نارمنڈی پر حملہ کیا جائے گا ہاں تو میں تمام تفصیلات بتاتا ہوں۔ فوجوں کی کل تعداد......''

اسٹینو کی پنسل کاغذات بھرتی گئی۔ گستاپو کا نمائندہ بے زار سے انداز میں بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔ بالآخر ایک گھنٹہ بولنے کے بعد جب کرسٹوفر کی زبان رکی تو لیپ نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ! تم نے بڑا عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے اور ہمیں بیش قیمت راز فراہم کیے ہیں۔ اب ان اطلاعات کو جانچنے کا وقت آ گیا ہے۔ تم نے جو کچھ بتانا تھا بتا دیا' اب ہم تم پر تشدد کریں گے اور پھر دیکھیں گے کہ تمہاری زبان پر اس وقت کون سے حقائق آتے ہیں۔"

"پاگل تو نہیں ہوگئے۔" کرسٹوفر بھنا گیا۔ "میں پہلے بھی آپ لوگوں کو حقیقی اطلاعات فراہم کرتا رہا ہوں اور میرا خیال تھا کہ اس مرتبہ بھی آپ کھرا سودا کریں گے لیکن اپنی رقم بچانے کے لیے اگر آپ تشدد کر کے مجھے ہلاک ہی کرنا چاہتے ہیں تو یہ بھی کر دیکھیے۔ میرے منہ سے ہمیشہ سچی بات نکلے گی۔"

"ہم یہی تو پرکھنا چاہتے ہیں۔" لیپ نے گردن موڑ کر میز کے پاس کھڑے ہوئے دونوں افراد کو آگے آنے کا اشارہ کیا اور پھر تشدد سہتے سہتے کرسٹوفر کی جان نکل گئی۔ وہ بلند آواز سے چلاّ رہا تھا۔ اس کے منہ سے بے اختیار کنسکی اور لیپ کے لیے گالیاں نکل رہی تھیں کبھی کبھی اس کے منہ سے آؤل اور ونی یوہ کے لیے بھی گالیاں نکل جاتیں۔ اس کا پورا جسم درد کی آگ میں جل رہا تھا۔ دماغ پھٹا جارہا تھا۔ اب مزید تشدد برداشت کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ یہی وقت زہریلے کیپسول کو چبا کر اس اذیت سے نجات حاصل کرنے کا تھا۔ اگر چند لمحے تشدد اور جاری رہتا تو اس کا دماغ بالکل سُن ہوجاتا اور وہ کیپسول کے طریقۂ استعمال کو بھی بھول جاتا' ان لوگوں کے ہاتھوں میں یہ بڑی بڑی سوئیاں تھیں۔ وہ اس کی انگلیوں اور پیروں کے ناخنوں کے نیچے گوشت کو کچوکے دے رہے تھے۔ انہوں نے تشدد کے جدید طریقے ایجاد کر لیے تھے اور یہ راز پالیا تھا کہ کن اعصاب کو کچوکے لگانے سے انسان مچھلی کی طرح تڑپ اٹھتا ہے۔

اس نے اپنی اذیت ناک زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کا ذہن رفتہ رفتہ جسم سے لاتعلق ہوتا جارہا تھا۔ اگر اب بھی اس نے کچھ نہ کیا تو پھر خودکشی نہیں کر سکے گا۔

اسے لیپ کی منحوس صورت نظر آئی جو کہہ رہا تھا۔

"تیس سیکنڈ کے اندر اندر سب کچھ بک دو ورنہ موت کی بھیک مانگو گے اور موت تم سے دُور بھاگے گی۔"

کرسٹوفر نے اس کی جانب نظریں اٹھائیں اور زبان سے مصنوعی دانت تلاش کرنے لگا۔ اس وقت یہ کام پہاڑ توڑنے سے بھی زیادہ محنت طلب تھا۔ وہ بہ مشکل اپنی زبان کو حرکت دے سکتا تھا۔ بالآخر مصنوعی دانت اکھڑ گیا اور کیپسول اس کے منہ میں آ گرا۔ اس نے در و دیوار پر آخری نظریں ڈالیں۔ دنیا کو الوداع کہا اور پوری قوت سے کیپسول چبا ڈالا۔ شیشے کا کیپسول زوردار آواز میں اس کے منہ میں کرچی کرچی ہوگیا۔

کرسٹوفر نے اطمینان کی سانس لی۔ آنکھیں بند کر کے جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور موت کا انتظار کرنے لگا۔

جونہی اس نے کیپسول چبایا۔ وہ لوگ سمجھ گئے کہ ان کے ساتھ داؤ کھیلا جاچکا تھا۔ وہ اچھل کر اس پر آ پڑے۔ ان کے سخت اور مضبوط ہاتھ اس کا منہ کھول رہے تھے۔ پھر ڈاکٹر اس کے کھلے ہوئے منہ میں جھانکنے لگا۔ کمرے میں موجود ہر شخص جرمن زبان میں چلاّ رہا تھا اور کرسٹوفر حیران تھا کہ اسے اب تک موت کیوں نہیں آئی۔

جرمنوں نے اسے صوفے سے کھینچ کر الٹا لٹکا دیا۔ تشدد کرنے والے دونوں جرمنوں نے اس کی ٹانگیں پکڑی ہوئی تھیں جب کہ ڈاکٹر گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا اس کے منہ میں کوئی اوزار چلا رہا تھا۔ اس کی وجہ سے اسے اُبکائی آئی اور پھر اس نے قے کر دی۔

اس کے ذہن میں ایک خلش تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کیپسول ٹوٹنے کے بعد جب زہر اس کے منہ میں نکلے گا تو جلن نہ سہی کم از کم کسی مائع کی موجودگی کا احساس تو ہوگا لیکن اسے کسی بھی قسم کا احساس نہیں ہوا تھا۔ اسے تو یوں لگا جیسے اس نے خالی کیپسول چباڈالا ہو اور بس......؟

ڈاکٹر اس کے معدے سے نکلنے والی رطوبت سے کیپسول کے ٹکڑے تلاش کر کے ان کا بغور جائزہ لے چکا تھا۔ وہ لیپ کو کمرے میں ایک جانب لے گیا اور وہ خاصی دیر تک سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔ بالآخر لیپ واپس آیا اور کرسٹوفر سے بولا۔

''ہوں تو درحقیقت تم برطانوی ایجنٹ ہو اور ہمیں گمراہ کرنے کے لیے غلط اطلاعات فراہم کرنے آئے تھے۔ تمہارے افسروں نے تمہاری گلو خلاصی کا بھی نہایت عمدہ بندوبست کر رکھا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قسمت ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔ تمہارا کیپسول ناکارہ تھا' اس کی ساخت میں خرابی رہ گئی تھی اور اس میں زہر نہیں بھر سکا تھا۔ اب تم نہیں مرسکو گے اور میں تم پر قطعاً رحم نہیں کروں گا۔ چلو لڑکو! پوری قوت سے شروع ہوجاؤ۔'' اس نے تشدد کرنے والوں کو اشارہ کیا اور پھر کمرے میں کرسٹوفر کی کرب زدہ چیخیں گونجنے لگیں۔

❁......☆......❁

اس کا ذہن بالکل سُن ہوچکا تھا اور زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ نہ معلوم وہ انہیں کیا کچھ بتاچکا تھا اس کی باتیں بے ربط تھیں۔

''اُف خدایا! یہ درد۔ ارے میں مرگیا......بس کرو ظالمو......کم بختو......پانچ یا چھ جون......نارمنڈی پر حملہ......ذلیل' کمینو......یہی تو اصل حملہ ہے۔ پیٹن کے پاس کوئی فوج نہیں......کوئی بھی چیز نہیں......وہاں سب کچھ جعلی ہے۔ میں نے پورا جنگی منصوبہ دیکھا ہے۔ ارے بس کرو...... ہائے خدایا! مجھے اٹھالے۔ اف میں مرگیا' انہوں نے مجھ سے کہا تھا جرمنوں کو یقین دلا دینا کہ اصل حملہ کیلے پر ہوگا...... نارمنڈی پر نہیں...... یہ جھوٹ ہے...... اے اب مت مار...... ہائے...... ہائے...... مرگیا...... ارے اصل حملہ نارمنڈی پر ہوگا...... نارمنڈے...... حملہ...... نارمنڈی......درد......درد......درد......نارمنڈی......''

''تم کون ہو؟''

''کرسٹوفر!''

''تمہارا کوڈ کیا ہے؟''

''کرسٹوفر رابن......پیٹر ہملٹن!''

''کتنے عرصے سے برطانوی ایجنٹ ہو؟''

''1940 سے۔''

''ڈی ڈے کب ہے؟''

''پانچ جون......چھ جون۔''

''حملہ کہاں ہوگا؟''

''اصل حملہ نارمنڈی پر ہوگا؟''

''آ وَل کون ہے؟''

''کرنل جان!''

''ونی پوہ کون ہے؟''

''کرنل مٹکاف!''

وہ سوال پر سوال کرتے رہے اور کرسٹوفر ایک معمول کی طرح سچ سچ جواب دیتا گیا۔

❁......☆......❁

کرسٹوفر ہوش میں آیا تو اس کا سارا جسم سُن تھا۔ شاید انہوں نے کسی نشہ آور دوا کے انجکشن لگادیے تھے۔ وہ اسی کمرے میں صوفے پر پڑا تھا۔ اس نے دیکھا اس کے ہاتھوں اور پیروں کا گوشت قیمہ بن چکا تھا۔

اس وقت کمرے میں صرف جرمن اسٹینو اور نفرت انگیز شکل وصورت والا گستاپو کا کیپٹن تھا۔ وہ عورت

کرسٹوفر کو ہوش میں آتا دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھی۔

"کچھ تھوڑا بہت کھالو کیونکہ چند مزید سوال رہ گئے ہیں اور ہم نہیں چاہتے کہ نقاہت سے چل بسو۔" وہ عورت بولی۔ "پھر کل بہادروں کی طرح پھانسی کے تختے تک خود جانا۔" وہ ایک چمچے سے طاقتور قسم کا سوپ کرسٹوفر کو پلانے لگی۔

اب کرسٹوفر کو پھر تکلیف محسوس ہورہی تھی لیکن یہ تکلیف پہلے کی طرح پورے جسم میں نہیں تھی بلکہ صرف اپنے مقام پر محسوس ہوتی تھی مثلاً وہ بتا سکتا تھا کہ درد انگوٹھے میں ہے یا دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں۔

اچانک گستاپو کا کیپٹن کرسٹوفر سے مخاطب ہوکر انگریزی میں بولا۔

"چرچل! دیکھنے میں وہ کیسا لگتا ہے منحوس؟"

کرسٹوفر اس کے لب و لہجے پر حیران رہ گیا۔ وہ اہلِ زبان کی طرح فرفر انگریزی بول رہا تھا۔ انداز لندن کے باشندوں جیسا تھا۔

"وہ بڑا بہادر انسان ہے۔ تمہارے کارپورل ہٹلر کو شکست دے کر چھوڑے گا وہ۔"

گستاپو کا کیپٹن مضحکہ اڑانے کے انداز میں بولا۔

"سنا ہے وہ پکا شرابی ہے۔"

کرسٹوفر نے سرد نظروں سے اسے گھورا۔ اسے اس شخص کی شکل وصورت سے نفرت ہوگئی تھی۔ کس غرور سے گردن اکڑائے بکواس کیے جا رہا تھا۔

"شرابی تو تمہارا کارپورل ہٹلر ہے۔" کرسٹوفر نے دانت پیس کر کہا۔

"کیا تم نے اسے کبھی نشے میں دیکھا ہے؟"

"میں اسے اتنے قریب سے نہیں جانتا۔"

"میرا خیال ہے تم اب بھی حقائق پوشیدہ رکھنے کی کوشش کررہے ہو۔"

کرسٹوفر نے ایک نظر اس پر ڈالی اور خاموش رہا اسی وقت دروازہ کھلا اور کرنل لیپ اندر داخل ہوا۔ کمرے کا دروازہ بند ہوگیا۔ اسٹینو نے جرمن زبان میں کرنل سے کچھ کہا۔ شاید بتا رہی تھی کہ قیدی سے گستاپو کا کیپٹن بھی پوچھ گچھ کرتا رہا ہے۔

لیپ نے سرد نظروں سے گستاپو کے کیپٹن کو گھورا۔ چند لمحے وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے رہے پھر کرنل لیپ مڑا اور میز کے عقب میں جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تم ہمیں اور کیا بتا سکتے ہو؟" اس نے گونجیلی آواز میں پوچھا۔

"اب بتانے کو اور کیا رہ گیا ہے؟"

"دیکھو! تم نے اپنی مرضی سے جو کچھ بتانا تھا بتا چکے پھر تم نے ہماری مرضی کے مطابق ہمیں سب کچھ بتادیا۔ لیکن اب تم وہ باتیں بتاؤ گے جو ہمارے ذہن میں نہیں آسکیں۔ نہیں بتاؤ گے تو اب ہمیں تم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یاد رکھو! اب اگر ہمارے ہاتھوں دم توڑ گئے تو ہمیں کوئی افسوس نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے تو ختم کردو مجھے۔"

لیپ کے چہرے پر غصے کے تاثرات دیکھ کر کرسٹوفر اپنی ہنسی ضبط نہ کرسکا۔ لیپ کا پارہ چڑھ گیا اور وہ اسٹینو سے مخاطب ہوکر بولا۔

"ذرا ڈاکٹر کو بلواؤ۔ میں چاہتا ہوں یہ زندہ بھی رہے اور مرنے کی تمنا بھی کرتا رہے۔"

عورت نے اثبات میں سر ہلایا اور میز پر رکھے ہوئے فون کی طرف بڑھی اور پھر اسی لمحے حالات نے عجیب سی کروٹ لی۔

گستاپو کے کیپٹن نے ایڑی کے بل گھوم کر ایک خاص داؤ سے عورت کی دونوں آنکھوں میں انگلیاں گھسا دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا ہاتھ بھی گھوما اور برین گن کا بٹ لیپ کی کنپٹی پر پڑا۔ وہ اچھل کر فرش پر

جا پڑا۔ اس نپی تلی چوٹ کے بعد اس کا ہوش میں رہ جانا ناممکن تھا۔ کیپٹن نے عورت کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا وہ اس کا گلا دبا رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی مخصوص گرفت سے کرسٹوفر پہچان گیا کہ اس شخص کو خصوصی تربیت دی گئی ہوگی۔ چند لمحوں میں عورت کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور وہ فرش پر گرتی چلی گئی۔

کرسٹوفر اس ڈرامے پر شدید حیران تھا۔ کمرے میں بے ہوش لیپ کی بے ترتیب سانسوں کی آواز گونج رہی تھی۔ کرسٹوفر ذہنی طور پر خود کو تیار کرنے لگا۔ شاید گستاپو کا کیپٹن اسے قتل کرے گا۔

اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی' اس کی طبیعت خاصی بہتر تھی۔ کیپٹن عورت کی لاش پھلانگ کر اس کی طرف بڑھا۔ اس کے اعصاب تن گئے۔ وہ اپنے خصوصی داؤ پیچ استعمال کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ لیکن کیپٹن نے اس پر حملہ نہیں کیا بلکہ اس سے پوچھا۔

''کیا تم چل سکتے ہو؟''

''کیا؟'' کرسٹوفر حیران رہ گیا۔

''میرے خیال سے تم تیزی سے حرکت نہیں کر سکو گے۔ میں چاہتا تھا کہ یہ گدھے کا بچہ تمہیں تھوڑا سا وقت دے دیتا اور تمہاری طبیعت بہتر ہو جاتی لیکن اب کیا ہو سکتا ہے ہمیں انہی حالات سے گزرنا پڑے گا۔ تمہارے جوتے وہ پڑے ہیں' جلدی سے پہن لو۔''

کرسٹوفر بے حس و حرکت پڑا رہا۔ کیپٹن تیزی سے بولا۔ ''اوہ گدھے! جلدی کرو۔ خدا کے لیے جلدی کرو۔ میں تمہارا دوست ہوں' بہادرانہ معرکہ' کچھ سمجھے؟''

کرسٹوفر غیر حاضر دماغی سے احمقانہ انداز میں اس کی جانب دیکھتا رہا۔

''یاد کرو' بہادرانہ معرکہ۔'' کیپٹن جھلا کر بولا۔

اور پھر کرسٹوفر کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ چرچل کے الفاظ اس کے ذہن میں گونجنے لگے۔

''وہ اپنی شناخت کے لیے بہادرانہ معرکہ کے الفاظ استعمال کرے گا اور تم اس کے احکامات پر بلا چوں و چرا عمل کرو گے۔''

کیپٹن نے اس کے جوتے اٹھا کر اس کی طرف پھینکے۔

''جلدی سے پہن لو۔'' پھر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ ''ہمیں باتیں کرتے رہنا چاہیے۔ ورنہ دروازے کے باہر کھڑے ہوئے دونوں بدمعاش شک میں پڑ جائیں گے۔ راستہ صاف کرنے میں تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔ کیا تم اس قابل ہو؟''

''میں کوشش کروں گا لیکن بات سنو۔ تم ہو کون؟''

''یہ فضول باتوں کا وقت نہیں ہے۔ چلو جلدی کرو۔ اٹھو۔'' کیپٹن غصے سے بولا پھر اس نے لیپ کا ریوالور ہولسٹر سے نکال کر کرسٹوفر کی طرف بڑھایا۔ ''گولی تو چلا لو گے؟''

''میرا خیال ہے چلا چلوں گا۔''

''تو پھر مجھے کور دو۔''

ریوالور ہاتھ میں لیتے ہی کرسٹوفر کا درد جاگ اٹھا۔ لیکن اب اس کے جسم میں حوصلے کی نئی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے آنسو پینے کی کوشش کی۔ گستاپو کا کیپٹن اسے سہارا دے کر دروازے کی طرف بڑھا۔

دو قدم چلتے ہی کرسٹوفر کے پیروں میں آگ سی لگ گئی۔ پورے جسم میں درد پھیل گیا تھا۔ کیپٹن دروازہ کھولنے ہی والا تھا کہ کرسٹوفر بولا۔

''ٹھہرو!'' اس نے دیوار کا سہارا لے کر اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پایا۔ ''میرے لیے چلنا بے حد دشوار ہے۔ میں یہاں سے نہیں نکل سکوں گا۔ بہتر ہے تم مجھے ختم کر کے خود چلے جاؤ۔''

''تمہیں ہلاک کر دوں؟ ذاتی طور پر تو مجھے ایسا

بے حد خوشی ہوگی لیکن مشکل یہ ہے کہ چرچل نے ...ہیں زندہ سلامت واپس لانے کا حکم دیا تھا۔ وہ تم سے بے حد محبت کرتا ہے۔ تم اپنی تکلیف کی جانب سے ...ہٹانے کی کوشش کرو۔ ہمارا پہلا مسئلہ اس عمارت سے زندہ سلامت نکلنا ہے۔‘‘

گستاپو کے کیپٹن نے جونہی دروازہ کھولا۔ باہر کھڑے ہوئے دونوں افراد ہوشیار ہوگئے۔ انہوں نے پستول ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تھے۔ کرسٹوفر کے ہاتھ میں ریوالور دیکھتے ہی ان کے منہ حیرت سے کھل گئے۔ ابھی وہ سنبھلنے نہ پائے تھے کہ کیپٹن نے چیتے کی سی پھرتی سے ان پر چھلانگ لگائی اور دونوں کے سر پوری قوت سے آپس میں ٹکرائے۔ ایک کی آنکھیں آسمان کی طرف چڑھ گئیں وہ سلوموشن میں زمین پر گرنے لگا لیکن دوسرا شخص ابھی ہوش میں تھا۔ کیپٹن نے اس کی گردن پر کھڑی ہتھیلی کا وار کرنا چاہا لیکن اس نے گردن بچالی۔ کیپٹن کا وار اس کے شانے پر پڑا۔ اس نے اپنا پستول اٹھایا اور ساتھ ہی شور مچانے کے لیے منہ کھولا۔ عین اسی وقت کرسٹوفر نے ریوالور کا دستہ پوری قوت سے اس کے سر پر دے مارا۔ جرمن کٹے ہوئے شہتیر کی مانند زمین پر گرتا چلا گیا۔

گستاپو کیپٹن نے جلدی جلدی دونوں کو کمرے میں گھسیٹ لیا۔

’’خدا کا شکر ہے۔‘‘ وہ بولا۔ ’’اگر ان میں سے کوئی شور مچادیتا تو یہ عمارت ہمارے لیے چوہے دان بن جاتی۔ تم نے عین وقت پر وار کیا۔ معلوم ہوتا ہے تمہاری شہرت غلط نہیں تھی۔‘‘ لیکن درد کرسٹوفر کو کھائے جارہا تھا۔ وہ کاٹ دار لہجے میں بولا۔

’’شہرت...... مائی فٹ! یہ درد شہرت سے زیادہ حقیقی ہے۔‘‘ گستاپو والا اس پر توجہ دیے بغیر بولا۔

’’ہم نے پہلا کام کرلیا ہے یعنی راستہ صاف ہوگیا ہے۔ اب مجھے یہ کرنا ہے کہ تمہیں یہاں سے زندہ سلامت نکالوں اور لندن رپورٹ دوں کہ لیپ نے تشدد کرکے تم سے کیا معلومات حاصل کرلی ہیں۔ اس نے تمام باتوں سے برلن کو فوراً مطلع کردیا تھا۔‘‘

اس نے فون اٹھایا اور جرمن زبان میں دہاڑنے لگا پھر فون رکھ کر بولا۔

’’میں نے ڈاکٹر کو بلوایا ہے۔ اس کے میڈیکل بیگ میں درد مار ادویات ضرور ہوں گی۔ وقتی طور پر تم چلنے پھرنے کے قابل ہوجاؤ گے۔‘‘ پھر اس نے ایک جرمن محافظ کی وردی اتارنی شروع کی۔ ’’یہ تمہارے سائز سے بڑی تو ہے لیکن کام چل جائے گا‘ چلو جلدی سے پہن لو۔‘‘

ڈاکٹر نشے میں دھت تھا۔ اس پر قابو پانا چنداں دشوار ثابت نہ ہوا۔ وہ فوراً بے ہوش ہوگیا۔ اس کے بیگ میں درد مار دوا کے دو انجکشن تھے۔ گستاپو والے نے ایک انجکشن تو کرسٹوفر کے لگایا اور دوسرا سرنج سمیت جیب میں رکھ لیا۔

’’چند لمحوں بعد دوا کا اثر شروع ہوجائے گا تو ہم اپنی کارروائی شروع کریں گے۔ دیکھو اس وقت ہم دوسری منزل پر ہیں‘ نیچے اترنے کے لیے ہم ہنگامی زینہ استعمال کریں گے۔ یہ لاک رہتا ہے اور اس پر پہرہ بھی ہوتا ہے لیکن لفٹ استعمال کرنا موت کو دعوت دینا ہوگا۔ اصل مشکل گراؤنڈ فلور پر ہوگی۔ وہاں ہم کوشش کریں گے کہ پہلے بات چیت کرکے نکل جائیں۔ دوسری صورت میں ہمیں گولیاں چلاتے ہوئے فرار ہونا پڑے گا۔ باہر صحن میں بہت سی گاڑیاں ہیں اگر تم نکل جاؤ میں نہ نکل سکوں تو تم سب سے بھاری گاڑی پر قبضہ کرکے فرار ہوجانا۔ میں اس سے زیادہ مدد نہیں کرسکوں گا اور ہاں میرا نام ہیری گروبر ہے۔ برطانیہ میں پیدا ہوا لیکن والد جرمن تھے‘ گستاپو میں کیپٹن ہوں۔‘‘

''ہم کس جگہ پر ہیں؟''

''چیر برگ ایس ایس کے ہیڈ کوارٹر میں۔''

دونوں کمرے سے نکل آئے۔ ایک ریوالور کرسٹوفر کی وردی کے ہولسٹر میں تھا۔ دوسرا اس نے جیب میں رکھ لیا تھا۔

راہداری کے آخری سرے پر ہنگامی زینہ تھا۔ اس کا دروازہ لاک تھا اور اس پر ایک مسلح باوردی پہرے دار کھڑا تھا۔

پہرے دار کے قریب پہنچ کر ہیری نے اچانک اس پر حملہ کر دیا۔ اس کی کھڑی ہتھیلی کے وار سے اس کی گردن ٹوٹ گئی۔ وہ فرش پر آ رہا۔ ہیری نے جلدی سے اس کی جیب سے چابیاں نکالیں اور دروازے کا لاک کھول دیا۔ اس نے پہرے دار کی لاش اندر گھسیٹ کر دروازہ پھر لاک کر دیا۔

لیکن سیڑھیاں اترنا کرسٹوفر کے بس کی بات نہیں تھی۔ پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی اس کی چیخ نکل گئی اور تکلیف سے پورا جسم کانپنے لگا۔ وہ پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ جب درد کی لہر تھمی تو اس نے نیچے اترنے کے لیے ایک انوکھا طریقہ استعمال کیا جس طرح بچے سیڑھی کی ریلنگ پر پھسلتے ہیں' اسی طرح وہ نیچے اترنے لگا۔ ان سنگین حالات میں بھی دونوں اس پر ہنس پڑے۔

پہلی منزل پر پہنچ کر جونہی کرسٹوفر کے قدم زمین پر لگے۔ اس کے جسم میں پھر ناقابل برداشت درد کی لہر دوڑ گئی۔ وہ ہانپنے لگا۔ اس جگہ انہیں نہایت محتاط رہنے کی ضرورت تھی کیونکہ یہاں بھی دروازے کے دوسری جانب ایک پہرے دار موجود تھا۔

عین اس وقت کرسٹوفر کے ذہن میں ایک سوچ ابھری۔ تم پیشہ ور ایجنٹ ہو۔ حالات کا پیشہ ورانہ انداز میں مقابلہ کرو اور اس نے یہ چیلنج قبول کر لیا۔

''ٹھیک ہے ہیری! چلو اب چلتے ہیں۔'' وہ سرگوشی میں کھنک دار آواز میں بولا۔ ہیری نے حیرت سے اسے دیکھا لیکن وہ بولا کچھ نہیں۔ وہ سیڑھیاں اترنے لگا۔

جونہی وہ گراؤنڈ فلور پر پہنچے اوپر دروازے کھلنے کی آواز آئی اور پھر حیرت آمیز چیخیں اور احکامات دیے جانے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہیری نے غصے سے ہونٹ چبا ڈالا۔

''انہیں ہمارے فرار کی اطلاع مل گئی ہے۔ بھاگ اب وقت بالکل نہیں رہا'' اس نے دروازہ کھولا۔ بر گن اس کے ہاتھ میں فائر کے لیے بالکل تیار تھی۔ اس وقت وہ ایک راہداری کے اختتام پر تھے جو اس طرف بند ہو گئی تھی۔ راہداری کے دوسری جانب ایک لمبا چو ہال تھا۔ جس میں چاروں طرف جرمن بھاگے پھر رہے تھے۔ وہ بدحواس نظر آ رہے تھے۔

راہداری میں داخل ہوتے ہی ہیری نے زور زو سے جرمن زبان میں بولنا شروع کر دیا۔ آٹھ دس جرمن بھاگتے ہوئے ہنگامی زینے کی طرف جا رہے تھے۔ فوراً رک گئے ان کے افسر نے جو ایک کارپورل تھا ہیری سے کچھ کہا اور پھر وہ سب ہنگامی زینے کی طرف بڑھ گئے۔ ہیری تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ہال میں داخل ہو چکا تھا۔ کرسٹوفر اس کے ساتھ تھا' ہیری کا رخ داخلی دروازے کی جانب تھا لیکن یہ دروازہ بند تھا اور شیشے کے باہر چار جرمن سنتری باہر کی جانب منہ کیے اٹینشن کھڑے تھے۔

ہیری دروازے کے قریب بنی ہوئی چیک پوسٹ کی طرف بڑھا جہاں کاغذات چیک کیے جاتے تھے چیک پوسٹ میں ایس ایس کا ایک سارجنٹ او لیفٹیننٹ موجود تھے۔ ہیری نے چیک پوسٹ سے کئی قدم پہلے ہی زور زور سے دہاڑنا شروع کر دیا۔ کرسٹوفر نے بھی اپنے چہرے پر درشتگی کے تاثرات پیدا کر لیے تھے۔

لیفٹیننٹ نے نرم لہجے میں کچھ کہا۔ ہیری نے جیب سے کاغذات نکال کر اس کی میز پر پٹخ دیے۔ لیفٹیننٹ شاید اس کو پہچانتا تھا کیونکہ وہ اکثر وہاں آتا رہتا ہوگا۔ اس نے کاغذات پر محض ایک نگاہ ڈالی اور انہیں ہیری کی طرف واپس بڑھاتا ہوا نرم لہجے میں کچھ کہتا رہا۔ غالباً دروازے نہ کھول سکنے پر معذرت کررہا تھا۔ یہ بات اب اس کے دائرہ اختیار سے باہر تھی۔ ہیری نے پھر غرّا کر کچھ کہا لیکن لیفٹیننٹ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

ہیری نے ایک نظر کرسٹوفر پر ڈالی۔ ایک لمحے کے لیے ان کی نگاہیں ملیں اور کرسٹوفر اس کا پیغام سمجھ گیا۔ ان کے حرکت کرنے سے قبل لابی میں ایک جرمن گھسا جو چیخ چیخ کر کچھ احکامات جاری کررہا تھا۔ وہاں موجود جرمنوں میں کھلبلی مچ گئی اور وہ ادھر اُدھر بھاگنے دوڑنے لگے۔ غالباً انہیں عمارت کی تلاشی کا حکم دیا گیا تھا۔

ہیری غصے سے بڑبڑاتا ہوا واپسی کے لیے تیزی سے ایڑی پر گھوما اور اس کے کاندھے پر جھولتی ہوئی برین گن پھسل گئی۔ اس نے فوراً برین گن سنبھالی اور یک بیک اندھا دھند فائرنگ شروع کردی۔ عمارت گولیوں کی آواز سے گونج اٹھی تھی۔ کرسٹوفر نے دونوں ریوالور ہاتھ میں پکڑ لیے تھے اور فائرنگ کے لیے بالکل تیار تھا۔ ہیری کا نشانہ دروازے کے باہر کھڑے سنتری تھے۔ گولیوں کا برسٹ ان چاروں کو چاٹ گیا۔

''بھاگو!'' ہیری چلّایا اور خود بھی دروازے کی جانب بھاگ اٹھا۔ کرسٹوفر تمام تر تکلیف کے باوجود اس کے ہم قدم تھا۔ ان کے عقب میں زبردست شور شرابا ہو رہا تھا۔ وہاں موجود ہر جرمن چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو ان کی جانب متوجہ کررہا تھا پھر گولیوں کی ایک باڑھ آئی لیکن اس سے قبل ہیری اور کرسٹوفر سیڑھیاں اترنے لگے تھے۔ گولیاں ان کے سروں پر سے گزر گئیں۔

سیڑھیوں کے برابر ایک فاکس ویگن کھڑی تھی۔ ہیری چلّایا۔

''سوار ہو جاؤ!'' اور اس نے خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ کرسٹوفر گھوم کر دوسری طرف سے پسنجر سیٹ پر آ گرا۔ اسی لمحے ہیری نے لابی کی جانب برین گن کا ایک برسٹ مارا۔ مقصد یہ تھا کہ جرمن چند لمحوں کے لیے چھپ جائیں اور یہ لمحات ان کے فرار کے لیے ازبس ضروری تھے۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ کار فراٹے بھرتی ہوئی مین گیٹ کی طرف دوڑنے لگی۔

ہزاروں گز پہ پھیلے ہوئے اس صحن میں ہر قسم کی بیسیوں گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان میں چھوٹی بڑی کاریں، فوجی جیپیں، لاریاں حتیٰ کہ بکتر بند گاڑیاں بھی موجود تھیں۔

وہ ایک مرحلہ تو طے کر آئے تھے لیکن اب ایک اور خطرناک مرحلہ باقی تھا۔ مین گیٹ کے فولادی دروازے سے باہر نکلنا۔

پہلے تو مین گیٹ پر تعینات فوجی صورتِ حال سمجھ نہ سکے۔ کچھ دیر بعد غالباً فون پر انہیں حکم دیا گیا کہ فاکس ویگن کو نکلنے نہ دیں۔ تو وہ چیک پوسٹ سے دوڑتے ہوئے نکلے۔ یہ آٹھ فوجی تھے۔ وہ فولادی دروازوں کو بند کرنے لگے۔ چار دروازے کے ایک پٹ کو اور چار دوسرے پٹ کو کاندھے سے دھکیل رہے تھے اور لمحہ بہ لمحہ یہ بھاری دروازہ انچ انچ کر کے بند ہوتا جارہا تھا۔

فاکس ویگن جیسی چھوٹی کار اس آہنی گیٹ کی فولادی سلاخیں توڑ کر باہر نکلنے کے قابل نہیں تھی۔ کرسٹوفر کے ذہن میں فوراً ایک ترکیب ابھری۔ اس نے ہاتھ باہر نکال کر گارڈز پر فائرنگ شروع کردی۔ ان لمحات میں اسے اپنے جسم میں کروٹیں لیتے درد کی لہر کو محسوس کرنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ اس کی ترکیب کارگر ثابت رہی۔ گارڈز نے دروازہ چھوڑ کر اپنا اسلحہ

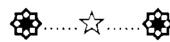
نکالنے کی کوشش کی لیکن ابھی وہ اپنے ہولسٹر اور جیبوں سے الجھے ہوئے تھے کہ تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی کار ان کے سر پر جا پہنچی۔ محافظ بوکھلا کر بھاگ اٹھے اور کار دروازے میں سے چند انچ کے فاصلے میں سے نکلتی چلی گئی۔ اگر کرسٹوفر بروقت اپنا ہاتھ اندر نہ کھینچتا تو اس کا ہاتھ کلائی سے کٹ چکا ہوتا۔

کرسٹوفر بروقت کارروائی نہ کرتا اور گارڈز آہنی گیٹ کو چند انچ مزید بند کردیتے تو وہ چوہے دان میں پھنس کر رہ جاتے اور پھر ان کی موت یقینی تھی۔

ایک لمحے کے لیے کرسٹوفر کی نظریں گیلری کی جانب اٹھیں وہاں البرٹ لیپ غصے سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ کرسٹوفر سے نظریں ملتے ہی اس نے غصے سے گھونسا لہرایا۔ پھر بھاگتا ہوا عمارت میں داخل ہوگیا۔ یہ بڑی خطرناک بات تھی۔ لیپ ان کو فرار ہوتے دیکھ چکا تھا اور اب وہ چاروں طرف ان کا حلیہ نشر کردے گا۔ یہ کار بھی ان کے لیے مخدوش ہوچکی تھی۔

دیوار پر بنی ہوئی پوسٹوں سے ان پر فائرنگ شروع ہوگئی تھی۔ ہیری زگ زیگ انداز میں کار چلا رہا تھا۔ کار کے پہیے کبھی فٹ پاتھ پر چڑھ جاتے اور کبھی کار ایک جھٹکے سے تیز ہوکر بھاگنے لگتی۔

تاہم چند لمحوں میں وہ فائرنگ کی زد سے نکل آئے۔ کار نے ایک چوراہا عبور کیا۔ ہیری کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ چند لمحوں کے لیے کار کے ایک جانب کے دو پہیے ہوا میں اٹھے۔ خطرہ تھا کہ وہ الٹ جائے گی لیکن پھر کار سیدھی ہوکر سبک رفتاری سے دوڑنے لگی۔ ہیری نے جلدی جلدی چند موڑ اور کاٹے اور کار شہر کی بھول بھلیاں نما گلیوں اور سڑکوں میں گم ہوگئی۔



اب وہ ایک پتلی سی سڑک پر جارہے تھے۔ ہیری نے فرار کے بعد پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

”میری بات غور سے سنو! ہوسکتا ہے ہمیں بات کرنے کا پھر موقع نہ ملے۔ اگر ہماری راہیں جدا ہوگئیں تو تم ڈاکٹر ہنری فرٹے کے پاس چلے جانا۔ وہ اوکٹی وائل میں فوشی روڈ پر مکان نمبر ۱۷ میں رہتا ہے۔“

کرسٹوفر نے نام اور پتا یاد کرلیا۔

”یہ قصبہ یہاں سے دو قصبوں کے بعد ہے۔ اس کے پاس وائرلیس بھی ہے اور پھر وہ میڈیکل ڈاکٹر ہے۔ تمہارا علاج کرسکے گا۔“ کرسٹوفر نے کچھ بولنا چاہا لیکن ہیری نے ہاتھ ہلا کر اسے خاموش کردیا۔ ”مجھے بات ختم کرلینے دو۔ تم نے جو کچھ جرمنوں کو بتایا ہے وہ سب تمہارے افسروں اور چرچل کا ایک منصوبہ تھا۔ جرمنوں کو بھی اس بات کا علم ہے کہ کوئی ملک غیر پیشہ ور ایجنٹوں کو زہر کے کیپسول نہیں دیتا اور نہ ہی فیلڈ ایجنٹوں کو حقائق بتائے جاتے ہیں چنانچہ لیپ نے تم سے حاصل ہونے والی اطلاعات فوراً برلن بھجوادی ہیں اور جرمن ہائی کمان اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ تم نارمنڈی پر حملے کے بارے میں گمراہ کن خبر دینے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ اب مشکل یہ ہے کہ مجھے خود نہیں معلوم اتحادی کیلے پر حملہ آور ہوں گے یا نارمنڈی پر۔ ہمیں فوراً یہ اطلاع انہیں دینی ہوگی کہ اگر کیلے پر حملے کا پروگرام ہے تو فوراً منسوخ کردیا جائے۔ جرمن اپنی پوری قوت وہاں جھونک رہے ہیں۔ اتحادیوں کا قبرستان بنادیں گے اس جگہ کو۔“

ہنری نے کار ایک پیٹرول پمپ میں موڑ لی جو خالی پڑا ہوا تھا۔ گیراج میں ایک فیاٹ کار کھڑی تھی۔ انہوں نے فاکس ویگن سے نجات حاصل کی اور فیاٹ میں بیٹھ کر دوبارہ روانہ ہوگئے۔

اب وہ اوکٹی وائل کے مضافات میں پہنچ چکے تھے۔ یہ بے حد خوب صورت علاقہ تھا' سرسبز اور شاداب۔

''میری بات یاد ہے نا!'' ہیری کہہ رہا تھا۔ ''اگر ہم
س وجہ سے ڈاکٹر فرٹے تک نہ پہنچ سکے تو تم ایک اور
ہاں چلے جانا۔ چیر برگ میں ایک چھوٹا سا کیفے ہے۔
ی پیچو امیلس اسٹریٹ پر۔ یہ مقامی مزاحمتی گروپ کا
ڈہ ہے۔ اس کی سربراہ ایک نوجوان لڑکی ہے اور اس کا
ادا وہاں بارمین ہے۔ ان کے علاوہ میں تمہیں اور کوئی پتا
نہیں بتا سکتا۔'' پھر اس نے کار ایک سڑک پر موڑی۔
''لو! اب ہم ڈاکٹر فرٹ کے پاس پہنچنے ہی والے ہیں۔
اس کا مکان اگلے چوک سے آگے بائیں ہاتھ پر چوتھا
والا ہے۔''

سڑک بالکل ویران تھی۔ یہ بات کرسٹوفر کے ذہن میں کھٹکنے لگی۔ اس نے پہلے بھی ایسی آبادیاں دیکھ رکھی تھیں۔ سنسان اور ویرانی کا ایک ہی مطلب ہوتا تھا۔ جرمن فوجی وہاں موجود ہیں اور مقامی باشندے ان کے ڈر سے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ ہیری بھی صورت حال سے باخبر تھا۔ وہ بولا۔

''مجھے حالات مخدوش نظر آ رہے ہیں۔ اس لیے ہم براہِ راست ڈاکٹر کے گھر جانے کے بجائے تھوڑی سی چیکنگ کریں گے۔ پہلے ہم اس کے گھر کے سامنے سے گزرتے چلے جائیں گے۔ تم بھی گردوپیش پر نظر رکھنا اگر دونوں مطمئن ہو گئے تو واپس آ کر ڈاکٹر کے مکان میں چلیں گے ورنہ یہاں سے بھاگ جائیں گے۔''

کرسٹوفر غور سے اِدھر اُدھر کا جائزہ لیتا رہا۔ ڈاکٹر فرٹے کا مکان نیا اور خوب صورت تھا۔ سامنے ایک طویل وعریض لان تھا۔ جس میں کئی ہرے بھرے درخت تھے۔ ہیری چاروں طرف کا بغور جائزہ لیتا ہوا کار سڑک کے آخری موڑ تک لے گیا پھر اس نے کار روکی اور واپس مڑ گیا۔ اب اس نے ڈاکٹر کے مکان سے چند قدم آگے جا کر کار روک لی۔

''تم کار ہی میں ٹھہرو۔ میں جا کر ڈاکٹر سے ملتا ہوں پھر تمہیں بھی بلا لوں گا۔''

وہ کار کو اسٹارٹ حالت میں ہی چھوڑ کر ڈاکٹر کے مکان کی طرف بے حد چوکنّے انداز میں بڑھا۔ اس نے برین گن ہاتھوں میں سنبھال رکھی تھی اور ایک لمحے میں فائرنگ کرنے اور بھاگنے کے لیے تیار تھا۔

اب وہ گیٹ میں داخل ہو کر پورچ کی طرف جا رہا تھا۔ چاروں طرف مکمل سناٹا تھا۔ کوئی حرکت نہ تھی۔ کرسٹوفر کے اعصاب پوری طرح تنے ہوئے تھے اور وہ دونوں ریوالور ہاتھوں میں لیے بے حد چوکنا بیٹھا تھا۔

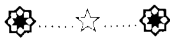
ہیری نے مکان کے دروازے پر دستک دی اور پیچھے مڑ کر کرسٹوفر کی جانب دیکھا۔ کرسٹوفر بڑے غور سے مکان میں دیکھ رہا تھا۔ کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا کھسکا۔ کسی شخص کا چہرہ نظر آیا اور پھر دروازہ کھل گیا۔ ہیری اس شخص سے باتیں کرنے لگا۔

عین اسی وقت کرسٹوفر کی چھٹی حس نے کسی خطرے کا احساس دلایا۔ کھڑکی کا پردہ پھر ہلا تھا اور بندوق کی نالی نظر آ رہی تھی۔ کرسٹوفر نے ہیری کو خبردار کرنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ کسی نے ڈاکٹر کو دھکا دیا اور وہ پورچ میں آ گرا پھر گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ ہیری چھلانگیں لگاتا ہوا واپس بھاگا اور کرسٹوفر نے یونہی مکان کی جانب چند فائر کر ڈالے۔

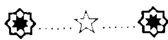
مکان کا دروازہ زوردار آواز میں کھلا۔ اس میں سے رائفلوں سے مسلح جرمنوں کا غول برآمد ہوا۔ ڈاکٹر فرٹے بھاگ کر درختوں کی جانب بڑھا لیکن گولیوں کا ایک برسٹ اس کو چاٹ گیا اور وہ زمین پر گر کر ساکت ہو گیا۔

ہیری دو چار قدم بھاگنے کے بعد مڑ کر جرمنوں پر گولیوں کا برسٹ مارتا اور پھر بھاگنا شروع کر دیتا۔ اس

کار سے چند قدم کے فاصلے پر آ پہنچا تھا چلا کر بولا۔
''ہمیں پکڑنے کے لیے یہ جرمنوں کی چال تھی' شاید ڈاکٹر فرٹے نے انہیں سب کچھ بتا دیا تھا۔''
عین اسی لمحے کسی جرمن کا نشانہ ٹھیک بیٹھا اور گولیاں ہیری کی کمر میں پیوست ہوگئیں۔ وہ لڑکھڑایا اور زمین پر گر گیا لیکن اس نے آخری بہادرانہ معرکے کے طور پر اپنی برین گن کرسٹوفر کی جانب اچھال دی تھی۔ کرسٹوفر نے دروازہ کھول کر گن اٹھائی اور جرمنوں پر زبردست فائر کھول دیا۔ وہ سب آڑ میں ہوگئے۔ کرسٹوفر نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہیری کو کار کی عقبی نشست پر ڈالا مکان کی جانب ایک برسٹ مارا اور پھر کار کو تیز رفتاری سے لے بھاگا۔
جرمن مکان سے نکل آئے تھے اور تیزی سے غائب ہوتی ہوئی کار پر اپنا گولہ بارود ضائع کر رہے تھے۔
اچانک کرسٹوفر کے اعصاب تن گئے' ایک گولی عقبی اور سامنے کی ونڈ اسکرین کو توڑتی ہوئی اس کے سر کے پاس سے نکلتی چلی گئی۔ وہ بال بال بچا تھا۔ شیشے کی کرچیاں اس کے ہاتھوں اور چہرے پر آ کر گری تھیں اور عین اسی لمحے اس نے عقب نما آئینے میں دیکھا کہ ایک آرمرڈ کار کسی اور مکان سے نکل کر اس کے پیچھے لگ گئی ہے' اس نے پوری قوت سے ایکسیلیٹر دبا دیا۔ کار برق رفتاری سے بھاگ رہی تھی۔ اس نے جلدی جلدی چند موڑ کاٹے' اسے اس شہر کی گلیوں اور سڑکوں کا علم نہیں تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ نادانستگی میں پھر اسی سڑک پر جا پہنچے۔
اس نے جھٹکے سے کار روکی۔ ''ہیری تم خیریت سے ہو نا؟'' ہیری عقبی نشست پر آڑا ترچھا پڑا ہوا تھا۔ اس کی کھلی ہوئی بے جان آنکھیں کرسٹوفر پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اپنا فرض انجام دے کر ہمیشہ کی نیند سو رہا تھا۔ کرسٹوفر نے بڑی عقیدت سے اس کی لاش کو سلوٹ کیا اور کار چلا دی۔



اب وہ پیدل ہی ویرانے میں چل رہا تھا۔ اس کا ایک ایک قدم من من بھر کا تھا۔ پیروں کی تکلیف پھر سے چمک اٹھی تھی۔ اس کو پیدل چلتے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔
اس نے کار جھاڑیوں میں چھپا دی تھی۔ ہیری کی لاش اس نے کار ہی میں رہنے دی تاہم ہیری کی وردی اتار کر اب وہ جرمن گستاپو کا کپتان بن چکا تھا۔ اس کے پاس ہیری کے شناختی کاغذات' کچھ رقم' برین گن اور انجکشن کی ایک شیشی اور سرنج تھی۔
اس وقت اسے آرام' خوراک' طبی امداد اور وائرلیس کی شدید ضرورت تھی۔ اسے آول کو اطلاع دینی تھی کہ جرمنوں کو کیلے پر حملے کا یقین ہوگیا ہے اور انہوں نے اس مقام پر اپنی تمام فوجی قوت جھونک دی ہے۔
اس نے تھوڑی دیر آرام کا فیصلہ کیا۔ سبز گھاس سے بھری ہوئی زمین پر نیم دراز ہو کر اس نے انجکشن کی شیشی نکالی' سرنج میں دوائی بھری اور اپنے بازو میں درد مارنشہ آور دوا کا انجکشن لگا لیا۔ تھوڑی دیر بعد جب دوا نے اثر دکھانا شروع کیا اور اسے تکلیف میں کمی محسوس ہوئی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔



وہ سائیکل پر سوار چیر برگ کی سڑکوں سے گزر رہا تھا۔ سائیکل پر قبضہ کرنے کے لیے بھی اس نے خوب خوب ڈراما کیا تھا۔ اس نے ایک بوڑھے سے پوسٹ مین کو برین گن دکھا کر اس سے کہا تھا کہ ملک و قوم کو اس کی سائیکل کی ضرورت ہے۔ بوڑھا پوسٹ مین حیرت سے منہ پھاڑے اسے دیکھتا رہا تھا اور وہ سائیکل پر بیٹھ کر ہوا ہوگیا تھا۔ اس طرح اسے پیدل چلنے کی تکلیف

نجات مل گئی اور اس کی رفتار بھی تیز ہوگئی تھی۔

وہ چیر برگ کے کیفے پیچو میں مزاحمتی گروہ سے رابطہ قائم کرنے جارہا تھا۔ حالات یہاں بھی خراب ہوسکتے تھے لیکن اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا' اس وقت شام ڈھل چکی تھی اور اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔

وہ ایک فوجی اسپتال کے سامنے سے گزرا۔ کئی جرمن فوجی گیٹ پر ڈیوٹی دے رہے تھے۔ کرسٹوفر نے نظریں چرا کر گزرنا چاہا لیکن وہ بھول گیا تھا کہ گستاپو کے کیپٹن کی وردی میں ہے۔ فوجیوں نے جرمن انداز میں سلوٹ کیا اور وہ سر ہلاتا ہوا گزر گیا۔ اس وقت دن ہوتا تو فوجی اس کی وردی کی پشت خون سے آلودہ دیکھ کر ضرور شبہے میں مبتلا ہوجاتے۔

کیفے والی سڑک میں داخل ہوکر وہ بے حد چوکنا ہوگیا۔ اس کی عقابی نظریں چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ایک کھلی چھت والی کار سڑک پر سے گزری۔ اس میں چار جرمن افسر براجمان تھے۔ انہوں نے کرسٹوفر کو دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ کرسٹوفر زبردستی مسکرایا اور آگے چلتا گیا۔ کار آگے جاچکی تھی۔

کیفے کے نزدیک پہنچ کر وہ سائیکل سے اترا۔ پیروں کا درد اسے چلنے نہیں دیتا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر چل رہا تھا عین اسی لمحے چار جرمن سپاہی سامنے سے آتے نظر آئے۔ اس کا دل کانپنے لگا لیکن وہ چلتا رہا۔ اس نے اپنی آنکھیں اوپر چڑھالی تھیں۔ چڑھی ہوئی آنکھیں' لڑکھڑاتی چال اور مسلی ہوئی وردی..... وہ پکا شرابی نظر آرہا تھا۔

ایک جرمن سپاہی نے ہاتھ اٹھایا اور جرمن انداز میں سلوٹ کر کے جرمن زبان میں نہ جانے کیا کچھ بکتا رہا۔ کرسٹوفر نے اسی انداز میں ہاتھ اٹھا کر ''ہیل ہٹلر'' کہا اور آگے بڑھ گیا۔ اب وہ کیفے کے دروازے پر تھا۔ اس نے ہینڈل پکڑا' دروازے پر جرمن فوج کا کوئی بورڈ لگا

ہوا تھا۔ شاید یہ کیفے آؤٹ آف باؤنڈ تھا۔ اس نے فوجیوں کونظر انداز کرکے ہینڈل گھمایا اور اندر داخل ہوگیا۔ گستاپو کے افسر تحقیقات کے لیے ہر جگہ جاسکتے تھے۔

یہ ایک چھوٹا سا کیفے تھا۔ چند میزیں اور کونے میں چھوٹا سا بار، یہی اس کی کل کائنات تھی۔ دیواروں پر چند تصویریں آویزاں تھیں۔ سب سے بڑی تصویر ہٹلر کی سرکاری فوٹوگراف تھی۔ کیفے میں صرف دو انسان تھے۔ ان دونوں کی نظریں اس پر مرکوز تھیں اور چہرے ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھے۔ لڑکی نوجوان اور خوب صورت تھی۔ اس کا دادا ساٹھ برس سے ہرگز زیادہ نہ تھا۔ وہ بے حد قوی الجثہ تھا۔

کرسٹوفر نے خاموشی توڑتے ہوئے فرانسیسی زبان میں لڑکی سے پوچھا۔

''کیا یہ تمہارے دادا ہیں؟''

''کیا یہ زیر حراست ہیں؟'' لڑکی کی آواز بے حد مترنم تھی۔

''لڑکی! سوال کا جواب سوال سے مت دو۔'' وہ کرخت لہجے میں بولا۔

''جی! یہ میرے دادا ہیں۔''

''تمہیں غداری کے الزام میں گولی ماری جاسکتی ہے۔ تم دونوں غدار ہو۔'' وہ خاموش ہوکر ان کے چہرے کے تاثرات دیکھتا رہا۔ دراصل وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کہیں ڈاکٹر فرٹے کی طرح یہ دونوں بھی تو جرمنوں سے نہیں مل گئے۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دادا نے نرم لہجے میں کہا۔

''جناب! آپ کو غلط اطلاعات ملی ہیں۔ کسی نے دشمنی میں ہمارے خلاف لگائی بجھائی کردی ہے۔''

کرسٹوفر نے کاؤنٹر کا سہارا لیا۔ بریِن گن اتار کر کاؤنٹر پر رکھی اور تھکے ہوئے انداز میں بولا۔

''میری بات غور سے سنو۔ میں انگریز ہوں۔ مجھے ہیری نے تمہارا پتا بتایا تھا۔ مجھے تم لوگوں کی مدد درکار ہے۔'' اس آخری مرحلے میں وہ بے حد کمزوری محسوس کررہا تھا۔ وہ دونوں بالکل خاموش کھڑے رہے۔

''دیکھو! مجھے شناختی الفاظ یا کوڈ ورڈز کا علم نہیں ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح تم لوگوں کو اپنی سچائی کا یقین دلاؤں لیکن میں انگریز ہوں اور تمہاری مدد کا طلب گار ہوں۔''

وہ بھلا اس کی بات پر اتنی آسانی سے کیسے یقین کرلیتے۔ کرسٹوفر چکرایا اور کاؤنٹر کا سہارا لے کر اس نے بمشکل خود کو گرنے سے بچایا۔ اس نے چکراتے ہوئے سر کو ہاتھوں میں تھام لیا۔ اب اس میں کھڑا رہنے کی سکت نہ تھی۔

بوڑھے اور لڑکی کی نظریں اس کے ہاتھوں پر جم گئیں۔ رفتہ رفتہ دونوں کے چہرے نرم پڑتے گئے۔ بالآخر لڑکی بولی۔

''دادا!''

''لڑکے! یہ کس کا کام تھا؟'' دادا نے پوچھا۔

''البرٹ لیپ نامی ایک سور کا!''

''ہاں! میں اسے جانتی ہوں۔ بے حد ظالم انسان ہے۔'' دادا اور لڑکی نے آنکھوں آنکھوں میں کچھ اشارے کیے۔ ''ہمیں تمہاری بات پر یقین آ گیا ہے۔'' لڑکی بولی۔ ''ہم تمہاری کیا مدد کرسکتے ہیں؟''

''مجھے طبی امداد، خوراک اور وائرلیس کی ضرورت ہے۔''

''اور چیزیں تو مل جائیں گی لیکن ہمارے پاس وائرلیس نہیں ہے۔''



لڑکی نے اس کے زخموں پر مرہم لگایا اور پیروں کی

انگلیوں میں یک بیک ٹھنڈک سی پڑ گئی۔ پھر جب وہ کرسٹوفر کے ہاتھوں کے ناخنوں پر پلاسٹر چڑھانے لگی تو اس کی چیخیں نکل گئیں۔ اس وقت وہ لوگ کیفے کے عقب میں ایک چھوٹے سے کمرے میں تھے۔

تھوڑی دیر بعد دادا کھانا لایا۔ ڈبل روٹی، بہت سارا گوشت اور گرما گرم کافی کا کپ۔ کرسٹوفر بدتمیزی سے کھانا نگلنے لگا۔ لڑکی اس پر بے ساختہ ہنس پڑی اور کرسٹوفر شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ وہ شرمندگی مٹانے کو بولا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ اتحادیوں کا حملہ ہونے والا ہے۔''

''ہر شخص کو معلوم ہے، اسی لیے تو آج ہم یہاں تنہا ہیں۔ ہمارے سارے ساتھی رات کو نارمنڈی میں تباہی پھیلانے کے لیے جا چکے ہیں۔ اس روز کے لیے ہم نے برسوں انتظار کیا ہے۔'' دادا نے جواب دیا۔ لڑکی اس کے پیروں کا مساج کر رہی تھی جو پھول کر کپا ہو چکے تھے۔ وہ ایک نرس کی سی مستعدی و فرض شناسی سے یہ کام کر رہی تھی۔

''میں ایک انتہائی ضروری پیغام لندن بھیجنا چاہتا ہوں۔''

''یہ ہمارے بس سے باہر ہے۔ ہمارے پاس وائرلیس نہیں ہے۔''

''تو پھر میرے لیے ایک کشتی کا بندوبست کر دو۔''

دادا قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ ''بے وقوف نوجوان! کیا تم ایک کشتی پر سمندر عبور کرو گے۔ تم سے قبل بھی تین چار آدمیوں نے یہ کوشش کی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکا۔''

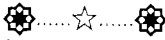
''جو بات میں جانتا ہوں اس کا علم انہیں نہیں ہوگا۔ ساحل سے چند میل کے فاصلے پر ایک برطانوی آبدوز ہر وقت موجود رہتی ہے۔ اگر مجھے کشتی مل جائے تو میں اس تک پہنچ جاؤں گا اور وہاں سے لندن...... دیکھو......! میرے پیغام پر جنگ کا دارومدار ہے۔'' اس نے سینہ فخر سے پھلایا اور مسکرا کر لڑکی کو دیکھا۔ وہ کرسٹوفر سے متاثر نظر آ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے، ہم تمہیں کشتی فراہم کر دیں گے۔''

''لیکن دادا ان کی حالت دیکھو، یہ کشتی میں کیسے سفر کریں گے۔'' لڑکی کی آواز میں محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

''لڑکی! یہ سفر بے حد ضروری ہے۔ تمہاری آزادی کے لیے۔ نازیوں کی شکست کے لیے۔ یاد رکھو! جنگ کے بعد بشرطِ زندگی تم سے ضرور ملاقات کروں گا۔''

دادا بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا اور لڑکی نے شرم سے سر جھکا لیا تھا۔



بحریہ کے دفتر میں پہنچنے والا پیغام بالکل مختصر تھا۔

''بے حد خفیہ، فوری اور ذاتی۔ صرف وزیراعظم کے لیے۔ رابن ٹیگر کو سلام کہتا ہے۔ تین گھنٹے میں ان کی خدمت میں حاضر ہو جائے گا۔''

اور تین گھنٹے بعد کرسٹوفر وار روم میں چرچل، آوَل اور ونی پوہ کو تمام تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔

انہوں نے جو ڈبل گیم کھیلا تھا وہ کامیاب رہا تھا۔ اب نارمنڈی کا میدان صاف تھا اور جرمن کیمپ میں ان کی آمد کے منتظر تھے، جرمن دھوکا کھا گئے تھے۔

اور یہ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کا اہم موڑ تھا۔



ماسی

خلیل جبار

حقیقی زندگی میں جنم لینے والے ڈرامہ کا ڈراپ سین۔
اس واقعہ کی روداد' جو روزانہ ہمارے اردگرد رونما ہوتے ہیں لیکن ہم اسے چسکے لے کر دیکھتے' پڑھتے ہیں اور پھر لاحول پڑھ کر فراموش کر دیتے ہیں۔
نئے افق کا ایک مستقل سلسلہ' حیدرآباد کے معروف کورٹ رپورٹر کی ڈائری کا ایک ورق۔

میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا سول کورٹ کی عمارت میں داخل ہوا تھا' ابھی ابھی مجھے ایک چپڑاسی نے بتایا تھا کہ سول کورٹ میں کسی دلہے کو گرفتار کر کے پیش کیا گیا ہے۔ میرے لیے یہ ایک دلچسپ خبر تھی' میں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ ضرور دلہا کو شادی کے موقع پر ہوائی فائرنگ کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہوگا۔ ان دنوں شادی کی تقریبات میں ہوائی فائرنگ کا سلسلہ بہت بڑھ گیا تھا' ان اندھی گولیوں میں اکثر کوئی نوجوان یا بچہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ کئی زخمی ہو جاتے ہیں پولیس کے سختی کرنے پر بھی شادی کی تقریبات میں ہوائی فائرنگ کرنے سے لوگ باز نہیں آتے۔

سول کورٹ میں دلہا کو دیکھ کر مجھے ایک حیرت کا جھٹکا لگا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ دلہا نوجوان ہوگا لیکن وہ ایک بوڑھا شخص تھا جس نے دلہے کا لباس پہنا ہوا تھا' اس کے ہاتھوں میں آہنی کڑیاں لگی ہوئی تھیں۔

''مجھے معلوم تھا کہ تم یہ خبر لینے ضرور آؤ گے۔ یہ خبر جتنی اچھی ہمارے اخبار کے لیے ہے اتنی ہی تمہارے اخبار کے لیے بھی ہے۔'' ایس ایم رضوی ایک کرسی سے اٹھتے ہوئے میرے نزدیک آئے' ان کے ساتھ نعیم قریشی بھی موجود تھے۔

''آج ہمارے ساتھ تم نے غداری کر دی' اکیلے ہی یہ خبر لینے آ گئے ہو۔'' میں نے کہا۔

''ارے بھئی ہم تمہارے ساتھ کیسے غداری کر سکتے ہیں ہم کینٹین میں بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے تھے جب تم نہیں آئے پھر ہم یہاں پہنچے ہیں کہ کہیں یہ خبر ہم سے بھی مس نہ ہو جائے۔'' ایس ایم رضوی نے وضاحت کی۔

''میرا انتظار کیا تھا پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دلہے میاں کا بیان ہو چکا ہے آؤ اس سے بات چیت کر لیں' کہیں ایسا نہ ہو پولیس اسے تھانے لے جائے۔'' نعیم قریشی نے کہا۔

''ہاں ہمیں اس کام میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔'' میں نے کہا۔

ہم جیسے ہی دلہا میاں کی طرف بڑھے ایک لمحے کے لیے وہ بُری طرح چونکا تھا مگر جیسے ہی اسے پتا چلا کہ ہم اخباری رپورٹر ہیں اس کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔

''تم لوگ میری یہ خبر اخبار میں ضرور شائع کرنا' میرے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوا ہے عین جس وقت میرا نکاح ہونا تھا مجھے جھوٹے مقدمے میں پھنسا دیا گیا ہے۔''

''ہمارا کام یہی ہے' بے فکر ہو جاؤ سب باتیں صاف صاف ہمیں بتا دو۔'' ایس ایم رضوی نے دلہا میاں کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

دلہا میاں کو ہمیں دیکھ کر اپنائیت کا احساس ہو رہا تھا



اس لیے وہ خوشی خوشی اپنی آپ بیتی سنانے کو تیار ہوگیا تھا۔

''میرا نام روشن دین ہے، میں دس سال قبل اریگیشن ڈیپارٹمنٹ سے ریٹائرڈ ہوا تھا۔ مجھے ریٹائرمنٹ پر جو رقم ملی تھی وہ میں نے بینک میں ماہانہ منافع کی بنیاد پر جمع کرادی تھی۔ بینک سے رقم پر مجھے ماہانہ منافع ملتا تھا اس میں میری اچھی گزر بسر ہورہی تھی۔ میری پہلی اور دوسری بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی، اتفاق سے ان دونوں کا ہی دو، دو سال کے وقفے سے قبل انتقال ہوگیا تھا۔ میرے دوست احباب نے بہت مشورہ دیا کہ میں تیسری شادی کرلوں شاید تیسری بیوی سے اولاد ہوجائے۔ میرے دل میں آئی کہ میں تیسری شادی کرلوں شاید اولاد کی نعمت مل جائے پھر یہ سوچ کر اس خیال کو مسترد کردیا کہ میری عمر ساٹھ سال سے اوپر ہوچکی ہے۔ میری بقیہ زندگی بونس پر چل رہی ہے، ایسے میں میری ہونے والی اولاد کو میں کس کے سہارے پر چھوڑ کر جاؤں گا۔ اس لیے میں نے اپنی دونوں بیویوں کی یاد کے سہارے جینے کا فیصلہ کرلیا تھا مگر انسان سوچتا کچھ ہے اور ہو کچھ جاتا ہے۔ ایک سال قبل میری ملاقات سرور نامی ایک شخص سے ہوئی، وہ موٹر سائیکل کے پارٹس کا سامان لاہور سے لاکر حیدرآباد کی دکانوں پر سپلائی کرتا ہے۔ اس سے ملاقات میرے دوست رفیق کی معرفت ہوئی تھی اس نے کچھ رقم سرور کو دی ہوئی تھی جس پر سرور معقول منافع ماہانہ دیتا تھا۔ میرے پاس بھی کچھ اضافی رقم موجود تھی میں نے بھی لالچ میں آکر اسے رقم ماہانہ منافع کی بنیاد پر دے دی اسے رقم دیتے ہوئے ایمانداری کی بات ہے میں ڈر رہا تھا کیونکہ اکثر سننے میں یہی آتا ہے کہ

لوگ ایک ماہ یا دو ماہ منافع پر دے کر لوگوں سے ٹھیک ٹھاک رقم جمع ہو جانے پر رفو چکر ہو جاتے ہیں مگر سرور نے میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی بلکہ ماہانہ منافع باقاعدگی سے دیتا رہا۔ اس کی ایمانداری پر میں بہت خوش تھا۔ سرور کی خواہش تھی کہ میں بینک میں لگا سرمایہ بھی اس کاروبار میں لگا دوں تاکہ مجھے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو جائے۔

سچی بات یہ تھی کہ میری ساری زندگی کی کمائی بس یہی تھی جو میں نے بینک میں جمع کی ہوئی تھی۔ اس رقم کے معاملے میں میں کسی بھی قسم کا کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس لیے بینک سے رقم نہیں نکلوائی' سرور ہر ماہ منافع دینے کے لیے خود میرے گھر پر آیا کرتا تھا۔ وہ مجھے اپنا کام کرتا دیکھ کر حیرت کرتا تھا۔ ایک دن سرور نے مجھے گھر کا کام کرتے دیکھ کر کہا۔

''روشن! یہ تمہاری عمر آرام کرنے کی ہے اور تم اس عمر میں کام کر رہے ہو؟''

''کیا کروں گھر میں میرے علاوہ کوئی اور نہیں ہے اس لیے اپنا کام خود ہی کر لیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تم گھر کے لیے ماسی کیوں نہیں رکھ لیتے۔''

''ماسی...... ارے بھئی گھر میں کام ہی کتنا ہے جو ماسی رکھ لوں جب تک جسم میں جان ہے میں اپنا کام خود کرتا رہوں گا۔'' میں نے کہا۔

''دیکھ روشن! کھانا پکانا' کپڑے برتن دھونے کا کام عورت پر ہی اچھا لگتا ہے اور پھر تمہاری آمدنی ہے کہ ایک ماسی رکھ سکتے ہو۔''

''ماسی بھی اس گھر میں کام کرتی ہے جہاں خواتین ہوں' میں بوڑھا آدمی ہوں میرے پاس کوئی بھی ماسی کام کرنے کو تیار نہ ہوگی۔''

''تم نوجوان تو ہو نہیں جو ماسی تمہارے گھر میں کام کرتے ہوئے ڈرے۔ کوئی بھی نوجوان ماسی تمہارے گھر میں کام کرنے کو تیار ہو جائے گی۔ اس طرح اس ماسی کا بھلا ہو جائے گا۔'' سرور نے کہا۔

''سچی بات یہ ہے کہ بوڑھا ہونا بھی ایک طرح سے بیماری ہے' انسان بڑھاپے میں اعصابی کمزوری کا شکار ہو جاتا ہے' چھوٹے اور معمولی کام بھی اسے پہاڑ معلوم ہوتے ہیں۔ یہی صورت حال میرے ساتھ بھی تھی' میں گھر کے کام کر لیتا تھا لیکن دل کام کرنے کو نہیں چاہتا تھا۔ میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ میرے گھر میں کوئی بھی ماسی میرے اکیلے رہنے کے سبب کام کے لیے نہیں آئے گی جب سرور نے مجھے یقین دلایا کہ میرے گھر میں ماسی کام کرنے آ جائے گی تب میری ہر کام کرتے ہوئے جان نکلنے لگی تھی۔ میری یہ کوشش ہوتی کہ کاش جلدی سے کوئی ماسی آ جائے تاکہ میری ان کاموں سے جان چھوٹ جائے۔ میں نے اپنے چاہنے والوں کو ماسی کے لیے کہہ دیا تھا مگر ماسی کا انتظام نہ ہو سکا۔ یہ کام بھی سرور نے ہی کر دیا وہ ثمینہ نامی عورت کو لے آیا' وہ بیوہ خاتون تھی اور مختلف گھروں میں کام کر کے اپنا پیٹ پال رہی تھی۔ اس کی عمر بھی کوئی زیادہ نہیں تھی' تقریباً تیس سال کے لگ بھگ تھی وہ کام میں بہت ہوشیار تھی۔ اس کے گھر میں آنے سے میں بالکل ہی بے کار ہو گیا۔ بے کار اس لیے کہ ہر کام وقت پر ہو جاتا تھا' میرے کام کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ ثمینہ صبح دو گھنٹے کے لیے آتی تھی پھر شام میں دو گھنٹے کے لیے آتی تھی۔ گھر میں اکیلے آدمی کا کام ہی کتنا تھا' مجھے ثمینہ کو دیکھ کر دکھ بھی ہوتا تھا کہ وہ بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی اس نے دیکھا ہی کیا تھا اس کے بچے بھی نہیں تھے کہ جس کے سہارے وہ جی لیتی کہ وہ بڑھاپے میں اس کا سہارا بنیں گے۔

ایک دن وہ شام میں میرے گھر آئی تو وہ بہت تھکی ہوئی تھی' میں نے از راہ ہمدردی اس سے پوچھ ہی لیا۔

''کیا بات ہے ثمینہ! آج تم بہت تھکی تھکی اور اداس دکھائی دے رہی ہو؟''

''کیا کریں صاحب ہماری قسمت میں یہ ہی لکھا ہے ا۔ جہاں کام کریں وہیں مالکان کی معمولی معمولی غلطی پر ڈانٹ سنیں۔'' ہمدردی کے دو بول سن کر ثمینہ کی آنکھیں بھرآ ئی تھیں۔

''پھر بھی پتا چلے کہ کیا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں عبدالشکور صاحب کے یہاں کام کرنے جاتی ہوں ان کے دو ہی بچے ہیں فراز اور کشف انہیں ویڈیو گیم کھیلنے کا بہت شوق ہے ہر وقت گیم کھیلنا ان کا مشغلہ ہے۔ میں نے انہیں ڈانٹ دیا کہ ہر وقت گیم کھیلنا اچھی بات نہیں ہے' کچھ اپنی تعلیم پر بھی توجہ دے لو۔ بس پھر کیا تھا انہوں نے اپنی ممی کو میری شکایت کردی' وہ غصے میں بھر کر آئیں اور مجھے کھری کھری سناڈالیں کہ میں دو ٹکے کی اوقات والی ان کے بچوں کو ڈانٹنے والی کون ہوتی ہوں۔''

''اس نے تمہیں دو ٹکے کی اوقات والی کہا؟'' مجھے غصہ آ گیا۔

''اس طرح کے خطابات سننا ہمارے لیے معمولی بات ہے صاحب!'' ثمینہ نے اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''تم کل سے ایسے بدتمیز لوگوں کے گھروں پر کام کرنے نہیں جاؤ گی۔'' میں نے کہا۔

''اگر میں کام کرنے نہیں جاؤں تو پھر کھاؤں گی کہاں سے؟''

''تمہیں مختلف گھروں سے جو رقم ملتی ہے وہ میں تمہیں دوں گا۔تم سارا دن اس گھر میں گزارنا۔''

''میں سارا دن یہاں کیا کروں گی' یہاں میرے لیے اتنا کام ہی نہیں ہے۔''

''کیا یہ ضروری ہے کہ تم سارا دن کام کرو؟''

''پھر......''

''جب کام سے تھک جاؤ' ٹی وی کے سامنے بیٹھنا اور ٹی وی پروگرام دیکھنا۔'' میں نے کہا۔

''محلے والے کیا کہیں گے کہ......''

''اچھی تنخواہ مجھ سے لوگی اور فکر تمہیں محلے والوں کی ہے کہ وہ کیا کہیں گے؟'' مجھے غصہ آ گیا۔

''نن...... نہیں...... مم...... میرا......''

''دیکھو ثمینہ! بات یہ ہے کہ ملازم جو ہوتا ہے وہ مالک کے ماتحت ہوتا ہے اسے وہی کام کرنا ہوتا ہے جو مالک کہے محلے والوں کو اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے کہ ملازم گھر میں کام کررہا ہے یا ٹی وی پروگرام دیکھ رہا ہے' میری بات سمجھ میں آ رہی ہے۔''

''جی...... جی ہاں......'' ثمینہ نے کہا۔

''دیکھو ثمینہ! میں ان مالکان میں سے نہیں ہوں جو مزدوروں کا خون چوس لیتے ہیں اور اجرت معمولی سی ادا کرتے ہیں۔''

میری بات پر وہ گردن ہلا رہی تھی جیسے سب باتیں اس کی سمجھ میں آ رہی ہیں۔ دوسرے دن سے ثمینہ صبح آنے لگی تھی اور شام گئے ہی اس کی واپسی ہوتی تھی اس کے دن بھر گھر میں رہنے سے میرے سونے گھر میں رونق ہوگئی تھی۔ وہ گھر جو ہر وقت سونا رہتا تھا وہ اچھا لگنے لگا تھا۔ ہم دونوں دن بھر ٹی وی پروگرام دیکھتے رہتے تھے اور ٹی وی پروگراموں پر تبصرے بھی کرتے جاتے تھے۔ ثمینہ مجھے ہنستی مسکراتی اچھی لگتی تھی ایک دن وہ ہنستے ہوئے مجھ سے کہنے لگی۔

''صاحب جی جب سے میں تمہارے گھر میں آئی ہوں اتنا کبھی زندگی میں نہیں ہنسی جتنا یہاں ہنستی ہوں۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''پنجاب کے دیہات میں بہت غربت ہے' گھر میں جب سے پیدا ہوئی تھی غربت ہی غربت دیکھی تھی۔ بوڑھے والدین نے غربت سے چھٹکارا دلانے کی خاطر میری شادی ایک بڑی عمر کے آدمی اللہ دین سے کردی۔ میں بہت چیخی چلائی مگر میری کسی نے کبھی نہیں سنی چند دن

ہی سکون کے گزرے تھے کہ اللہ دین کا انتقال ہوگیا۔ میرے شوہر کا انتقال کیا ہوا اس کے بھائیوں نے آنکھیں پھیر لیں' انہوں نے میرے شوہر کی جائیداد پر قبضہ کرلیا اور مجھے منحوس قرار دے کر والدین کے پاس بھیج دیا۔ میں پھر سے اس غربت کا شکار گھر میں آ گئی' میری واپسی میرے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوئی۔ گاؤں کے لوگوں میں میرے منحوس ہونے کی افواہ نے ایسا کام کیا جو نوجوان مجھے نظر بھر کر دیکھا کرتے تھے وہ مجھے راستے میں دیکھتے ہی نظریں جھکا کر چلنے لگے تھے۔ میں ان کے اس طرز عمل پر کٹ کر رہ جاتی لیکن کر کچھ نہیں سکتی تھی' گھر میں غربت نے اس طرح ڈیرے ڈال لیے تھے ہماری جان ہی نہیں چھوڑ رہے تھے۔ میں بھی والدین پر بوجھ بن گئی تھی' سرور ہمارے دور کا رشتہ دار ہے۔ وہ میرے والدین کو سبز باغ دکھا کر کام دلانے کے لیے یہاں لے آیا اور مجھے مختلف گھروں میں ماسی کا کام دلا دیا ہے۔ یہاں مختلف گھروں سے جو رقم ماہانہ ملتی ہے وہ میرے گھر والوں کے لیے ناکافی ہوتی ہے مگر وہ یہ سوچ کر سرور کو کچھ نہیں کہتے کہ کچھ نہ ہونے سے ہونا بہتر کے مصداق گھر والوں کو کچھ مل ہی رہا ہے ان کی جیب سے کچھ جا نہیں رہا ہے۔''

میں ثمینہ پر جو گزری تھی وہ سن کر آبدیدہ ہوگیا' ثمینہ کی آنکھوں میں جھلملاتے آنسو دیکھ کر میں نے ثمینہ کو دلاسا دیا۔

''صبر کرو ثمینہ! اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا' جب تک میں زندہ ہوں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' کوئی بھی مسئلہ ہو مجھے ضرور بتانا۔'' میری ہمدردی پا کر اس نے میرے کندھے سے اپنا سر لگا دیا میں اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھنا چاہتا تھا کہ میرا ہاتھ سر سے اتر کر اس کی کمر سے ہوتا ہوا اس کے کولہوں کو چھو گیا تھا۔ میں اسے اپنی بانہوں میں بھر کر حوصلہ دلانا چاہتا تھا مگر ایسا کرنے سے قاصر رہا۔ مجھے اس سے نا جانے کیوں اتنی ہمدردی ہوگئی تھی۔ وہ میری بیٹی کے برابر تھی اگر میں اسے گلے لگا کر دلاسا دے بھی دیتا تو کون سا جرم ہو جاتا۔ وہ جب تک میرے گھر رہتی تھی میری آنکھوں کو ٹھنڈک محسوس ہوتی تھی وہ جب چلی جاتی میں اداس ہو جاتا تھا۔ شاید مجھے اس سے محبت ہوگئی تھی لیکن میں اس محبت کو ابھی کوئی نام دینے سے قاصر تھا۔

ایک دن جب ثمینہ گھر آئی اس کی آنکھیں اشک بار تھیں میرے بار بار پوچھنے پر وہ بات کو گول کر رہی تھی جس پر مجھے سخت غصہ آ گیا اور میں چیخ پڑا۔

''ثمینہ! تم مجھے غیر سمجھتی ہو جبھی بات چھپا رہی ہو۔''

''یہ کیسی بات کر رہے ہیں یہاں آ کر مجھے جو اپنائیت ملی ہے اس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔''

''پھر کون سی بات ہے جو تم مجھے بتانے سے گریز کر رہی ہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''سرور مجھ سے گھر میں رہائش دینے کی عوض ہر ماہ ایک ہزار روپے لیتا ہے' امی سخت بیمار تھیں اس لیے میں دس ماہ سے سرور کو پیسے نہیں دے سکی ہوں۔ وہ صبح بہت شور کر رہا تھا کہ مجھے ہر حال میں دس ہزار روپے چاہئیں مگر اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی ہے' بس یہ بات ہے۔'' ثمینہ نے کہا۔

''اس لالچی انسان کو اتنا بھی احساس نہیں ہے کہ تم کس پریشانی سے گزر رہی ہو۔ ٹھیک ہے تم کام کرو میں کچھ سوچتا ہوں۔'' میں نے ثمینہ کو دلاسا دیا۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے یہی فیصلہ کیا کہ سرور کا منہ بند کرنے کے لیے دس ہزار روپے میں دے دوں۔ شام گئے جب وہ جانے لگی تو میں نے دس ہزار روپے کی رقم اس کے ہاتھ پر رکھ دی' اتنی رقم ہاتھوں میں دیکھ کر اس نے مجھے حیرت سے دیکھا۔

''یہ رقم سرور کے منہ پر دے مارنا تاکہ آئندہ وہ تم سے بدتمیزی نہ کر سکے۔'' میں نے کہا۔

''میں یہ رقم اتنی جلدی اتار نہ سکوں گی۔'' وہ بولی۔

''تم سے رقم کون کم بخت مانگ رہا ہے۔'' میں نے ملراتے ہوئے کہا۔

''صاحب جی تم بہت عظیم ہو۔'' وہ بولی۔

اس نے جیسے ہی اپنا سر میرے کندھے سے لگایا بے اختیار میں نے اسے اپنی بانہوں میں بھرلیا اس نے اشکبار آنکھوں سے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔

''اب تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے کوئی بھی مسئلہ ہو مجھے کہہ دینا۔'' میں نے کہا۔

ثمینہ خوش خوش میرے گھر سے چلی گئی اسے خوش دیکھ کر میرا چہرہ بھی خوشی سے کھل اٹھا اس کی خوشی میری خوشی میں پنہاں تھی۔

کئی دن گزر جانے پر پھر اس نے سرور کی کوئی شکایت نہیں کی، میں بھی مطمئن تھا کہ ثمینہ خوش ہے۔ ایک دن ثمینہ جب میرے گھر آئی وہ بہت خوف زدہ تھی، اسے پریشان دیکھ کر میں بھی پریشان ہوگیا۔

''ثمینہ کیا ہوا تم آج اتنی پریشان کیوں ہو؟''

''صاحب جی میرے والد کی چند دن قبل اچانک طبیعت خراب ہوگئی تھی، میری امی کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ ان کا علاج کرا سکے مجبوراً وہ میرے پاس آ گئیں کہ میں کہیں سے رقم کا بندوبست کروں۔ ایسے میں سرور امی سے بولا۔

''ارے خالہ میرے ہوتے ہوئے تم کیوں ثمینہ کو تکلیف دیتی ہو۔''

سرور نے اپنے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

وہ کتنا مکار اور مفاد پرست ہے بھلا مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے مگر میں چپ رہی، میں نہیں چاہتی تھی کہ میری ماں کو سرور کی جانب سے مجھ پر جو ظلم و ستم ہو رہا ہے پتا چلے۔ ظاہر ہے انہیں یہ جان کر تکلیف ہی ہوتی اور سرور بھی غصے میں آ کر اپنے گھر سے مجھے بے دخل کر دیتا۔ امی جان سرور سے دس ہزار روپے والد صاحب کی تیمارداری کے لیے لے کر چلی گئیں جب وہ امی جان کو دس ہزار روپے کی رقم دے رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک آ گئی تھی۔ اس خاص چمک کو دیکھ کر میں سہم سی گئی، میرا شک درست ہی ثابت ہوا کل رات جب میں یہاں سے گھر پہنچی سرور مجھے دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا اور قریب آیا اور بولا۔

''ثمینہ تیار رہنا تمہیں شاہد کے پاس ایک رات گزارنی ہے۔''

میں شاہد کا نام سن کر لرز کر رہ گئی شاہد ایک عیاش اور ٹھرکی قسم کا آدمی ہے۔ عورتوں پر جنسی تشدد کرنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ اس بنا پر اس کی بیوی بھی اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ سرور مجھے شاہد کے پاس دو تین بار پہلے بھی رات گزارنے کے لیے بھیج چکا ہے اس ہوس کے مارے نے ہر دفعہ مجھ پر اتنا جنسی تشدد کیا تھا کہ میرے زخم کئی دن تک بھرے نہیں تھے۔ مجھے سرور پر بے اختیار غصہ آ گیا۔

''سرور! تمہیں شرم آنی چاہیے تم ہمارے کیسے رشتہ دار ہو جو مجھے شاہد کے پاس بھیج رہے ہو۔''

''کیوں کیا خرابی ہے شاہد میں دوسروں سے ایک رات کا معاوضہ ڈبل دیتا ہے ایسا اچھا بندہ کہاں ملے گا؟''

''وہ اتنا ہی اچھا ہے تو پھر تم اپنی بیوی کو اس کے پاس کیوں نہیں بھیج دیتے۔'' میں نے غصے سے کہا۔

میری بات پر وہ چراغ پا ہوگیا اور میرے رخسار پر زوردار تھپڑ جڑ دیا میں تڑپ کر رہ گئی۔

''ذلیل کمینی...... میرے احسانوں کا یہ صلہ دے رہی ہے میری بیوی کے بارے میں ایسی گندی سوچ رکھتی ہے۔'' وہ بولا۔

''اور تم جو مجھے غیر مردوں کے پاس بھیجتے ہو جب تمہاری غیرت کہاں چلی جاتی ہے۔'' میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ میرے جواب سے سرور کو ایک جھٹکا ضرور

لگا تھا مگر وہ فوری سنبھل گیا۔

''میرے پاس کوئی قارون کا خزانہ نہیں ہے جو تیرے ماں باپ پر لٹاتا رہوں۔ کاروباری حالات ویسے ہی خراب چل رہے ہیں' میرا اپنا گزر بسر بڑی مشکل سے ہو رہا ہے۔ اگر تم شاہد کے پاس نہیں جانا چاہتی مت جاؤ' مجھے میرے پیسے لوٹا دو اور اپنے والدین کو خط لکھ دو کہ برائے مہربانی پیسوں کے لیے میرے گھر آنے کی زحمت نہ کریں۔'' وہ یہ کہتے ہوئے زیر لب مسکرایا۔

اس کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گئی وہ مجھے سوچتا ہوا چھوڑ کر چلا گیا۔ میری پوری رات آنکھوں میں کٹی' مجھے یہ سوچ سوچ کر خیال آ رہا ہے کہ میں اس وحشی درندے کے پاس پھر جاؤں گی۔ مجھے موت بھی نہیں آتی' اس طرح کی زندگی گزارتے میں تنگ آ چکی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے ثمینہ رو پڑی۔

''ثمینہ مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ سرور اتنی گری ہوئی حرکت بھی کر سکتا ہے۔ تمہاری مجبوری سے کس طرح فائدہ اٹھا رہا ہے' تمہیں ماسی بنا کر گھروں میں کام کے لیے بھی بھیجتا ہے اور تم سے عصمت فروشی کا کام بھی لے رہا ہے۔''

''سرور بہت ظالم انسان ہے' میں ہی نہیں کئی اور عورتوں سے بھی ماسی اور عصمت فروشی کا کام لیتا رہتا ہے۔ وہ مجبور لوگوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کا فن جانتا ہے۔''

''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا'' میں غصے میں آ گیا۔

''بتا کر بھی کیا کرتی' سرور سے تمہاری دوستی ہے میرے مقابلے میں اس کی بات کو سچ سمجھتے۔ یہاں زیادہ دن کام کرنے سے مجھ پر تمہارا اعتماد بحال ہوا ہے اس لیے میری بات پر یقین آ گیا ہے۔''

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو' اس وقت تم میرے لیے انجان تھیں' میں تمہاری سچ بات کو بھی جھوٹ ہی سمجھتا۔ ثمینہ! میں تمہارے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔''

''میرے نصیب ہی کھوٹے ہیں۔'' وہ بولی۔

''ایسی بات نہیں کرتے' تم میں یہ خرابی ہے بہت جلدی مایوس ہو جاتی ہو' میں کچھ سوچتا ہوں تم ایسا کرو گھر کے کام نمٹانے کے بعد میرے پاس آؤ۔'' میں نے کہا۔

ثمینہ کے کام میں مصروف ہو جانے پر میں گہری سوچ میں ڈوب گیا' وہ جوان تھی میں ایک بوڑھا آدمی میری اس سے انسانی ہمدردی کرنا یہ بے رحم معاشرہ اسے کچھ اور ہی رنگ دے دیتا۔ میں اسے اپنے گھر میں پناہ دے سکتا تھا اس کے بوڑھے والدین کی کفالت کی ذمہ داری بھی نبھا سکتا تھا مگر لوگ مجھ پر انگلیاں اٹھاتے اور ان افراد میں انگلی اٹھانے والوں میں سب سے پہلے سرور ہی ہوتا۔ میری سمجھ میں یہی بات آئی کہ سب سے پہلے سرور سے بات کی جائے' اسے سمجھایا جائے پھر بھی وہ باز نہ آئے پھر مجھے کوئی دوسرا قدم اٹھانا چاہیے۔

شام میں ہی میری ملاقات سرور سے ہو گئی' ملاقات ہونے پر جب میں نے سرور سے ثمینہ سے متعلق بات کی وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ اس کا اس طرح ہنسنا مجھے انتہائی ناگوار گزرا تھا مگر میں ثمینہ کی وجہ سے خاموشی اختیار کیے ہوئے تھا۔

''میرے بھولے بادشاہ! تم نا جانے کس دور میں جی رہے ہو' آج کل کاروباری حالات ایسے نہیں رہے' گھر کا چولہا چلانا مشکل ہو گیا ہے ایسے میں کسی کی مالی مدد کرنا ناممکن ہو گیا ہے' میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں۔ ثمینہ کے والدین ثمینہ کو سونے کی چڑیا سمجھے ہوئے ہیں' وہ آئے دن مختلف بہانوں سے میرے گھر آ کر کبھی پانچ ہزار' کبھی دس ہزار روپے لینے چلے آتے ہیں۔ ان سے پرانی رقم کا مطالبہ کرنے پر کہتے ہیں کہ ثمینہ کام کر کے اتار دے گی۔ اب تم خود ہی بتاؤ کہ ماسی کے کام میں اتنا پیسہ کہاں سے آئے گا جو ثمینہ اتارے گی۔''

سرور بات ٹھیک کر رہا تھا واقعی ثمینہ کی اتنی آمدنی نہیں

تھی کہ وہ والدین کا قرض اتنی جلدی اتار سکے۔ سرور کا کاروبار بھی اتنا اچھا نہیں رہا تھا ایسے میں وہ کہاں سے ثمینہ کے گھر والوں کو بھاری، بھاری رقم دے سکے اس لیے سرور نے ثمینہ سے یہ دھندہ شروع کرا دیا تھا۔

''سرور تم میرے دوست بھی ہو اور کاروباری پارٹنر بھی تم میری ایک بات مانو گے؟'' میں نے کہا۔

''ایک نہیں دس بات مانوں گا' تم حکم تو کرو۔'' سرور مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھنے لگا۔

''میں تمہیں حکم نہیں دے سکتا صرف التجا کر سکتا ہوں کہ ثمینہ کو تم اس کی مرضی کے خلاف کسی شخص کے پاس نہیں بھیجو گے۔''

''بس...... اتنی سی بات میں اسے اس کی مرضی کے خلاف ہرگز کہیں نہیں بھیجوں گا۔''

''تم سچ کہہ رہے ہو؟'' میں خوش ہوتے ہوئے بولا۔

''ہاں روشن دین بھائی میں ٹھیک کہہ رہا ہوں' تمہارا حکم سر آنکھوں پر۔ تم ایسا کرو کہ ثمینہ کو اپنے گھر پر رکھ لو اس طرح تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ میں اسے اس کی مرضی کے خلاف کہیں نہیں بھیج رہا ہوں۔'' سرور نے کہا۔

''لیکن لوگ کیا کہیں گے کہ میں نے ایک جوان عورت کو اپنے گھر پر رکھا ہوا ہے۔'' میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

''لوگوں کی پروا کرنا چھوڑ دو ان کا کام یہی ہے اور ویسے بھی تمہاری عمر اتنی ہے کہ کوئی بھی تم پر شک نہیں کرے گا۔ تمہاری شرافت کے چرچے پورے محلے میں ہیں' لوگ آنکھ بند کر کے تمہاری شرافت کی قسم کھا سکتے ہیں۔ یہ بات میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں۔''

''ہاں میں نے ساری زندگی نیک نامی ہی کمائی ہے۔'' میں اپنی تعریف سن کر خوش ہو گیا۔

میری بھی یہی خواہش تھی کہ ثمینہ میری نظروں سے دور نہ ہو اور میری یہ خواہش سرور پوری کر دینا چاہتا تھا۔ اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی تھی۔

''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ثمینہ کے والدین کے آئے دن رقم مانگنے کے مطالبے کیسے پورے کروں گا؟'' سرور سوچ میں پڑ گیا۔

''تم ثمینہ کے والدین کی فکر نہ کرو' وہ جب بھی رقم لینے آئیں مجھ سے لے کر اسے دے دینا۔'' میں نے آفر کی۔

''اس رقم کی واپسی کی کیا صورت ہو گی کہیں ایسا نہ ہو کہ اچانک تم مجھ سے رقم کا مطالبہ کر دو اور میں بیٹھے بٹھائے پریشانی میں نہ آ جاؤں۔''

''میرا تم سے یہ وعدہ ہے کہ جو رقم میں تمہیں دوں گا وہ ہرگز کبھی بھی نہیں مانگوں گا۔'' میں نے کہا۔ میری اس بات پر وہ خوش ہو گیا۔

''روشن دین! تم حقیقت میں انسان نہیں فرشتہ ہو حالانکہ میں نے ثمینہ کو تمہارے پاس اس لیے بھیجا تھا کہ جب دوسرے لوگ ثمینہ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں تو ایسے میں تم کیوں محروم رہو لیکن تم نے ثمینہ کی مجبوری سے بالکل بھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ وہ تمہاری غیر موجودگی میں میری بیگم سے تمہاری تعریفیں کرتے نہیں تھکتی ہے۔''

''سرور تم میرے کردار کے بارے میں اچھی طرح سے جانتے ہو میں ایسا انسان نہیں ہوں۔ میں انسانی ہمدردی کے تحت ثمینہ کی مالی مدد اس طرح کرنا چاہتا ہوں کہ اسے بُرا نہ لگے۔''

''روشن دین میں تمہارے جذبے کو سراہتا ہوں مجھے تم پر ہمیشہ فخر رہے گا۔''

میں خوشی خوشی گھر آ گیا' صبح جب ثمینہ گھر آئی اس کے چہرے سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

''ثمینہ آج سے تم اس گھر میں رہو گی' سرور سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں سرور نے رات ہی مجھے یہ خوش خبری سنا دی۔'' ثمینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اسے خوش دیکھ کر میرا جی خوش ہو گیا' میں ثمینہ کی خوشی

میں خوش تھا' جذبات سے بے قابو ہوکر میں نے ثمینہ کو اپنی بانہوں میں بھرلیا اور اس کے ماتھے پر شفقت بھرا بوسہ بھی لے لیا۔ اس نے کسی بھی قسم کی کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ بھی میری طرح میری خوشی میں خوش تھی۔

ثمینہ میرے گھر آ کر بہت خوش تھی اس کی ہر وقت یہی کوشش ہوتی تھی کہ میری خدمت کرتی رہے۔ مجھے بھی اسے اپنے پاس بٹھانا اچھا لگتا تھا۔ رات کو سونے سے پہلے روز بردستی میرے پاؤں ضرور دباتی تھی حالانکہ میں اسے منع بھی کرتا تھا کہ میری عادت خراب نہ کرو۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ جن بزرگوں کو پاؤں دبانے کی عادت ہوجائے وہ پھر اس کے عادی ہوجاتے ہیں جب تک ان کے پاؤں نہ دبائے جائیں انہیں سکون نہیں ملتا۔

ثمینہ بہت حسین تھی وہ میری عمر کے اس حصے میں میرے حواس پر چھا گئی تھی' دو منٹ کی دوری بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھی اور پھر وہ ہوگیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں بڑے مضبوط کردار کا مالک تھا مگر میرا مضبوط کردار ڈگمگا گیا۔ میں اپنی اس حرکت پر سخت شرمندہ ہوگیا مگر ثمینہ نے مجھے حوصلہ دیا اور سمجھایا کہ میں فرشتہ نہیں انسان ہوں اور انسان خطا کا پتلا ہے۔ مجھے آئندہ کوشش کرنی چاہیے کہ ایسی غلطی پھر سے نہ ہو۔ میں نے ثمینہ کو بھرپور یقین دلایا کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا مگر میں اپنی بات پر قائم نہیں رہ سکا اور وقفے وقفے سے وہ حرکت کرنے لگا تھا جو مجھے زیب نہیں دیتی تھی۔ ثمینہ کی طرف سے مزاحمت نہ ہونے پر میں عادی ہوگیا تھا۔ سرور کو بھی میری حرکات کا اندازہ ہوگیا تھا اس لیے مجھے سرور نے بلیک میل کرنا شروع کردیا۔

آئے دن ثمینہ کے والدین کے نام پر بھاری بھاری رقمیں لوٹنے لگا تھا' سرور کے بلیک میل کرنے پر میرے دیوالیہ ہونے میں کوئی کسر باقی نہ رہی۔ مجھے سرور کی بلیک میلنگ سے نکلنا تھا اور اس کا واحد حل یہی تھا کہ کسی طرح ثمینہ سے شادی کرلوں اور اس کے والدین کو اپنے پاس رکھ لوں۔ اس طرح سرور کو بھاری رقم دینے کا سلسلہ بھی رک جائے گا۔

میں نے جب ثمینہ کو اپنا فیصلہ سنایا وہ بھی خوش ہوگئی اور جب اس نے مجھے یہ بتایا کہ وہ حاملہ ہوچکی ہے۔ میری پریشانی میں اور اضافہ ہوگیا۔ اب مجھے اس مشکل اور کڑے وقت میں ثمینہ سے نکاح کرنا فوری طور پر ضروری ہوگیا تھا۔ میں نے اپنے چند دوستوں سے جب اس معاملے پر مشاورت کی انہوں نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا کہ میں فوری طور پر اس نیک کام کو کرنے میں تاخیر نہ کروں ورنہ میں بڑی مشکل میں پھنس جاؤں گا اور اس سے نکلنا مشکل ہوجائے گا۔ میں نے ثمینہ سے نکاح کرنے کے لیے اپنی مسجد کے پیش امام سے بات کرلی تھی مگر میرے اس منصوبے کی خبر نا جانے کیسے سرور کو ہوگئی وہ عین اس وقت جب میرا نکاح ہونے والا تھا۔ پولیس کو لے کر آگیا اس نے تھانے میں میرے خلاف رپورٹ لکھوادی تھی کہ میں ثمینہ کے ساتھ زیادتی کرتا رہا ہوں جس سے وہ حاملہ ہوگئی ہے۔ یہ سب اس نے انتقامی طور پر کیا ہے کیونکہ میرے ثمینہ سے نکاح کرلینے سے وہ اس رقم سے محروم ہوجائے گا جو وہ ثمینہ کے والدین کے نام سے بٹورتا رہا ہے۔

سرور کے بارے میں مجھے ثمینہ نے بتایا ہے کہ وہ نہ جانے کتنی معصوم لڑکیوں کو خرید کر گناہ کا کاروبار کراتا رہا ہے۔ پولیس نے میرے خلاف مقدمہ درج کرکے مجھے گرفتار کرلیا ہے مگر امید ہے کہ مجھے عدالت سے انصاف ضرور ملے گا کیونکہ ثمینہ عاقل و بالغ ہے۔ وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے جاسکتی ہے' دنیا کی کوئی طاقت اسے اس کی مرضی کے خلاف جانے سے نہیں روک سکتی۔''

''روشن دین تم خود اقرار کررہے ہو کہ ثمینہ نے تمہیں بتایا ہے کہ وہ حاملہ ہوچکی ہے' کیا یہ جرم نہیں ہے؟'' ایس

ایم رضوی نے پوچھا۔
''میں اس جرم کی تلافی ثمینہ سے نکاح کر کے پوری کر رہا ہوں اور یہ جرم ہوا بھی ہے تو دونوں کی مرضی شامل تھی۔ میں نے کوئی زبردستی یہ کام نہیں کیا ہے۔''
''تمہیں ثمینہ سے بھی اس کا موقف لینا چاہیے کہ وہ کیا کہتی ہے؟'' میں نے کہا۔
''ہاں ٹھیک ہے ہمیں اس سے بھی موقف لینا چاہیے۔'' نعیم قریشی نے کہا۔
ثمینہ کچھ فاصلے پر کھڑی تھی وہ ایک لمحے کو ہمیں دیکھ کر خوف زدہ ہوگئی تھی مگر جب اسے معلوم ہوا کہ ہم صحافی ہیں اور اس کا موقف لینا چاہتے ہیں تو اس کا خوف دور ہوا اور وہ ہم سے بات چیت کرنے پر تیار ہوئی' اس نے چادر سے اپنا آدھا چہرہ چھپاتے ہوئے بولی۔
''سرور نے روشن دین کے خلاف تھانے میں جو پرچہ کٹوایا ہے وہ سراسر جھوٹ ہے۔ مجھے کسی نے بھی نہیں ورغلایا' میں اپنی مرضی سے روشن دین کے گھر میں رہتی ہوں۔ یہ الزام بھی غلط ہے کہ روشن دین مجھے اپنے دوستوں کے پاس عصمت فروشی کے لیے بھیجتا رہا ہے۔ حقیقت صرف یہی ہے کہ میں اپنی مرضی سے روشن دین کے پاس رہتی ہوں۔ ہم سے انجانے میں جرم ہوا ہے اس کا یہی حل ہے کہ ہمارا نکاح ہوجائے۔ میں نے عدالت سے یہی استدعا کی ہے کہ میں عاقل و بالغ ہوں اور مجھے میری مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی اجازت دی جائے۔''
''بی بی روشن دین عمر میں تمہارے والد کے برابر ہے۔'' ایس ایم رضوی نے کہا۔
''ہاں وہ مجھ سے عمر میں بڑا ہے لیکن وہ مجھے تحفظ دینا چاہتا ہے' نوجوان مجھے منحوس سمجھ کر شادی نہیں کرتے۔ روشن دین کو میرے بارے میں سب علم ہے' اس کے باوجود وہ مجھے نا صرف اپنانے کو تیار ہے بلکہ میرے بوڑھے والدین کو اپنے پاس رکھ کر ان کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ میرے آنے والے بچے کو ولدیت میں اپنا نام دینا چاہتا ہے پھر مجھے اور کیا چاہیے۔''
''عدالت نے کیا حکم جاری کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''میرا بیان ابھی قلم بند ہوا ہے اور چند دن کے لیے دارالامان بھیجا جا رہا ہے' چند دن دارالامان رہنے پر میرا پھر بیان ہوگا اس کے بعد ہی عدالت سے حکم جاری ہوگا۔''
''عدالت لڑکی کو دارالامان اس لیے بھیجتی ہے کہ لڑکی نے اگر کسی دباؤ کے تحت کوئی بیان دیا ہے تو دارالامان میں چند دن رہ کر اس دباؤ سے نکل آئے اور درست بیان دینے کی پوزیشن میں آجائے۔ بی بی! تم فکر نہیں کرو' عدالت تمہارے ساتھ کسی بھی قسم کی زیادتی نہیں کرے گی۔'' نعیم قریشی نے کہا۔
''ہم تمہاری ایسی خبر شائع کریں گے کہ کوئی اور لڑکی سرور کے چکر میں نہیں پھنس سکے گی۔'' ایس ایم رضوی نے سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔
''اخبار کے لیے بڑی اچھی خبر مل گئی ہے۔'' میں نے کہا۔
''تم دیکھنا میرا اخبار اس خبر کو کتنا نمایاں کرے گا۔'' ایس ایم رضوی نے کہا۔
''ہاں شام کے اخبارات کے لیے یہ بڑی اچھی خبر ہے خاص کر بڑی عمر کے لوگ بڑے چسکے لے لے کر پڑھیں گے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ میری بات پر نعیم قریشی اور ایس ایم رضوی بھی ہنس پڑے۔



سمجھوتہ

سلیم اختر

محبت انسان کو مجبور کر دیتی ہے اور وہ ایسی غلطیاں کر جاتا ہے جس کا ازالہ وہ زندگی بھر نہیں کرسکتا۔
ایک عورت کا احوال' جو اپنی پہلی محبت میں ایک سنگین غلطی کر بیٹھی اور پھر اپنوں نے ہی اس سے منہ موڑ لیا۔
سلیم اختر کے قلم سے حقیقت بیان کرتی تحریر

محبت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا مگر یہ عبادتوں کی طرح پاک ہے' ہر محبت کرنے والے کو منزل ملنے کا یقین ہوتا ہے مگر منزل کب ملتی ہے۔ محبت کی راہیں تو بے حد کٹھن ہوتی ہیں۔ انسان راستوں کی بھول بھلیوں میں کھو جاتا ہے' مٹ جاتا ہے مگر منزل نہیں ملتی۔ محبت آناً فاناً ہی دل میں گھر کر لیا کرتی ہے۔ چپکے چپکے بارش کی نرم پھواروں کی طرح خوشگوار اثر ڈال دیتی ہے اس وقت دل کا آنگن کیا ہوتا ہے تو جب یہ محبت بارش بن کر برستی ہے تو آنگن کی کچی مٹی سوندھی سوندھی خوشبو دینے لگتی ہے۔

❁ ❁ ❁

وہ پہلی بار مجھے لودھی کلینک میں ملا تھا جہاں میں والدہ کی دوائی لینے آئی تھی۔ مریضوں کا رش ہونے کی وجہ سے لودھی کلینک میں ٹوکن لینا پڑتا ہے' میرے بعد غالباً اس کی باری تھی پہلی نظر میں ہی وہ مجھے اچھا لگا تھا۔ یونانی دیوتاؤں جیسا اس کا رنگ و روپ میرے دل میں بس گیا تھا۔ سلگتا ہوا چہرہ' بھرے بھرے بازو' چوڑا چکلا سینہ...... میدے کے پیڑے میں گلاب کی سرخی ملا رنگ اور خوابوں کے شہزادے جیسا نکلتا ہوا قد' سپنوں کی تعبیر کی صورت میں آنکھوں کے راستے میرے دل میں اتر گیا اور دل کے سارے دروازے خود بخود سوچے سمجھے بغیر آہٹ کے کھل گئے تھے' میری نظروں کی پیاس کا احساس اسے بھی ہوا ہوگا۔

❁ ❁ ❁

امی کو شوگر اور بلڈ پریشر کا عارضہ تھا' ڈاکٹر لودھی کی دوا سے یہ دونوں بیماریاں کنٹرول میں رہتی تھیں میں نے ان کا نسخہ لے کر ان کی دوا Repeat کرانے آئی تھی۔ میں دوا لے کر کلینک سے نکل آئی' میں کمیٹی چوک کے اسٹاپ پر کھڑی ہو کر سات نمبر کی ویگن کا انتظار کر رہی تھی کہ میں نے اسے پھر دیکھا وہ میری جانب ہی آ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آیا اور میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تو میں ساکت دم بخود حیران اور پریشان سی ہو گئی وہ آہستہ سے بولا۔

''میڈم آپ اپنا نسخہ کلینک پر بھول آئی تھیں۔''
اس کے ہاتھ میں امی کا نسخہ تھا میں نے اس سے لے لیا اور پھر کہا۔

''بہت بہت شکریہ۔'' نہ جانے میں نے یہ الفاظ کتنی مشکل سے ادا کیے تھے۔

''صرف شکریہ سے تو کام نہیں بنے گا' ٹریٹ دینی پڑے گی آپ کو۔'' اس نے بڑے ہی شوخ انداز میں کہا تھا میں تو جیسے مر ہی گئی تھی۔

''آپ ٹیچر ہیں ناں' میں نے آپ کی باتوں سے اندازہ لگا لیا تھا' اچھا آپ اپنے اسکول کا یا اپنا ذاتی نمبر دے دیں' میں خود ہی آپ سے ٹریٹ لے لوں گا۔''

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر اسے ٹیلی فون نمبر دیتے ہوئے کہا۔

''ساڑھے گیارہ اور بارہ کے درمیان فون کیجیے گا اس وقت بریک ہوتی ہے۔ میرا نام شیریں ہے۔'' میں نے جھجک کر نہ چاہتے ہوئے بھی کہہ دیا کہ یہ میرا دل کہہ رہا تھا' نہ جانے کیوں جی چاہ رہا تھا اس سے بات کرنے کو' اس سے واسطہ رکھنے کو اس میں کچھ کشش ہی ایسی تھی' جان لیوا مار دینے والی...... وہ مسکراتا ہوا ایک بھرپور نظر مجھ پر ڈال کر مخالف سمت میں چلا گیا۔



میرے لیے وہ دن مبارک تھا' میں تمام دن اسی کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس میں ایک کشش تھی بے بس کر دینے والی' میں نے اسے بھلانا چاہا مگر وہ بار بار میرے ذہن کے پردے پر نمودار ہو جاتا' اپنی انگارہ جیسی آنکھوں اور سلگتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ' وہ رات میں اسی کے بارے میں سوچتے سوچتے سوئی تھی۔

اگلے روز اسکول پہنچ کر بھی میں اس کے سراپے سے پیچھا نہ چھڑا سکی' جب بریک ٹائم ہوا تو میرے نمبر پر ایک کال آئی' نیا نمبر تھا مجھے یقین تھا یہ اسی کی کال ہوگی' میں نے اٹینڈ کر لی۔

''میں تابش بات کر رہا ہوں' وہی ٹریٹ والا میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟'' وہ بھاری آواز میں بولا۔

''نن...... نہیں...... بالکل نہیں۔'' میں نے

جلدی سے جواب دیا۔
''تو پھر کیا فیصلہ کیا ہے آپ نے؟'' اس نے پوچھا۔
''کا ہے کا فیصلہ؟'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔
''ارے بھول گئیں شیریں جی! بڑی بے وفا ہیں آپ۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔
''میں سمجھی نہیں۔'' میں نے کہا۔
''آپ نے ٹریٹ دینی ہے یاد ہے نا؟'' وہ بولا۔
''ضرور دوں گی۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
''نہیں دے سکیں گی آپ۔'' وہ بولا۔
''آپ مانگیں تو سہی۔'' میں نے جواب دیا۔
''اچھا وقت آئے گا تو ٹریٹ مانگ لوں گا' پھر انکار مت کر دینا۔'' اس نے شوخی سے کہا۔
''اب تو میں آپ کو ٹریٹ دے کر ہی رہوں گی۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔
''اچھا' آپ کے اسکول کا نام کیا ہے اور کہاں پر ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''سینٹ پیٹرک ہائی اسکول' مال روڈ پر ہے۔''
''ہاں ہاں سمجھ گیا' وہاں سے میرا گزر ہوتا رہتا ہے۔'' اس نے کہا۔
پھر اس نے بتایا کہ وہ ایک ایڈورٹائزمنٹ کا ادارہ چلا رہا ہے اور ڈی ایچ اے میں رہتا ہے اور اس وقت وہ دفتر سے بات کر رہا ہے۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں اور اس نے فون بند کر دیا۔
میں پہلے تو بہت گھبرائی تھی مگر اب اس سے بات کرنے کے بعد خوش تھی' وہ مجھے اچھا لگا تھا اس کی ہر ادا مجھے بھا گئی تھی۔ وہ دھیرے سے چپکے سے میرے دل میں پناہ گزین ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا' میں بھی اسے اچھی ہی لگی ہوں گی تبھی تو اس نے کال کی ہے۔ عین اسی وقت پر جو میں نے اسے بتایا تھا میں من ہی من میں مسکرانے اور گنگنانے لگی۔ میری زندگی میں شاید پہلی بار بہار آئی تھی' میرے من میں پہلی بار پھول کھلے تھے۔ خوشبوؤں کی لہریں میرے انگ انگ میں سما گئیں' یہ محبت کا اعجاز تھا۔ وہ محبت جو ہوا بن کر جہاں سے بھی گزرتی ہے' وہاں سرمستی کا احساس پیدا کر دیتی ہے۔ ایک خوشبو آن کی آن میں پھیل جاتی ہے' شاید یہ وہی خوشبو تھی جو میرے گالوں پہ حیا کی سرخی بن کر اور آنکھوں میں نشہ بن کر ساری دنیا میں اعلان کر رہی تھی۔ اس خوشبو نے مجھے یہ بتا دیا تھا کہ وہ میری آنکھوں میں سرخ ڈورے بن کر ابھری ہے اور تابش کے سر کا تاج بن گئی ہے۔



ابا جان ایک سرکاری ادارے میں گریڈ سولہ کے ملازم تھے۔ ہم تین بہن بھائی تھے' سب سے بڑی باجی صفیہ' پھر بھائی نعمان اور سب سے چھوٹی میں۔ بھائی سب گھر والوں کا لاڈلہ تھا ابو اس کی ہر خواہش پوری کرتے تھے۔ گھر میں خوشحالی تھی' کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ ضرورت کی ہر چیز گھر میں موجود تھی۔
ابو کی ریٹائرمنٹ سے قبل باجی صفیہ کی شادی برادری میں ہوئی تھی مگر ان کی شوہر سے اور شوہر کی ان سے نہ بن سکی اور وہ طلاق لے کر ماں باپ کی دہلیز پر آ گئیں۔ انہوں نے دوسری شادی نہ کرنے کی قسم کھالی حالانکہ امی ابو نے بہت کوشش کی تھی کہ وہ اپنے گھر کی ہو جائیں تو اسی میں ان کی بہتری اور عزت ہے مگر وہ نہ مانیں مجبوراً سب کو خاموش ہونا پڑا۔ کچھ ہی عرصہ بعد ابو کی ریٹائرمنٹ ہو گئی انہیں محکمہ کی طرف سے حساب کتاب ملا تو بھائی نعمان نے فارن جانے کی ضد پکڑ لی۔ اس کے کافی دوست یورپ جا کر سیٹ

ہوگئے تھے اس لیے وہ دولت مند بننے کے لیے یورپ جانا چاہتا تھا۔

ابو نے اسے بہت سمجھایا کہ وہ نہ جائے وہ اسے اپنے ہی محکمہ میں ملازمت دلا دیں گے مگر بھائی کسی صورت نہ مانا تو ابا نے رضا مندی ظاہر کردی۔ بھائی کچھ ماہ بعد وزٹ ویزا لے کر روانہ ہوا تھا اس کی روانگی تک ابا جان کو ملی ہوئی رقم میں سے ساٹھ فی صد خرچ ہوگیا تھا۔ بھائی اسلام آباد سے ترکی روانہ ہوا تھا' ترکی کے شہر استنبول پہنچ کر اس نے فون کیا تھا کہ اب وہ یہاں سے بذریعہ سڑک یورپ جائے گا اس کے ہمراہ دو دوست بھی تھے پھر دو ماہ گزر گئے اس دوران نعمان کا کوئی فون نہیں آیا تھا۔ دو ماہ بعد اس نے مزید رقم طلب کی تھی اور بتایا تھا کہ وہ اس وقت لیبیا میں ہے اور اب یہاں کشتی کے ذریعے اٹلی جائے گا۔ ابا جان نے اسے مزید رقم بھجوادی تھی اس کے بعد آج تک ہمارا رابطہ نعمان سے نہیں ہوا کہ وہ کہاں ہے' زندہ ہے یا نہیں...... محلّے کے لوگ بتاتے ہیں کہ لیبیا سے اٹلی جاتے ہوئے کئی کشتیاں سمندر میں غرق ہوجاتی ہیں۔

نعمان کو گئے پانچ سال کا عرصہ گزر گیا ہے' اس عرصہ میں ابا جان بیٹے کی جدائی کے غم کو سینے سے لگائے اگلے جہاں سدھار گئے تھے۔ ان کے مرنے کے بعد زندگی تھم سی گئی تھی امی اس غم سے نڈھال ہوگئیں اور انہیں کئی بیماریوں نے گھیر لیا' انہیں شوگر اور بلڈ پریشر کے علاوہ بھی کئی بیماریاں چمٹ گئی ہیں۔ بیٹے کی جدائی میں رو رو کر ان کی بینائی بھی کمزور ہوگئی ہے۔ اس عرصہ میں میں نے ہمت نہیں ہاری۔ میں نے بی اے کرنے کے بعد بی ایڈ کرلیا اور پھر سینٹ پیٹرک اسکول میں ملازمت بھی مل گئی۔ وہاں میری دو کلاس فیلو پڑھاتی تھیں' ابو کے مرنے اور سوگ کے ابتدائی دنوں کے بعد زندگی معمول پر تو آ گئی تھی مگر لوگ بدل گئے تھے یا نہیں' ہم لوگوں کو ایسا ہی محسوس ہوا تھا کیونکہ اس سے پہلے تو ہم نے ایسا سوچا ہی نہیں تھا۔

یہ شکر تھا کہ سر چھپانے کو اپنا گھر تھا اور میں بھی کمانے لگی تھی' مجھے کماتا اور گھر والوں کو کھاتا پیتا دیکھ کر میرے لیے کچھ رشتے آئے مگر میں نے انکار کردیا۔ ابو کی موت کے غم کے ساتھ بھائی نعمان کا غم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہونے لگا مگر امی نے ان غموں کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ باجی صفیہ نے گھر سنبھالا ہوا تھا اور میری غیر موجودگی میں وہ امی کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ ان ہی کی وجہ سے میں آرام سے سروس کررہی تھی' مجھے اتنی تنخواہ مل جاتی تھی کہ گھر کی گزر بسر بہتر انداز میں ہورہی تھی اور کچھ بچت بھی ہورہی تھی۔

ان حالات میں تابش تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح میری زندگی میں آیا اور میری زندگی میں ہلچل سی مچ گیا۔ میں اگلے دن بھی اس کے فون کا انتظار کرتی رہی تھی مگر اس کا فون نہیں آیا' میں منتظر ہی رہی اور پریشان بھی۔ طرح طرح کے خیالات دل ودماغ میں آنے لگے' گھر آ کر بھی دل نہ لگا۔ تھوڑا سا کھانا کھا کر میں اپنے کمرے میں جاکر لیٹ گئی۔ بے قراری حد سے بڑھی تو میرے آنسو نکل آئے۔

''کہاں ہو تابش؟ فون کیوں نہیں کیا؟ ٹریٹ تو لے لیتے۔''

میرے پاس اس کا پتا اور فون نمبر بھی نہ تھا پھر نہ جانے کس نے کہا تھا شاید دل نے کہ......

''شیریں! تم بھی کتنی بے وقوف ہو' کیوں سائے کے پیچھے بھاگ رہی ہو؟ کیوں ایک

سائے سے دل لگا رہی ہو؟ کلینک کی شناسائی' سڑک کی ایک ملاقات اور ایک ٹیلی فون کال...... اس طرح تھوڑی ہوتا ہے۔ زندگی ایسے تھوڑی بیتتی ہے' میں سوچتی رہی' روتی رہی' الجھتی رہی اور بگڑتی رہی مگر اس یونانی دیوتا کی آنکھیں بار بار میری نظروں کے سامنے رقص کرتی رہیں وہ میرا تعاقب کرتی رہیں۔'' باجی صفیہ نے مجھے بے چین سا دیکھا تو پوچھ بیٹھیں۔

''شیریں! خیریت تو ہے تم کبھی اس قدر بے چین نہیں ہوئی ہو؟'' میں صفیہ باجی سے کچھ نہ چھپا سکی اور ان کو سب کچھ بتا دیا' یوں میرے دل کا بوجھ اتر گیا تھا۔

''مگر شیریں! یہ تو بڑی بے وقوفی کی بات ہے' نہ جانے وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا تھا؟ ایسا نہیں ہوتا ہے۔ اس طرح کسی پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے پھر تم اس کو تو جانتی بھی نہیں ہو۔'' باجی نے صاف بات کر دی۔ میں ان کی بات سمجھ گئی' مگر میں سمجھ کر بھی نہیں سمجھی تھی یا شاید میں سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے میں اگلے دن پھر اس کے فون کا انتظار کرنے لگی مگر بریک ٹائم میں بھی اس کا فون نہ آیا تو میں بہت ہی بے چین اور بے تاب ہوگئی حتیٰ کہ چھٹی کا ٹائم ہوگیا۔

میں اسکول سے باہر نکلی اور سڑک کے کنارے بس اسٹاپ کی طرف جانے کے لیے چلنے لگی۔ ابھی تھوڑا ہی چلی تھی کہ ایک گولڈن رنگ کی کار میرے قریب آ کر رک گئی۔ تابش نے گاڑی سے سر باہر نکالا اور بولا۔

''ٹریٹ دینے کو تیار ہیں میڈم جی!'' میں ٹھٹک کر رہ گئی' جیسے ایک بھونچال سا آ گیا ہو۔ میرے جواب دینے سے پہلے ہی اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور کہا۔

''آئیں بیٹھیں آپ ٹریٹ تو دیں گی نہیں' چلیے میں ہی ٹریٹ دے دیتا ہوں۔'' میں کچھ سوچے بغیر بے ساختہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ مجھے صدر کے کے ایف سی میں لے گیا۔ ہم دونوں وہاں دو گھنٹے تک بیٹھے رہے تھے' میں مسحور سی ہو کر اس کو دیکھتی رہی جیسے وہ صرف میرے لیے بنایا گیا ہے۔ ہم نے ڈھیروں باتیں کیں' ادھر اُدھر کی پھر اس نے مجھے میرے گھر کے اسٹاپ پر چھوڑ دیا۔ میں نے باجی کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ آج دیر ہو جائے گی۔ میں نے گھر پہنچ کر باجی سے کچھ نہ چھپایا تھا اور انہیں بتا دیا کہ آج میری تابش سے ملاقات ہوئی تھی' میں نے باجی سے کہہ دیا کہ وہ بہت ہی اچھا ہے اور میں اس کی چاہت میں گرفتار ہوگئی ہوں۔ باجی نے میری حوصلہ افزائی نہ کی اور کہنے لگیں۔

''تم جذباتی باتیں مت کرو۔ یہ معاملہ اتنا آسان نہیں ہے' ابھی تک تم اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی ہو۔ اس کا خاندان کیسا ہے' اس کا کام کیسا ہے؟ صرف گاڑی رکھنے سے انسان امیر نہیں ہو جاتا۔ شیریں میری لاڈلی بہن! ہوشیار رہنا' زمانہ بہت ہی چالباز ہے۔''

''زمانہ خراب ہوگا مگر تابش خراب نہیں ہوسکتا۔'' میں ہنس دی اور کہا۔

اگلے دن پھر اس کا فون آیا تھا' وہی شوخ آواز بھری بھری' پُراسراری' ہم دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔

ہماری اگلی ملاقات بھی کے ایف سی میں ہی ہوئی تھی' ہم دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ اس نے اپنے گھر' ماں اور بہن بھائیوں کے بارے میں بتایا تھا کہ ان سب کی شادیاں ہوچکی ہیں اور

وہ اپنے اپنے گھروں میں رہتی ہیں اور اب اس کی ماں اس کی شادی کرنا چاہتی ہیں۔ وہ کسی حسین لڑکی کی تلاش میں ہیں، مگر اب ان کو لڑکی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا۔

اس کی یہ بات سن کر میں نہال ہوگئی، میں وہ احساسات یہاں بیان نہیں کرسکتی۔ وہ جذبات سامنے نہیں لاسکتی، خوشی کا ایک احساس، ایک ہلکے پن کا تصور، ایک ایسا حسین خواب جو کبھی ختم نہ ہو۔ اس نے میرے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر آہستہ سے دبایا تھا۔ میں نے گھر پہنچ کر باجی کو بتایا تو وہ خوش تو ہوئیں مگر وہ کہنے لگیں۔

''ہمارے ہاں ایسا تو نہیں ہوتا ہے تم اس کو کہو کہ اپنی ماں کو ہمارے گھر بھیجے اور یہ گھر سے باہر ہوٹلوں اور پارکوں میں ملنے کا سلسلہ ختم کرو۔ میں یہ اچھا نہیں سمجھتی، امی کو پتا چلا تو وہ بھی ناراض ہوں گی، اسے ضروری ملنا ہے تو اسے اپنے گھر بلالو۔''

میں باجی کی باتوں پر مسکرا کر رہ گئی، وہ کہتی تو ٹھیک تھیں مگر انہیں کیا معلوم کہ یہ محبت کیا ہوتی ہے۔ انہوں نے تو کسی سے محبت کی ہی نہیں تھی، مجھے ان کی باتیں تلخ بھی لگی تھیں پھر بھی میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں تابش کو کہوں گی کہ وہ اپنے والدین کو ہمارے گھر بھیجے۔

❀......❀......❀

اگلی ملاقات بھی گھر سے باہر ہوئی تھی اور میں نے اسے بھرپور نظروں سے اپنے من میں سماتے ہوئے کہا۔

''تابش! تم نے اپنی امی سے بات کی، اس طرح ملنے سے بہتر ہے کہ ہم شادی کرلیں۔ میں اب تمہارے بنا نہیں رہ سکتی۔ میں اب تمہارا ساتھ چاہتی ہوں، تمہاری زندگی میں شامل ہونا چاہتی ہوں۔''

''شیریں! بڑا مسئلہ ہے، ہمارے خاندان میں شادی صرف برادری میں ہوتی ہے۔ میں نے تمہارے کہے بغیر ہی امی سے بات کی تھی مگر وہ کہتی ہیں کہ میں جان دے دوں گی مگر تمہاری شادی برادری سے باہر نہ ہونے دوں گی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں اس مسئلہ کو کیسے حل کروں؟''

''میں نے اپنی باجی سے تمہارا ذکر کیا ہے، امی سے بعد میں کروں گی۔ باجی انہیں منالیں گی، باجی کہتی ہیں اگر تمہاری مرضی یہی ہے تو میں راضی ہوں۔'' میں نے بتایا میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کروں۔ اب کیا ہوگا تابش؟'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''میں پھر کوشش کرتا ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''دوبارہ امی سے بات کرتا ہوں ان کو راضی کرنے کی کوشش کروں گا ورنہ مجھ میں ہمت ہے کہ دنیا سے بغاوت کرلوں۔''

میں نے باجی کو تابش کے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ کہنے لگیں۔

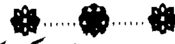
''نہیں شیریں! یہ بہتر نہیں ہوگا، اس کے گھر والوں کو ہمارے گھر آنا ہی ہوگا۔ مجھے اس شخص پر شک سا ہونے لگا ہے۔''

ایک روز میں اصرار کرکے تابش کو اپنی باجی اور ماں سے ملانے کے لیے اپنے گھر لے ہی آئی، کھانا اس نے ہمارے ساتھ ہی کھایا تھا اور ڈھیروں باتیں بھی کی تھیں۔ اس نے بتایا کہ اس کی ماں نہیں مان رہی اور اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم لوگ عدالت میں جاکر شادی کرلیں۔

مگر میری امی اور بہن نے ایسا کرنے سے انکار کردیا اور اس پر واضح کردیا کہ جب تک اس

کے گھر والے باقاعدہ طور پر شیریں کا رشتہ مانگنے نہیں آئیں گے یہ شادی نہیں ہوگی۔ بغیر کسی نتیجے کے تابش چلا گیا' باجی اور امی کو تابش اچھا لگا تھا کہ وہ میرے لیے اچھا شوہر ثابت ہوگا مگر انہیں اس پر شک بھی ہوگیا کہ وہ سچا آدمی نہیں ہے کوئی بیٹا اپنی ماں کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کرتا۔

میں پریشان ہوگئی' میں نے وہ رات سوچ سوچ کر اور جاگ جاگ کر گزاری۔ تابش میرے حواس پر آسیب کی طرح چھا گیا تھا۔ اس نے مجھے فتح کرلیا تھا اور اب میں اس کی باندی بننے کو تیار تھی۔ میں کئی لوگوں کو پسند تھی جو مجھے چاہتے تھے مگر تابش نے مجھے دیوانی بنادیا تھا۔ میں اسے دل و جان سے چاہتی تھی' میں اپنی قسمت پر ناز کرتی تھی کہ مجھے ایسا چاہنے والا ملا ہے جو لاکھوں میں ایک ہے۔ مردانہ حسن و جمال کا نادر نمونہ ہے' میں بھی تو کم نہ تھی وہ میرے لافانی حسن کی تعریفیں کرتا تو میں مسحور ہوجاتی۔ ایک نشہ سا میرے رگ و پے پر طاری ہوجاتا۔ عورت کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ اسے چاہا جائے' اسے سراہا جائے اور مرد نے ہمیشہ ہی اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا ہے۔ کبھی خلوص اور سچائی کی روشنی میں رہ کر اور کبھی مکاری اور ریاکاری کے اندھیرے میں چھپ کر۔ عورت اتنی بھولی ہے کہ وہ اس سراب کو جانتی ہے' پہچانتی ہے مگر پھر بھی اس کے دھوکے میں آجاتی ہے۔



میں نے کئی بار اس کا دفتر دیکھنے کی خواہش کی مگر وہ مجھے دفتر نہ لے کر گیا۔ وہ کہتا تھا کہ میں اسٹاف کی نظروں میں تمہیں نہیں لانا چاہتا تھا اس نے بتایا تھا کہ اس کے دفتر میں چار افراد کام کرتے ہیں جن میں ایک لڑکی بھی ہے۔ مگر میرا اصرار جاری رہا پھر ایک روز چھٹی والے دن وہ مجھے اپنے دفتر لے گیا۔ بڑا شاندار دفتر تھا اس کا' تین کمروں کے علاوہ دو باتھ' ایک کچن اور ایک ریسٹ روم تھا جہاں بیڈ وغیرہ بھی لگا ہوا تھا اس نے خود ہی چائے بنائی اور ہم ریسٹ روم میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ وقت گزرتے گزرتے وہ حد سے ہی گزر گیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی ہم دونوں وہ سب کچھ کر گزرے جو ہمیں شادی سے پہلے نہیں کرنا چاہیے تھا اس میں تابش کا تصور اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا کہ وہ مجھے چھٹی والے دن اکیلے اپنے دفتر میں لے آیا تھا' کچھ تصور میرا بھی تھا میں خود بھی تو اسے بہت چاہتی تھی میری سپردگی میں میری مرضی بھی شامل تھی۔

''تابش...... اب ہمیں فوراً شادی کرنی ہوگی۔'' وہ کچھ دیکھتے ہوئے مسکرایا اور بولا۔

''ہاں اب ہمیں جلد از جلد ایک ہونا ہے' میں ماں جی سے بات کرتا ہوں اگر وہ نہ مانیں تو ہم کورٹ میرج کرلیں گے۔''

تابش نے مجھے ڈھیروں تسلیاں دیں تو میں مطمئن ہوگئی' وہ مجھے میرے گھر کے قریب ڈراپ کرکے چلا گیا اور میں گھر آگئی مگر نہ جانے کیوں مجھے چین نہ آیا تھا۔ میں بہت ہی پریشان ہوگئی کہ اب کیا ہوگا۔ تابش مجھ سے شادی کرے گا تب ہی میں محفوظ رہوں گی۔ میں نے ابھی تک باجی صفیہ کو یہ پریشانی نہیں بتائی اور انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اسکول کے کسی مسئلہ پر پریشان ہوں۔



یوں ہی چار دن گزر گئے تھے' نہ ہی تابش کا فون آیا تھا اور نہ ہی وہ مجھے لینے کے لیے اسکول آیا تھا۔ اس کا موبائل یا تو بند ملتا تھا یا پھر مصروف' جس وجہ سے میرے اندیشوں کو تقویت ملنے لگی کہ

تابش میرے ساتھ بے وفائی تو نہیں کر گیا۔ اس کے دفتر کا ٹیلی فون نمبر میرے پاس نہیں تھا۔

لہٰذا اگلے دن میں اسکول سے چھٹی کر کے اس کے دفتر چلی گئی' تابش دفتر میں موجود نہ تھا اس کی سیکریٹری نے بتایا۔

''تابش کا بچہ بہت بیمار ہے' لہٰذا وہ گاؤں گیا ہوا ہے۔''

''کیا کہہ رہی ہو تم؟ تابش شادی شدہ ہے؟'' میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

''ہاں میڈم! تابش شادی شدہ ہے اس کی بیوی ہے' تین بچے بھی ہیں جو گاؤں میں رہتے ہیں۔ تابش ہر ہفتے گاؤں جاتا ہے۔''

مجھے یقین نہ آیا تھا کہ میں اپنے کانوں سے کیا سن رہی تھی' میں نے اس کی سیکریٹری سے دوبارہ پوچھا اور دوبارہ اس سے مجھے یہی جواب ملا تھا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے' اتنا بڑا جھوٹ..... نہیں تابش ایسا نہیں کرسکتا.....'' میں سوچ سوچ کر پاگل سی ہوگئی تھی' باجی نے مجھ سے کئی بار پوچھا کہ میں پریشان کیوں ہوں مگر میں انہیں کچھ نہ بتاسکی۔ ان کو بتانے کی ہمت ہی نہیں ہورہی تھی۔

اگلے روز اس نے فون اٹینڈ کرلیا وہ گاؤں سے واپس آگیا تھا۔ میری آواز اور بات کرنے کا انداز سن کر وہ سکتے میں آگیا' میں زور سے چیخی تھی۔

''کیوں جھوٹ بولا ہے تم نے مجھ سے؟'' وہ خاموش رہا۔

''جھوٹے..... بدمعاش..... کمینے..... بے غیرت انسان..... کس جرم کی سزا دی ہے تم نے مجھے۔ میں نے تو تم سے سچی محبت کی تھی' صرف تمہیں چاہا تھا..... بولو ناں..... بولتے کیوں نہیں؟''

''تمہارا غصہ ختم ہوگا تو بولوں گا' تم خاموش ہوگی تو کچھ کہوں گا۔'' اس نے اپنے اسی انداز میں کہا۔ میں کچھ اور کہنے ہی والی تھی کہ وہ بولا۔

''میں تمہیں سب کچھ بتادوں گا کہ مسئلہ کیا ہے؟ کل میرا انتظار کرنا میں اسکول سے تمہیں لینے آؤں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔

یقین و اعتبار کا وہ محل جو میں نے آہستہ آہستہ بنایا تھا وہ چکنا چور ہوگیا تھا' ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس کی کرچیاں میرے انگ انگ میں پیوست ہوگئی ہوں۔ درد ہی درد..... جسم سے روح تک' اوپر سے اندر تک..... زخم زخم لہولہان..... پاش پاش..... اس کے ساتھ گزرے ہوئے تمام لمحے خوفناک پرچھائیوں کی مانند امڈ آئے تھے اور سانپ بن کر مجھے ڈسنے لگے تھے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں غلیظ اور ناپاک ہوگئی ہوں' میرے جسم کا پور پور گندگی کا ڈھیر بن گیا ہے۔ میں نے غسل کیا تھا اور پورے خضوع و خشوع کے ساتھ نماز پڑھی اور اپنے گناہ کی خدا سے معافی مانگی تھی۔

''اے میرے پروردگار! اے میرے خالق و مالک! مجھے حاملہ مت کردینا' وہ بوجھ میں کیسے برداشت کروں گی۔ دنیا والوں کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ ماں اور بہن سے کیا کہوں گی۔'' میں نے ساری رات جاگ کر گزاردی' روتے ہوئے اور دعا کرتے ہوئے اپنی بدقسمتی کا ماتم کرتے ہوئے۔



اگلے روز ہم جگنی ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے' میری آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''شیریں! میں تمہیں پہلی نظر میں دیکھ کر ہی تمہارا دیوانہ ہوگیا تھا' تمہیں پانے کی خواہش اتنی شدت اختیار کرگئی تھی کہ میں تم سے سچ بول ہی نہیں

سکتا تھا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ میں شادی شدہ ہوں' میری بیوی ہے بچے ہیں مگر ماں باپ نہیں ہیں۔ ایک چھوٹا بھائی ہے جو کالج میں پڑھتا ہے مگر میں خوش نہیں ہوں' میری بیوی میری چچا زاد ہے۔ یہ شادی میری پسند سے نہیں ہوئی تھی' یہ میرے والد اور چچا کی مرضی کی شادی تھی۔ میری بیوی جاہل اور گنوار ہے' اس کی زندگی صرف دیہات تک محدود ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ شوہر کیا ہوتا ہے' اس کے حقوق کیا ہوتے ہیں' میں تو اس کے ساتھ محض نام کی زندگی گزار رہا ہوں بس وقت گزار رہا ہوں۔ مجھے اس سے قطعی محبت نہیں ہے' وہ محبت کرنے کے قابل ہی نہیں ہے۔ محبت تو میں نے تم سے کی ہے صرف تم سے...... تم نے بھی تو مجھے چاہا ہے' میری منزل اور نصیب تو تم ہو۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ میری نظروں میں اس کی محبت بھری باتیں اور اس کے دیئے ہوئے محبت کے تحفے یاد آ گئے تھے اور یہ بھی کہ میں نے اس سے محبت کی تھی مگر اس نے مجھے دھوکہ دیا تھا۔ میں نے اس پر اعتماد کیا تھا مگر اس نے جھوٹ بولا تھا' میں نے تو اس سے پیار کرلیا مگر اس نے فراڈ کیا۔ میں تو اس کی صورت' شخصیت اور انداز پر مرمٹی تھی میں نے محل بنایا تھا اس نے توڑ ڈالا تھا' میرے آنسو نکل آئے تھے۔

''مگر تابش! میں تم سے الگ نہیں رہ سکتی' تم کو یہ حقیقت مجھے پہلے ہی بتا دینی چاہیے تھی۔'' میں نے روتے ہوئے کہا تھا۔

''پھر تم مجھ سے دور ہو جاتیں' مجھے چھوڑ دیتیں اور کبھی نہ ملتیں پھر میں کیا کرتا؟'' اس نے بھی تقریباً روتے ہوئے کہا۔

''اب کیا ہوگا تابش! تم شادی شدہ ہو' تمہارے بچے ہیں۔'' میں نے پوچھا' وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''شیریں! مرد تو ایک سے زیادہ شادیاں کرسکتا ہے ناں۔ قانونی' مذہب اور شریعت اس کی اجازت دیتے ہیں۔ تم بولو' کیا مجھ سے اب بھی شادی کرو گی؟ ابھی اسی وقت...... میں تمہیں پہلی بیوی بنا کر رکھوں گا کیونکہ تم صرف میری بیوی نہیں محبوبہ بھی ہو گی جس سے پیار کیا جاتا ہے۔ پہلی بیوی کو میں چھوڑ نہیں سکتا کچھ مجبوریاں ہیں وہ صرف نام کی بیوی ہے اور رہے گی۔ میں یہاں شہر میں تمہارے لیے علیحدہ مکان لوں گا' جہاں ہم دونوں رہیں گے اپنی خوشی سے اپنی مرضی سے' ہم گاؤں والوں کو اس کی خبر تک نہ ہونے دیں گے اور نہ کبھی گاؤں جائیں گے۔'' مجھے اس کی آنکھوں میں پیار ابلتا ہوا نظر آیا تھا۔ مجھے لگا تھا جیسے وہ سب کچھ دل سے کہہ رہا ہو' سچ بول رہا ہو۔ میں زیادہ کچھ نہ کہہ سکی اور فوراً کوئی فیصلہ نہ کرسکی میں نے اسے صرف اتنا کہا۔

''مجھے گھر چھوڑ دو۔'' اس نے میرا کہا مانا اور مجھے گھر کے قریب اتار دیا۔

یہ محبت بھی کیا عجیب چیز ہوتی ہے جب سے دنیا بنی ہے جب سے انسان بنے ہیں اور جب سے انسان نے انسان کو چاہا ہے یہ جذبہ موجود ہے۔ اربوں' کھربوں سال سے انسان کو اندھا کردینے والا یہ جذبہ نہ جانے کیا کچھ کرا دیتا ہے۔ اسی لیے تابش مجھے اس روپ میں بھی اچھا لگا تھا۔ معصوم سا' مظلوم سا' وقت کا ستایا ہوا...... جسے کوئی اس جیسی اچھی اور حسین عورت نہ ملی تھی۔ اسے کسی اچھی عورت کی ضرورت تھی جو اس کی دوست ہو'

اس کو سمجھے جو اس کے دکھ درد کی ساتھی ہو جس کے کاندھوں پر سر رکھ کر وہ رو سکے اس کی سن سکے' اپنی کہہ سکے۔ زمانے نے اس کے ساتھ بڑا ظلم کیا تھا' میں اس کا درد بانٹنا چاہتی تھی۔



شادی شدہ آدمی کے ساتھ شادی...... باجی صفیہ اور امی نے مکمل طور پر انکار کر دیا تھا۔ انہیں یقین نہ آ رہا تھا کہ تابش ایسا بھی ہو سکتا ہے مگر میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں تابش سے ہی شادی کروں گی۔ امی اور باجی نے مجھے سمجھایا کہ میں شادی شدہ آدمی سے شادی کی بے وقوفی نہ کروں۔ میری سمجھ میں مگر کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اب کیا کروں؟

یوں ہی دن گزرنے لگے تھے چند دنوں بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں حاملہ ہوں۔ میں نے تابش کو فون پر بتایا تو وہ کہنے لگا۔

''تم فکر نہ کرو شریں! فی الحال میں تمہارا حمل ضائع کر دیتا ہوں۔'' مگر میں نہ مانی اور اسے کہا۔

''میں تم سے جلد از جلد شادی کرنا چاہتی ہوں' میری باجی اور امی مانیں نہ مانیں میں تمہارے ساتھ کورٹ میں جا کر شادی کرنے پر تیار ہوں۔'' تابش نے میرے اس فیصلہ سے اتفاق کیا اور کہنے لگا۔

''میں ایک دو دن میں تمہیں بتاتا ہوں۔'' میں مطمئن سی ہو کر تابش کا انتظار کرنے لگی مگر میرا وہ انتظار طویل ہوتا گیا۔ تابش نے مصروفیت کا بہانہ بنا کر ملاقات نہ کی اور فون پر مجھے تسلیاں اور دلاسے دینے لگا پھر ایک دن آیا کہ اس کا موبائل بند ہو گیا۔ اس نے شاید سم بدل لی تھی۔

اگلے دن میں اسکول سے چھٹی کر کے تابش کے دفتر چلی گئی' وہاں جا کر پتا چلا کہ تابش نے دفتر اور بزنس فروخت کر ڈالا ہے۔ یہ خبر سن کر دکھ اور درد کے مارے میری آنکھیں بھر آئیں' استقبالیہ پر وہی لڑکی بیٹھی تھی جو تابش کے دفتر میں مجھے ملی تھی۔ میں نے اس کو تابش اور اپنے تعلق کا بتایا اور اس سے کہا کہ تابش بزنس فروخت کر کے کہاں گیا ہے؟

اس نے بتایا کہ وہ صحیح تو نہیں جانتی مگر اسے اندازہ ہے کہ وہ ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ میں یہ جان کر دکھوں اور غموں کے بوجھ سے نڈھال ہو گئی۔ دفتر کی کسی فائل سے اس نے مجھے تابش کے گاؤں کا ایڈریس دے دیا۔ میں نے اس کے گاؤں جانے کا ارادہ کر لیا' تابش دھوکے باز نکلا تھا اس روز احساس ہوا کہ تابش کی محبت محض ایک ڈھونگ تھی۔ اس روز میرا اعتبار مردوں سے اٹھ گیا۔

مجھے اپنا مستقبل تاریک لگنے لگا کہ اب میں ماں اور بہن کو کیا منہ دکھاؤں گی' جب ان کو یہ معلوم ہوگا کہ میں ماں بننے والی ہوں تو وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر پائیں گی۔ باجی اور امی کو تو پہلے ہی تابش پر اعتماد نہ تھا' تابش کی بے وفائی نے میری آرزوؤں کا خون کر ڈالا تھا۔ میرے چاند کو گہنا دیتا تھا' وہ چاند جو اس کی چاہت اور محبت کا چاند تھا۔ وہ چاند جو میں نے جیون آکاش کے ماتھے کا جھومر بنایا تھا اب اس چاند نے اب کبھی نہ جگمگانا تھا' اس کی چاندنی کی برکھا اب کبھی نہیں برسنی تھی۔



وہ پوٹھوہار کے علاقہ میں ایک بڑا سا گاؤں تھا' میں راستہ پوچھتے ہوئے وہاں جا پہنچی تھی۔ ایک عورت مجھے تابش کے گھر لے جانے کے بجائے اس کے چچا اور سسر چوہدری جمال احمد کے گھر لے گئی تھی۔ میں نے خوف زدہ ہو کر رو رو کر چوہدری جمال کو اپنی داستان سنائی تو وہ بہت ہی دکھی سا

ہو گیا اس نے میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''بیٹی! تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے' میرے خون نے کی ہے یہ ستم ظریفی اب تمہیں انصاف بھی اسی سے ملے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے کسی ملازمہ کو آواز دی' وہ آئی تو اس نے مجھے اس کے ہمراہ مہمان خانے میں بھیج دیا۔ وہ ایک آراستہ پیراستہ کمرہ تھا۔ چوہدری جمال کے رویہ نے مجھے مطمئن سا کر دیا تھا۔ شام کا کھانا کھانے کے بعد چوہدری جمال مہمان خانے میں آ گیا اور مجھے بتانے لگا۔

''تابش اور دانش میرے بڑے بھائی کی اولاد ہیں' یہ بچے تھے کہ میرا بھائی فوت ہو گیا۔ میں نے ان کو اپنی اولاد کی طرح پالا' پڑھایا اور جوان کیا اور اپنی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی جمیلہ کی شادی تابش کے ساتھ کر دی حالانکہ میرا بیٹا نواز اس رشتہ کے خلاف تھا۔ اسے تابش کے کردار سے نفرت تھی کہ تابش کے گاؤں کی ایک دو لڑکیوں کے ساتھ تعلقات تھے اور وہ ان کو برباد کر چکا تھا مگر میں نے اپنے بیٹے کی بات نہ مانی اور جمیلہ کی شادی تابش سے کر دی۔ تابش کے اصرار پر ہی میں نے شہر میں اس کو کاروبار شروع کرایا جس کا تمام خرچ میں نے ہی برداشت کیا تھا۔ تابش جب سے شہر گیا تھا تب سے وہ گاؤں بہت کم آتا تھا۔ آتا بھی تو ایک رات گزار کر چلا جاتا' میری بیٹی جمیلہ اور بیٹے نواز کو اب تابش سے شکایت رہنے لگی تھی۔ نواز' تابش کی خبر رکھتا تھا۔ شہر میں اس کے کچھ دوست ہیں جو تابش کی نگرانی کر کے اس کی حرکات نواز کو بتا دیتے تھے۔ تم سے قبل بھی وہ ایک اور لڑکی کو برباد کر چکا تھا۔ نواز کو تمہارے اور تابش کے تعلقات کا بھی علم تھا جب نواز نے ثبوت کے ہمراہ تابش کے کرتوتوں سے مجھے آگاہ کیا تو تب مجھے اپنے فیصلہ پر ندامت ہوئی۔ ہم نے تابش کا شہر والا دفتر فروخت کر دیا تا کہ ہم اسے راہ راست پر لا سکیں۔ اسی بات پر تابش اور نواز میں تو تو میں میں ہو گئی اور بات اتنی بڑھ گئی کہ تابش' نواز کی گولی لگنے سے زندگی کی بازی ہار گیا۔ نواز ان دنوں جیل میں ہے' ہم پہلے ہی پریشان تھے کہ اب تم اپنا دکھڑا لے کر آ گئی ہو' ان حالات میں سمجھ نہیں آ رہی کہ میں کیسے تمہاری مدد کروں۔ کیسے تمہارے دکھ کا مداوا کروں' تم چاہو تو میں تمہیں رقم دے سکتا ہوں کہ تم جا کر اس بوجھ سے نجات حاصل کرو۔ میں تمہارے اکاؤنٹ میں اتنی رقم ڈال دوں گا کہ تم زندگی بھر گھر بیٹھ کر کھاتی رہو۔'

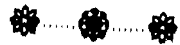
''میں تابش کی نشانی کو ضائع نہیں کرنا چاہتی کیونکہ میں نے اس سے دل سے محبت کی تھی اور یہ اس کی محبت کی واحد نشانی ہے جو میرے وجود میں پل رہی ہے۔'' میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''ٹھیک ہے بیٹی میں تمہیں اب یہاں سے نہیں جانے دوں گا' میں چاہوں تو تمہاری شادی دانش سے کر دوں مگر ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ دانش نے جمیلہ سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے جلد ہی دانش اور جمیلہ کا نکاح ہو جائے گا۔'' چوہدری جمال نے تفصیل بتا دی۔

میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اب میں کیا کروں' تابش کی موت نے میرے جیون میں اندھیرے بھر دیئے تھے۔ اس کی موت کا دکھ بھی مجھے چین نہ لینے دے رہا تھا۔ میرا وجود آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوبنے لگا تھا' محبت کرنے کی مجھے کڑی سزا ملی تھی' اب محسوس ہو رہا تھا کہ میں محبت کے نام پر سرابوں کے پیچھے بھاگتی رہی ہوں۔

اگلے دن جمیلہ سے ملاقات ہوئی تو اس کی

ت دیکھ کر مجھے اس پر ترس آ گیا وہ تو مجھ سے
ں بڑھ کر خوب صورت تھی مگر زندگی نے اس کے
اتھ گھناؤنا مذاق کیا تھا اس کا شوہر اس کا ہو کر بھی
س کا اپنا نہ تھا۔
اس نے جمیلہ کو مقام ہی نہ دیا تھا جس کی وہ حق
دار تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ جمیلہ کی آنکھوں میں
صرف آنسو ہی نہ تھے اس کی آنکھوں میں میرے
لیے نفرت کے سائے منڈلا رہے تھے کہ میں ہی تو
اس کے ارمانوں کی قاتلہ تھی۔ میں نے ہی اس کا
حق اس سے چھینا تھا۔ اس کی آنکھوں میں زمانے
بھر کا درد اور دکھ سمٹ آیا تھا' اس کا قصور بھی تو کوئی
نہ تھا میں ہی قصوروار تھی۔ میں ہی اس کی مجرم تھی
میں نے اس سے اس کا سہاگ چھینا تھا' میں
عورت ہو کر بھی عورت کی دشمن بن گئی تھی۔ مجھ میں
جمیلہ کا سامنا کرنے کی ہمت نہ رہی اور میں واپس
شہر لوٹ آئی۔



امی اور باجی نے اپنا منہ اور سر پیٹ لیا تھا کہ وہ
زمانے والوں کو کیا منہ دکھائیں گی کہ میں کس کی
گناہ پیٹ میں اٹھائے پھر رہی ہوں' میں ان
دونوں کی نظروں میں بھی گر گئی تھی۔ نفرت ہو گئی تھی
اپنی زندگی سے' میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنی
زندگی کا خاتمہ کر لوں گی۔ امی نے تو اس دکھ کو سینے
سے لگا لیا اور اگلے جہاں سدھار گئیں میں ہی ان
کی موت کی وجہ بن گئی۔ باجی نے بچہ ضائع کرنے
کو کہا تھا مگر میں نے انکار کر دیا تھا گھر میں اب
میں اور باجی رہ گئی تھیں۔ ہم میں بھی روزانہ ہی کسی
نہ کسی بات پر تکرار ہونے لگی تھی یوں ہی دو ماہ گزر
گئے تھے کہ ایک روز چوہدری جمال ہمارے گھر
آ گئے انہوں نے مجھے پیار کیا اور پھر کہنے لگے۔

''بیٹی شیریں! میرا بیٹا نواز رہا ہو کر آ گیا ہے
میں اپنا عہد نبھانے آ گیا ہوں۔ میں نے نواز سے
بات بھی کر لی ہے وہ راضی ہے' تم بھی میرا یہ فیصلہ
قبول کر لو۔ میں تمہیں اپنی بہو بنانا چاہتا ہوں۔''
چوہدری جمال کا فیصلہ جان کر میں ششدر رہ گئی۔
باجی صفیہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی بے
بسی اور بے کسی کے عالم میں۔ میرے لیے اس
سے اچھی خبر اور کیا ہو سکتی تھی۔ دل میں جلترنگ
سے بجتے ہوئے محسوس ہوئے' ایک اور جذبے
سے آشنائی ہوئی کہ اس دنیا میں چوہدری جمال
جیسے زبان کے پکے لوگ بھی بستے ہیں جو دوسروں کا
دکھ اپنے سینے میں بھی محسوس کرتے ہیں۔
میں اور باجی چوہدری جمال کے ہمراہ گاؤں
آ گئیں اور پھر میں چوہدری جمال کی بہو بن گئی۔
میں آج بھی اسی گاؤں میں اسی حویلی میں رہتی
ہوں' نواز اب بدل گیا ہے ورنہ وہ بہت ہی اکھڑ
تھا' اس نے تابش کی اولاد کو اپنی اولاد کی طرح
سمجھا ہے۔ میں اور نواز دونوں ہی زندگی کے دکھ
سہہ کر اس مقام تک آئے ہیں کہ یہ حالات سے
سمجھوتہ کر لیا ہے اور خوشیوں بھری زندگی گزار
رہے ہیں جب غموں کے بعد خوشیاں ملتی ہیں تو غم
بے معنی لگنے لگتے ہیں۔ یہی قانون فطرت ہے'
یہی نظام کائنات ہے۔ یہی عمل اور اس کا ردعمل'
رنج و مسرت کا ذائقہ ہمارے احساسات کے لیے
ایک کلید ہے۔ زندگی کو بالآخر وقت سے سمجھوتہ کرنا
ہی پڑتا ہے۔



ڈبل کراس

سید احتشام

ایک قاتل کی سرگزشت اس نے قانون کے ساتھ ساتھ کئی لوگوں کو ڈبل کراس کیا تھا۔
ایک خوب صورت خاتون کا احوال' وہ اپنے قاتل شوہر سے خوف زدہ تھی۔
مغرب سے انتخاب ایک خوب صورت کہانی۔

جنوبی اونٹاریو میں موسم سرما نہایت شدید تھا۔ درجہ حرارت صفر سے بھی کئی ڈگری نیچے آ گیا تھا اور زمین مکمل طور پر برف سے ڈھک گئی۔ پچاس میل کے رقبے پر محیط بلینہم کا خطرناک دلدلی علاقہ بھی ان میں شامل تھا۔ اس علاقے کے وسط میں ڈیولز ہول نامی ایک مقام تھا۔ پرنسٹن کے دو لکڑ ہارے وہاں سے گزرے سخت سردی کے سبب ان کے منہ سے بھاپ نکل رہی تھی۔ اچانک ایک کے منہ سے بھاپ نکلنا بند ہوگئی۔ اس کی سانس سینے ہی میں رک گئی اور وہ دہشت سے پھٹی نظروں سے ایک شے کو گھورنے لگا جس نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرلی تھی۔

''خدایا، یہ تو کسی کی لاش ہے۔'' اس نے چیخ کر کہا ساتھ ہی انگلی سے اس جانب اشارہ کیا۔

دونوں جلدی سے لاش کے قریب پہنچ گئے۔

''قتل۔''

دوسرے لکڑ ہارے کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

''ہمیں پولیس کو مطلع کر دینا چاہیے۔''

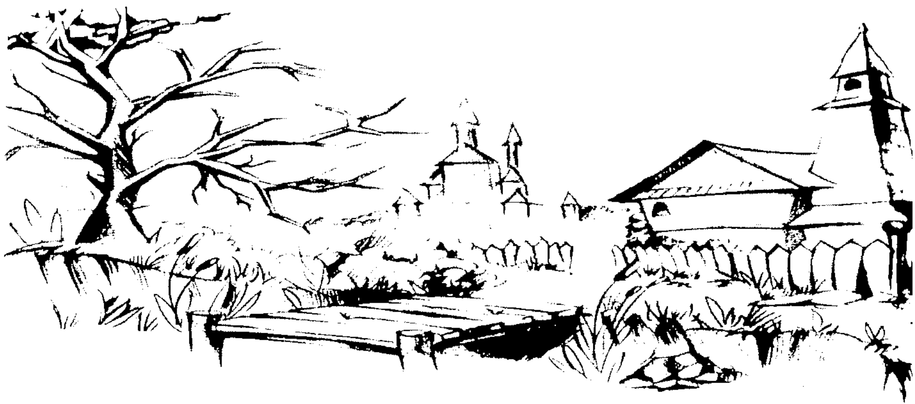
دونوں واپس پرنسٹن پہنچے اور پولیو کو اس واقعے کی رپورٹ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ ڈیولز ہول کے پاس سے گزر رہے تھے کہ وہاں انہیں ایک اجنبی کی لاش نظر آئی جو اوندھے منہ پڑی تھی۔ پولیس اس وقت ڈیولز ہول روانہ ہوگئی اور وہاں پہنچ کر اس نے لاش اپنے قبضے میں کرلی۔ انہوں نے دیکھا کہ لاش کسی نوجوان کی تھی۔ اس کے جسم پر انگریزی تراش خراش کے کپڑے تھے لیکن جس نے بھی اسے قتل کیا۔ اس کی شناخت کا سارا سراغ مٹا دیا تھا۔ اس کی جیبوں میں کوئی رقم نہیں تھی۔ کوئی پرس بھی نہ تھا۔ نہ ہی کاغذات تھے۔ کپڑوں پر سے درزی کا تکمہ کاٹ کر نکال لیا گیا تھا۔ لانڈری کے نشانات کی جگہ سے کپڑے کے ٹکڑے کاٹ لیے گئے تھے۔ پولیس نے یہ بھی دیکھا کہ نوجوان کے سر کے پچھلے حصے میں دو گولیاں ماری گئی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ کیس باضابطہ اونٹاریو صوبے کے سی آئی ڈی کے سربراہ سپرنٹنڈنٹ جان ونسن مرے کے سپرد کر دیا گیا جو ایک زمانے میں کینیڈا کا سب سے عظیم سراغ رساں ہوا کرتا تھا۔

اس قتل کی اطلاع ملتے ہی اخباری نمائندے اس کے ہاں جا دھمکے اور اسی قتل کے بارے میں کچھ جاننا چاہا۔

''ممکن ہے آپ حضرات کو میری یہ منطق بہت عجیب لگے۔'' وہ ایک سوال کے جواب میں بولا۔

''لیکن میں یہ ثابت کردوں گا کہ کوئی بھی شخص ارتکاب قتل کے بعد کہیں نہ کہیں اپنا کوئی نہ کوئی سراغ چھوڑے بغیر نہیں رہتا۔''

اور پھر وہ اپنی اس بات کو سچ ثابت کرنے پر کمر بستہ ہوگیا۔ اس نے تفتیش کا آغاز اس بنیاد پر کیا کہ قاتل کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی طرح مقتول سے وابستہ ضرور تھا۔ چنانچہ وہ اپنی ٹیم کے ہمراہ اس دلدلی علاقے میں پہنچ گیا اور وہ سب جائے واردات کا گہری نظروں سے معائنہ کرنے لگے۔ مرے کو یہ سمجھنے میں قطعی دیر نہیں لگی کہ قاتل نے جان بوجھ



کر ڈیولز ہول کو اپنے مذموم اور گھناؤنے مقصد کے لیے منتخب کیا تھا اور وہ اس وسیع وعریض دلدلی علاقے سے کسی حد تک واقف تھا۔ مرے برفانی ڈھلوان پر آگے بڑھنے لگا۔ اس کی عقابی نظریں برف کے ایک ایک ذرے کا ایکسرے لے رہی تھیں۔ اچانک وہ ٹھٹک گیا۔ اس کی نظر ایک سگریٹ ہولڈر پر پڑی تھی۔ اس نے جھک کر چاندی اور عنبر کا ساختہ وہ سگریٹ ہولدر اٹھالیا اس پر ایف سی بی کندہ تھا لیکن یہ سگریٹ ہولڈر کس کا تھا؟ قاتل کا یا مقتول کا؟

اس نے جلد ہی کیوبک اور نیویارک کی جہاز راں کمپنیوں سے رابطہ قائم کرنا شروع کردیا وہ چاہتا تھا کہ یہ کمپنیاں اپنی فائلیں چیک کرکے بتائیں کہ کیا ان کے مسافروں میں ایسا کوئی شخص تھا جس کے نام کے آغاز میں یہ تین حروف آتے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے امریکہ اور کینیڈا کے اخبارات میں مقتول کا حلیہ شائع کرا دیا۔ تیسرے روز وہ اپنے کام میں مصروف ہی تھا کہ ایک اجنبی پرنسٹن میں وارد ہوا۔ اس نے ایک مختصر سے ہوٹل میں قیام کیا اور رجسٹر میں اپنا نام جان آر برچال لکھوایا، وہ انگریز تھا۔ اس کے ہمراہ اس کی خوش جمال بیوی بھی تھی پرنسٹن وارد ہونے کے بعد وہ چند گھنٹے تک اپنے طور پر لوگوں سے اس قتل کے بارے میں پوچھ گچھ کرتا رہا بالآخر اس نے مرے کو ڈھونڈ نکالا۔

''میں چند ہی گھنٹے پیشتر انگلینڈ سے یہاں پہنچا ہوں۔'' اس نے مرے سے کہا۔

''اور میرا خیال ہے کہ میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔''

''تم میری کیا مدد کرسکتے ہو؟'' کینیڈا کے عظیم سراغ رساں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے اس شخص کے ساتھ کچھ وقت گزارا ہے جس کا حلیہ اخبارات میں شائع ہوا ہے اور جس کی لاش دلدل میں پائی گئی تھی۔'' اس نے انکشاف کیا۔

''ایک منٹ۔'' مرے جلدی سے بول پڑا۔ ''کیا تم اس کی لاش شناخت کرسکتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''اگر یہ واقعی وہی شخص ہے تو مجھے اس میں دشواری نہیں ہوگی۔''

مرے اسے لے کر سرد خانے پہنچ گیا اور جب لاش پر سے کپڑا ہٹایا جانے لگا تو وہ پیچھے کھڑا ہو کر اس شخص کے چہرے کے تاثرات دیکھنے لگا۔

''ہاں۔'' اس شخص نے اثبات میں سر ہلایا۔

''یہی ہے وہ نوجوان جس سے میں جہاز پر ملا تھا۔''

''اس کا نام کیا تھا؟'' مرے نے پوچھا۔

برچال ایک لمحہ کے لیے ہچکچایا۔

''میں نہیں جانتا۔'' اس نے کہا۔

''لیکن میرا خیال ہے کہ اس کا نام بھی میرے نام کی طرح بی سے شروع ہوتا تھا لیکن مجھے بالکل یاد نہیں آرہا۔''

تھوڑی دیر کے بعد برچال رخصت ہوگیا۔ مرے نے اس دوران غور کیا کہ مسز برچال بلاوجہ نروس نظر آرہی تھی۔

اس نے اس جوڑے کی انکوائری کی تو اس کے علم میں یہ بات آئی کہ وہ جوڑا ہیملٹن روانہ ہوگیا ہے جہاں سے وہ نیاگرا آبشار دیکھنے جائے گا۔ یہ اطلاع ملتے ہی اس نے ہیملٹن پولیس سے رابطہ قائم کیا اور جوڑے پر کڑی نگاہ رکھنے کی ہدایت کی۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ پرسٹن اور اس کے نواح کے لوگوں کو یاد آ تا تھا کہ انہوں نے پہلے بھی برچال کو دیکھا تھا ان کے خیال میں وہ حیرت انگیز طور پر اور پریشان کن حد تک ایک خاص آدمی لارڈ سمرسٹ سے مشابہ تھا جو تقریباً دو سال پہلے وہاں آیا تھا لیکن اس کے بعد اس کی کوئی خیریت سننے میں نہیں آئی تھی۔

مرے نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ممکن ہے اس کیس کی تفتیش کی جڑیں انگلینڈ میں ہوں اسکاٹ لینڈ یارڈ کو ایک ٹیلی گرام روانہ کیا۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں نے اس کا ایک لمبا چوڑا جواب دیا۔ انہوں نے تصدیق کی کہ مسٹر اور مسز برچال امریکہ اور کینیڈا کے دورے پر نکلے ہوئے ہیں۔ برچال آکسفورڈ یونیورسٹی کا فارغ التحصیل ہے اس کی آمدنی کے ذرائع مخصوص ہیں۔ بظاہر مسٹر اور مسز برچال اپنے کاروبار میں ہونے والے منافع سے عیش کر رہے ہیں کیونکہ برچال نے ایک اشتہار شائع کرایا تھا جس کے مطابق اسے کاشت کاری سے دلچسپی رکھنے والے کسی شریف آدمی کی ضرورت تھی۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں نے اس اشتہار کی کاپی بھی بھیجی تھی جس میں لکھا تھا۔

''کینیڈا، آکسفورڈ کے ایک فارغ التحصیل کو پارٹنر شپ کے لیے ایک ایسے شریف آدمی کی ضرورت ہے جو اس کے ساتھ رہ کر کاروبار سیکھ سکے اسے پارٹنر بننے تک رہائش طعام اور کاروبار کو وسعت دینے کے لیے پانچ سو پاؤنڈ اور پانچ فیصد سود بہر طور دینے ہوں گے۔ پتا جے آر برچال بمعرفت کلب 4 پارک پلیس، سینٹ جیمز لندن۔''

اسکاٹ لینڈ یارڈ نے یہ اطلاع بھی دی تھی کہ برچال ایسے دو نوجوانوں کے ہمراہ انگلینڈ سے روانہ ہوا ہے جنہوں نے اسے پریمیم ادا کر دیا ہے اور جنہیں جنوبی اونٹاریو میں واقع برچال کے فارم میں کاشت کاری سیکھنا ہے۔ ان دو پر امید نوجوانوں میں سے ایک کا نام مسٹر ڈوپیلی اور دوسرے کا نام مسٹر ایف سی بینویل ہے مرے یہ رپورٹ پڑھ کر سوچ میں پڑ گیا کیا بینویل ہی اس سگریٹ ہولڈر کا مالک تھا جس پر ایف سی بی کندہ تھا؟ اس نے بینویل کے والدین کو لندن ٹیلی گرام کیا جس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ ان کا بیٹا ایک شخص مسٹر برچال کے ساتھ کینیڈا گیا ہوا ہے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا کہ ان کے بیٹے نے مسٹر برچال کو پانچ سو پاؤنڈ پیشگی ادا کیے ہیں۔ یہ پڑھ کر مرے کے دماغ میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ یہ جواب کسی اور امر کی بھی تصدیق کرتا تھا۔ یہی کہ برچال ایک نہایت سفاک سازشی تھی جس نے پانچ سو پاؤنڈ ہضم کرنے کی خاطر بینویل کو قتل کر دیا تھا۔ مرے نے دوسرے نوجوان پیلی کا سراغ لگانے کی کوشش کی لیکن اسے اس میں ناکامی ہوئی۔

دوران تفتیش اسے ملٹن سے ایک رپورٹ وصول ہوئی۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ برچال 16 فروری کو یعنی بینویل کی لاش بازیافت ہونے سے چھ روز پہلے وہاں یعنی پرسٹن وارد ہوا تھا۔ پھر ایسٹ ووڈ نامی قصبے سے یہ اطلاع موصول ہوئی کہ گرینڈ ٹرنک ریلوے لائن کے پاس رہنے والی ایک لڑکی نے 19 فروری کی صبح دو آدمیوں کو دلدلی علاقے کی جانب جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ اطلاع موصول ہوتے ہی مرے اس پندرہ سالہ لڑکی سے ملنے پہنچ گیا اور اسے اس کی زبانی جو معلومات حاصل ہوئیں ان کی روشنی میں اسے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ وہ دونوں اجنبی برچال اور بینویل ہی تھے۔ لڑکی نے اسے یہ بھی بتایا کہ اس نے ایک گھنٹے کے بعد دوسرے بڑی عمر کے آدمی کو تنہا دلدلی علاقے سے واپس آتے دیکھا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ برچال اس دلدلی علاقے کے جغرافیہ سے کیسے واقف تھا۔ اچانک مرے کو یاد آ گیا کہ لوگوں نے دو سال پہلے لارڈ سمرسٹ کو دیکھا تھا اگر یہ ایک ہی شخص کے دو مختلف روپ تھے تو بات صاف ہو جاتی تھی۔

مرے نے ایسٹ ووڈ میں اپنی تفتیش جاری رکھی۔ بالآخر اس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جس

لے بتایا کہ اس نے 19 فروری کی صبح گولیاں چلنے کی دو آوازیں سنی تھیں۔ پھر ایسٹ ووڈ کے اسٹیشن ماسٹر نے بتایا کہ 19 فروری کو ڈنڈیس سے چلنے والی ایک ٹرین جس سے ہملٹن کی ٹرین جڑی ہوئی تھی لیٹ تھی جب وہ ٹرین وہاں پہنچی تو اس نے دو آدمیوں کو اس سے اترتے دیکھا۔

''مجھے وہ یاد نہ رہتے۔'' وہ بولا۔

''لیکن ہوا یہ کہ نوجوان کا سگریٹ ہولڈر گر گیا جسے میں نے اٹھا لیا۔''

''کیا تمہیں یاد ہے کہ لارڈ سمرسٹ نامی ایک شخص دو سال پہلے یہاں آیا تھا؟'' مرے نے پوچھا۔

''ہاں، بہت اچھی طرح یاد ہے۔'' اسٹیشن ماسٹر نے جواب دیا۔

''نہ صرف وہ بلکہ لیڈی سمرسٹ بھی یاد ہے۔ وہ واقعی بہت حسین عورت تھی۔ وہ دونوں پکنک منانے دلدلی علاقے کی طرف گئے تھے کیونکہ وہ موسم گرما تھا۔''

مرے نے اس وقت ہیملٹن پولیس کو ایک ٹیلی گرام بھیجا اور اس کے چند ہی گھنٹے بعد برچال اور اس کی بیوی کو زیر حراست لے لیا گیا۔ برچال اپنی گرفتاری پر سخت مشتعل تھا اور اس کی بیوی سسکیاں لے رہی تھی اس کے کچھ ہی دیر کے بعد ایک اور شخص وہاں وارد ہو گیا۔

وہ گم شدہ پیلی تھا وہ مونٹریال سے آیا تھا اس نے برچال سے معاہدے پر دستخط کیے تھے اور اسے پانچ سو پاؤنڈ ادا کیے تھے۔ یہ پارٹی وہائٹ اسٹار نامی ایک بحری جہاز میں سفر پر روانہ ہوئی تھی۔ جسے اپنے شیڈول کے مطابق 4 فروری کو لنگر انداز ہونا تھا یہی وہ وقت تھا جب پیلی نے پہلی بار یہ سنا کہ بینویل نامی جو تھا شخص ان کی پارٹی میں شامل ہونے والا ہے پھر بینویل کسی ذاتی کام سے برچال کے ہمراہ بفیلو چلا گیا لیکن برچال جب بیس فروری کو واپس آیا تو مینویل اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اس امر نے پیلی کو مشکوک کر دیا اور وہ نیاگرا آبشار تک برچال کے ہمراہ سفر کرنے پر لعنت بھیج کر اپنے پانچ سو پاؤنڈ اس سے واپس لیے بغیر بذریعہ ٹرین مونٹریال پہنچ گیا۔

''اور یہی وجہ ہے مسٹر مرے کہ میں آپ کو یہاں نظر آ رہا ہوں۔'' اس نے سراغ رساں کو بتایا۔

مرے کے ہونٹوں پر ایک سفاک مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے کینیڈا میں ایک ایسا شخص مل گیا تھا جو برچال کی دہری چال کی حقیقت سے واقف تھا وہ فوراً برچال کے پاس پہنچ گیا جو زیر حراست تھا۔

''تم ایک بیان دے دو کہ تم اور تمہاری بیوی نے قتل کی سازش کی تھی۔'' وہ بولا۔

''میری بیوی اس کی سازش میں ہرگز شریک نہیں۔''

برچال کا ردعمل شدید تھا۔

''وہ میرے منصوبوں سے واقف تک نہیں تھی۔'' وہ مرے کے منہ پر چیخا۔

''وہ تو یہ بھی نہیں جانتی کہ میں نے کسی سے پیشگی رقم وصول کی تھی۔''

چنانچہ مرے نے مسز برچال کو رہا کر دیا۔ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تھا اسے اس کا ہلکا سا بھی گمان نہ تھا۔ وہ اپنے شوہر کی طرف سے بے حد خوفزدہ تھی مرے کو اس پر بہت ترس آنے لگا۔ وہ ایک معصوم عورت تھی اسے بالکل علم نہ تھا کہ اس کا شوہر ایک سفاک قاتل تھا۔

برچال پر ایسٹ ووڈ میں ایک نوجوان بے گناہ کو قتل کرنے کے الزام میں مقدمہ چلا یہیں اس نے دو سال پہلے خود کو لارڈ سمرسٹ کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا لہٰذا مقدمے کی سنسنی خیزی میں زبردست اضافہ ہو گیا تھا اس مقدمے کی بازگشت پورے شمالی امریکا اور یورپ میں سنی گئی۔ اس کی سماعت چھ روز تک ہوئی لیکن مرے نے اس امر کو یقینی بنا دیا تھا کہ فیصلہ کسی بھی حالت میں مشکوک نہ ہو۔ چنانچہ اسے سزائے موت سنا دی گئی اور 14 نومبر کی ایک سرمئی صبح اسے تختہ دار پر لٹکا دیا گیا اور یوں ایک حریص اسکالر اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

گلیڈی ایٹر

احمد سجاد بابر

ان ارواح کا قصہ' جو انسان ہوتے ہوئے بھی انسانیت سے کوسوں دور تھیں۔ مظلوموں کی سسکاریاں ان کی خوشیاں تھیں' قہقہے تھے۔

یونان کے ایک جنگجو غلام کا احوال' وہ غلطی سے اک حیوان کو انسان سمجھ بیٹھا تھا۔

ایک کھٹکا سا ہوا، جیسے کوئی داخلی دروازے سے آ کر ٹکرایا ہو

''کون ہے دروازے پر؟'' راہبِ اعظم نے چونک کر پوچھا۔

کلیسا کی دیواروں سے بادوباراں کا طوفان ٹکرا رہا تھا، ہوائیں کسی وحشی سانڈ کی مانند سنگی دیواروں پر سر مارتیں اور بے دم ہو کر گر جاتیں، وقفے وقفے سے آسمان پر ایک روشن ٹیڑھی میڑھی لکیر نمودار ہوتی جیسے آسمان میں دراڑ پڑ گئی ہو اور پھر ایک زوردار کڑاکا ماحول کی ہیبت میں اضافہ کر دیتا۔ مجموعی طور پر یہ ایک خوفناک رات تھی۔

''جانے کون بے چارہ ہے' رات کے پچھلے پہر، یسوع مسیح اس پر اپنا کرم فرمائے۔'' ضعیف راہبِ اعظم نے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے خود کلامی کی اور دروازے کی طرف بڑھے۔

دروازہ کھولنے پر کوئی دھم سے اندر آ گرا راہبِ اعظم بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹے یہ ایک بچہ تھا۔ عمر سات آٹھ سال کے لگ بھگ تھی اور چہرے پر نقاہت اور بے چینی مترشح تھی، اس وقت یقینی طور پر وہ بے ہوش تھا۔

''اوہ! لگتا ہے بے چارہ ہوش وحواس میں نہیں، مائی لعل چائلڈ......'' پریشانی راہبِ اعظم کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔

''ڈیوڈ! کہاں ہو تم؟ جلدی سے ادھر آؤ۔'' بوڑھے راہب نے چرچ کے خدمت گار کو آواز دی۔ فوراً ادھیڑ عمر ڈیوڈ اندرونی ہال سے برآمد ہوا، بچے کو زمین پر بے سدھ دیکھ کر اس کے قدموں میں تیزی در آئی۔

''فادر! کون ہے یہ ننھی روح؟'' ڈیوڈ نے بے اختیار بچے کو بازوؤں میں اٹھا لیا۔

''کسے معلوم ڈیوڈ! شاید آسمان سے ٹوٹا کوئی تارہ یا پھر شاید دریائے اردن کی مقدس فضاؤں میں اڑتا کوئی معصوم ابابیل۔'' راہبِ اعظم نے کھوئے لہجے میں کہا۔

بچہ بے ہوشی میں بھی سسکیاں لے رہا تھا۔

''سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں، سب نفرت کرتے ہیں۔ نہیں جینا چاہتا میں فادر۔''

......❖❖❖......

یہ نیا روم تھا، آج کا روم' بلند و بالا عمارات کے ساتھ پراسراریت کی دھند میں لپٹا شہر۔ کرسمس کی وجہ سے شہر دلہن کی طرح جگمگا رہا تھا۔ سانتا کلاز اپنے مخصوص کاسٹیوم پہنے بچوں میں تحائف تقسیم کر رہے تھے۔ کرسمس ٹری ماحول کو خوبصورت بنا رہے تھے۔ شہر کے قدیم کلیسا میں بھی ایک خاص تقریب شروع ہونے جا رہی تھی یہ وہ تقریب تھی جو صدیوں سے جاری تھی، اس متبرک دن راہب اعظم شہر کے



باسیوں میں محبت، امن اور سکون کا باعث بننے والوں میں میڈل اور اعزاز تقسیم کرتے تھے، یہ اعزاز کسی بھی فرد کو اس کے ذاتی کارنامے پر بھی دیا جاتا تھا یا پھر اس کے بزرگوں میں اگر کسی نے کوئی ایسا کارنامہ سرانجام دیا ہو جسے محبت کا سرچشمہ قرار دیا جا سکے تو اس کی بعد کی نسلوں کو بھی اس ایوارڈ کا حق دار قرار دیا جاسکتا تھا۔ یہ ایوارڈ عزت اور وقار کا سمبل بن چکا تھا ”میڈل آف لوو“ کا نام دیا گیا تھا، ہر کسی کی خواہش ہوتی تھی کہ اس سال یہ اعزاز اس کے خاندان کا حصہ بنے، جس فیملی میں یہ میڈل آتا، اسے رشک کی نگاہوں سے دیکھا جاتا۔ تمام سرکاری اور نجی تقریبات میں اس خاندان کو خاص مہمان کے طور پر مدعو کیا جاتا تھا۔ شاہی تقریبات میں بھی اس خاندان کو اہمیت دی جاتی، یہ سنہری رنگ کا طلائی میڈل ہوتا تھا جو نیلے رنگ کے ربن میں بندھا ہوتا تھا۔ میڈل کی گولائی کے وسط میں ایک نقرئی رنگ کی صلیب اور درمیان میں ایک اڑنے کو تیار عقاب کی تصویر کندہ تھی۔

آج بھی وہی خاص دن تھا۔ کلوسیئم (Colosseum) کی قدیم عمارت شہر کے باسیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ یہ وہی عمارت تھی جس میں ہزاروں سال پہلے موت اور خون کا کھیل کھیلا جاتا تھا۔ فضا لوبان اور صندل کی خوشبو سے لبریز تھی۔ کلوسیئم کے اندر کا ماحول ویسا ہی بنایا گیا تھا جیسے قبل مسیح کے سیاہ دور میں ہوا کرتا تھا، شاہی خاندان اسٹیج پر زرق برق لباس میں موجود تھا۔ کنگ بنفسِ نفیس موجود تھے مگر اس تقریب کی سب سے اہم شخصیت راہب اعظم تھے، جن کا خاندان صدیوں سے اس قدیم اور بڑے کلیسا کا بشپ چلا آرہا تھا۔ راہب اعظم اس وقت اپنے مخصوص طلائی لبادے میں ملبوس تھے۔ سر پر سنہری ہڈ نما لمبوتری پگڑی، گلے میں صلیب، انگلی میں بشپ کی علامتی انگوٹھی اور ہاتھ میں دھاتی خمدار کروزیئر (خمدار دھاتی لاٹھی) تھی جو ان کو رعب دار بنا رہی تھی۔ ہال میں ہزاروں لوگ دم سادھے بیٹھے ہوئے تھے۔ اسٹیج کے دائیں جانب میڈل کے انتخاب کی جیوری کے افراد اپنی منقش چوبی کرسیوں پر باوقار انداز میں براجمان تھے، جیوری کا انتخاب بھی شہر کے ذہین اور دانشور طبقے سے کیا جاتا تھا۔ جیوری کی رائے کے بعد حتمی فیصلہ راہب اعظم کو ہی کرنا ہوتا تھا۔

مذہبی رسومات کی ادائیگی کے بعد پنڈال میں سناٹا چھا گیا۔ سب کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ راہب

اعظم میڈل کے اعلان کے لیے اپنی نشست سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

……❖❖❖……

''اس سال کے میڈل آف لوو کے لیے بھی کئی لوگوں میں سخت مقابلہ تھا، بہت مشکل ہو چلا تھا فیصلہ کرنا مگر فیصلہ تو کرنا ہی تھا اور پھر فیصلہ ہو گیا۔''

راہب اعظم نے تجسس بھرے انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا، پنڈال میں بے چینی کی ایک لہر پیدا ہوئی، سامعین نے بے چینی سے پہلو بدلے۔

''میں اب ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کرنا چاہتا۔'' راہب اعظم نے پراسرار انداز میں کہا، ان کے چہرے پر ایک بھید بھری مسکراہٹ تھی۔

بہت سے لوگ آج کے میڈل کے لیے امید لے کر آئے تھے۔ ان کے چہرے ستے ہوئے اور آنکھوں میں امید ہلکورے لے رہی تھی۔ اس وقت سب سے زیادہ بے تابی انہی کے انداز سے ہویدا تھی۔

''میں ایک ایسے فرد کو بلانے لگا ہوں کہ بظاہر تو اس کی زندگی اور اس کے اجداد کی زندگی محبت سے خالی نظر آتی ہے مگر میرے وجدان نے میری رہنمائی کی ہے کہ اس سال کے میڈل آف لوو کا اس سے بڑا حقدار کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں یہ میرے اندر کی آواز تھی جس نے مجھے بتایا، میری نگاہوں نے اس کے ماتھے پر جگمگاتی روشنی دیکھ لی تھی……''

راہب اعظم نے ذرا سا توقف کیا، بے چینی کی ایک لہر کلوسئیم کے ایک کونے سے دوسرے تک پھیلتی چلی گئی۔

''ہمارے آج کے معزز مہمان کو سامنے لایا جائے۔'' راہب اعظم نے صلیب پر انگلی پھیرتے ہوئے بارعب آواز میں کہا۔

ہال میں ایک گہرا سکوت چھایا تھا، صرف بے چین سانسوں کی آواز تھی جو فضا میں گونج رہی تھی، ہزاروں نگاہیں اسٹیج کے عقب میں جمی تھیں جہاں سے آج کے مہمان کو آنا تھا۔

کلیسا کے خدمت گاروں کے دائرے میں زرق برق لباس میں ملبوس ایک بچے کو اسٹیج پر لایا گیا۔ ہال میں گہرا سناٹا تھا۔ اچانک ہال میں سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ پیدا ہوئی جو تھوڑی دیر میں شور میں ڈھل گئی۔

''ہم نہیں مانتے اس فیصلے کو، یہ اس میڈل کی توہین ہے، یہ ہماری روایات کی توہین ہے۔''

کئی آوازیں ایک ساتھ ہال میں گونجیں، جیسے کسی نے ہال میں بم چلا دیا ہو، کبھی ایسے نہ ہوا تھا کہ کسی نے راہب اعظم کے فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہو، مگر آج انہونی ہو چکی تھی۔ شاہی خاندان بھی تذبذب کا شکار نظر آ رہا تھا۔ سارا ہی ہال احتجاج میں کھڑا ہو چکا تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

''یہ ظالم لوگوں کی نسل ہے، سنگدل اور پتھر دل لوگوں کا خون ان کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔'' کچھ آوازیں کلوسئیم کی سنگی دیواروں سے ٹکرائیں۔

''یہ غدار اسپارٹکس کی نسل سے ہے، جس نے بغاوت کی تھی، جس کی وجہ سے روما کی سلطنت تباہ ہوتے ہوتے بچی تھی۔'' چند مزید آوازوں کی بازگشت چمگادڑوں کی طرح چھت سے لٹک گئیں۔

''لوو میڈل کی اتنی توہین۔ گلیڈی ایٹرز کے خاندان میں جائے گا محبت کا پیغام۔ ارے ان کو کیا پتہ کہ محبت کیا ہے۔ قاتل ہیں یہ قاتل۔'' آوازوں کے بگولے ہال میں چکرا رہے تھے، بچے کا چہرہ ذلت کے احساس سے سفید پڑ گیا تھا۔ ایک خدمت گار نے اسے محبت کے ساتھ خود سے لپٹا لیا تھا ورنہ وہ

کب کا گر چکا ہوتا۔

''خاموش...... میں کہتا ہوں چپ ہو جاؤ۔ میں جانتا ہوں کہ تم لوگ کیا سوچ رہے ہو اور ٹھیک ہی سوچ رہے تمہاری کیونکہ تم نے ویسا سوچا جیسا تم نے سوچنا چاہا، چاہے حقیقت جو بھی تھی مگر تم حقائق سے آج تک نظریں چرا رہے ہو۔ اس کا خاندان قاتل کیسے ہوا جبکہ ان کو خونی درندے کے قتل یا اپنی بقا میں سے کسی ایک کو چننا تھا۔'' راہب اعظم کی پتھریلی آواز نے جیسے ان پر طلسم پھونک دیا۔ ہال میں پھر سے گہرا سکوت تھا مگر احتجاج کی لہر ابھی تک گردش میں تھی۔

''یہ سچ ہے کہ اس بچے کی رگوں میں اسپارٹکس کا خون دوڑ رہا ہے۔ وہی اسپارٹکس جو باغی تھا' وہی اسپارٹکس جسے بغاوت کے جرم میں ہلاک کر دیا گیا تھا' وہی اسپارٹکس کہ جو اپنے وقتوں کا بہادر اور جری گلیڈی ایٹر تھا۔ ہاں یہ بچہ اسی خاندان سے ہے مگر کسے معلوم کہ سچ کیا ہے، کون جانتا ہے کہ وقت کی دھند کے پار کیا ہوا تھا؟ تمہیں آج سننا پڑے گا، آج صرف سننے کا دن ہے۔'' راہب اعظم کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی چھلک آئی۔

...... ❖ ❖ ❖ ......

''آج بڑا مقابلہ ہے کلوسیئم میں، اسپائیکلس لڑکے کا مقابلہ آج خونی شیر سے۔'' مشعل تھامے ہوئے قید خانے کے پہریدار نے پاس کھڑے دوسرے پہریدار سے سرگوشی کی۔

''ہاں اور سنا ہے کہ شیر تین دن سے بھوکا ہے، اس کی خوفناک دہاڑ اور غراہٹ میں پاگل پن جھلکنے لگا ہے، دیوتا رحم کریں اسپائیکلس پر۔'' پہریدار کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں رقصاں تھیں۔

''لوگ بے چینی سے منتظر ہیں اس مقابلے کے، تین ماہ سے کوئی مقابلہ جو نہیں ہوا تھا۔'' پہلے پہریدار نے دبے لہجے میں کہا۔

''اچھا چپ کر جاؤ، کوئی سن نہ لے۔'' دوسرے پہریدار نے خوفزدہ انداز میں پہلے کو گھورا۔

اسپائیکلس کا نام روم میں بہادری کی علامت بن چکا تھا، وہ ایک گلیڈی ایٹر تھا۔ اسپارٹکس کے خاندان کا گلیڈی ایٹر' ایک غلام۔ محض تفریح کا ذریعہ کئی درندے اس کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔

وہ فاتحانہ انداز میں اکھاڑے میں اترتا، اس کے چہرے پر ایک پرسکون مسکراہٹ ہوتی جس میں زمانوں کے بھید چھلک رہے ہوتے تھے، اکثر وہ پہلے چند منٹوں میں ہی خونی درندے کو چیر پھاڑ دیتا تھا۔ وہ عوام میں بہادری کے لیے تو مقبول تھا مگر لوگ اس کا خون دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کی تڑپتی لاش ان کے دل میں ٹھنڈک بن کر اتر سکتی تھی مگر ہر بار اسپائیکلس ان کی امیدوں کا محل زمیں بوس کر دیا کرتا تھا، شاہی خاندان بھی درندے کی فتح چاہتا تھا مگر اسپائیکلس ان کی خوشی کے لیے اپنا جیون داؤ پر نہیں لگانا چاہتا تھا، جیتنا اس کی زندگی کی ضمانت تھا۔ اسے ہر حال میں جیتنا ہوتا تھا۔

...... ❖ ❖ ❖ ......

یہ جنوری کی ایک چمکیلی صبح تھی۔ کلوسیئم میں انسانی اژدہام ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وحشت زدہ چہرے چنگھاڑتے، جھاگ اڑاتے اور درندگی سجائے ہوئے چہرے' خون دیکھنے کے لیے بے تاب چہرے' لاشوں پر تھرکنے کے انتظار میں بے کل چہرے' ایک ہی طرح کے ہزاروں چہرے کلوسیئم میں جمع تھے۔ وہ اسپائیکلس کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ انہیں علم تھا کہ آج بھی غلام جیت جائے گا مگر امید کی ایک کرن کے تحت وہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ اس مرتبہ

درندہ زیادہ خونخوار اور وحشی تھا۔ اکھاڑے کے ایک کونے میں شیر کا پنجرہ تھا۔ یہ ایک دیوہیکل اور لمبے ڈیل ڈول والا درندہ تھا، اس کی آنکھوں میں غضب اور حرکات میں بجلی کے لپکتے کوندے سی پھرتی تھی، ایسی پھرتی جس میں بے چینی اور وحشت جمع تھی۔ پنجرے کے پاس ایک غلام کھڑا تھا جس نے دروازہ کھول کر دوڑ جانا تھا۔ مقابلہ شروع ہونے والا تھا۔ کلوسئیم تماشائیوں اور درندے کی چنگھاڑ سے لرز رہا تھا۔ شاہی خاندان بالکونی میں براجمان تھا۔ شہزادے، شہزادیاں اور بادشاہِ وقت شوقِ انتظار میں پہلو بدل رہے تھے۔

آخر وہ لمحہ آن پہنچا جب اسپائیکلس اکھاڑے میں داخل ہوا۔ لوگوں نے اس پر تھوکنا اور آوازیں کسنا شروع کر دیں۔ اسپائیکلس چمکیلے مسلز والا لڑاکا تھا جس کی رگ رگ سے توانائی اور زندگی پھوٹ رہی تھی، اس کا قد عام رومیوں سے ایک ہاتھ بلند تھا، اس کے ایک ہاتھ میں چمکدار تلوار تھی۔ سر پر حفاظتی خول تھا، سینے کے گرد آہنی لباس اور بائیں ہاتھ پر نوکیلا دستانہ تھا، وہ ڈھال استعمال نہیں کرتا تھا، اسے معلوم تھا کہ ڈھال صرف ایک نفسیاتی حوصلہ ہوتی ہے، ڈھال درندے کی ضرب کو روک نہیں سکتی۔ اس وقت اسپائیکلس کی آنکھوں میں مخصوص فاتحانہ مسکراہٹ دوڑ رہی تھی، وہی مسکراہٹ جس سے لوگ چڑتے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ ہر کوئی اسے شکست زدہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی خون میں لت پت لاش جانے کتنی آنکھوں میں ٹھنڈک بن کر اترے گی۔ وہ ہارنے سے پہلے ہارنا نہیں چاہتا تھا، وہ جینا چاہتا تھا کیونکہ اس کے جینے کی ٹھوس وجہ موجود تھی، اس وجہ سے اس کے چہرے پر مہربان اور حوصلہ بھری مسکراہٹ ہوتی تھی۔ وہ بھوکے شیر سے مقابلہ کرنے کے لیے اکھاڑے میں تنہا کھڑا تھا۔

بادشاہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور غلام نے پنجرے کا پٹ کھول کر دوڑ لگا دی۔

شیر ایک جست لگا کر باہر آیا اور ہوا میں زقند بھر کر اسپائیکلس پر جھپٹا جیسے اسے معلوم ہو کہ یہی وہ شخص ہے جس کو زیر نہ کرنے کا مطلب موت ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے موت ہوا میں تیرتی ہوئی چلی آ رہی ہو۔ تماشائیوں کے منہ سے لذت بھری چیخ نکلی۔ درندہ واقعی جلدی میں تھا، بھوک نے اس میں وحشت بھر دی تھی۔

اسپائیکلس نے آخری لمحے میں زمین پر لڑھکنیاں کھا کر شیر کے ابتدائی حملے کو ناکام کیا، درندہ ایک دہاڑ کے ساتھ زمین پر گرا اور پلک جھپکنے میں کھڑا ہو گیا، اس کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی، نوکیلے دانت ادھ کھلے منہ سے جھانک کر خوف پیدا کر رہے تھے۔ دونوں حریف پھر آمنے سامنے تھے۔ شیر کی دم بے چینی سے ہل رہی تھی وہ عام شیروں سے دوگنی جسامت رکھتا تھا۔

شیر نے اس بار ہوا میں چھلانگ لگانے کی بجائے اسپائیکلس پر براہ راست حملہ کیا، قریب تھا کہ اس کے دائیں پنجے کا وار اسپائیکلس کا شانہ ادھیڑ دیتا کہ غلام لڑکے نے انتہائی پھرتی سے اپنا پہلو بچا۔تے ہوئے شیر کی گردن پر تلوار سے وار کیا جو اچٹتا ہوا شیر کی بالوں بھری گردن پر محض خراش ہی ڈال سکا۔ کلوسئیم شیر کی دہاڑ اور تماشائیوں کی مغلظات سے گونج اٹھا، لوگ اسپائیکلس کی لاش دیکھنا چاہتے تھے۔ شاہی بالکونی میں بھی بے چینی اپنے عروج پر تھی۔

اسپائیکلس کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح بے پروائی تھی جو تماشائیوں کو بھڑکا رہی تھی۔

اسپائیکلس کو یوں لگا جیسے ایک درندہ اکھاڑے

ں اور ہزاروں باہر ہیں۔ وہ درندوں کے درمیان ہ ا ہے، ہر کوئی اس کی موت چاہ رہا تھا، سبھی اس کی بوٹیاں نوچنا چاہتے تھے۔ شیر ایک بار پھر ہوا میں چھلانگ لگا چکا تھا، وہ سپائیکلس کو روند دینا چاہتا تھا۔

اسپائیکلس نے اپنی تلوار سیدھی کی، وہ اس کھیل کو اسی لمحے ختم کر دینا چاہتا تھا، اسے معلوم تھا کہ بس اگلے لمحے وہ فاتح ہوگا ہمیشہ کی طرح۔

اچانک بالکونی کی طرف سے ایک وحشت بھری آواز سنائی دی۔ ایک نسوانی آواز، جنون میں ڈوبی۔

"مر کیوں نہیں جاتے تم نیچ انسان۔"

اسپائیکلس نے حیرت سے بالکونی کی طرف دیکھا، ایک لمحے کو اس کی نظریں اس دلکش وجود پر پڑیں۔ یہ شہزادی ٹریشا تھی' خوبصورتی اور حسن کا شاہکار۔ اس وقت وہ بے چینی سے مٹھیاں بھینچے اپنی نشست پر کھڑی ہو چکی تھی۔ اسی نے اسپائیکلس کو الفاظ کا کوڑا مارا تھا۔

اسپائیکلس جیسے پتھر کا ہو چکا تھا، اس کی تمام حسیات اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ تلوار والا ہاتھ ہوا میں ساکت تھا' یہ بات ان ہونٹوں سے نکلی تھی جو اس کے لیے وجہِ زندگی تھے۔ وہ جیت سکتا تھا مگر وہ جیتنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں درد سمٹ آیا۔ وہ محبت اس کی آنکھوں سے لہو بن کر بہہ رہی تھی جو اس نے شہزادی ٹریشا سے چپکے چپکے کی تھی، خاموش محبت۔ وہ تو اس کے لیے جیتا کرتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ شہزادی باقیوں جیسی نہیں ہے، شہزادی اس کو جیتا دیکھنا چاہتی ہے، شہزادی اس کی ہر فتح پر خوش ہوتی ہے مگر آج اس پر انکشاف ہوا کہ شہزادی بھی درندے کے ساتھ ہے، شہزادی اس کی لاش دیکھنا چاہتی ہے، شہزادی اس وحشی مجمعے کے ساتھ ہے۔ وہ تو غلام ہے اور غلام تنہا ہوتے ہیں۔ وہ ساکت کھڑا تھا۔ یہ ایک لمحہ تھا، اس لمحے میں جیسے شہزادی نے بھی اس کی آنکھوں کا کرب پڑھ لیا تھا، شہزادی کرسی پر ڈھے سی گئی۔

فیصلہ تو ہو چکا تھا، اس ایک لمحے نے فیصلہ کر دیا تھا۔ شیر ایک دہاڑ کے ساتھ لڑاکا غلام پر گرا' اس کا ہاتھ اسی طرح فضا میں ساکت تھا اور نگاہیں بالکونی پر جمی تھیں۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ سیکڑوں درندوں کو ایک لمحے میں موت کے منہ میں پہنچانے والا خاموشی سے پیچھے ہٹ چکا تھا۔

تماشائیوں کے منہ سے چیخ نکلی' اس چیخ میں مسرت نہیں بلکہ درد تھا، کرب تھا اور تڑپ تھی۔ روم کے بہادر گلیڈی ایٹر نے جان دے دی۔ محبت پر جان دے دی۔ وہ یہ تو نہیں چاہتے تھے۔ وہ اسپائیکلس کو مقابلہ کرتے دیکھنا چاہتے تھے مگر وہ کس کے لیے لڑتا۔ اس کی موت تو اس نے مانگی تھی جو وجہِ زندگی تھی۔

اسپائیکلس کی بکھری لاش کے گرد سسکیوں کی گونج رقص کر رہی تھی۔

⁂

کلوسئیم میں سسکیاں گونج رہی تھیں، راہبِ اعظم کی سسکیاں' عوام کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی سسکیاں، جیوری اور شاہی خاندان کی سسکیاں۔

مجمع سر سے ہیٹ اتار کر ننھے مہمان کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو چکا تھا۔ عدم آباد میں اسپائیکلس کی روح مسکرا رہی تھی۔

قسط نمبر 27

قلندر ذات

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الٰہی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو ذات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندر، ریچھ اور کئی دکھانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آہن کی ہے جو ذات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنی تئیں دنیا مسخر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسائیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے۔ کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔





جسپال حیرت سے بُت بنا جمال کو دیکھ رہا تھا جو ایک اُوٹ میں کھڑا سامنے کی سمت فائرنگ کرتا چلا جارہا تھا۔ ایسے میں بانیتا کور کی کراہ ابھری تو اسے ہوش آیا۔ تب تک ہرپریت اس کی طرف بڑھ چکی تھی۔ اس نے بانیتا کور کو سنبھالا۔ تبھی نوتن کور نے تیزی سے چیختے ہوئے کہا۔

''جسپال۔! وہ سامنے کھڑی سیاہ کار بلٹ پروف میں ہم بانیتا کو اسپتال لے جاسکتے ہیں۔''

جسپال نے لمحے کا کوئی حصہ بھی سوچنے میں ضائع نہیں کیا اور فوراً اس جانب بڑھ گیا۔ جو اس سے تقریباً بیس پچیس گز کے فاصلے پر تھی۔ نجانے کیوں جمال کے وہاں ہونے کی سمجھ نہ آنے کے باوجود وہ حوصلہ مند ہوگیا تھا۔ اسے پورا یقین ہوگیا تھا کہ وہ اس افتاد سے پوری طرح نمٹ لے گا۔ چابی ڈیش بورڈ ہی میں تھی۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور بانیتا کور کی جانب لپکا۔ نوتن کور کے ساتھ ہرپریت اس کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ جبکہ کرن کور اور بچن کور ہاتھوں میں گنیں لیے فائرنگ کررہی تھی۔ انہوں نے لمحہ بھر کو انہیں دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے جانے کو کہا، اس کے ساتھ ہی انہوں نے فائرنگ کی بوچھاڑ کردی۔ جسپال نے گیٹ کی سیدھ میں کار نکالی اور پھر نکلتا چلا گیا۔

گیٹ کے باہر کا منظر ہی عجیب تھا، یوں دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے انہیں ختم کرنے کو پوری فوج ہی اتری ہوئی ہو۔ سامنے کافی ساری گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان کے ساتھ بہت سارے لوگ تھے۔ ایک بار تو جسپال کا دل کیا کہ یہیں پر اتر کر وہ ان پر گولیاں برسانا شروع کردے لیکن کار کے اندر بانیتا کور کی ابھرتی ہوئی کراہوں نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا۔ گیٹ سے نکلتے ہی کئی گنوں کا رُخ کار کی جانب ہوا ۔انہوں نے شعلے اگلے، مگر جسپال زن سے گذر گیا وہ اس قدر تیز رفتاری سے بھاگ رہا تھا، جس قدر کار اس کی گرفت میں تھی۔ اس نے ٹریفک کی پروا نہیں کی۔ اسے اندازہ تھا کہ اسپتال کس طرف ہوسکتا ہے، تبھی ہرپریت اس کی رہنمائی کرنے لگی۔ اس دوران نوتن نے رتن دیپ سنگھ کو اس حملے کے بارے میں مطلع کردیا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ کے اندر اسے جالندھر ہی سے پوری طرح مدد مل جائے گی۔ رتن دیپ سنگھ نے اسے ایک نجی اسپتال کے بارے میں بتایا جہاں بانیتا کو لے جایا سکتا تھا۔ نوتن اس کے بارے میں اچھی طرح جانتی تھی۔ دس منٹ کے اندر اندر وہ وہاں پہنچ گئے۔ کئی سارے لوگ ان کے انتظار میں اسپتال کے باہر ہی کھڑے ہوئے تھے۔ جیسے ہی کار رُکی، انہوں نے بانیتا کور کو سنبھال لیا۔ وہ اسے سیدھا آپریشن تھیٹر لے گئے۔ کچھ لوگ تو اس کی حفاظت کے لیے وہاں آگئے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہاں ایسے ہی لوگوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد آپریشن تھیٹر سے نکلنے والے ڈاکٹرز میں سے ایک نے انہیں بتایا کہ بانیتا کور اب خطرے سے باہر ہے، لیکن ابھی اُسے ہوش نہیں، صبح تک اسے ہوش آجائے گا۔

جیسے ہی جسپال کو یہ اطمینان ہوا، اس نے پاس کھڑی ہرپریت سے کہا۔

''ہرپریت۔! تم انوجیت سے کہہ کر گھر سے گاڑی منگوالو اور اس میں چلی جانا، میں فارم ہاؤس جا رہا ہوں۔ یہ بات نوتن کو بتا دینا۔''

یہ کہہ کر وہ واپس فارم ہاؤس کی طرف جانے کے لیے پارکنگ کی طرف بڑھ گیا۔ اسی وقت اسپتال کے گیٹ کے پاس پارکنگ میں کار رکی اور اس

ان سے بلدیو سنگھ، بچن کور اور جمال باہر نکلے۔ جمال تیر کی سی تیزی کے ساتھ ان کی طرف بڑھا۔ اس نے جمال کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور باقیوں کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چلے گئے تو جسپال کا جمال سے پہلا سوال یہی تھا کہ تم یہاں کیسے؟

"دیکھو! یہ توجیہات نہ تمہاری سمجھ میں آئیں گی اور نہ میں تمہیں سمجھا پاؤں گا۔ اس وقت تم پر آنچ آئی تو میں یہاں پر ہوں۔ جیسے ہی تم پر خطرہ ٹل گیا، میں یہاں رہ ہی نہیں پاؤں گا۔"

"مطلب تم بتاؤ گے نہیں؟"

"نہ بتانے والی کوئی بات نہیں ہے۔ بس اتنا سمجھ لو کہ عشق، زمان و مکان کی قید سے آزاد کر دیتا۔ یہی وہ قوت ہے جو زمان و مکان پر تسخیر کی قوت رکھتی ہے۔ یہی تسخیر انسان کی خودی ہے۔ ابھی اس کی وضاحت کا موقع نہیں، وقت آنے پر پوری طرح سمجھا دوں گا، یہ وعدہ رہا۔" جمال نے جواب دیا تو جسپال اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

"اچھا ہمارے بعد کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، تم نے فارم ہاؤس کے تہہ خانے میں اسلحہ نہیں دیکھا۔ وہاں سب کچھ موجود ہے۔ بس اسے استعمال کیا اور عقل سے کیا۔ انہیں کچھ دیر تک روکا، پھر باہر سے بھی مدد آ گئی۔ بس وہ لوگ بھاگ گئے، کچھ زخمی ہوئے، جو مر گئے، وہ ساتھ لے گئے، تین بندے ہم نے ان کے پکڑ لیے ہیں۔" جمال نے بتایا

"گڈ۔ بندے کہاں ہیں؟" جسپال کے منہ سے بے ساختہ نکلا

"وہ رتن دیپ سنگھ کے بندے لے گئے ہیں۔" جمال نے کہا پھر بولا۔ "سناؤ، اب یہاں سکھ شانتی ہے نا۔" جسپال نے پوچھا۔

"لگتا تو یہی ہے۔" جمال نے جواب دیا

"اب سنبھال لو گے؟" اس نے پوچھا۔

"اب تو میں سب سنبھال لوں گا۔" جسپال نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا

"آؤ، ایک نگاہ بانیتا کور کو دیکھ لیں۔" جمال نے کہا اور اسپتال کے اندر کی جانب بڑھ گیا۔

وہ دونوں آگے پیچھے کاریڈور میں چلتے ہوئے آئی سی یو تک جا پہنچے۔ شیشے کی دیوار میں وہ کچھ دیر تک بانیتا کور کو دیکھتا رہا۔ جسپال بھی اسے پوری توجہ اور گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے ساتھ کھڑے جمال سے جب بات کرنے کے لیے رُخ موڑا تو وہ وہاں پر نہیں تھا۔ دور دور تک اس کی موجودگی کا احساس نہیں تھا۔ اس بار جسپال کو حیرت محسوس نہیں ہوئی بلکہ اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

بانیتا کور کو ابھی ہوش نہیں آیا تھا۔ اسے سنبھالنے کے لیے اس کے بھائی اور بہت سارے لوگ وہاں موجود تھے۔ اس لیے جسپال سنگھ فارم ہاؤس جا پہنچا، جہاں باقی سب موجود تھے۔ پچھلی شام جو فائرنگ کے آثار تھے ابھی تک ویسے ہی موجود تھے۔ اگرچہ پولیس نے اپنی کارروائی کر لی تھی، لیکن وہ سب دکھاوا تھا، یہ شاید ان کے بس کی بات ہی نہیں تھی۔ فارم ہاؤس پر سوائے اسلحہ کے کوئی ایسی غیر قانونی چیز نہیں تھی۔ وہ اندر لاؤنج میں چلا گیا۔ ایک صوفے پر بچن کور، کرن کور اور نوتن کور بیٹھی ہوئی تھیں، جبکہ دوسری طرف بلدیو سنگھ، وکرم سنگھ، اور سرجیت سنگھ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ان کے درمیان جا کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ماحول میں سوگواریت پھیلی ہوئی تھی۔

"کچھ پتہ چلا؟" اس نے بیٹھتے ہی سب کی طرف دیکھ کر پوچھا تو نوتن نے دھیمے سے بتایا

"میری ابھی کچھ دیر پہلے رتن دیپ سنگھ جی سے

بات ہوئی ہے، اسی بارے میں، انہوں نے کہا ہے کہ ایک بندہ ابھی تھوڑی دیر میں دہلی سے یہاں پہنچنے والا ہے، اس کے پاس کافی معلومات ہیں، وہی بریف کرے گا۔''

''کب تک آجائے گا وہ؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''حتمی تو کہا نہیں جا سکتا کب آئے گا، لیکن آج ہی ایک دو گھنٹوں سے پہلے آجائے گا، وہ وہاں سے نکل پڑا ہے، اسی کام کے لیے۔'' وہ اسی دھیمے لہجے میں بولی۔

''اس کا مطلب ہے، انتظار۔'' جسپال نے مضطرب انداز میں کہا تو کرم سنگھ بولا۔

''میرا خیال ہے کہ......''

بلدیو سنگھ اس کی بات کاٹ کر تیزی سے بولا۔

''خیال، اندازہ کچھ نہیں، حقائق ہونے چاہئیں بس، یہ جو کھیل ہم نے شروع کیا ہے، اس میں اندازے کی ذرا سی غلطی سب کچھ ختم کر دے گی۔ اب بہت زیادہ محتاط ہو جانے کا وقت آگیا ہے۔''

''چلیں انتظار کرتے ہیں اس کا۔'' نوتن کور نے کہا تو ایک طویل خاموشی ان میں در آئی۔ جیسے ہر بندہ اپنے آپ میں سوچ رہا ہو۔ انہیں کل شام ابھی تک یاد تھی، جب موت انہیں چھو کر گزر گئی تھی۔

اس وقت روشن دن کا پہلا پہر ختم نہیں ہوا تھا کہ وہ شخص آگیا، جس کے بارے میں رتن دیپ سنگھ نے انہیں بتایا تھا۔ وہ لمبے قد کا مضبوط جوان تھا۔ پہلی نگاہ میں وہ کوئی فلمی ہیرو ہی لگتا تھا۔ وہ ان کے درمیان آ بیٹھا تو اعتماد سے بھرپور لہجے میں بولا۔

''[redacted] میں کون ہوں، اس کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس کے بعد ہماری [redacted] ملاقات ہو۔ یہ ساری باتیں میں فون پر بھی بتا سکتا تھا لیکن میں آپ سب لوگوں کے ہر سوال کا جواب دینے آیا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے سب کی طرف دیکھا اور پھر کہتا چلا گیا۔ ''یہ جو تم لوگوں پر حملہ ہوا ہے، اس میں ایجنسیاں پوری طرح ملوث ہیں۔ ان کا مقصد تم لوگوں کو بے نقاب کرنا تھا، وہ اس مقصد میں کامیاب ہو گئے ہیں۔''

''کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں؟'' بلدیو سنگھ نے سوال کیا۔

''پوری طرح، یہ ایک بار کی کوشش نہیں تھی، تین بار انہوں نے ایسا کیا ہے اور تینوں بار ہی وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ اب ہونا تو یہ چاہیے کہ وہ تم سب کو پکڑ لیں، مقدمہ بنائیں اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے سڑنے، مرنے کے لیے پھینک دیں۔ سوال یہ ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟

''ہاں یہ سوال بنتا ہے؟'' جسپال سنگھ نے تیزی سے کہا۔

''وہ ایسا اس لیے نہیں کر سکے کہ انہیں اب بھی شدید الجھنیں ہیں۔ وہ اپنے بڑوں کو حتمی جواب نہیں دے پائے، اسی لیے......''

اس نے کہنا چاہا کہ سرجیت سنگھ نے کہا۔

''یار آپ کہانی مت سناؤ، سیدھی بات کرو۔''

اس پر وہ ذرا سا مسکرایا اور پھر بولا۔

''سیدھی بات یہ ہے کہ ان کی پہلی الجھن بانیتا کور ہے، ایک شام پہلے وہ پاکستان میں دیکھی گئی لیکن اگلے دن وہ ممبئی سے امرتسر آ گئی۔ پوری فورس واہگہ اور اس کے آگے پیچھے لگی رہی تھی۔ انہیں کوئی ریکارڈ نہیں ملا، اور نہ کوئی ایسا شک بھی ایسا ملا کہ وہ سندیپ کور اور اس کے درمیان کوئی کڑی تلاش کر سکیں۔ اس کا ایک دم سے ممبئی میں ظاہر ہونا ان کے لیے حیرت انگیز ہے۔ لاہور سے ممبئی کی کڑیاں نہیں مل رہی ہیں۔''

"بس یہی یا کچھ اور......" سر جیت نے پوچھا تو وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

"دوسرے وہ لوگ جو چند دن پہلے گوور میں ہنگامہ کیے ہوئے تھے، وہاں ایک بڑا سیاست دان قتل ہو گیا، وہ لوگ ایک دم سے بامیتا کور کے ساتھ کیسے آ گئے، اتنے شارٹ وقت پر؟ اس کے پیچھے وہ کسی بڑے نیٹ ورک کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ یہی سمجھ رہے ہیں کہ سامنے آنے والے یہ چند لوگ مہرے ہیں، اصل لوگوں تک رسائی کی جائے یا انہیں ہی پکڑ لیا جائے۔"

"یہ تو وہ کسی حد تک درست سوچ رہے ہیں۔" ہلدیو نے مسکراتے ہوئے کہا تو ماحول ایک دم سے نرم ہو گیا

"اور اب یہ جو بات میں بتانے جا رہا ہوں یہ بالکل نہ سمجھ میں آنے والی ہے، جسپال اور بامیتا کا مشترکہ دوست جمال، ایک ہی وقت میں یہاں بھی ہے اور پاکستان میں بھی۔ جس وقت یہاں فائرنگ ہونے کی ویڈیو دکھائی گئی تھی، تو اس میں جمال کو دیکھا گیا۔ اس کی یہاں موجودگی نے سب کو الرٹ کر دیا کہ یہ یہاں کیسے پہنچا، لیکن اسی وقت پاکستان سے تصدیق آ گئی کہ وہ اپنے گاؤں میں ہے۔ دراصل وہ اس کے گاؤں نور نگر پر حملہ کروانے کی پوری تیاری کر چکے تھے۔"

"تو پھر حملہ......" جسپال نے تیزی سے پوچھا۔

"نہیں ہوا، اس کی یہی وجہ ہے کہ وہ ہے کہاں؟" وہ سکون سے بولا پھر لمحہ بھر رک کر کہنے لگا، "وہ اس اسپتال میں بھی دیکھا گیا، جہاں اب بامیتا کور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پہلے اپنی تصدیق کرنا چاہ رہے ہیں، اور یہ بھی تلاش کر رہے ہیں کہ سندیپ کور سے ان کا ان سے کہیں کوئی تعلق تو ہے؟"

ایک دم سے ان میں خاموشی چھا گئی۔ یہ خاموشی کافی دیر تک رہی۔ نوتن کور جانتی تھی کہ سندیپ کور پر کیا گزری، اس کے ساتھ کیا ہوا، وہ کیسے بھارت واپس آئی۔ مگر وہ خاموش رہی۔ یہ تفصیلات بتانے کا ابھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ہر بندہ اپنی جگہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیسے ہوا؟ انہوں نے بھی ایک شخص کو یہاں فائرنگ کرتے دیکھا تھا۔ اور اونچی اونچی آواز میں جسپال سے باتیں کرتے ہوئے سنا تھا۔ یہ خاموشی پھر اسی نے ہی توڑی۔

"سوال یہ ہے کہ ایک ہی وقت میں کوئی بندہ دو جگہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا جمال یہاں ہے؟ یا اس کا کوئی ڈپلی کیٹ یہاں پر ہے؟"

"آپ تصدیق کرنے آئے ہو یا بتانے؟" جسپال سنگھ نے پوچھا۔

"میں صرف بتانے آیا ہوں، تاکہ اسی مناسبت سے آئندہ کا لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ ورنہ وہ تو ہمیں گھیر چکے ہیں، وہ کسی وقت بھی ہمیں پکڑ سکتے ہیں۔" اس نے جواب دیا تو ہلدیو سنگھ نے پورے سکون سے کہا۔

"دیکھو مسٹر۔ اس کی کسی کو کوئی سمجھ نہیں ہے، ممکن ہے یہ کوئی چکر رہا ہو، اس بارے میں اگر بامیتا کور کچھ بتا سکے تو ممکن ہے یہ گتھی کھل جائے، ورنہ ہم سب کی سمجھ میں بھی یہ بات نہیں آ رہی ہے۔ مگر یہ پکی بات ہے کہ وہ یہاں ہو بھی تو ہمارا اس سے کوئی لینا دینا نہیں، اس کے بارے میں ہمیں کوئی علم نہیں ہے۔"

"چلیں، اگر ہم فرض کر لیں کہ وہ ہے تو بھی اور اگر نہیں تو بھی، ایجنسیوں کا تو یہ یقین ہو جانا چاہیے کہ وہ یہاں ہے اور کسی وقت بھی اپنی کارروائی کر سکتا ہے؟" وہ ان سب کی طرف دیکھ کر یوں بولا جیسے پوچھ رہا ہو۔ تبھی ہلدیو بولا۔

"اس طرح تو وہ ہمارے پیچھے ہی لگے رہیں گے، اکتا جائیں گے تو ہمیں پکڑ لیں گے، یہ کوئی بات نہیں، وہ بات کرو جو کرنے والی ہے۔"

"تو سنو پھر۔! اب تم لوگ نگاہوں میں آ چکے ہو اور پوری طرح ان کے سامنے ہو۔ اب آپ لوگوں کو دو میں سے ایک فیصلہ کرنا ہوگا۔ یا تو اپنی کاروائی جاری رکھو اور پکڑے جاؤ، کسی گولی کا نشانہ بنو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ زیر زمین چلے جاؤ، ملک سے باہر بھاگ جاؤ۔" اس نے سب کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہم نے ایسا کچھ بھی نہیں کرنا، جو ظلم ہوگا، اس کے خلاف آواز بلند کریں گے، جیسا بھی ہو۔ موت سے ہمیں کوئی ڈرا نہیں سکتا۔ اب اگر کوئی کام کی بات ہے تو بتاؤ، ورنہ......" بلدیو نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ تب وہ دھیمے سے انداز میں مسکرایا اور بولا۔

"دیکھو ویر جی۔! سارے بھارت کو ایک طرف رکھو، ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں، ہمیں اپنے پنجاب سے مطلب ہے اور وہ بھی خالصہ پنجاب کی۔ اس وقت ہندو راج کے خلاف جس قوم میں سب سے زیادہ نفرت ہے، وہ سکھ قوم ہے۔ ہندو بھی اسے جانتے ہیں، ان کے بڑے مسلمان، سکھ اور عیسائی کو کیسے ختم کرنا چاہتے ہیں، یہ روزانہ نت نئے منصوبے بناتے ہیں۔ جہاں وہ نسل کشی کا سوچتے ہیں، وہاں وہ ان میں پائی جانے والی سوچ کو بھی ختم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اب تک پوری قوت سے کچھ نہیں کر سکے سوائے سازشوں کے، لیکن اب وہ کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔ اور انہیں طاقت دی ہے، یہودی لابی نے، انہوں نے اس مقصد کے لیے باقاعدہ ادارے بنا لیے ہیں، جن کی پوری تفصیلات میرے اس بریف کیس میں ہے، وہ میں تم لوگوں کو ابھی دے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے سانس لیا، بریف کیس کھولا، اس میں سے ایک نارنجی رنگ کی فائل نکال کر بلدیو سنگھ کی طرف بڑھا دی۔ اس نے پکڑ لی تو وہ بولا۔ "اس میں اس پورے نیٹ ورک کے بارے میں تفصیل ہے، یا تو اسے ختم کرنے کا ٹاسک لو، اور سکھی پر احسان کرو، یا پھر زیر زمین چلے جاؤ، کہیں دوسرے ملک جانا ہے تو بتاؤ، وہاں بھیج دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے طویل سانس لی جیسے اپنی بات کہہ چکا ہو۔ تب بلدیو سنگھ نے پوچھا۔

"بس یا کوئی اور بات؟"

"میں دو گھنٹے مزید یہاں ہوں۔ آپ اس رپورٹ کو دیکھ لیں، کوئی بات پوچھنی ہے تو پوچھ لیں۔" اس نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"وکرم سنگھ، انہیں کمرہ دکھاؤ، جہاں یہ آرام کر لیں، ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہم بات کرتے ہیں۔" بلدیو سنگھ نے کہا تو وہ اٹھ گیا، وکرم سنگھ اسے لے کر اندر چلا گیا۔

☆......☆......☆

شام ہونے سے پہلے ہی ہم واپس گھر آ گئے تھے۔ اماں لان میں بیٹھی ہوئی میری منتظر تھی۔ نور نگر کی حویلی میں آنے کے بعد ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ میں کار سے اتر کر سیدھا ان کی طرف چلا گیا۔ وہ مسلسل مجھ پر نگاہیں ٹکائے ہوئے تھیں۔ میں نے ان کے پاس دھری ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے دھیمے سے لہجے میں پوچھا۔

"اماں، خیریت ہے آپ یوں یہاں پر بیٹھی ہیں؟"

"تمہیں بتایا تو تھا کہ میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔" انہوں نے پرسکون لہجے میں بتایا

"تو پھر آپ گئے نہیں، یہاں......" میں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"تُو آتا تو میں جاتی، تجھے ساتھ لے کر ہی جانا تھا۔ نجانے کہاں کہاں کی سیریں کرتا پھرتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئیں۔

"چلیں اب؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، وہ ابھی سوہنی آتی ہے تو چلتے ہیں۔" اماں نے پورچ کے داخلی دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں اماں کے کہے ہوئے لفظوں میں گم تھا۔ لیکن اظہار نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد سوہنی ایک چھوٹے سے بیگ کے ساتھ باہر آ کر کار کے پاس کھڑی ہوگئی۔ اماں اور میں اس طرف بڑھ گئے۔

بہت عرصے بعد میں اپنی اس گلی میں گیا تھا جہاں میرا بچپن بیتا تھا۔ پرانے سنگی ساتھی اور نجانے کیسا کیسا وقت یاد آتا چلا گیا۔ غربت کے وہ دن بھی مجھے یاد آ گئے، جب زندگی بڑی مشکل دکھائی دیتی تھی۔ لیکن ان حالات میں وہ بڑی آزادی کے دن تھے۔ نہ کوئی فکر اور نہ کوئی پریشانی۔ میں انہی یادوں میں کھویا ہوا اپنے گھر کے پھاٹک تک جا پہنچا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ سوہنی نے وہاں کی صفائی ستھرائی کے لیے ایک ملازمہ رکھ چھوڑی ہوئی تھی۔ اس دن وہاں آنے کا پیغام بھیج دیا۔ وہ منتظر تھی۔ صحن میں قدم رکھتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میں کبھی یہاں سے گیا ہی نہیں تھا۔ نیم کا درخت اب گھنا ہو چکا تھا۔ اس کے نیچے چارپائی دھری ہوئی تھی میں وہیں پر جا کر لیٹ گیا۔ ایک سکون میرے اندر یوں پھیلا جیسے کبھی کسی قسم کی کوئی فکر مجھے تھی ہی نہیں۔ اماں اور سوہنی اندر چلی گئیں۔ اور میں وہیں چارپائی پر پڑا اپنے آپ کو محسوس کرتا رہا۔

شام ڈھلے میں میں اٹھا اور گاؤں کے چوک میں جا بیٹھا۔ وہاں بہت سارے لوگ ملے باتیں ہوتی رہیں۔ ان کے دکھ درد اب بھی وہی تھے۔ لیکن ایک احساس مجھے ضرور ہوا تھا کہ وہ غلامی کی فضا میں سانس لے رہے تھے، اس سے نجات ملنے کے بعد وہ آزادی سے سوچ سکتے تھے۔ انہیں مجھ سے بہت ساری امیدیں بندھ گئیں تھیں، جنہیں پورا کرنے کا میں نے ارادہ کرلیا تھا۔

رات ہوگئی تھی، جب میں لوٹ کر واپس گھر آیا۔ صحن میں اماں کے پاس دوسری چارپائی پر سوہنی بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ کھانا لے آئی۔ ہم تینوں نے مل کر کھایا۔ اس دوران میں گاؤں کے لوگوں کی باتیں کرتا رہا۔ سوہنی برتن اٹھا کر کچن میں چلی گئی تو اماں نے بڑے سکون کے ساتھ مجھ سے پوچھا۔

"پتر۔! میری خواہش ایک طرف، وہ جو ہے سو ہے۔ لیکن تُو نے مجھے ایک بات بتانی ہے، وہی بات جو تمہارے دل میں ہے۔"

"جی، اماں پوچھیں۔" میں نے کسی وضاحت کے بغیر ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"سوہنی کے ساتھ تمہاری شادی کی جو میں نے خواہش کی ہے، کیا تو نے اسے دل سے قبول کیا ہے؟" انہوں نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں اماں، میں نے اسے دل سے قبول کیا ہے۔" میں صاف طور پر کہہ دیا۔

"یہ دل سے قبول کرنے کی وجہ؟" انہوں نے پوچھا تو مجھے لگا کہ اصل میں یہی بات ہی جو وہ مجھ سے پوچھنا چاہ رہی ہیں۔ کیونکہ یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے بھی سوچا کہ میں ایسا کیوں چاہتا ہوں؟ کیا مجھے سوہنی سے شدید محبت ہوگئی ہے جسے عشق کہا جاتا ہے؟ یا اماں کی خواہش؟ میں کچھ دیر تک کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

"اماں، یہ ایسی بات ہے، جس کے بارے میں ابھی تک میں بھی فیصلہ نہیں کر پایا ہوں کہ ایسا کیوں ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں اگر شادی کروں گا تو

سوہنی ہی ہے؟'' میں نے تذبذب سے کہا۔

''وہی تو پوچھ رہی ہوں، کہ ایسا کیوں؟'' انہوں نے پھر وہی سوال کر دیا تو میں نے پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد کہا۔

''میں کوئی ایک وجہ نہیں بتا پاؤں گا۔''

''اچھا!'' یہ کہہ کر وہ بھی چند لمحے سوچتی رہیں پھر بولیں۔ ''کسی ایک کے ساتھ شادی کر لینے کی بہت ساری وجوہات ہوسکتی ہیں۔ اور شادی کے بعد بھی بہت سارے منصوبے ہوتے ہیں۔ انسان اپنی زندگی کو اپنے انداز سے سوچتا ہے لیکن تم جس راہ پر چل نکلے ہو، میں نہیں سمجھتی کہ اس کا کہیں انت ہوگا۔ کیا ایسے میں تم یہ شادی یا ازدواجی زندگی نبھا پاؤ گے؟''

''شاید نہیں، یا شاید ہاں؟'' میں نے کہا۔

''میں سمجھتی ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو، سوہنی بھی اسے سمجھتی ہے کہ شادی کے بعد اس کی ازدواجی زندگی کیسی ہوگی۔ کہنا میں یہ چاہتی ہوں پتر کہ آخر شادی کی وجہ کیا ممکن ہوسکتی ہے؟'' انہوں نے اسی طرح مجھے دیکھتے ہوئے کہا تو میں خاموش رہا۔ تبھی انہوں نے کہا۔ ''دیکھ پتر، جو کام رَبّ تعالیٰ کے کرنے کے ہوتے ہیں، اگر اس کی فکر ہم کرنے لگیں تو رَبّ تعالیٰ اس کی فکر نہیں کرتا۔ وہ کام انسان کو کرنے دیتا ہے۔ یہیں سے انسان اپنی آزمائش خود اپنے سر لے لیتا ہے۔ ظاہر ہے انسان کی کیا اوقات کہ وہ ایسے کام کر سکے۔ سو ہمیں وہ کام جو رَبّ تعالیٰ کے کرنے کے ہیں، ان کاموں کی فکر چھوڑ کر، ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ رَبّ تعالیٰ ہمارے کاموں کی ذمے داری بھی لے لے؟''

''ایسا کیا ہے اماں۔'' میں نے پوچھا۔

''وہ ہے رَبّ تعالیٰ کی رضا، تسلیم و رضا، اپنا آپ رَبّ تعالیٰ کی رضا میں پیش کر دے اور اس پر ڈٹ جائے۔ یہی بندگی ہے اور یہی بندگی کی انتہا۔ یہاں پھر من و تُو کیا، وہ بہت کچھ جو انسان کی بقا سے تعلق ہی نہیں رکھتا، ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں انسان کا تعلق ایک نئی نوعیت اختیار کرتا ہے اور وہ تعلق صرف اور صرف رَبّ تعالیٰ کے لیے ہوتا ہے۔ کیونکہ رَبّ تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ انسان کی دوستی اور دشمنی صرف اسی کے لیے ہو۔''

اماں کہہ رہی تھیں اور میں غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا، وہ گاؤں کی ان پڑھ خاتون کیسی باتیں کر رہی تھیں۔ مجھ سے رہا نہیں گیا تو میں نے یہی سوال کر دیا۔

''اماں یہ باتیں......''

''مجھے کسی نے نہیں رَبّ تعالیٰ نے سکھائی ہیں۔ میں پڑھ تو نہیں سکتی لیکن کلام پاک کا ترجمہ سُن تو سکتی ہوں۔ میں یہ تو جان سکتی ہوں کہ میرے رَبّ تعالیٰ نے مجھ سے کیا بات کی ہے۔ وہی بات میں کہہ رہی ہوں۔ میں نے خود سے کوئی تھوڑی بات کی ہے۔''

''اماں، آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں۔'' میں نے انتہائی تجسس سے پوچھا تو وہ بولیں۔

''دیکھ پتر۔! رَبّ تعالیٰ نے پاک مثال دی ہے اور وہ یہ کہ ایک دانہ زمین میں بویا جاتا ہے، اس سے بالیاں پھوٹتی ہیں اور ان میں دانے بھرتے ہیں۔ مطلب دانہ اپنا آپ فنا کرتا ہے تو اس میں بالیاں آتی ہیں، اور اسی میں دانے بھرتے ہیں۔ دراصل فنا ہی میں بقا ہے۔ اب فنا ہونے کی اصل حکمت یہ ہے کہ جیسی شے کے لیے فنا ہوں گے، ویسا ہی ہوگا۔ مردہ کے لیے فنا ہوں گے تو موت۔ زندہ کے لیے فنا ہوں تو زندہ، ہمیشہ زندہ رہنے والے کے لیے فنا ہوں گے تو ہمیشہ کی زندگی۔ اور صرف اور صرف تسلیم و رضا کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ مطلب ہمیشہ رہنے والے کی رضا میں فنا ہو جانے کا نام ہی

ہمیشہ کی زندگی ہے، یہی عبادت ہے، یہی بندگی ہے اور یہی انسان کی کامیابی ہے۔'' اماں نے کہا تو میں ان کے چہرے کی طرف دیکھتا چلا گیا۔

''اماں ۔! آپ نے کبھی مجھ سے ایسی باتیں نہیں کیں، یہ آج ایسے کیوں؟''

''اس لیے کہ اب تو ایسی باتیں سمجھنے کے لائق ہو گیا ہے اور اس پر عمل بھی کرسکتا ہے۔ سوہنی سے تیری شادی صرف اس نیت سے ہو کہ تمہیں اس میں بھی ربّ تعالیٰ کی رضا چاہیئے اور بس، یہی بات میں نے اسے سمجھادی ہے۔ وہ سمجھتی ہے اس بات کو۔''

''تو بس ٹھیک ہے اماں۔'' میں نے ماں کی بات کو ربّ تعالیٰ کی رضا سمجھ کر قبول کرلیا۔

''جاؤ اور جا کر سو جاؤ۔'' اماں نے کہا تو میں اٹھ گیا۔ باہر صحن میں آکر میں نے وقت دیکھا تو رات کا پہلا پہر ختم ہونے والا تھا۔ نجانے کیوں میرا من مچل رہا تھا کہ سوہنی اندر سے آجائے اور ہم چھت پر چلے جائیں۔ میں اس سے ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی قربت، اس کا لمس اور اس کا احساس چاہتا تھا۔ میں نے صحن میں کھڑے ہوکر ایک طویل سانس لی۔ مجھے پتہ تھا کہ ابھی اسے باہر آنے میں کچھ وقت لگے گا۔ اسے اماں کو دوا دینا تھی، انہیں سلانا تھا، پھر کہیں اس نے فری ہونا تھا۔ نیم کے درخت تلے چار پائی پڑی تھی، میں اس پر جالیٹا۔ مجھے وہاں پڑے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ اروند سنگھ کا فون آ گیا۔ اس کا نمبر دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں کال رسیو کرتے ہوئے پوچھا۔

''سردار جی خیریت ہی ہے نا؟''

تبھی اروند سنگھ کی بجائے جسپال سنگھ نے تیزی سے یوں پوچھا جیسے وہ سب کچھ ایک بار ہی جاننا چاہتا ہو۔

''مجھے نہیں لگتا کہ خیریت ہوسکتی ہے، ابھی کچھ دیر پہلے مجھے پتہ چلا ہے کہ نور نگر میں کوئی خطرہ ہے، تم سب لوگ ٹھیک تو ہو نا؟''

''نہیں ابھی تک تو سب ٹھیک ہے۔ بات کیا ہے؟'' میں نے پوچھا تو اس نے کچھ دیر پہلے فارم ہاؤس پر ہونے والی میٹنگ کے بارے میں اختصار سے بتاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، اگر نور نگر میں کوئی ایسی ویسی بات ہوتی ہے تو پھر وہ ٹھیک کہتا ہے، میں نے فون بھی اس لیے کیا کہ تم محتاط ہو جاؤ۔''

''اس کا مطلب ہے کہ سندیپ کور والا معاملہ ابھی ختم نہیں ہوا، اس طرح تو وہ سندیپ کور پر بھی اعتماد نہیں کریں گے۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''وہ اپنے باپ پر اعتماد نہیں کرتے اور پھر جو بندہ ایک بار دشمن کا قیدی ہو جائے اور پھر وہ بچ کر بھی آ جائے تو اسے ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ وہ بچے تھوڑی ہیں، ظالمانہ ایجنسیاں چلا رہے ہیں۔'' جسپال نے نفرت سے کہا۔

''چلو ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں۔ محتاط ہو جانا اچھی بات ہے۔'' میں نے کہا اور کال ختم کردی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے چوہدری اشفاق کو فون کیا، وہ اس وقت حویلی ہی میں تھا۔ میں نے اسے ساری تفصیل بتائی تو وہ بولا۔

''سیکورٹی کا معاملہ تو ٹھیک ہے، کوئی بھی نگاہ سے بچ نہیں سکتا، لیکن پھر بھی میں دیکھ لیتا ہوں۔'' اس نے کہا اور فون بند کردیا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ ساری رات سو نہیں پائے گا۔ میرے اندر بے چینی بڑھنے لگی تھی۔ کئی سوچیں آتی چلی گئیں۔ تبھی اندر سے سوہنی آ گئی، مجھے اس کی آمد کا پتہ ہی اس وقت چلا، جب وہ میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔ پھر میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

”کیا بات ہے، کوئی کسی قسم کا خطرہ تو نہیں؟“

”ممکن ہے، نہیں بھی ہے، کچھ کہہ نہیں سکتا، ابھی جسپال کا فون آیا تھا۔“ میں نے اسے بتایا تو وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”تو چلو، چلیں حویلی۔“

”تم یہاں اماں کے پاس رہو، میں نکلتا ہوں۔“

”نہیں، میں، تمہارے ساتھ جاتی ہوں، اماں کے پاس وہ صفیہ ہے، ذرا ٹھہرو، میں ابھی آتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے پلٹ گئی۔ اسے واپسی میں چند منٹ لگے، اس وقت تک میں کار گیٹ سے باہر نکال چکا تھا۔ وہ تقریباً بھاگنے والے انداز میں کار کا گیٹ کھول کر اس میں بیٹھ گئی۔

”کیا کر کے آئی ہو؟“ میں نے گیئر لگاتے ہوئے پوچھا تو بولی۔

”سب ٹھیک ہے، یہاں کی فکر نہ کرو، یہاں سب ٹھیک ہے۔“ وہ اضطراری لہجے میں بولی تو میں نے اپنی ساری توجہ سڑک پر لگا دی۔

پہلے میں سیدھا حویلی کی طرف گیا، وہاں کافی ہلچل تھی۔ چوہدری اشفاق نے سب کو الرٹ کر دیا تھا۔ جیسے ہی میں گیٹ پر پہنچا، اسی لمحے مجھے خیال آیا۔ جس طرح میں اس ہلچل کو دیکھ رہا ہوں، وہ نگاہیں جو یہاں کسی کی جانب سے متعین ہو سکتی ہیں، وہ بھی تو دیکھ رہی ہوں گی؟ ممکن ہے کہ چوہدری اشفاق کا بھی یہی خیال ہو کہ دشمن ان کی تیاری دیکھ کر ہی دہل جائے اور حوصلہ کھو بیٹھے۔ مگر میں چاہتا تھا کہ اگر کوئی دشمن تاک میں ہے تو حملہ کرے تاکہ مجھے احساس ہو جائے کہ وہ کون ہے؟ اس بارے میں فیصلہ کر چکا تھا کہ جہاں تک بھی جا سکا، اپنے دشمن کا پیچھا ضرور کروں گا۔

میں نے فون نکالا اور چوہدری اشفاق کو ہدایات دیں، پھر وہیں سے کار موڑ لی۔ میں واپس پلٹ پڑا۔ اب اگر متوقع دشمن آ بھی جاتا تو مجھے فوراً اطلاع ہو جانی تھی۔ میں اس سڑک پر آ کر رک گیا، جہاں سے ایک طرف نور پور گاؤں اور دوسری طرف حویلی تھی۔ اس کے درمیان بنی سڑک شہر کو جاتی تھی۔

”یہاں کیوں رُک گئے؟“ سوہنی نے دھیمے سے پوچھا تو میں نے خوشگوار انداز میں کہا۔

”تم سے باتیں کرنے کے لیے۔“

”کیا کار میں اتنا اسلحہ ہے کہ تم اس سے دشمن کا مقابلہ کر سکو۔“ وہ میری بات نظرانداز کر کے بولی۔

”ہاں ہے؟“ میں نے اطمینان سے کہا تو وہ بھی مطمئن سی ہو گئی۔ میں نے کار بڑھا دی اور یونہی پھرتا رہا۔ ہم ساری رات یونہی سڑکوں پر پھرتے رہے۔ جی بھر کے باتیں کیں۔ نجانے کن کن راستوں پر کار لیے گھومتا رہا، یہ مجھے بھی یاد نہ رہا۔

اس وقت صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ میں نہر کے پل پر کار کھڑی کر کے نیچے اتر آیا، صبح کی مست ہوا نے مجھے مدہوش سا کر دیا۔ میں نے لمبی لمبی سانسیں لیں اور سوہنی کو بھی باہر آ جانے کو کہا۔ وہ بھی باہر آ گئی۔ بہت خوشگوار موسم تھا۔ جس طرف سے پانی آ رہا تھا، ہم ادھر نیچے کی جانب بڑھ گئے۔ ہم وہاں سے زیادہ سے زیادہ دو سو قدم کے فاصلے تک گئے ہوں گے۔ دل چاہ رہا تھا کہ کہیں بیٹھا جائے۔ انہی لمحات میں اچانک پل پر ٹائروں کی چرچراہٹ کی تیز آواز کانوں میں پڑی، جس نے ماحول کو بھی جھنجوڑ کے رکھ دیا۔ فطری طور پر میں نے اس جانب دیکھا، دو سیاہ فور ویل گاڑیوں کے درمیان ہنڈا اکارڈ کھڑی تھی۔ ان کا رُخ نور نگر سے شہر کی جانب تھا۔ جس کار میں ہم تھے وہ کراس کر گئی تھیں۔ ان گاڑیوں میں سے کئی لوگ جھانک رہے تھے۔ تبھی وہ تینوں گاڑیاں

ریورس میں واپس ہوئیں اور کار کے پاس رک گئیں۔ بلاشبہ وہ قریب سے گذرے تھے۔ میری کار پہچان کر انہوں نے اپنی گاڑیاں روک لیں تھیں۔ اب لازماً وہ مجھے تلاش کریں گے۔

میں سوہنی کو لے کر فوراً چھپ گیا۔ میں نے لا شعوری طور پر پسٹل کے ساتھ انتہائی تیزی سے سیل فون نکالا اور چوہدری اشفاق کا نمبر پش کر کے اسپیکر آن کر دیا۔ رابطہ ہوتے ہی میں نے پوچھا۔

''خیریت ہے نا؟''

''ہاں بالکل، کوئی نہیں آیا؟'' اس نے بتایا

''لیکن دشمن ساری رات چھپا رہا ہے،'' پھر میں نے موجودہ صورت حال بتا کر تیزی سے کہا۔ کہا۔ ''فوراً نکلو، انہیں پکڑنا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے فون جیب میں ڈالا اور سوہنی کو لیتا ہوا درخت کی اوٹ میں چلا گیا۔ میں انہیں غور سے دیکھنے لگا کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق وہ دس سے بارہ آدمی ضرور تھے۔

''میرے پاس بھی پسٹل ہے، یہ دیکھو۔'' مجھے درخت کی اوٹ میں ہوتا دیکھ کر سوہنی نے سرگوشی میں کہا۔

''تو پھر تم ایسا کرو، پیچھے کسی درخت کی اوٹ میں ہو جاؤ، اس وقت گولی نہ چلانا، جب تک انتہائی ضروری نہ ہو، یہاں میں دیکھتا ہوں۔''

وہ میرے پاس سے اٹھی اور پیچھے چلی گئی۔ تب تک ان میں سے ایک فور وہیل کا سن روف کھول کر دو بندے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ میں انہیں دیکھتا رہا۔ میں انہیں اپنا احساس نہیں دینا چاہتا تھا۔ مجھے چوہدری اشفاق کا انتظار تھا، انہیں یہاں آتے ہوئے کم از کم دس سے پندرہ منٹ تو ضرور لگنے تھے۔ جن میں سے ابھی چار یا پانچ منٹ گذرے ہوں گے۔

تبھی انہی دو لوگوں نے گنیں نکالیں اور سامنے کھڑی کار پر فائرنگ کرنے لگے۔ چند منٹ غصہ نکالنے کے بعد ایک نے راکٹ لانچر سمیت سر نکالا اور راکٹ داغ دیا۔ ایک دھما کہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی کار کے پرخچے اُڑ گئے۔ کار کے ساتھ اسلحہ بھی ختم ہو گیا تھا، اب میرے پاس ایک اکلوتا پسٹل بچا تھا۔

اگر چہ چند گولیوں کے ساتھ میں انکا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا لیکن پھر بھی میں انہیں چھیڑنا نہیں چاہتا تھا، وہ اگر اِدھر اُدھر پھیل گئے تو مجھے انہیں اکٹھا کرنا مشکل ہو جانا تھا۔ میں صبر سے سر چھپائے بیٹھا رہا۔

میں یہی دعا کر رہا تھا کہ وہ یہاں سے چل نہ پڑیں۔ دس منٹ سے زیادہ کا وقت گذر چکا تھا۔ میرے اندر سنسنی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ لوگ گنیں لیے گاڑیوں سے اُتر چکے تھے۔ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا، میں وہاں سے کسی دوسری جگہ چھپ بھی نہیں سکتا تھا، پیچھے سوہنی تھی، میں اسے بھی دیکھ سکتا تھا، میں آنکھیں جھپکے بغیر سامنے کھڑے دشمنوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے سیل فون نکالا اور چوہدری اشفاق سے رابطہ کیا

''بس پُل کے پاس آ گئے ہیں۔'' اس نے تیزی سے کہا تو میں نے وہاں کی صورت حال بتاتے ہوئے کہا۔

''ابھی تو وہ کھڑے ہیں، اگر چل پڑے تو مشکل ہو جائے گی۔''

''کوئی بات نہیں سامنے سے بھی بندے آ رہے ہیں اور نہر کی طرف سے بھی، چاروں طرف سے ہیں۔'' اس نے کہا تو میں نے فون آن ہی رکھا اور سامنے دیکھنے لگا۔ وہی ہوا، جس بارے میں ابھی ظاہر کیا تھا، وہ واپس گاڑیوں میں بیٹھنے لگے تھے۔ تبھی میں نے تاک کر نشانہ لیا اور یکے بعد دیگرے دو

بندے گر گئے۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی میں اپنی جگہ بدل لی تھی۔ ایک طرح سے اعلان جنگ ہو گیا تھا۔ وہ ایک دم سے الرٹ ہو کر انہوں نے پوزیشن لے لی اور فائر کھول دیا۔ میں نے پھر نشانہ لیا اور پہلی فور وہیل کا ٹائر برسٹ کر دیا۔ میری توقع کے مطابق انہوں نے فائر کی آواز والی سمت پر بے دریغ فائرنگ کرنا شروع کر دی۔

میں کچھ دیر صبر کیے چھپا رہا، تبھی میری نگاہ نہر کی دوسری جانب پڑی جہاں کافی فاصلے پر کاریں تیزی سے آ رہی تھیں۔ بلاشبہ وہ اپنے ہی بندے تھے۔ تب میں باقی گاڑیوں کے ٹائر بھی برسٹ کر دیئے۔ اس وقت انہوں نے گاڑیوں سے چھلانگیں لگا دیں۔ ایسے وقت میں ان کی پچھلی طرف سے چوہدری اشفاق آن پہنچا۔

''جمال۔! نہر کے ساتھ کچی سڑک پر دو کاریں آ رہی ہیں۔'' سوہنی کی آواز عقب سے سنائی دی

''تم چھپی رہنا، ممکن ہے وہ اپنے لوگ نہ ہوں۔'' میں نے اسے کہا اور خود کو مزید چھپا لیا۔ کچھ لمحے بعد کاریں زن سے ہمارے قریب سے آگے گزر گئیں۔ تبھی میں فون پر چوہدری اشفاق سے کہا۔

''کوشش کرو، یہ زندہ پکڑیں جائیں۔''

''بہتر۔'' اس نے جواب میں کہا اور خاموش ہو گیا۔

وہ چاروں طرف سے گھیرے جا چکے تھے۔ تبھی کسی نے اونچی آواز میں کہا۔

''تم لوگ گھیرے جا چکے ہو، اپنے ہتھیار پھینک کر، سروں پہ ہاتھ رکھ کر پُل پر الٹے لیٹ جاؤ۔''

اس وارننگ کے جواب میں انہوں نے ایک دم سے فائرنگ شروع کر دی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بات نہیں مانیں گے۔ یہ ان کی غلطی تھی، مگر انہیں کیا احساس تھا کہ ان کے چاروں طرف لوگ ہیں۔ جواباً سامنے سے بھی اس سے کہیں شدت سے فائرنگ ہوئی۔ جو بھی سر اٹھاتا اس کے فائر لگ جاتا۔ میری رینج میں جو بھی آتا، میں اس کا نشانہ لیتا اور فائر کر دیتا۔

دس پندرہ منٹ اسی فائرنگ میں گزر گئے، یہاں تک کہ سامنے سے فائر ہونا بند ہو گئے۔ میں یہ مان ہی نہیں سکتا تھا کہ ان میں لوگ زندہ نہ ہوں، وہ چھپ گئے تھے۔ میں نے یہ بات فون پر چوہدری اشفاق سے کہہ دی۔ وہ سمجھتے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔

''ہمیں پتہ ہے کہ کتنے لوگ اب بھی زندہ ہیں، میرے دس گننے تک جو بھی پُل پر جا کر لیٹ گیا، اسے کچھ نہیں کہا جائے گا، ورنہ گنتی کے بعد ہینڈ گرنیڈ سے گاڑیوں کے ساتھ انہیں بھی تباہ کر دیا جائے گا۔ ایک ...... دو......'' ابھی گنتی پانچ تک پہنچی تھی کہ دو نوجوان نکلے اور پُل کی طرف بڑھے، وہ جا کر لیٹ گئے۔ جب دیکھا کہ انہیں کچھ نہیں ہوا، تین مزید نکلے اور انہوں نے بھی ایسا کیا۔ دس تک گنتی پوری ہو گئی تھی، تب چوہدری اشفاق نے پھر کہا۔ ''جتنے لیٹے ہوئے ہیں، وہ اُٹھ کر ہاتھ سر پر رکھ کے، سڑک پر چلو، گاڑیوں پر گرنیڈ پھینکنے ہیں۔'' اسی لمحے ایک نوجوان نکلا اور تیزی سے پُل کی جانب بڑھا۔ اب ان گاڑیوں کو دھماکے سے اڑانا بنتا تھا، لیکن میں نے روک دیا۔ وہ چھ تھے اور پل سے نیچے اتر کر سڑک پر جا رہے تھے۔ میں نے انہیں قابو کرنے کو کہا۔

اگلے دس منٹ میں انہیں قابو کر لیا گیا، میرا اندازہ بہت قریب تھا، وہ گیارہ لوگ تھے۔ ان تینوں گاڑیوں میں کافی اسلحہ تھا۔ جو قابو کر لیا۔

''انہیں مسافر شاہ کے تھڑے پر لے کر آؤ۔'' میں نے کہا اور ایک کار میں جا بیٹھا۔ سوہنی بھی میرے ساتھ بیٹھنے لگی تو میں نے اسے روک دیا کہ وہ

دوسری ایک کار میں گھر اماں کے پاس جائے وہ پریشان ہوگی۔ میں کار میں بیٹھا اور مسافر شاہ کے ٹھڑے پر جا پہنچا۔ جسپال سنگھ کی بات درست تھی، سو میں نے اروند سنگھ کو کال کی، وہ سمجھ گیا اس نے کال جسپال کو ملا دی، تب میں نے اسے ساری صورت حال کے بارے میں بتا دیا۔

☆......☆......☆

جسپال فارم ہاؤس کے لان میں جمال سے فون پر بات کر کے ایک کرسی پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔ اسے یہ خیال تو تھا کہ بھارتی سرکار کی ایجنسیاں انہیں کسی بھی وقت اپنی نگاہوں میں لے سکتی تھیں، لیکن یہ امید نہیں تھی کہ وہ اس طرح ایک دم سے گھیرے میں آ جائیں گے۔ وہ جو کوئی بھی دشمن تھا، اس کی نگاہ ان سب پر تھی، جتنا اسے نظر میں رکھا ہوا تھا، اسی قدر جمال کو بھی گھیرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ مگر اسے یقین تھا کہ حالات جیسے بھی ہوں گے، اسی میں سے رستہ نکلنے والا تھا۔ وہ انفار مرات کے پہلے پہر ہی ان کے پاس سے جا چکا تھا۔ اس نے جو رپورٹ بلدیو سنگھ کو دی تھی، وہ ساری رات اسی پر کام کرتا رہا۔ کچھ دیر پہلے اس نے بلدیو سنگھ کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تھا، وہ سو رہا تھا۔ اس لیے وہ بھی اطمینان سے باہر لان میں آ گیا تھا۔ لازماً اس نے کچھ طے کر لیا ہوگا، اسے بھی سمجھ میں آ گیا ہوگا جو وہ یوں گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا۔ وہ انہی خیالوں میں تھا کہ اس کا سیل فون بجا۔ وہ نوتن کی کال تھی۔ اس نے اندر بلا لیا تھا۔ وہ اٹھ کر اندر کی جانب بڑھ گیا۔ لاؤنج میں ناشتہ لگا ہوا تھا۔ سبھی وہیں تھے۔ وہ بھی جا کر بیٹھ گیا۔ بڑے اطمینان سے ناشتے سے فارغ ہو کر وہ چائے کے مگ لیے صوفوں پر آن بیٹھے۔ ہر ایک کے دماغ میں تھا کہ دیکھیں بلدیو سنگھ کیا کہتا ہے۔ تبھی اس نے یہ تجسس ختم کرتے ہوئے کہا۔

''ہمیں اب ایک بہت بڑا فیصلہ کرنا ہوگا۔ یہ گیم جو اس رپورٹ میں دکھائی دے رہی ہے، بہت بڑی ہے، اس میں ہم یا تو کبھی یوں فنا ہو جائیں گے جیسے تھے ہی نہیں، یا پھر ان میں ہمارا شمار ہو جائے گا، جو گیم کھلانے والے ہوتے ہیں۔''

''اوئے پہلیاں نہ ڈالو، سیدھی بات کرو۔'' وکرم سنگھ نے اکتائے ہوئے لہجے میں تیزی سے کہا۔

''تو سیدھی بات یہ ہے پیارے، یہ ایجنسیاں تو ہمیں چھوڑنے والی نہیں ہیں، انہوں نے ہمیں ہر حال میں گھیرنا ہے اور مارنا ہے۔ ابھی تک انہیں حتمی ثبوت نہیں ملے جس کی بنیاد پر وہ ہاتھ ڈال سکیں ہم پر، کیونکہ ابھی الیکشن ختم ہوا ہے اور رتن دیپ سنگھ جی کی پارٹی اکثریت میں ہے۔ ہمیں اس کا سہارا کہہ لو، یا مہلت۔ ہماری گیم ختم ہے۔ آج نہیں تو کل۔''

''تو پھر ہم مر جائیں؟'' وکرم سنگھ نے غصے میں کہا۔

''مریں تیرے دشمن یار۔'' یہ کہہ کر اس نے سانس لیا اور بولا۔ ''ہمیں ایک بار گم ہوا ہے، ایسے کہ جیسے ہم یہاں تھے ہی نہیں۔ اس وقت ہی سامنے آئیں جب ہم اس پوزیشن میں ہوں کہ ان ایجنسیوں کا سامنا کر سکیں۔'' اس نے قدرے مایوسانہ انداز میں کہا۔

''مطلب میدان چھوڑ دیں۔'' سرجیت سنگھ نے کہا۔

''اس کے سوا صرف ایک آپشن ہے۔'' وہ بولا۔

''کیا......'' اسی نے پوچھا۔

''ہمیں اس کا سہارا لینا پڑے گا، جو ان ایجنسیوں کو بھی آنکھیں دکھا سکے، اتنا طاقتور بندہ ہی ہمیں پناہ میں لے تو، ہم اپنی کاروائیاں جاری رکھ سکتے

ہیں۔''اس نے صاف گوئی سے بتایا

''ایسا کون ہے؟''سرجیت سنگھ نے پوچھا۔

''وہی جو یہاں پر موجود یہودی کا مخالف ہے۔اب تک نجانے کیا سے کیا ہو جاتا اگر اس خطے میں طاقت کا توازن نہ ہوتا۔یہ رَبّ تعالی کا بھی نظام ہے کہ اگر ایک طاقت سر اٹھاتی ہے تو دوسری اس کے ساتھ ہی اٹھ جاتی ہے۔یہی طاقت کا توازن ہے۔اگر کوئی ایک طاقت بھی زیادہ یا کم ہوئی تو اسی سے بگاڑ یا اچھائی پیدا ہوتی ہے۔''بلدیو سنگھ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''یار تو یہ لیکچر بازی چھوڑ اور سیدھے بتا کہ اب کرنا کیا ہے بس۔''وکرم سنگھ نے اکتاتے ہوئے کہا۔

''اچھا چلو تم لوگ نہیں سمجھنا چاہتے تو میں سیدھے یہ بتاتا ہوں کہ ہندو اور یہودی گٹھ جوڑ سے جو نئی قوت سامنے آئی ہے،اس کے برابر ایک نئی قوت بھی جنم لے چکی ہے۔وہ کون ہیں؟اس بارے میں کچھ معلوم نہیں لیکن وہ ہیں۔ان کی رسائی کہاں تک ہے یہ بھی نہیں معلوم مگر جو لوگ ان کا مقابلہ کر رہے ہیں،وہ اپنی کچھ تو حیثیت رکھتے ہوں گے۔ہم اگر انہیں جوائن کر لیں تو......''یہ کہتے ہوئے اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور سب کی طرف دیکھا۔تبھی جسپال سنگھ نے پوچھا۔

''ان کا کوئی اشارہ،کوئی ان کا اتہ پتہ؟''

''یہ رپورٹ سب کے سامنے ہے،جہاں تک میں سمجھا ہوں،اس رپورٹ میں اُن کا تو کوئی ذکر نہیں ہے لیکن،ہندو یہودی لابی کے وہ لوگ ہیں جو اُن کی ہٹ لسٹ پر ہو سکتے ہیں۔اگر ہم انہیں ختم کریں تو ہم ان تک پہنچ سکتے ہیں۔''بلدیو سنگھ نے کہا۔

''انہیں کیسے پتہ ہوگا کہ یہ ہم نے ہی مارا ہے؟''سرجیت سنگھ نے پوچھا تو وہ بولا۔

''میرے ذہن میں تو یہی ہے،اگر تم لوگوں کے دماغ میں کچھ مزید آئے تو ہم اس پر بھی بات کر سکتے ہیں۔''

''او کے،ٹارگٹ کون کون ہیں؟''

''ایک بندہ تو یہیں جالندھر کا ہی ہے،ابھی ابھی ایم ایل اے بنا ہے،مزید یہ پڑھ لیں۔''اس نے بتایا

''یہ تو شاخیں کاٹنے والی بات......''بچن کور نے کہنا چاہا تو وکرم سنگھ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

''شاخیں ہی سہی،جڑ خود بخود مل جائیں گی۔''یہ کہہ کر اس نے رپورٹ پکڑ لی۔تبھی جسپال سنگھ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''میں اوگی پنڈ جا رہا ہوں،جو بھی سمجھ میں آئے مجھے بتا دینا،میں آ جاؤں گا۔''

''او کے۔''بلدیو سنگھ نے کہا اور وہاں سے اٹھ کر باہر آ گیا۔وہ بہت حد تک سمجھ گیا تھا جب تک بانیتا کور ٹھیک نہیں ہو جاتی،ان کے درمیان رہنا وقت کا ضیاع ہے۔بلدیو سنگھ صرف ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے۔اسے کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔وہ اوگی پنڈ کی جانب چل دیا۔

☆......☆......☆

میں جس وقت مسافر شاہ کے تھڑے کے پاس بنے ہوئے کمروں کے آگے پہنچا تو فرید بھی وہیں کھڑا تھا۔اس نے چارپائی بچھا دی تھی اور ان کے قریب ہی وہ چھ لوگ کھڑے تھے۔میں کار سے اتر کر وہیں جا بیٹھا اور ان کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔وہ بھی میری طرف اسی نفرت سے دیکھ رہے تھے۔مجھے کچھ عرصہ پہلے پکڑے ہوئے لوگ یاد آ گئے۔میں نے دھیمے سے لہجے میں پوچھا۔

''کس نے بھیجا ہے تمہیں؟''

''سردار زریاب خان نے۔''خلاف توقع ایک

نوجوان نے طنزیہ لہجے میں بتایا
''کون ہے وہ؟'' میں نے پوچھا۔
''حیرت ہے، تم اسے نہیں جانتے ہو، پورا ملک انہیں جانتا ہے ان سے ڈرتا بھی ہے۔'' وہی نوجوان یوں بولا جیسے وہ میری عقل پر ماتم کر رہا ہو۔
''اس کا کوئی رابطہ نمبر ہے تمہارے پاس یا پھر مجھے تلاش کرنا پڑے گا؟'' میں نے اسی سکون سے پوچھا۔
''ہاں ہے، کرو رابطہ ان سے۔'' اس نے کہا اور فوراً ہی فون نمبر بتا دیا۔ چوہدری اشفاق اس کا نمبر ملانے لگا۔ چند لمحوں میں رابطہ ہو گیا۔ تصدیق کے بعد اس نے فون میری جانب بڑھا دیا۔
''کون ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔
''جمال بات کر رہے ہو؟ اس نے تصدیق چاہی تو میں نے ہنکارا ابھرا، تب وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''تم شاید مجھے نہیں جانتے، لیکن میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اب وقت آ گیا ہے تم اس زمین پر نہ رہو، بہت اودھم مچا لیا تم نے یہاں۔''
''اس زمین پر ہمیشہ کسی نے بھی نہیں رہنا، ہاں البتہ کوئی پہلے چلے جاتا اور کوئی بعد میں۔ اب پتہ نہیں تم پہلے جاؤ گے یا میں، یہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ بولو، ان بے چاروں کو کیوں بھیجا تھا، خود کیوں نہیں آ گئے؟''
''ارے، تمہارے لیے یہی بہت ہیکیونکہ تمہارے لیے صرف دو ہی آپشن ہیں، یا تو اس ملک کی زمین کے نیچے دفن ہو جاؤ یا پھر یہ ملک چھوڑ کر یہاں سے چلے جاؤ، میں تمہیں زیادہ سے زیادہ چوبیس گھنٹے دے سکتا ہوں، اس سے زیادہ نہیں۔'' وہ انتہائی غرور سے بولا۔
''میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ تمہیں مجھ سے کیا دشمنی ہے، لیکن تم نے اپنی موت پر خود ہی مہر لگا دی ہے۔ یا پھر کسی نے تمہیں موت کی طرف دھکیل دیا ہے۔ چ ان چوبیس گھنٹوں میں اگر تم ان چھے لوگوں کو واپس لے جا کر دکھا دو، تو میں اپنا آپ تمہارے حوالے کر دوں گا۔ ورنہ میں تمہیں تلاش تو کر ہی لینا ہے۔'' میں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔
''ڈن ہو گیا۔ انتظار کرو۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے چند لمحے فون کو دیکھا اور چوہدری اشفاق سے اروند سنگھ کا نمبر ملانے کو کہا تا کہ اس کے بارے میں معلومات مل سکیں۔
تانی کے تربیت یافتہ لڑکے وہاں موجود تھے۔ وہ ان چھ کے بارے میں بے تاب تھے۔ تب میں نے ایک سے پوچھا۔
''کیا کریں ان کا، انہیں اب واپس لے کر جانا ہے انہوں نے، جنہوں نے ان لوگوں کو یہاں بھیجا تھا؟''
''اچھی بات ہے کہ وہ خود آ جائیں۔'' وہ نوجوان بولا۔
''فی الحال ایسا کرو، ان کے ہاتھوں کو باندھ کر رسی ان کے پیروں سے باندھ دو، پھر بھگاتے ہوئے دو تین چکر اس میدان کے لگواؤں۔ چوبیس گھنٹے انہیں یہیں رکھنا ہے، میدان میں، میں بھی یہیں ہوں۔ پھر دیکھتے ہیں۔'' میں نے کہا تو وہ ویسا ہی کرنے لگے۔ جو کوئی بھی ذرا سی مزاحمت کرتا، وہ لڑکے اسے سیدھا کر دیتے، یہاں تک کہ انہوں نے ان کو آگے لگا لیا۔ خود ایک کھلی جیپ میں بیٹھ گئے اور انہیں بھگانا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد ہی ان کا دم اکھڑنے لگا۔ ان میں جو پہلا گرا تو لڑکوں نے اسے اٹھا کر پھر آگے لگا لیا۔
میرے سامنے فرید کھڑا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اویار فرید۔! ایسے کر یہاں پر جتنے لوگ ہیں، ان کے لنگر پانی کا بندوست تم نے کرنا ہے۔ہم سب ئے اب ڈیرے یہیں پر ہیں۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' اس نے مودبانہ لہجے میں کہا اور ایک طرف ہٹ گیا۔ ایسے میں چوہدری اشفاق کا فون بجا تو اس نے فون میری جانب بڑھا دیا۔ اروند نگھ بولا۔

''یہ لاہور ہی کے نواحی علاقے سے کوئی کال کر رہا تھا۔اس کی لوکیشن ابھی بھیج دیتا ہوں۔''

''مطلب وہ ہمیں خود دعوت دے رہا ہے کہ ہم اس تک پہنچیں۔'' میں خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

''لیکن میرا خیال ہے کہ یہ کوئی مہرہ ہی ہے،اس کے پیچھے کوئی ہے۔وہ خاموشی سے اپنا کام کر کے غائب ہو جانا چاہتا ہے۔''اس نے اپنی رائے دی تو میں نے پوچھا۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

میرے یوں پوچھنے پر اس نے اس رپورٹ کے بارے میں بتایا جو بلد یو سنگھ وغیرہ کے پاس تھی اور وہ اس پر بات کر چکے تھے۔

''مطلب کوئی قوت......'' میں نے کہنا چاہا تو اس نے تیزی سے کہا۔

''بہت احتیاط سے جمال، منظر کچھ اور ہے اور پس منظر کچھ اور ابھی کسی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ہم سب اسی پر کام کر رہے ہیں۔دو چار گھنٹے دو، ہم سب بات کر لیں، پھر کوئی حتمی نتیجہ نکالتے ہیں۔'' اس نے کہا تو میں نے ہاں کہہ دی، تب اس نے فون بند کر دیا۔

وہ میدان کا ابھی پورا چکر نہیں لگا پائے تھے۔لیکن آدھے سے زیادہ فاصلہ طے کیا تھا۔کافی دور وہ مجھے نقطوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔تبھی ایک دم سے میرے دماغ میں خیال آیا، کہیں ان کے لوگ وہاں موجود نہ ہوں؟ ممکن ہے ان کے علاوہ بھی حملہ آوروں کا کوئی گروپ موجود ہو، ابھی کون سا پورا علاقہ چھان مارا ہے؟ یا یہ تصدیق ہو گئی ہے کہ علاقے میں ان کے علاوہ کوئی دوسرا حملہ آور موجود نہیں ہے۔ میں نے غور کیا اور پھر چوہدری اشفاق کو اس خدشے سے آگاہ کیا؟

''یہ میرے ذہن میں پہلے ہی سے تھا، میں نے پورے علاقے میں بندے پھیلا دیئے ہیں۔ ہر جگہ یہ بات پہنچ گئی ہے کہ کوئی اجنبی آدمی دکھائی دے تو فوراً پتہ دیں۔اگر کوئی ہوا تو سامنے آ جائے گا۔''

اس نے مجھے تفصیل بتائی تو میں مطمئن ہو گیا۔ میں چارپائی پر لیٹ کر ان حالات کو سوچنے لگا۔جسپال سنگھ اور اروند سنگھ نے اب تک جو مجھے تفصیل بتائی تھی۔ میں نے اس پر غور کیا تو مجھے یہی لگا کہ اب تک وہ معاملہ اپنے منطقی انجام تک نہیں پہنچا، جو سندیپ کور اور سنیل ورما کے ساتھ چلا تھا۔میرے خیال میں ابھی تک شاخیں ہی کٹی تھیں۔ وہ پودا جڑ سے نہیں اکھڑا تھا۔ یہ سارے لوگ مجھے ایک ہی طرح کی تربیت والے لگتے تھے۔ میں نے سوچ لیا کہ اب ان کے ساتھ کیا کرنا ہے۔

میں سامنے سے آتے ہوئے ان بھاگتے ہوئے لوگوں دیکھتا رہا۔ان کی بری حالت تھی۔ان کا سانس اکھڑا ہوا تھا۔وہ درختوں کے نیچے یوں آ کر گرے جیسے ان میں جان ہی نہ رہی ہو۔لڑکوں نے انہیں باندھ کر ایک کمرے میں دھکیل دیا۔دوپہر ہو گئی تھی۔ میں وہیں درختوں کے نیچے چارپائی پر لیٹا ہوا تھا، وہیں میری آنکھ لگ گئی۔

میری آنکھ کھلی تو شام اتر رہی تھی۔ دن ابھی کھڑا تھا۔وہاں فرید کے سوا کوئی نہیں تھا۔میں نے اس سے وہاں کی ویرانی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا۔

''چوہدری اشفاق، سب کو لے کر خاموشی سے چلا گیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ یہ جگہ محفوظ نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم اپنا خیال رکھنا۔ ہو سکے تو آج جلدی گاؤں چلے جانا۔'' میں یہ کہتے ہوئے اٹھا اور حویلی کی طرف چل دیا۔

شام ہونے کو تھی جب میں حویلی پہنچا۔ میں لاؤنج میں آ گیا۔ وہاں اماں نورنگر کی کچھ خواتین کے ساتھ موجود تھی۔ میرے بیٹھتے ہی اماں نے کہا۔

''پتر۔! تیرے ساتھ جو حالات لگے ہوئے ہیں، وہ کب ختم ہوں، میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی، لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ میں نے اپنا فرض نبھانا ہے۔''

''یہ کیا بات کر رہی ہیں اماں، میں سمجھا نہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''تمہاری اور سوہنی کی شادی ابھی اور اسی وقت ہو گی، جاؤ نہا دھو کر تیار ہو جاؤ۔ میں نے مولوی صاحب کو بلوایا ہے، ابھی نورنگر کے کچھ بزرگ بھی آ جائیں گے۔ دیر مت کرو جاؤ۔'' اماں نے حکم دیا

''جیسے آپ کی مرضی۔'' میں نے کہا اور اندر کی جانب چلا گیا۔

مغرب کے بعد حویلی کافی زیادہ روشن تھی۔ لان میں نورنگر کے لوگ موجود تھے۔ اماں نے اپنے طور پر سارے انتظامات کروا لیے تھے۔ میں وہاں ان کے درمیان جا بیٹھا۔ میرے بیٹھتے ہی مولوی صاحب نکاح پڑھانے لگے۔ خطبے کے بعد دعا مانگی گئی اور کھانا سرو کیا جانے لگا۔ وہاں ہر بندہ مصروف تھا سوائے میرے۔ اچانک مجھے فرید دکھائی دیا۔ میں نے اسے قریب بلا کر ان لوگوں کے بارے میں پوچھا جو پکڑے ہوئے تھے۔ اس نے بتا دیا کہ وہ کہاں پر ہیں۔ میں ان تک بھی کھانا پہنچانے کے بارے میں کہا۔

عشاء سے کافی بعد تک کہیں جا کر حویلی میں سناٹا چھا گیا۔ ایسے میں چوہدری اشفاق میرے پاس آ گیا۔ میرا فون اس کے پاس تھا۔

''میں جان بوجھ کر اٹھا لایا تھا، تم ڈسٹرب نہ ہو۔''

''کوئی کال آئی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، سوائے اروند کے۔ ابھی کچھ دیر پہلے۔'' اس نے دھیمے سے لہجے میں بتایا

''کیا کہہ رہا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے اسے بتا دیا ہے کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ وہ صبح بات کرے گا۔'' وہ اسی لہجے میں بولا۔

''اور وہ......'' میں نے پوچھنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھتے ہوئے کہا۔

''میں دیکھ لوں گا۔ جاؤ بھابھی انتظار کر رہی ہو گی۔''

میں حویلی میں آیا تو اماں لاؤنج میں ہی تھیں۔ ان کے دامن میں ایک سرخ رنگ کا ڈبہ تھا، جو عموماً زیور رکھنے کے کام آتا ہے۔ وہ بڑا پرانا تھا۔ انہوں نے وہ مجھے دیتے ہوئے کہا۔

''بیٹا۔! یہ تیرے باپ نے کبھی مجھے دیا تھا۔ میں نے تو پہنا نہیں، ویسے کا ویسا پڑا ہوا تھا۔ یہ لو اور اپنی بیوی کو تحفے میں دے دینا۔'' میں نے وہ ڈبہ پکڑ لیا تو وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ ''جاؤ، میں اب سونے جا رہی ہوں۔''

میرے لیے مخصوص کمرے میں بیڈ پر سوہنی سرخ جوڑا پہنے ہوئے بیٹھی ہوئی تھی۔ میری آہٹ پا کر وہ اٹھ گئی۔ مجھ سے کچھ کہا نہیں گیا۔ میں بیڈ پر جا کر بیٹھ گیا تو سوہنی جھکی اور میرے پاؤں سے جوتا اتارنے لگی۔ میں جھجکا تو وہ بولی۔

'' مجھے خدمت سے مت روکیں، اب آپ

مجازی خدا ہو، اور آپ کو پتہ ہے کہ یہ شادی ہم نے محض رَبّ کی رضا کے لیے کی ہے۔'' اس کے اں لینے پر میں رُک گیا۔ تب وہ بولی۔ ''آپ وضو کر یں۔ ہم اپنی نئی زندگی کا آغاز نفل پڑھ کر کریں گے۔ کیا خیال ہے۔''

''بہت نیک خیال ہے۔'' میں نے کہا اور وضو کرنے کے لیے اٹھ گیا۔

میری زندگی کی وہ اہم رات بیت گئی۔ صبح صادق سے پہلے ہم نہا چکے تھے۔ سوہنی تہجد پڑھنے لگی اور میں اٹھ کر بالکنی میں آ گیا۔ میرے ذہن میں نورنگر کے حالات تھے۔ میں چوہدری اشفاق سے رابطہ چاہتا تھا تا کہ مجھے معلومات مل سکیں۔ میں بالکنی سے پلٹ کر کمرے میں چند لمحے رُکا اور باہر نکلتا چلا گیا۔

میں نیچے لاؤنج میں آیا تو ٹھٹک گیا۔ میرے سامنے چوہدری اشفاق کے ساتھ کرنل سرفراز بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اٹھ گئے اور بازو پھیلاتے ہوئے خوشی سے بھرے لہجے میں بولے

''شادی مبارک ہو جمال۔''

''جی خیر مبارک۔'' میں بھی خوشگوار انداز میں بولا۔

''میں نے سرِشام فون کیا تو چوہدری اشفاق نے فون ریسیو کیا، تب مجھے پتہ چلا کہ تمہاری آج شادی ہے۔'' انہوں نے صوفے کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

''وہ دراصل اماں نے......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولے

''مجھے سب بتا دیا ہے چوہدری اشفاق نے۔'' انہوں نے کہا، تب تک میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''آپ نے فون کیا؟'' میں نے انہیں یاد دلایا تو وہ پرسکون سے لہجے میں بولے

''یہ تو تم پر اٹیک ہوا ہے، اور جن کے بندے اب تمہارے پاس ہیں، یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ یہ بندے تمہیں مارنے آئے تھے، یا جو بھی ان کے ہتھے چڑھ جاتا، لیکن ایسا نہ ہو سکا، اس سے بھی انہیں فائدہ ملا ہے، وہ جان گئے ہیں کہ یہاں پر وہ اگر کارروائی کرنا بھی چاہیں تو انہیں کیا کرنا ہوگا۔''

''کیا انہیں ہمارے بارے میں پہلے نہیں پتہ تھا؟'' میں نے پوچھا تو وہ بولے

''بالکل بھی نہیں، وہ محض تمہاری طاقت کا اندازہ ہی نہیں کرنا چاہتے بلکہ خوف بھی پھیلانا چاہتے ہیں۔ اس گیم کے پیچھے جو بھی ماسٹر مائنڈ ہے، وہ بہت چالاک اور انتہائی اذیت پسند لگتا ہے۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے سمجھنے کے لیے پوچھا۔

''یہ حقیقت ہے کہ اس کا کوئی سرا پتہ ہمارے پاس نہیں ہے اب تک۔ اصل میں وہ کون ہے؟ اس بارے میں بھی ہم نہیں جانتے ہیں۔ یہ اگر چند اتفاقات نہ ہوتے تو شاید ہم اس کی درست سمت کا بھی اندازہ نہ لگا سکتے، میں نے لفظ اندازہ استعمال کیا ہے۔ اب یہی دیکھو، یہاں جو اس نے حملہ کروایا ہے، وہ یہیں کے بندے استعمال کر کے، وہ مر بھی جاتے ہیں تو اسے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ بے چارے اس کے بارے میں جانتے ہی نہیں ہیں۔ یہاں کا جو اس کا مقامی ایجنٹ ہے وہ بھی اس کے بارے میں پوری طرح نہیں جانتا۔''

''مقامی ایجنٹ، مطلب، سردار زریاب خان؟'' میں نے تجسس سے پوچھا تو وہ بولے

''ہاں وہی، اس نے یہ زمہ داری لی تھی، اسے ہم نے اپنی حفاظت میں لے لیا ہے۔ اس سے بہت کچھ معلوم ہوا ہے۔ یہ ایک گروپ کے پیچھے تین مزید گروپ تھے اور انہوں نے حملہ کرنا تھا۔ سب کچھ ختم

کرنے کے لیے، یہاں سے لوگوں کو قید کرنے کے لیے تا کہ بعد میں یہ دیکھ سکیں کہ تم کہاں پر ہو؟ یہ ان کی غلطی تھی یا انہوں نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا کہ انہوں نے جالندھر میں فارم ہاؤس پر حملہ کر دیا، جس میں بانیتا کو زخمی ہو گئی۔ وہاں تمہارے شواہد ملے، تو یہ حیرت اور اس کی بازگشت مجھ تک پہنچ گئی، ہمارے ذرائع نے یہاں پر حملے کے بارے میں پورا پلان بتا دیا تو بچت ہو گئی ورنہ وہ اپنا کام کر چکے تھے، خیر۔! کیا تم وہاں پر گئے تھے، کیسے؟''

''نہیں، دھوکا ہوا ہے، یہ ان کی کوئی کارروائی ہو گی۔'' میں کرنل سرفراز کے سامنے بالکل پہلو بچا گیا۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتے رہے، پھر بولے

''خیر۔! اب تک کے شواہد جو ہمیں ملے ہیں، ان سے یہی اندازہ ہے کہ یہ بھارتی اور یہودی گٹھ جوڑ ہے۔ صرف تصدیق باقی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کی جڑیں بہت دور تک جائیں گی۔''

''ہمیں کرنا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہ صرف ان کا مقابلہ کرنا ہے، بلکہ خود کو محفوظ بھی کرنا ہے۔ میں صرف اس لیے یہاں تک آیا ہوں کہ تم تیار ہو یا ابھی چند دن......''

''میں تیار ہوں۔'' میں نے فوراً کہا۔

''دیکھو اگر تم چند دن یا جب تک تم چاہو اس گیم سے دور رہنا چاہتے ہو تو میں تمہارے لندن جانے کا بندوبست کر دیتا ہوں، کینیڈا، جہاں بھی تم چاہو۔ تمہیں محفوظ کرنے کے بعد ہی ہم......'' وہ کہہ رہے تھے کہ میں نے تیزی سے ان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''ایسا کچھ بھی نہیں ہے، میری بیوی میری راہ میں حائل نہیں ہے، بلکہ وہ میرے شانہ بشانہ لڑنے کے لیے تیار ہے۔''

''یہ اچھی بات ہے،'' انہوں نے خوش ہوتے ہوئے کہا، پھر لمحہ بھر رک کر بولے،''یہ نور نگر، اب ایک مرکز ہو گا، اس کی سیکورٹی کیسے اور کس حد تک ہو گی یہ تمہیں بعد میں پتہ چل جائے گا۔ یہاں سے تم نے اس ٹاسک کو پورا کرنا ہے۔ یہ تمہارے ذمے ہے۔'' انہوں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں اسے دیکھتا ہوں۔'' میں نے بلا تامل اس ٹاسک کو قبول کر لیا۔ وہ چند لمحے بیٹھے کچھ سوچتے رہے، پھر اٹھتے ہوئے بولے

''اچھا اب میں چلتا ہوں۔ باقی باتیں پھر ہوتی رہیں گی، میری طرف سے سوہنی کو مبارک باد دے دینا۔''

''آپ بیٹھیں، کم از کم ناشتہ تو کرتے جائیں۔'' میں نے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولے

''وہ پتہ نہیں کہاں نصیب ہو گا۔ اللہ حافظ۔'' یہ کہتے ہوئے وہ باہر کی جانب چل دیئے۔ میں ان کے ساتھ پورچ تک گیا، جہاں ان کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ اگلے چند منٹ میں ان کی گاڑی گیٹ پار کر گئی تھی۔

اس وقت سورج نکل رہا تھا، جب بڑے میدان میں دیگیں پکنا شروع ہو گئی تھیں۔ چوہدری اشفاق نے یہی سوچا تھا کہ بجائے پورے علاقے کو یہاں بلانے کے علاقے میں ہر گاؤں اور بستی تک کھانا پہنچایا جائے، یہاں تک کہ ہر گھر میں کھانا پہنچ جائے۔

☆......☆......☆

جسپال سنگھ اپنے کمرے میں پڑا سو رہا تھا۔ صبح کے آثار واضح ہو چکے تھے۔ ایسے میں اس کا سیل فون بج اٹھا۔ دوسری رنگ پر اس کی آنکھ کھل گئی اور تیسری پر اس نے فون سائیڈ ٹیبل سے اٹھا لیا۔ وہ اروند سنگھ کی

کال تھی۔
"ہاں بول اروند۔" اس نے خمار آلود لہجے میں کہا۔
"تم آج ہی کینیڈا کے لیے نکل آؤ۔تمہارے لیے بھارت میں خطرہ ہے۔" اس نے بتایا
"مطلب، کیسا خطرہ؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔
"میں نے نوتن کور کو ابھی بتایا ہے، کچھ دیر بعد ان پر ایک بڑا چھاپہ پڑنے والا ہے، بھارتی ایجنسی "را" انہیں گرفتار کرنے والی ہے۔ظاہر ہے وہ تم تک بھی پہنچیں گے یا پہنچ جانے والے ہوں گے۔" اس نے بتایا
"اگر وہ پکڑنے والے ہیں تو وہ مجھے فلائی بھی نہیں کرنے دیں گے، ائیر پورٹ پر ہی دھر لیں گے۔" جسپال سنگھ نے سوچتے ہوئے کہا۔
"اب وہاں سے کیسے نکلنا ہے، یہ سوچا جا سکتا ہے، لیکن اب نکلنا ہے، کوئی راستہ نہیں ہے۔جمال پر حملہ ہوا تھا، اس نے حملہ آوروں کو گھر لیا ہے۔وہ شک ان کا دور ہو گیا ہے کہ جمال بھارت میں ہے۔" اس نے بتایا۔
"اب یہ ہوگا، کیسے نکلوں گا؟" اس نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا۔
"اب یہ مقامی حالات کو دیکھو کیا کرنا ہے۔وہی کرو جو فوری طور پر ہو سکتا ہے۔" اس نے بھی نہ سمجھ آنے والے انداز میں کہا۔
"وہ لوگ کہاں جائیں گے، مطلب بلدیو سنگھ وغیرہ۔" اس نے پوچھا۔
"وہ رات کے نکل گئے ہیں، ان کے پاس ایسے ہی کسی وقت کے لیے تھائی لینڈ جانے کا آپشن موجود ہے۔یہاں بس نوتن کور ہے۔" اس نے بتایا
"تو پھر میں کہیں نہیں جاؤں گا، میں یہ چند دن رتن دیپ سنگھ کی حویلی میں گزاروں گا۔پھر دیکھتے ہیں۔" جسپال سنگھ نے تیزی سے کہا اور بیڈ سے اُٹھ گیا۔
"او کے، جیسے تم مناسب سمجھو۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔
جسپال سنگھ نے تیزی سے الماری کھول کر اپنا بیگ اٹھایا، کار کی چابی لی اور نیچے ڈرائنگ روم میں آیا ۔وہاں کوئی نہیں تھا۔وہ ہرپریت کور کے کمرے کی طرف چلا گیا۔دروازہ کھلا ہوا ہی تھا۔سامنے بیڈ پر وہ سوئی ہوئی تھی۔وہ اس کے قریب گیا اور اسے اٹھانا چاہا، لیکن رُک گیا۔وہ اسے دیکھنے لگا۔سوتے ہوئے وہ کتنی معصوم لگ رہی تھی۔بھاری پلکیں، تیکھی چتون، نازک ہونٹ، اور...... تبھی ایک دم اسے حالات کی نزاکت کا احساس ہوا تو اس نے ہولے سے اس کا بازو ہلایا۔اس نے فوراً ہی آنکھیں کھول دیں۔اسے یوں اپنے سامنے کھڑے پا کر حیرت سے بولی۔
"جسّی، خیر تو ہے نا؟"
"نہیں خیر نہیں ہے۔" اس نے تیزی سے کہا۔
"کیوں کیا ہوا؟" وہ بولی۔
"مجھے فوری یہاں سے نکلنا ہے۔" اس نے جواب دیا
"تو پھر......" وہ کہتے ہوئے رک گئی
"میں نکل رہا ہوں۔جہاں بھی پہنچا تمہیں بتا دوں گا، میرا شام تک پتہ نہ چلے تو سمجھو "را" کے ہتھے چڑھ گیا ہوں۔پھر جو ہو سکے۔" یہ کہتے ہوئے دھیرے سے پلٹنے لگا تو ہرپریت اسے اداس نگاہوں سے دیکھنے لگی۔اس نے مزید نہیں دیکھا اور باہر نکلتا چلا گیا۔
وہ سلطان پورہ روڈ پار کر کے سکھیا ننگا دل سے ہوتا ہوتا ہوا دریائے ستلج پر پہنچا۔وہاں سے سیدھا منڈی گوئندوال جا پہنچا۔یہی روڈ سیدھا لے کر اس وقت وہ ترن تارن کے قریب تھا، جب سورج نمودار ہو گیا تھا۔اس کا جی چاہ رہا تھا کہ قریب ہی کہیں سے ناشتہ

کرلے۔اسے سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔شہر سے باہر ہی ایک ڈھابے پراس نے کار روک دی۔وہاں کافی سارے لوگ کھلے میں دھری چار پائیوں پر ہی بیٹھے کھا پی رہے تھے۔وہ بھی ان میں جا کر بیٹھ گیا۔اس نے ناشتے کا آرڈر دیااور ہرپریت کوفون کر دیا۔

''سناؤ،کوئی خیرخبر۔''

''اورتو کچھ نہیں انوجیت ویر کے پاس صبح سے چندلوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ممکن ہیں وہ وہی ہوں۔'' اس نے بتایاتوجسپال نے تیزی سے کہا۔

''کوئی پتہ نہیں چلا۔''

''ابھی تک تو نہیں۔وہ وہاں سے اٹھ کر ہی نہیں آیا۔''اس نے بتایاتواس نے کہا۔

''اچھا،چلوجیسے ہی کچھ پتہ چلے، مجھے بتانا، بلکہ انوجیت ہی سے کہنا کہ مجھے کال کرلے۔''

یہ کہہ کراس نے فون بند کردیا۔وہ چار پائی پر کمر سیدھی کرنے کولیٹ گیا۔کچھ ہی دیر بعد ناشتہ آ گیا۔ وہ بڑے سکون سے کھا پی رہا تھا کہ انوجیت کا فون آ گیا۔

''اچھا ہوا تو نکل گیا، وہ لوگ تیرے لیے ہی آئے تھے، اسمبلی ممبر ہونے کی وجہ سے وہ گھر پر سیدھے چھاپہ نہیں مار سکے، میں تو سمجھا تھا کہ تو اب تک گھر میں ہے۔''

''پھر کیا ہوا؟''جسپال نے تیزی سے پوچھا۔

''یہ تو مجھے ہرپریت نے فون کر کے بتایا تو مجھے پتہ چلا، میں نے خود انہیں آفر کی کہ وہ پورا گھر دیکھ لیں،وہ کل کچھ دیر کے لیے آئے تھے،پھر کہیں چلے گئے ہیں۔''انوجیت نے بتایاتوجسپال نے کہا۔

''مگر وہ نہیں مانیں ہوں گے۔''

''اب مجھے نہیں پتہ،گھر کی تلاشی تو نہیں لی انہوں نے لیکن چلے گئے ہیں۔''اس نے کہا۔

''بس ٹھیک ہے۔''جسپال نے کہا۔تبھی اس کی نگاہ اس کی کار کی اوٹ میں کھڑے تین آدمیوں پر پڑی، جو وہاں پر کام کرنے والے ایک لڑکے سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ وہ مسلسل نہ میں سر ہلا رہا تھا۔جسپال فوراً سمجھ گیا کہ لوگ اس تک پہنچ گئے ہیں۔وہ بظاہر سکون سے اٹھا اور ہاتھ دھونے والے بیسن کی جانب بڑھا۔وہ لڑکا،اس لڑکے کے پاس پہنچ چکا تھا،جس نے آرڈر سرو کیا تھا۔اسی لمحے جسپال نے اپنی کمر کے ساتھ بندھے پسٹل کو محسوس کیا اور تیزی کے ساتھ ڈھابے کی دوسری جانب چلا گیا۔وہ وہاں سے نکلنے ہی والا تھا کہ اسے اپنے پیچھے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔دولوگ اس کی طرف تیزی سے آرہے تھے۔جسپال کے پاس بھاگنے کا وقت نہیں تھا اور نہ ہی وہ پسٹل نکال پایا تھا کہ وہ اس پر جھپٹ پڑے۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ تربیت یافتہ تھے۔وہ دونوں کے قابو میں آچکا تھا،انہوں نے اسے بازوؤں سے پکڑا تھا۔تبھی اس نے پوری قوت سے زمین پر بیٹھتے ہوئے جھٹکا دیا۔ان کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو وہ قلابازی کھانے والے انداز میں زمین پر لوٹ گیا۔اگلے ہی لمحے وہ ان کی گرفت سے آزاد تھا۔تبھی وہ اس کی طرف بڑھے توجسپال ان کی طرف بڑھ آیا،انہیں اپنے اندازے کی غلطی کا احساس تب ہوا، جب جسپال نے اپنی کہنیاں دونوں کے سینوں پر ماریں۔وہ ایک دم سے اکھٹے ہی کو جھک گئے۔جس طرح کہنیاں نیچے گئیں اسی طرح اس نے مٹھیاں بھینچ کر ان کے منہ پر پنچ مارے۔اگر چہ وہ اتنے زور سے نہیں پڑے تھے۔لیکن اسی لمحے جسپال الٹے قدموں پیچھے ہٹا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔اوٹ میں ہونے کی وجہ سے وہاں پر بیٹھے ہوئے

ں کو ابھی پتہ نہیں چلا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا وہاں سے رک کی ہوئی گاڑیوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ تبھی اس کے پیچھے سے فائر ہوا۔ جسپال چھپ چکا تھا، اس نے پسٹل تو نکال ہی لیا تھا لیکن اس نے فائر کرنے کی غلطی نہیں کی۔ وہاں ڈھابے پر ایک دم سے ہلچل مچ گئی تھی۔ اچانک تیسری طرف سے بھی فائر ہوا تو جسپال چوکنا ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس صورت حال سے کیسے نکلا جائے۔

سامنے سڑک رواں دواں تھی، اس کے سامنے ڈھابہ تھا، اس کے دائیں اور بائیں جانب خالی جگہ تھی۔ ڈھابے سے کافی پیچھے فصلیں تھیں۔ سڑک پر اس کے لیے کسی گاڑی سے کیا رکنا تھا، تب تک اس تک وہ لوگ پہنچ جاتے، ڈھابے کے پیچھے فصلوں تک جایا جا سکتا تھا، لیکن یہ کافی رسک والی بات تھی۔ لیکن وہاں سے بچ جانے کے کافی چانس تھے۔ اگر مقابلہ کرنے کی بھی کوئی صورت بنتی تو وہاں ہو سکتا تھا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا اور تیزی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس کے دائیں جانب ایک ٹرک سٹارٹ ہوا۔ اس نے اچھل کر دیکھا وہ خالی تھا، بلاشبہ وہ وہاں کی فائرنگ سے ڈر کر نکل رہا تھا۔ جسپال نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بھاگ کر اس میں جا بیٹھا۔ اس ٹرک والے نے بھی کافی تیزی دکھائی، اگلے چند منٹوں میں وہ سڑک پر تھا۔ وہ ٹرک بھاگا چلا جا رہا تھا۔

جسپال کے لیے یہ غنیمت تھا کہ اس کے پاس جو فون تھا وہ اسی خصوصی نوعیت کا تھا۔ اس نے فوراً ہی نوتن کور کو فون کیا، رابطہ ہوتے ہی اس نے اپنی صورت حال کے بارے میں بتایا۔

"تم اسے کرو، جہاں بھی تم رکو، کوشش کرو کہ ترن تارن ہی میں کہیں رکو، بلکہ یہیں رک جاؤ۔" اس نے الجھتے ہوئے کہا۔

"وہ تو میں رک جاؤں گا، جہاں مجھے چھلانگ نہ لگانی پڑے۔" جسپال نے کہا۔

"اس کے بعد مجھے کال کر کے بتانا کہ کہاں پر کھڑے ہو، مطلب لوکیشن، میں سنبھال لوں گی۔" اس نے کہا تو جسپال نے فون بند کر دیا۔

وہ ٹرک کے اندر ہی لیٹا رہا۔ یہاں تک کہ شہر کے آثار دکھائی دینے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ شہر میں داخل ہو گئے۔ ترن تارن بائی پاس پار کرتے ہی ذرا آگے جا کر ریلوے پھاٹک تھا۔ ٹرک وہاں رک گیا۔ وہ انتہائی تیزی سے کود گیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا پھر ذرا آگے بڑھ کر اس نے نوتن کور کو فون کر دیا۔ اس نے اپنی لوکیشن بتائی۔ تبھی اس نے راہنمائی کرتے ہوئے کہا کہ یہیں سے دائیں جانب ریلوے اسٹیشن ہے۔ اس کے پاس پہنچو، وہاں سے تمہیں لے لیں گے۔ اس نے ایک نمبر بھی بھیج دینے کو کہا، جس پر رابطہ کرنا تھا۔ وہ دائیں جانب نیچے اتر کر ریلوے اسٹیشن کی جانب چل پڑا۔ وہ ابھی سو قدم بھی نہیں چلا تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ ایک بھاری آواز نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟

دس منٹ نہیں گذرے ہوں گے۔ وہ ابھی اسٹیشن تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ اس کا فون دوبارہ بجا۔ وہ لوگ اسے ریلوے ٹریک کے ساتھ ساتھ چلنے والے ٹریک کی جانب بلا رہے تھے۔ وہ اس طرف چلا گیا۔ اسے ایک چمچماتی کار دکھائی دی۔ فون پر رابطے کی وجہ سے وہ جیسے ہی وہ کار کے قریب پہنچا، پچھلا دروازہ کھول دیا گیا۔ وہ آرام سے اس میں پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی کار چل دی۔

کار میں ڈرائیور کے علاوہ ایک ہی آدمی تھا جو اس کے ساتھ ہی پسنجر سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کلین شیو تھا اور اس نے سیاہ چشمہ لگایا ہوا تھا۔ جسپال سنگھ کے

بیٹھتے ہی وہ نرم سے لہجے میں بولا۔
"جسپال سنگھ جی، کچھ دیر آرام کرنا چاہیں گے یا ہمیں بتائیں کہاں جانا ہے۔"
"دیکھو، میں تم لوگوں کی صوابدید پر ہوں، جو چاہیں اور جیسا چاہیں۔" اس نے گول مول سا جواب دے دیا
میری ابھی نوتن کور سے بات ہوئی ہے، کہہ رہی تھی کہ ابھی میں تمہیں ادھر ہی رکھوں، شانتی ہوتے ہی پھر کچھ سوچنا ہوگا۔" اس نے دوبارہ اسی لہجے میں کہا۔
"ٹھیک ہے۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا تو ڈرائیور نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ کچھ آگے جا کر شہر کی طرف مڑ گئے۔ وہاں سے مختلف موڑ مڑتے ہوئے پرتاپ سینما کے پاس آ کر رک گئے۔
"لو جی بائی جی، آپ یہاں اتر جائیں۔ وہ سامنے اڈا بازار ہے، اس کی نکڑ پر ایک بندہ بیٹھا ہوا ہے، اس نے کیسری پگ اور نیلی شرٹ پہنی ہوئی ہے۔ وہ خود ہی پہچان لے گا۔ آ جاؤ ادھر۔" اس نے کہا تو جسپال نے ایک لمحہ بھی تامل نہ کرتے ہوئے دروازہ کھولا اور نیچے اتر گیا۔ اس نے پلٹ کر بھی نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ اڈا بازار میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب پھلوں کی دوکان کے باہر بینچ پر ایک جواں سال لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ جیسے اس کے ہی انتظار میں تھا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور اس سے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔
"ست سری اکال سردار جسپال سنگھ جی۔"
"ست سری اکال۔"
"مجھے نکا سنگھ کہتے ہیں۔ آئیں پہلے گرو ترن تارن سنگھ جی مہاراج کے گرودوارہ چلیں، پھر باقی باتیں پھر کرتے ہیں۔" اس نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو اس نے قدم بڑھا دیئے۔
گرودوارہ ترن تارن جی خاصہ بڑا اور ہر مندر صاحب کی طرز پر بنا ہوا تھا۔ اس کا سرور بہت بڑا تھا۔ ایک طرف بڑا سارا مینار تھا۔ انہوں نے جاتے ہی ماتھا ٹیکا، پھر کچھ دیر وہیں رہنے کے بعد برآمدے میں آ گئے۔
"نکا سنگھ جی، لنگر خانے چلو، بڑی بھوک لگی ہے۔" جسپال نے بے تکلفانہ انداز میں کہا تو وہ تیزی سے بولا۔
"آؤ جی آؤ۔"
وہ دونوں لنگر خانے کی جانب بڑھ گئے۔
وہ پرشادے شکھ کے واپس برآمدے میں آ گئے تھے۔ جسپال کا خیال تھا کہ یہاں بیٹھ کر نکا سنگھ سے باتیں کرے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتا نکا سنگھ خود ہی بولا۔
"پہلے گھر چلتے ہیں جی، پھر وہیں باتیں ہوں گیں۔ آپ ادھر آرام بھی کر لینا۔"
"ٹھیک ہے۔" جسپال نے کہا تو دونوں گرودوارہ سے باہر نکلتے چلے گئے۔ وہ دونوں پیدل چلتے ہوئے مغربی جانب نیا بازار سے ذرا آگے ایک دو منزلہ مکان کے سامنے آ رکے۔ وہ مکان کیا تھا، پرانے زمانے کی حویلی تھی۔ گیروے اور سفید رنگ سے سجی اچھی لگ رہی تھی۔ وہ چھوٹی ڈیوڑی پار کر کے جب وہ اندر گئے تو صحن میں کافی فاصلے پر دو تین مرد اور عورتیں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ایک لمحہ کو ان کی طرف متوجہ ہوئے پھر اپنی باتوں میں مشگول ہو گئے۔ نکا سنگھ اسے لیے دوسری منزل پر آ گیا۔ باوجود حویلی پرانی ہونے کے وہاں پر ائیر کنڈیشنڈ سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ وہاں جدید سہولتیں بھی میسر ہیں۔ بالکل سامنے کے کمرے میں جس کے ساتھ چھت پر سیڑھیاں جا رہی تھیں، نکا سنگھ نے وہ دروازہ دھکیلا

اور اندر چلا گیا۔ سامنے فرش پر نوتن کور بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے سلیولیس شرٹ اور شارٹس پہنے ہوئے تھے۔ کمرہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہ جاتے ہی گدے پر لیٹ گیا۔ نکا سنگھ واپس چلا گیا۔

''مجھے امید تھی کہ تم یہاں ہی ہو گی۔'' جسپال نے طویل سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''آخر میں بھی تو تم لوگوں کے ساتھ ہوں، کیا وہ مجھے چھوڑ دیتے، پورے امرتسر میں وہ کتوں کی طرح ہماری بُو سونگھتے پھر رہے ہیں۔'' اس نے کہا اور سرہانے پر کہنی رکھ کر نیم دراز ہو گئی۔

''یہ اچانک ہو کیسے گیا؟'' جسپال نے پوچھا۔

''یہ اچانک نہیں جسپال، وہ کم از کم دو تین ماہ سے ہمارے پیچھے ہیں۔ وہ رامیش ورما کا، ڈیوڈ رابینز کا قتل نہیں بھول پائے ہیں۔ ان کا بہت بڑا پلان ہم نے ختم کیا، اسے دنیا کے سامنے لے کر آئے ہیں۔ ان کے مقابلے میں تیار ہونے والی قوت کو وقت مل گیا۔'' نوتن کور نے بڑے سکون سے اسے بتایا تو اس نے پوچھا۔

''مجھے بھی یہی لگتا ہے۔ خیر اب کیا کرنا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں، صرف انتظار۔ وہ سامنے فریج ہے، جو دل کرتا ہے کھاؤ پیو اور سو جاؤ۔ شام تک کوئی صورت حال واضح ہو جائے گی۔'' نوتن کور نے کہا اور سیدھی ہو کر یوں لیٹ گئی، جیسے اب وہ بات نہیں کرنا چاہتی ہو۔ جسپال اٹھا، اس نے فرج میں سے پانی پیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ اسے ابھی اوگی پنڈ فون کرنا تھا۔ اس نے جگہ بتائے بغیر اپنے محفوظ ہونے کے بارے میں بتا دیا۔

☆......☆......☆

پورے علاقے میں کھانا پہنچانے کا ذمہ چوہدری اشفاق نے لیا تھا۔ دوپہر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ مجھے کوئی کام نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں یہی سوچتا رہوں کہ اب آگے کرنا کیا ہے۔ اگر کرنل سرفراز خود نہ آئے ہوتے تو شاید میں اس میں اتنی دلچسپی نہ لیتا۔ یہ معاملہ گھمبیر تھا، اسی لیے وہ خود چل کر آئے۔ دوپہر کے بعد میں نے چوہدری اشفاق کو بتایا کہ میں مسافر شاہ کے تھڑے پر جانا چاہتا ہوں۔ وہ مصروف تھا، لہٰذا میں اکیلا ہی اس طرف کار لے کر نکل گیا۔

میں مسافر شاہ پہنچا تو وہاں خاموشی تھی۔ مجھے لگا جیسے وہاں پر فرید بھی نہیں ہے۔ میں نے کار روکی اور نیچے اتر آیا۔ کمروں کے پاس بھی کوئی نہیں تھا۔ درختوں کے نیچے چارپائی پڑی ہوئی تھی، میں اس پر جا کر لیٹ گیا۔ دور دور تک ہو کا عالم تھا۔ میں وہاں کافی دیر بیٹھا رہا۔ اچانک میری آنکھیں بند ہونے لگیں، جیسے مجھ پر غنودگی چھا رہی ہو۔ میں اپنی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس لیے خود کو اس غنودگی کے سپرد کر دیا۔ کچھ لمحوں بعد اندھیرا پھیل گیا۔ اس اندھیرے میں سے ایک منظر ابھر آیا۔

مجھے لگا میں ہوائی جہاز میں بیٹھا ہوا ہوں۔ میرے دائیں طرف کھڑکی ہے۔ میں اپنی سیٹ پر بیٹھا باہر جھانک رہا ہوں۔ باہر دور تا حد نگاہ نیلا آسمان ہے۔ سفید بادل نیچے کہیں کہیں دکھائی دے رہے ہیں۔ دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ دن خوب چمک رہا ہے تھا لیکن سورج کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک جہاز یوں ڈولنے لگا جیسے اسے خود پر قابو نہ رہا ہو۔ وہ انتہائی سرعت کے ساتھ زمین کی طرف جانے لگا۔ میرے ارد گرد چیخ پکار مچ گئی۔ لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ یہ جہاز نیچے کیوں جا رہا ہے اسے نہیں جانا چاہیے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ جہاز نیچے جا رہا تھا۔ مجھے یہ قطعاً خوف نہیں تھا کہ میں مارا جاؤں

گا۔ مجھے بس جہاز گرنے کا دکھ ہو رہا تھا۔ ہوا کے دوش پر جیسے ہی وہ زمین کے قریب آیا تو مجھے درختوں کے پتے کھڑکی میں دکھائی دیئے۔ سرسبز و شاداب درختوں کے پتے۔ مجھے لگا جہاز جنگل میں گرا ہے۔ لیکن اگلے ہی لمحے کھڑکی کے باہر نیلا رنگ چھا گیا۔ ویسا ہی نیلا رنگ جیسا پانی کا ہوتا ہے۔ مجھے سمجھ آ گیا کہ جہاز کسی سمندر میں گرا ہے اور ڈوبتا ہی چلا جا رہا ہے۔ جیسے جیسے جہاز نیچے جا رہا تھا جہاز گھلتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کا وجود بالکل ختم ہو گیا اور میں کھلے سمندر میں آن پڑا۔ اس وقت مجھے دباؤ محسوس ہونے لگا۔ لیکن میں اوپر کی جانب اٹھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ جب میں نے پانی کی سطح پر آ کر سر نکالا تو وہ ایک چھوٹی سی نہر تھی۔ میرے اردگرد لوگ خوف سے چیخ رہے تھے، میں جلدی سے باہر نکلا، اور لوگوں کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر انہیں باہر نکالنے لگا۔ جو بھی نکلتا وہ کنارے پر لیٹ جاتا۔ یہاں تک کہ کوئی آدمی بھی نہیں رہا۔ سورج کی تپش بہت بڑھ گئی تھی۔ میں نے چاہا کہ سب کو کنارے پر لے جاؤں۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ آندھی کے جیسی ہوا چلی۔ وہ مجھے اُڑا کر ایک بڑے سارے میدان میں گئی۔ میں نے جب سر اٹھا کر دیکھا۔ میرے سامنے معبد نما ایک عمارت تھی۔ وہ کس مذہب کے لوگوں کا عبادت خانہ تھا، یہ مجھے نہیں پتہ تھا۔ بس مجھے لگا کہ یہ کسی کا معبد خانہ ہے۔ وہ لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ اس پر دیگر رنگوں کے علاوہ سرخ رنگ حاوی تھا۔ میں جیسے ٹرانس میں آ گیا۔ میں آگے بڑھتا گیا۔ ہوا مجھے اس طرف دھکیلنے لگی یہاں تک کہ میں اس عبادت خانے کے کاریڈور میں جا پہنچا۔ میں نے جیسے ہی وہاں قدم رکھے، ایک دم سے سورج کی روشنی تھرتھرانے لگی، گڑگڑاہٹ ہوئی، دن میں بجلی چمکی اور شور ہونے لگا۔ اندر سے تیز آوازیں آنے لگیں۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے یہ عبادت خانہ پھٹ جائے گا۔ میرے قدم اکھڑنے لگے تھے۔ میں مضبوطی سے کھڑا رہا۔ تبھی وہاں سکون ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میری کیفیت بدلنے لگی۔ میری آنکھ کھل گئی۔

میرے چاروں سناٹا تھا۔ مجھے وہ خواب پوری طرح یاد تھا۔ اس میں دیکھی جانے والی ہر شے یاد تھی۔ فطری طور پر میں اسے سمجھنا چاہتا تھا لیکن میں نے اس پر دھیان نہیں دیا۔ مجھے احساس تھا کہ دماغ کھپانے کا کوئی فائدہ نہیں، وقت اور حالات ساری بات خود سمجھا دیں گے۔ میں نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا تو فرید کھڑا دکھائی دیا اور اس کے پاس ایک لمبے قد کا ادھیڑ عمر درویش کھڑا تھا۔ بھاری بھرکم وجود، سیاہ شلوار قمیص، پاؤں میں کھڑاویں، لمبے لمبے گیسو، تراشی ہوئی خوبصورت داڑھی، بھاری مونچھیں، سر پر درویشوں والی ٹوپی، کاندھے پر سفید چادر اور گلے میں مونگیے رنگ کا کینٹھا پہنا ہوا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو فرید کہنے لگا۔

’’آپ یہاں لیٹے ہوئے سو رہے تھے کہ یہ بابا یہاں آ گیا۔ آپ سے ملنا چاہتا تھا، میں نے روک لیا۔‘‘

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس سے پہلے کہ میں پوچھتا کہ تم کون ہو، اس نے اپنے کاندھے سے سفید چادر اتاری اور اسے بچھانے کے انداز میں پھیلایا۔ تبھی اس سفید چادر میں مجھے روہی والے بابا جی کی چہرہ دکھائی دیا۔ یوں جیسے پردہ اسکرین پر کوفلم چل رہی ہو۔ وہ چادر چند لمحے ہی تنی تھی، پھر اس نے وہ چادر لپیٹ کر اپنے کاندھے پر رکھ لی۔ اب مجھے اس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کون ہے۔ تب میں کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرتے ہوئے، اسے چار

پائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ فرید سے پوچھا۔

''کھانا آیا ہے تمہارے پاس۔''

''جی، وافر مقدار میں، تاکہ یہاں آنے والا کوئی مسافر بھی کھا سکے۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''تو لاؤ نا پھر یار، ہم کھائیں۔ ہم بھی مسافر ہی ہیں۔'' میں نے کہا تو فرید کمروں کی جانب پلٹ گیا۔ تب میں نے اس درویش کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''کیسے؟''

''رات ڈیوٹی لگ گئی۔ اب پڑے ہیں یہاں جب تک کوئی نئی ڈیوٹی نہیں لگ جاتی۔'' وہ یوں بولا۔ جیسے وہ بہت خوش ہے۔

''بہت ویرانہ ہے یہاں۔'' میں نے کہا۔

''ہر ویرانہ آباد ہوتا ہے سائیں۔ اور آبادیاں ہی ویرانوں میں بدلتی ہیں۔ یہ سب انسان کے اپنے اعمال کی وجہ سے ہی ہیں نا۔'' اس نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا پھر خاموش ہو گیا۔ یہ خاموشی اس وقت تک رہی جب تک فرید کھانا نہیں لے آیا۔ اس نے درخت کے نیچے زمین پر کپڑا بچھا دیا تھا۔ ہم تینوں وہاں جا بیٹھے۔ کھانا کھا کر جب میں چارپائی کی جانب بڑھا تو وہی درویش اٹھتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا۔

''اب تو جا۔ وہاں بڑے کام ہیں۔ ہمیں بھی تو اپنی ڈیوٹی کرنے دو۔''

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ بلکہ خاموشی کے ساتھ ذرا دور کھڑی کار کی جانب بڑھ گیا۔ مجھے اب ان ہونیاں حیرت زدہ نہیں کرتی تھیں۔

سہ پہر ہو گئی تھی۔ میں نور نگر کے راستے پر آ گیا۔ نجانے کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ ایک چکر گاؤں کا لگا کر آؤں لیکن اس دن مناسب نہیں تھا۔ میں حویلی کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے پورچ میں کار روکی تو لان میں مجھے پورا ٹولہ نظر آیا۔ گیت، سلمان، علی نواز، زویا، جنید، اکبر، مہوش اور فہیم ایک دائرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت خوشگوار احساس میرے اندر سرائیت کر گیا، جب میں نے رونیت اور اروند سنگھ کو بھی ان کے ساتھ دیکھا۔ میں والہانہ انداز میں ان کی جانب بڑھا تو وہ بھی اٹھ کر مجھ سے یوں چمٹ گئے جیسے کرکٹ میں کسی کھلاڑی کو آؤٹ کرنے پر یا فٹ بال میں گول کرنے والے کھلاڑی کو چمٹ جاتے ہیں۔ کچھ دیر تک یہ جذبہ رہا، پھر باری باری سبھی مجھے ملے۔ تو میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔

''یہ تم سب اچانک، بنا بتائے یہاں؟'' میں نے پوچھا تو گیت بولی۔

''تمہیں یقین ہونا چاہئے تھا کہ ہم ایسے ہی آتے، یہ کیسے سمجھ لیا کہ اکیلے اکیلے شادی رچا کر بیٹھ جاؤ گے۔''

''میں نے اکیلے کہاں شادی کی ہے، سوہنی کے ساتھ کی ہے۔'' میں نے کہا تو سبھی ہنس دیئے۔

''بس بانیتا کور کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔'' مہوش نے کہا تو جنید بولا۔

''اے موٹا دماغ۔! اس خوشی کے موقع پر کسی پرانی فلم کی جذباتی ماں کی طرح عین خوشی کے موقعہ پر ایسے افسردہ ڈائیلاگ مار کے ماحول خراب مت کرو۔''

''تم تو بہت باریک دماغ ہو نا۔'' مہوش نے چوٹ کی تو میں نے بیچ بچاؤ کراتے ہوئے کہا۔

''یہ رونیت کور اور اروند سنگھ جی کب پہنچے ہیں؟''

''آج ہی۔ بہت دنوں سے نکلنے کو جی چاہ رہا تھا۔ سمجھ لیں تھک گئے تھے، تمہاری شادی ایک بہانہ بن گئی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ حالانکہ میں سمجھ رہا تھا کہ ان سب کا ایک ہی جگہ ہونا، اور

یوں اچانک آجانا کسی مقصد کے بغیر نہیں تھا۔

''آؤ پھر اندر چلتے ہیں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ایسے نہیں۔ہم نے اماں جی کو بتا دیا ہے، سوہنی کو دوبارہ دلہن بنائیں، آج رات ہلا گلا ہوگا۔ ڈھولک بجائی جائے گی۔ پھر کھانا ہوگا۔ اگر منظور ہے تو ٹھیک، انہیں نے تو مان لیا ہے، اب تم بتاؤ۔'' زویا نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو میں ہنس دیا

''یار جو مرضی کر لینا، مگر اندر تو چلو۔'' میرے کہنے پر وہ سبھی اٹھ گئے۔

☆......☆......☆

سورج غروب ہو چکا تھا۔ نوتن کور اور جسپال سنگھ باہر جانے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ انہیں امرتسر پہنچنا تھا۔لیکن انہیں راستے میں پہلے ہی اتر جانا تھا۔ وہ بہت حد تک اپنا حلیہ بدل چکے تھے۔ ان کا لباس یوں تھا جیسے اکثر غیر ملکی بھارتیوں جیسا تھا۔ انہیں ایک گروپ کے ساتھ جانا تھا، انہیں بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ کون ہیں۔ اس وقت انہیں نکا سنگھ کا انتظار تھا۔ جیسے ہی وہ آیا وہ چل پڑے۔ وہ نیا بازار سے سیدھے سرکلر روڈ تک پیدل ہی چلتے چلے گئے۔ جہاں ایک جگہ وہ رک گئے۔ کچھ ہی دیر بعد ایک ہائی ایس وین آ گئی۔ وہ اس میں بیٹھ گئے۔

کچھ ہی دیر بعد ترن تارن کہیں بعد پیچھے رہ گیا۔ وہاں سے امرتسر کا فاصلہ چالیس منٹ کا تھا۔ لیکن ویگن والوں نے دربار صاحب جانا تھا جو وہاں سے تقریباً ایک گھنٹے کا سفر تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ویگن گل والی جانے والی ذیلی سڑک تک پہنچ گئی۔ وہ وہیں اتر گئے۔ چند قدم کے بعد انہیں ایک سیاہ رنگ کی کار دکھائی دی۔ وہی نمبر تھا جو انہیں بتایا گیا تھا۔ وہ اس میں بلا جھجک جا کر بیٹھ گئے۔ صرف ڈرائیور تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد ہی انہیں ڈیرہ بھگت جی گر و والی سے ذرا آگے ایک ڈیرے پر لے گیا۔

اس ڈیرے کے تین حصے تھے۔ سامنے دائیں اور بائیں۔ کار دائیں جانب والے پورشن میں جا رکی۔ وہ اترے تو ایک نوجوان آگے بڑھا اور انہیں لے کر اندر چلا گیا، جیسے ہی وہ اندر لاؤنج میں پہنچے انہیں خوشگوار حیرت نے گھیر لیا۔ بلدیو، سرجیت اور وکرم کے ساتھ بچن کور اور کرن بھی وہیں موجود تھیں۔ انہیں یوں لگا جیسے پہلی بار مل رہے ہوں۔ ابھی وہ یہ پوچھ بھی نہیں پائے تھے کہ وہ یہاں کیسے پہنچے ہیں کہ وہی نوجوان آیا اور انہیں کھانے کے بارے میں بتا دیا کہ میز پر لگ چکا ہے۔

وہ سب کھانے کی میز تک پہنچے۔ سب بیٹھ گئے تھے کہ سامنے والا دروازہ کھلا اور ایک بڑے ڈیل ڈول والا شخص اس میں سے برآمد ہوا اور ان کے قریب آ کر بولا۔

''ست سری اکال سب کو۔''

سبھی نے اس کے جواب میں فتح بلائی۔ تو وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''میں چنن سنگھ، آپ سب کا میزبان۔ آپ سب پرشادے شکھو جی، ساتھ ساتھ میں باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔'' یہ کہہ کر وہ مسکراتے ہوئے خاموش ہو گیا۔ سب کھانا کھانے لگے وہ کہتا چلا گیا۔ ''کبھی میں بھی آپ لوگوں کی طرح میدان میں تھا۔ اب نہیں اس طرح میدان میں نہیں ہوں مگر اپنے دھرم کے لیے شہید ہونا تو ہر سکھ کا کام ہے نا جی۔''

''بالکل۔ یہ تو ہے۔'' بلدیو سنگھ نے کہا۔

''میں اصل مقصد کی طرف آتا ہوں۔ یہ جو سندیپ کور والا معاملہ بنا ہے، اس نے ہماری تو آنکھیں کھول دی ہیں۔ سکھی کو یہ لوگ دیمک کی طرح چاٹ جانا چاہتے ہیں، لیکن ایسا ہو نہیں سکتا۔ ان کی

دیکھو، یہ سکھ سوچ ختم کرنے کے لیے جان لڑا رہے ہیں۔ خیر ایسا ہو تو نہیں سکتا اور نہ ہونے دیں گے۔ تم سب کو یہاں اکٹھا کیوں کیا گیا؟ میں یہ بتانا چاہتا ہوں۔"

"ہاں، یہ بات تو ہے، اگر کوئی کام تھا تو وہ وہیں جالندھر ہی میں بتا دیتے۔" بلدیو سنگھ ہی نے کہا۔

"نہیں بائی جی، یہ بات نہیں، جیسے ہی سندیپ کور والا معاملہ سامنے آیا ہے، اسی وقت سکھ بڑوں میں باقاعدہ طے ہوگیا ہے کہ اب کرنا کیا ہے۔ اس کے لیے جتھے تیار ہوگئے ہیں۔ اب ہوا یہ ہے کہ جیسے ہی بڑوں میں طے ہوا، انہیں معلوم ہوا کہ یہ جو ٹاسک ہندو اور یہودی نے لیا ہوا ہے اس کے خلاف بھی قوت تیار ہے۔ تب یہ جتھے داری انہی کے ساتھ شامل ہوگئی ہے۔ اب جو بھی کرنا ہوتا ہے، وہیں سے حکم ملتا ہے۔ کس جتھے کے ذمے کیا ہے، یہ میں نہیں جانتا لیکن مجھے آج صبح یہ ٹاسک دیا گیا ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے، ہم نے سندیپ کور کو اسپتال میں سے نکال کر لانا ہے۔ وہ اب کافی حد تک ٹھیک ہے، لیکن اس کی بیماری کے نام پر تفتیش جاری ہے۔ وہ لوگ اس پر اعتبار کر ہی نہیں رہے ہیں۔ باقی چار سکھ، وہ ایک دوسرے جتھے کے ذمے ہے۔" وہ انہیں سمجھانے والے انداز میں کہتا ہوا خاموش ہوگیا۔

"کب جانا ہے؟" جسپال نے پوچھا۔

"آج رات، جیسے ہی اسپتال کے اندر سے ہمیں اشارہ مل گیا، باقی ہم ابھی کچھ دیر بعد امرتسر چلے جائیں گے۔" بچن سنگھ نے کہا۔

"اوکے، پلان کیا ہے۔" جسپال نے گہری سنجیدگی سے پوچھا تو وہ انہیں بتانے لگا۔

وہاں سے اسپتال زیادہ سے زیادہ بیس کلومیٹر تک تھا۔ ڈیرے کے باہر مختلف گاڑیاں کھڑی تھیں۔ جسپال سنگھ ایک ہیوی بائیک پر بیٹھ گیا تو اس کے پیچھے بچن کور آن بیٹھی۔ وہ وہاں سے سیدھے گیٹ کی طرف نکلا اور پھر چلتا چلا گیا۔ باقی سب پلان کے مطابق آرہے تھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے میں وہ اسپتال کی پارکنگ تک جا پہنچے۔ اس نے بائیک پارکنگ میں نہیں لگائی، بلکہ کچھ دور ایک طرف لگا دی۔ بچن کور بائیک کے قریب ہی رک گئی۔ جسپال نے چابی اسے تھمائی اور خود اندر کی جانب بڑھ گیا۔

رات ہونے کی وجہ سے اسپتال میں رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ اکا دُکا لوگ آجا رہے تھے۔ روشنی بھی کم کم تھی، زائد لائٹیں بجھا دی گئی تھیں۔ ڈاکٹر اپنے اسٹاف سمیت راؤنڈ لگا چکا تھا۔ ایک طرح سے سکون تھا۔ سندیپ کور دو دن تک انتہائی نگہداشت وارڈ میں رہی تھی۔ اس کے بعد اسے ایک پرائیوٹ کمرے میں شفٹ کر دیا گیا تھا، جہاں اس کی نگرانی ہو رہی تھی۔ اس کے پاس کافی لوگ ہوتے تھے، لیکن اس وقت کمرے کے باہر دو گارڈ تھے۔ اندر دو خواتین تھیں، جو نرس کے روپ میں ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھیں۔

وہ پرائیوٹ کمرے "یو" کی شکل میں بنے ہوئے تھے۔ سندیپ کور کو بائیں جانب والے دوسرے کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ جسپال انٹرنس سے اندر داخل ہوا تو اسے وہ دونوں گارڈ دکھائی دیئے۔ وہ ایک بینچ پر بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ سامنے وکرم اور سرجیت کھڑے تھے۔ اور کرن کور جسپال کے پیچھے تھی۔ ان چاروں کا آپس میں جیسے ہی "ٹائی اپ" ہوا، وہ تینوں مختلف سمتوں سے غیر محسوس انداز میں آگے بڑھے۔ جسپال کمرے کے بالکل سامنے تھا۔ وہ دونوں کاریڈور میں دائیں بائیں سے آرہے تھے۔ جس وقت ان دونوں نے اچانک ان گارڈوں

پروار کیا، اسی لمحے وہ کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے ہی کرن کور بھی اندر چلی گئی۔

سندیپ کور اسپتال کے لباس میں سامنے بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک نرس نما گارڈ اس کے دائیں جانب اور دوسری بائیں طرف بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ تینوں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ جیسے ہی جسپال کو انہوں نے دیکھا وہ چونکتے ہوئے ایک ساتھ تیزی سے بولیں۔

''کون ہو تم؟''

جسپال نے جواب نہیں دیا، بلکہ بڑھ کر ایک زور دار تھپڑ اس کے منہ پر مار دیا، اسی لمحے کرن کور نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے پسٹل نکال لیے۔

''دیوار کی جانب منہ کر کے کھڑی ہو جاؤ۔ سر پہ ہاتھ رکھو۔ ذرا بھی حرکت کی تو گولی بھیجے میں اتر جائے گی۔'' جسپال نے یوں سرد لہجے میں کہا کہ وہ گارڈ فوراً ہی مڑ گئی۔ کرن کور بھی دوسری کو دیوار کے ساتھ لگا چکی تھی۔ تبھی جسپال نے سندیپ کور کہا۔

''چلو، اپنے پاؤں پر جاؤ گی یا تمہیں اٹھا لیں۔''

''کون ہو تم لوگ؟'' اس نے سختی سے پوچھا۔

''میجر راٹھور، فرام را۔ اتنا کافی ہے یا مزید بتاؤں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے آنکھ دبا دی، سندیپ نے ایک بار اسے حیرت سے دیکھا اور پھر اس کا تنا ہوا چہرا ڈھیلا پڑ گیا۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

''مجھے ویسے ہی بلوا لیا جاتا، یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔'' سندیپ کور نے پھر سختی سے کہا تو کرن کور بولی۔

''اے لڑکی زیادہ بکواس نہ کر، ساری باتیں اوپر جا کر بتانا، ہمیں تم پر اعتماد نہیں رہا۔ چلیں سر۔''

اس کے یوں کہتے ہی جسپال نے سندیپ کو اٹھا لیا۔ وہ مزاحمت کرنے لگی۔ جسپال کی گرفت ایسی تھی کہ وہ خود کو اس سے چھڑا نہ سکی۔ وہ اسے لے کر باہر کی جانب بڑھ گیا۔ تبھی اسے پیچھے سے کرن کور کی آواز آئی۔

''کون یہاں آیا تھا، کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیئے۔ صرف اپنے انچارج کو بتانا۔ ورنہ تم خود ذمہ دار ہو گی۔''

کمرے سے باہر والے گارڈ بے ہوش تھے۔ وکرم انٹرنس کے پاس تھا، سرجیت اور کرن نے کور لیا۔ جسپال تیزی سے آگے بڑھا۔ اس دوران اس نے سندیپ کور کے کان میں کہا۔

''جمال۔! ہم اس کے ساتھی ہیں۔'' یہ سنتے ہی اس کا بدن ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے سامنے کھڑی گاڑی میں سندیپ کور کو ڈال دیا۔ تب تک باقی بیٹھ گئے۔ اور گاڑی چل دی۔ وہاں جسپال اکیلا رہ گیا۔ وہ تیزی سے اپنی بائیک کی طرف جا رہا تھا کہ بچن کور بائیک پر بیٹھ گئی اور اس نے اسٹارٹ کر لی۔ جب تک وہ پیچھے آ کر بیٹھا اس نے گیئر لگا دیا۔ گاڑی گیٹ کے پاس پہنچ گئی۔ اسی لمحے ایک فائر ہوا جو گاڑی میں لگا، اس کے ساتھ ہی کئی فائر ہوئے۔ جسپال نے مڑ کر دیکھا دو آدمی ہاتھوں میں پسٹل لیے کار کو نشانہ بنا رہے تھے۔ جیسے ہی انہوں یہ کنفرم کر لیا کہ گاڑی گیٹ پار کر گئی ہے وہ تیزی سے ایک کار کی جانب بڑھے تا کہ اس کا پیچھا کیا جا سکے۔

''بچن، گیٹ سے باہر نکل کر رکنا۔'' جسپال نے تیزی سے کہا تو وہ بولی۔

''اوکے۔''

جیسے ہی وہ کار ان کے قریب سے گذری، اس نے بچن سے کہا کہ ڈرائیور کے قریب لے جاؤ۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ بچن نے بائیک ڈرائیور کی کھڑکی کے قریب لگا دی۔ دوسرا اس کے ساتھ پسنجر سیٹ پر تھا۔ دونوں کی پوری توجہ سامنے گاڑی کی طرف تھی۔ جسپال نے پہلا فائر ساتھ بیٹھے بندے پر، دوسرا

ا را یو ر پر کیا۔ انکی کار لہرائی، تب تک جسپال نے ٹائر ن فائر کر دیا۔ ایک دھماکہ ہوا

''بچن اب نکلو۔'' جسپال نے تیزی سے کہا تو بچن ے بائیک کی رفتار خطرناک حد تک بڑھا دی۔ ایک ملے شدہ موڑ پر فلنگ اسٹیشن کے پاس کار لیے نوتن کور کھڑی تھی۔ انہوں بائیک وہیں چھوڑی اور کار میں جا بیٹھے۔ ان کے بیٹھتے ہی نوتن کور نے کہا۔

''اب ہم نے واپس گل والی نہیں جانا۔''

''کہاں جانا ہے؟'' جسپال نے پوچھا۔

''جیسے ہی وہ لوگ کسی ٹھکانے پر پہنچیں گے ہمیں پتہ چل جائے گا، تب تک ہمیں کچھ وقت گزارنا ہے۔'' وہ سکون سے بولی تو بچن کور نے کہا۔

''کسی جگہ رُک جایا جائے۔''

''بات تمہاری ٹھیک ہے۔'' نوتن نے کہا اور سڑک کنارے جوس کے ٹھیلے کے پاس کار روک دی۔

جوس پیتے ہوئے پندرہ منٹ لگ گئے تھے، جب انہیں فون ملا۔ نوتن کو پوری لوکیشن سمجھا دی گئی۔ وہ چل دی۔ وہ امرتسر کا نو تعمیر شدہ پوش علاقہ تھا۔ کافی خوبصورت بنگلے تھے۔ ایک بنگلے پر جا کر اس نے کال ملائی، اندر سے وکرم سنگھ باہر آیا۔ وہ پورچ تک کار لے گئے۔ تبھی سرجیت سنگھ بھی باہر آ گیا۔ اس نے نوتن کور سے کہا۔

''لو جی، ہم سب جا رہے ہیں گل والی۔ وہیں رہیں گے۔ یہاں جسپال اور تم رہو گی۔ اب سنبھال لو سب۔''

وہ سب چلے گئے تو جسپال کے ساتھ نوتن کور اس کمرے میں چلے گئے جہاں سندیپ کور پڑی ہوئی تھی۔ وہ جسپال کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''تمہیں جمال نے کیسے؟''

''ابھی تمہاری اس سے بات کراتا ہوں۔'' جسپال نے کہا اور اس کے قریب فون لے کر بیٹھ گیا۔ کچھ لمحوں بعد فون لگ گیا تو جمال کی آواز ابھری، اس نے فون سندیپ کو تھما دیا۔ وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ چند منٹ بعد اس نے فون واپس دے دیا۔ وہ جسپال کو گہری نگاہوں سے یوں دیکھ رہی تھی، جیسے وہ اس کا مسیحا ہو۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟''

''پہلے تو مجھے یہ لگا تھا کہ ایک جگہ سے نکل کر کسی دوسری جگہ پھنس گئی ہوں لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں آزاد ہوں۔'' اس نے تشکر بھرے لہجے میں کہا۔

''اب تم آزاد ہی ہو۔'' نوتن نے کہا۔

''سب سے پہلے تو میرے یہ کپڑے، ان سے نجات دلاؤ مجھے۔'' سندیپ کور نے کہا۔

''ٹھیک ہے، کچھ کرتے ہیں۔'' نوتن کور نے کہا تو جسپال وہاں سے اٹھ گیا۔

☆......☆......☆

آدھی رات کے بعد جا کر کہیں سب کا ہلا گلا ختم ہوا۔ میں انہی کے ساتھ ان کی خوشی میں مصروف رہا۔ سوہنی بھی وہیں رہی۔ جب سارے تھک گئے تو دوسروں کی طرح وہ بھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ایسے ہی وقت میں جسپال نے میری بات سندیپ کور سے کروائی۔ وہ بہت خوش تھی کہ اب وہ محفوظ ہے۔ میں نے پھر بات کرنے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ میں جب کمرے میں گیا تو وہ جاگ رہی تھی۔ ہم سوئے نہیں یہاں تک کہ صبح صادق کا وقت ہو گیا۔ ہم نہا چکے تو سوہنی اپنے معمولات میں مشغول ہو گئی اور میں سونے کے لیے لیٹا ہی تھا کہ سلمان کا فون آ گیا۔ میں نے تیزی سے فون ریسیو کیا

''خیر ہے سلمان؟''

''خیر ہی ہے۔ تم ایسے کرو، لاؤنج میں آؤ۔ کسی

سے ملنا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔
میں تیزی سے لاؤنج میں پہنچا تو وہاں پر اکیلا سلمان ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی باہر کی جانب لپکا۔ میں بھی اس کے پاس چلا گیا۔ وہ کار میں بیٹھ چکا تھا، میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا تو وہ گیٹ کی جانب چل دیا۔
''کس سے ملنا ہے۔'' جیسے ہی اس نے گیٹ پار کیا تو میں نے پوچھا تب وہ الجھے ہوئے گہرے لہجے میں بولا۔
''جمال۔! یہ بندہ جو ابھی تمہیں ملنے آرہا ہے، یہ اس پورے ریجن کا ہی نہیں پورے جنوبی ایشیا میں بہت اہم ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ تم سے ایک دم کیوں ملنے آرہا ہے۔ مجھے ابھی کرنل سرفراز کا فون ملا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ وہ آرہا ہے۔''
''کہاں ملنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''یہ نورنگر کے پاس جو کھلا میدان ہے نا، وہاں۔'' اس نے جواب دیا
''مطلب مسافر شاہ کے تھڑے کے پاس۔'' میں نے کہا تو وہ بولا۔
''میں نہیں جانتا کہ وہ جگہ کون سی ہے، لیکن یہ دیکھو یہ نقشہ مجھے وہاں لے جائے گا۔'' اس نے کار کے ڈیش بورڈ کی جانب اشارہ کیا۔ وہاں سرخ بتی جل بجھ رہی تھی اور پیلے رنگ کے نقشے پر نیلی لکیر بنی ہوئی تھی۔ جو سفر طے کر لیتے وہ سبز ہو جاتی تھی۔
''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور سامنے دیکھنے لگا۔
وہ درست سمت پر جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہم مسافر شاہ کے تھڑے پر پہنچ گئے۔ جہاں مکمل اندھیرا تھا۔ لیکن درختوں اور کمرے کے پاس چوہدری اشفاق سمیت سارے کھڑے تھے۔ میں انہیں دیکھ ہی رہا تھا کہ فضا میں ہیلی کاپٹر کا شور ہونے لگا جو لمحہ بہ لمحہ بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ میدان میں کسی نے تیز روشنی سے اشارہ دینا شروع کر دیا۔ اس جگ مگ کرتی ہوئی روشنی میں مجھے یوں لگا جیسے وہاں پر بہت سارے لوگ کھڑے ہیں۔ ہیلی کاپٹر کی روشنی روشن ہوگئی۔ تب نیچے کئی سارے لوگ دکھائی دیئے۔ وہ سب سیکورٹی پر تھے۔ ہیلی کاپٹر روشنی کی لکیر پر ہی اترنے لگا۔ وہ ہم سے کافی فاصلے پر اتر رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ زمین کے ساتھ آلگا۔ چند منٹ بعد ایک کار کی ہیڈ لائینس روشن ہوئیں اور وہ ہماری جانب بڑھنے لگیں۔ اسی وقت سلمان میرے قریب آیا اور ایک کمرے کی جانب اشاری کرتے ہوئے بولا۔
''مہمان کو اس طرف لے کر جانا ہے، وہیں بات کرنی ہے۔''
ایسے میں کار ہمارے پاس آگئی۔ وہ اس میں سے نکلا۔ اس کے ساتھ ہی بہت سارے سیکورٹی کے لوگ اس کے اردگرد ہو گئے۔ وہ ایک بوڑھا سا آدمی تھا، لیکن اس کی گردن تنی ہوئی تھی اور وہ سیدھا یوں بڑھ رہا تھا جیسے کوئی پرانا فوجی ہو۔ اس نے بلیک پتلون پر سفید شرٹ پہنی ہوئی تھی، جس پر بلیک بو لگی ہوئی تھی۔ میں آگے بڑھا تو اس نے مجھ سے مصافہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔
''میں ہوں جمال۔'' میں نے کہا۔
''جانتا ہوں اور میں سکندر حیات، آئیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو ہم اس کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ کمرے میں دو صوفے رکھے ہوئے تھے۔ یہ کسی نے رکھوا دیئے ہوں گے۔ ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ دھیمی روشنی ہونے کے باوجود اس کا چہرہ واضح دکھائی دے رہا تھا۔ سفید رنگ، لمبی ناک، پتلے پتلے ہونٹ آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ گہری چمکتی ہوئیں۔ بال سفید، کلین شیو۔ پہلی نگاہ میں لگا جیسے وہ

کوئی بیورو کریٹ سفارت کار ہو۔
''مسٹر جمال۔! میں جو باتیں کرنے جارہا ہوں، وہ فون پر بھی کہہ سکتا تھا، لیکن مجھے تم سے ملنے، تمہیں دیکھنے کا بے حد شوق تھا۔ میں تجھے بہت پہلے سے جانتا ہوں۔ لیکن اس وقت میری توجہ تم پر زیادہ ہوگئی جب تم نے ممبئی میں اپنا وقت گزارا۔''
''جی۔'' میں اس سے زیادہ نہ کہہ پایا
''میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں جو بھی ٹاسک دیا جائے تم پورا کر لو گے۔ لیکن ہوا یہ کہ اب تک تمہیں کوئی بڑا ٹاسک دیا ہی نہیں گیا۔ خیر۔! اب وقت آ گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں تمہیں ٹاسک دوں، کچھ باتیں کہنا مناسب سمجھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا، پھر بولا ''دیکھو۔! یہ جو ہمارا جنوبی ایشا ہے، اس میں چند چیزیں ایسی ہیں جنہوں نے پورے علاقے اور اس کے عوام کو اپنا مطیع بنایا ہوا ہے۔ وہ چند بڑے لوگوں کا مافیا ہے، جن کا مذہب اور ملت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اُن کا مقصد صرف اور صرف طاقت ہے۔ جس سے وہ ہر شے حاصل کر لیتے ہیں۔ اس سے جو بڑی بڑی خرابیاں جنم لے چلی ہیں، ان میں سب سے بڑی موروثی سیاست ہے۔ اگر اس خاندان کا کوئی بندہ نہیں ہے تو ان کی کٹھ پتلی ہو گی۔ اسی سے جرائم کی بھرمار ہے۔ اسی سے طبقاتی نظام ہے، غربت ہے۔ جہالت ہے، بیماری ہے۔ ان چند لوگوں نے اگر ضرورت محسوس کی ہے تو غیر ملک سے بھی مدد لے لیتے ہیں۔ وہ جو پرانا تقسیم کرو اور حکومت کرو والا فارمولا تھا، وہ اب نہیں، اب تو خوف پیدا کرو اور من مانی کرو والی صورت حال ہے۔ المیہ یہ ہے کہ خوف پیدا کرنے والی جس قوت کو انہوں نے استعمال کیا ہے وہ مذہب ہے اور مذہبی لوگ۔ جنوبی ایشا کے کسی خطے کو اٹھا کر دیکھ لو، سب سے زیادہ خوف مذہب کی طرف سے ہے۔''
''جی یہ تو میں نے بھی محسوس کیا ہے۔'' میں نے کہا۔
''کیسا المیہ ہے کہ اس خطے کے ہر ملک کے عوام اپنے ہی لوگوں کے خلاف صف آرا ہیں۔ اس لڑائی میں اتنی توانائی خرچ ہو رہی ہے کہ اگر پانچ برس یہ لڑائی بند کر دی جائے تو ہر بندے کو زندگی گذارنے کی بہترین سہولیات میسر آ جائیں۔ خیر۔! ہم اپنے طور پر یہ جنگ لڑ رہے ہیں۔ ورنہ اب تک نجانے کیا سے کیا ہو جاتا۔'' اس نے اپنے لہجے کو برقرار رکھتے ہوئے کہا تو میں بولا۔
''جی، میں سمجھ رہا ہوں آپ کی بات۔''
''اب میں تمہیں بتاؤں۔ اس خطے میں ایٹمی توانائی آ جانے کے بعد طاقت کا توازن ہوا تو جنگ ہونا ناممکن ہو گیا۔ جو بھی لڑے گا، فنا سب نے ہو جانا ہے۔ لیکن اس میں ان چند لوگوں کے مافیا نے نئے نئے راستے نکال لیے ہیں۔ اسلحہ کی دوڑ لگا دی۔ کیوں نہیں معاہدہ کر لیتے کہ دس برس تک جنگ نہیں ہوگی بلکہ غربت کا خاتمہ کرنا ہے۔ نہیں کریں گے کیونکہ ان کی طاقت کم پڑ جائے گی۔ خیر اسے تم بہتر طور پر سمجھ لو گے۔ اس وقت تمہارے سامنے پاک و ہند دو بڑے ملک ہیں۔ انہیں دیکھو۔ جیسی طاقت تم چاہو گے تمہیں ملتی رہے گی۔ اب یہ تم پر ہے کہ تم نے طاقت کیسے حاصل کرنی ہے اور اس طاقت کو خرچ کہاں کرنا، مجھے پوری امید ہے کہ تم انسانیت کے لیے ہی کام کرو گے اور شیطانیت کو مات دو گے۔'' اس نے کہا۔
''انشاءاللہ۔'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا
''اوکے۔! اس وقت ہمارے اس خطے کو بہت بڑے خطرے نے آن گھیرا ہے۔ وہ خطرہ کیا ہے، کیسا

ہے؟ اس بارے میں صبح تمہیں ایک پولیس انسپکٹر ملے گا وہ بتائے گا۔ اب میں چلتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں بھی اٹھ گیا۔

''میں شاید تمہیں دوبارہ نہ ملوں لیکن اتنی طاقت مل جانے کے بعد تمہیں اس کا پاس کرنا، اسے استعمال کرنے کا حوصلہ بھی پیدا کرنا ہوگا۔ اللہ حافظ۔'' اس نے کہا۔ میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور باہر نکلتا چلا گیا۔ وہ چند قدم پھلانگ کر کار میں جا بیٹھا۔ وہ کار سیدھ میں چل نکلی۔ ہیلی کا پٹر سٹارٹ ہی تھا۔ کچھ ہی منٹ بعد وہ فلائی کرتے ہوئے نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

ایک دم سے خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ پراسرار بندہ اپنا اثر چھوڑ گیا تھا۔ سلمان کان سے فون لگائے کسی سے بات کر رہا تھا۔ میں پلٹا اور کار میں جا بیٹھا۔ میں اپنے بدن میں سنسنی محسوس کر رہا تھا۔ اب شاید مجھے بہت کم وقت ملے۔ سلمان میرے ساتھ آ بیٹھا اور کار چلاتے ہوئے واپس حویلی چل دیا۔ ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔

کچھ دیر بعد سبھی حویلی میں پہنچ گئے۔ ہر کوئی اس پر بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے کہا۔

''سب سو جاؤ۔ کچھ دیر آرام کرو۔ صبح بات ہو گی۔''

''او کے۔'' سلمان نے کہا اور سبھی اٹھ گئے۔ میں حیران تھا کہ وہ سب اس قدر مؤدب کیسے ہو گئے ہیں۔

اس وقت سورج نکل آیا تھا، جب ہم سبھی ناشتے سے فارغ ہو گئے تھے۔ ناشتے پر ہی سلمان نے کہا۔

''ہم نے ایک کمرہ دیکھا ہے، اسے ہم کنٹرول روم بنائیں گے۔ آج ہم سب یہی کام کریں گے کیونکہ ابھی کچھ دیر پہلے سامان یہاں پہنچ گیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

''اور ایک آدمی آپ سے ملنے کے لیے بیٹھا ہے۔ اسے ناشتہ کروا دیا ہے وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔'' چوہدری اشفاق نے کہا تو مجھے یاد آیا، سکندر حیات نے کسی انسپکٹر سے ملنے کو کہا تھا۔

''بلاؤ اسے۔'' یہ کہہ کر میں سب کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''تم سب بھی بیٹھو اور اس کی بات سنو۔''

کچھ دیر بعد ایک خوبرو نوجوان بہترین سوٹ میں ملبوس اندر آیا اور بڑے اعتماد سے سلام کرتے ہوئے بولا۔

''جی میں مسٹر جمال سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں ہوں جمال بولو، کیا بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''سر۔! میں ایک پولیس آفیسر ہوں۔ معاملہ کچھ ایسا ہے کہ مجھے اُس کی سمجھ نہیں آ رہی۔ مجھے کرنا کیا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ پھر مجھے یہ کہا گیا کہ میں آپ سے ملوں، یہ آپ سمجھ جائیں گے کہ مجھے آپ تک کس نے بھیجا ہے۔'' اس نے بڑے اعتماد اور سکون سے کہا۔

''بات کیا ہے؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''میں شروع سے اب تک کی تفصیل آپ کو سناؤں گا، اختصار میں شاید میں اپنی بات نہ کہہ پاؤں، اس کے لیے تھوڑا وقت لگے گا۔''

ٹھیک ہے آپ کہیں، جتنا بھی وقت لگے۔'' میں نے کہا تو بتانے لگا۔

☆......☆......☆

سنسناتی ہوئی گولی میرے قریب سے گذر کر میرے پیچھے کھڑی کار میں جا گھسی۔ اس سے جو آواز پیدا ہوئی، اس نے میرے اندر خطرناک صورت حال کا یقین بھر دیا۔ میں اگر وہیں کھڑا رہتا تو اگلے لمحے میرا بدن ان برستی ہوئی گولیوں سے چھلنی ہو جانے والا تھا۔ یہ بہادری نہیں سراسر خودکشی تھی۔ میں نے

یکلخت پینترا بدلا اور کار کے پیچھے جا چھپا۔اسی لمحے کئی گولیاں کار میں ٹھک ٹھک کے ساتھ پیوست ہوگئیں۔میرے ساتھ میرا جونیئر پولیس آفیسر عدنان اپنا سروس ریوالور تانے ہوئے فائر کرنے کے لیے میرے حکم کا منتظر تھا۔اس کے ساتھ تین کانسٹیبل تھے جو اپنی گنیں تانے ہوئے تھے۔

میرے سامنے قدیمی شہر کی بل کھاتی ہوئی گلی تھی۔دن کا پہلا پہر گذر چکا تھا۔دھوپ چمک رہی تھی۔میں گلی کی نکڑ پر کھڑا یہ سمجھنے کی کوشش کرر ہا تھا کہ یہ فائر کہاں سے ہور ہے ہیں؟گلی میں سارے ہی گھر پرانی طرز کے اور دو منزلہ تھے۔کس کھڑکی یا دروازے سے یہ فائر ہوئے تھے، میں ایک دم سے کوئی فیصلہ نہیں کر پار ہا تھا۔کیونکہ میرے چھپتے ہی سامنے سے ہونے والی فائرنگ بند ہوگئی تھی۔میں سمجھ رہا تھا کہ مجرم فقط میرا راستہ روکنا چاہتے ہیں۔اسی لمحے میں نے ایک فائر کیا تو سامنے سے ایک دم کئی فائر ہوئے۔جو کہ کار ہی میں لگے۔مجھے ڈر تھا کہ اگر کوئی فائر ایسا لگ گیا، جس سے پٹرول کو آگ لگ گئی تو یہی کار بم کی مانند پھٹ جائے گی۔صورت حال خاصی گھمبیر ہوگئی تھی اور میں ان مجرموں کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔دفعتاً عدنان کی سرسراتی ہوئی آواز میرے عقب سے ابھری۔

”سر!یہ علاقہ خطرناک ہے،یہاں ہم ان کا مقابلہ نہیں کر پائیں گے۔ہمیں مزید نفری چاہئے ہوگی۔“

عدنان نے تشویش بھرے لہجے میں مجھے مشورہ دیا تھا لیکن میں کچھ اور سوچ رہا تھا، میں نے اس کا جواب دینے کی بجائے تیزی سے پوچھا۔

”اس گلی کی دوسری طرف کیا ہے؟میرا مطلب ہے کہیں کھلتی بھی ہے یا بند ہے؟“

”کھلتی ہے، دوسری طرف ایک مصروف روڈ ہے۔درمیان میں بھی کئی گلیاں ہیں اور......“

وہ بتا رہا تھا مگر میں نے اس کی پوری بات نہیں سنی۔میں نے تیزی سے کار کے اندر ہاتھ ڈالا اور وائرلیس پر صورت حال سے آگاہ کر دیا۔جلد ہی مجھے یہ کہا گیا کہ مزید نفری بھیجی جا رہی ہے،ڈٹے رہیں اور کسی بھی صورت میں مجرم وہاں سے بھاگنے نہ پائیں۔جس طرح مجرم مجھے وہاں روکنا چاہتے تھے، میں بھی انہیں مصروف رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔میں نے فائرنگ کا حکم دے دیا۔جس کے جواب میں بھی فائرنگ ہونے لگی۔مجھے پوری طرح احساس تھا کہ ہم زیادہ دیر تک یہ چاند ماری نہیں کر سکتے۔سو ہم بڑی احتیاط سے اسلحہ خرچ کرر ہے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹہ پہلے میں اپنے تھانے میں تھا، جب مجھے وائرلیس پر اطلاع دی گئی کہ ہمارے علاقے میں سیاہ فور وہیل جیپ میں مجرم فرار ہور ہے ہیں،انہیں ہر حال میں روکنا ہے۔فور وہیل کا نمبر اور لوکیشن بھی بتا دی گئی کہ وہ کہاں پر ہے۔میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تھانے سے اپنی کار ہی میں اپنے جونیئر آفیسر اور کانسٹیبل کے ساتھ نکل پڑا تھا۔سڑک تک آتے ہمیں وائرلیس کے ذریعے معلوم ہوگیا تھا کہ وہ سیاہ فور وہیل کس طرف سے آرہی ہے۔میں نے ایک مخصوص جگہ پر ناکہ لگانے کا سوچا اور اس طرف بڑھ گیا۔وہاں سے کسی صورت بھی وہ فور وہیل نہیں نکل سکتی تھی۔جیسے ہی میں وہاں پہنچا اور ناکہ لگانے ہی والا تھا کہ وہ فور وہیل آتی ہوئی دکھائی دی۔اتنا وقت ہی نہیں تھا۔ہم اسے ناکہ لگا کر نہیں روک سکتے تھے۔میں نے اپنی کار سڑک کے درمیان کر کے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن ہمیں دیر ہوگئی تھی۔وہ سپیڈ میں تھی اس لیے ہمارے قریب سے نکل گئی۔اب سوائے تعاقب کے کوئی چارہ نہیں تھا۔

میں نے اپنی کار اس کے پیچھے لگا دی۔ بیس پچیس منٹ کے تعاقب کے بعد وہ قدیمی شہر کی انہی گلیوں میں گھس گئی۔ میں ان کے پیچھے لگا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اس گلی میں گھس گئے۔ میں جیسے گلی میں داخل ہوا، وہاں پر سیاہ فور وہیل نہیں تھی۔ یوں جیسے وہ گلی اس فور وہیل کو نگل گئی ہو۔ اتنی جلدی وہ فور وہیل گلی پار نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے پورا یقین ہو گیا تھا کہ وہ اسی گلی میں گھسے ہوئے ہیں۔ ہم وہاں گلی کی نکڑ پر رک گئے۔ اس وقت میں کار سے اتر کر اطراف کا جائزہ لینے لگا تھا کہ ایک دم سے فائرنگ ہونے لگی اور مجھے وہاں چھپنا پڑا تھا۔ تبھی مجھے یقین ہو گیا کہ مجرم یہیں کہیں ہیں۔ میں اگر کوشش کروں تو انہیں پکڑ سکتا ہوں۔

میں نفری کا انتظار کر رہا تھا، پندرہ منٹ کے اندر اندر اس پورے علاقے کو گھیر لیا گیا۔ اس گلی کی دوسری جانب انسپکٹر دلشاد آ گیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ بھاری نفری تھی۔ ہم دونوں کے درمیان رابطہ ہو گیا تھا۔ اس وقت وائرلیس اور انسپکٹر دلشاد سے جو معلومات ملیں، اس کے مطابق ہمارے مطلوبہ مجرم کسی اہم شخص کو ایئر پورٹ سے اغوا کر کے بھاگے تھے۔ ایک طرح سے اس علاقے میں کرفیو لگا دیا گیا۔ گھر گھر تلاشی شروع ہو گئی۔ اسی دوران پتہ چلا کہ اس گلی ہی میں ایک ذیلی گلی تھی، جو دائیں طرف کھلتی تھی۔ ایک فور وہیل اس میں سے آسانی کے ساتھ جا سکتی تھی۔ میں سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ بلاشبہ وہ اسی گلی میں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

''لیکن، جمال یہ سوچو کہ مجرموں نے کہاں سے فائر کیا اور کیوں کیا؟ وہ جیپ یہاں سے نکل کر کہاں گئی؟'' انسپکٹر دلشاد بھی وہی سوچ رہا تھا، جو سوچ مجھے چبھن دے رہی تھی۔ تبھی میں کہا۔

''ان سوالوں کے جواب تو وہی دے سکتے ہیں یا پھر یہاں سے تلاشی کے دوران کوئی اشارہ مل جائے۔''

''ٹھیک ہے یہاں کی تلاشی کے بعد ہم بات کرتے ہیں۔'' اس نے کہا اور پوری نفری لگا دی۔ ہم نے اندازے کے مطابق تلاشی شروع کر دی۔

میں ایک گھر میں گھسا تو ڈیوڑھی کے بعد چھوٹا سا صحن تھا۔ سامنے تخت پر ایک ادھیڑ عمر خاتون اور اسی کی جتنی عمر والا ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ انہی کے پاس تخت پوش پر ایک ادھیڑ عمر شخص آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔ جس کے پاس ایک نوجوان لڑکی پریشانی کے عالم میں کبھی ہمیں دیکھتی اور کبھی اس بوڑھے شخص کو دیکھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں ان سے کوئی بات کرتا۔ میرے ساتھ آئے لوگ سیڑھیوں سے اوپر چلے گئے۔ میرے سامنے موجود وہ بوڑھے اور نوجوان لڑکی مجھے خوف زدہ انداز میں میری طرف دیکھے چلے جا رہے تھے۔ چند لوگ اندرونی کمروں میں گھس گئے۔ تبھی اس نوجوان لڑکی نے بڑی لجالت سے کہا۔

''انسپکٹر پلیز، میرے نانا کو اس وقت اسپتال پہنچانا بہت ضروری ہے۔ میں انہیں لے کر نکل رہی تھی کہ ہماری چھت پر فائرنگ ہونے لگی۔ ان کی حالت مزید خراب ہو گئی ہے۔ انہیں فوری طور پر اسپتال پہنچانا بہت ضروری ہے، ورنہ......''

بوڑھے کا رنگ تانبے کے جیسا تھا، جیسا اکثر ان یورپین کا ہوتا ہے جو گرم ممالک میں زیادہ رہے ہوں۔ اس بوڑھے کی آنکھیں بند تھیں اور وہ برسوں کا بیمار لگ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں ان سے کوئی سوال کرتا، میرا ایک ماتحت تیزی سے نیچے آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ اوپر کے ایک کمرے میں گولیوں کے خول ملے ہیں۔ بلاشبہ فائرنگ یہاں سے کی گئی تھی۔ میں تیزی سے اوپر گیا۔ وہاں کافی سارے خول پڑے تھے۔ انہیں قبضے میں لے لیا گیا۔ میں نے

انسپکٹر دلشاد کو فون کر کے بتایا تو اس نے کہا۔
"میں بالکل تمہارے سامنے والے گھر میں ہوں۔ یہاں بھی ایک کمرے میں سے اسی طرح خول پڑے ہوئے ملے ہیں۔ یہاں سے بھی فائرنگ کی گئی ہے۔"
میں نیچے آیا تو وہ لڑکی اضطراری انداز میں میری طرف لپکی اور پھر سے کہا۔
"انسپکٹر، میرے نانا کو اسپتال لے جانا ہے۔ پلیز......"
"ٹھیک ہے لے جاؤ۔ مگر لے جاؤ گی کیسے؟" میں نے پوچھا۔
"کوئی ٹیکسی لے کر آتی ہوں۔" اس نے گھبراتے ہوئے کہا تو میں نے اس کے ساتھ ایک کانسٹیبل کو بھیج دیا۔ میں اس گھر سے باہر نکل کر سامنے کا گھر دیکھنے نکلا تھا کہ وائرلیس پر یہ اطلاع سننے کو ملی کہ شہر کے دوسرے علاقے میں ایک سیاہ فور وہیل جیپ ملی ہے، جس میں ایک بوڑھا بے ہوش ملا ہے۔
"شاید وہی ہو؟ مجرم اسے چھوڑ کر بھاگ گئے ہوں؟" انسپکٹر دلشاد نے اپنی رائے دی۔
"ابھی معلوم ہو جائے گا۔" میں نے کہا تو اسی وقت ایک دوسری اطلاع سننے کو ملی کہ جس علاقے میں ہم کھڑے تھے، وہیں قریب ہی ایک سیاہ رنگ کی فور وہیل جیپ دھماکے سے بعد جل رہی تھی۔ ہمیں فوراً وہاں پہنچنے کو کہا گیا۔ میں اپنے ساتھ نفری کو لے کر تیزی سے اپنی زخم خوردہ کار میں اس جانب بڑھا تاکہ موقع پر جا سکوں۔
میں موقع پر پہنچا تو وہ جیپ جل چکی تھی۔ سڑک کے ایک طرف خالی جگہ پر وہ پارک کی گئی تھی۔ اس کے آس پاس کوئی گاڑی نہیں تھی۔ اسے جلانے کے لیے ہلکا بم استعمال کیا گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے مجرموں نے جان بوجھ کر اس فور وہیل کو جلایا ہے۔ میں نے کوشش کر کے اس کا نمبر پڑھ لیا۔ یہ وہی فور وہیل تھی، جس کا تعاقب کرتے ہوئے ہم یہاں پہنچے تھے۔ میں ابھی اس جیپ کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اسی طرح کی اطلاع سننے کو ملی کہ ایک سیاہ رنگ کی فور وہیل جیپ شہر کے تیسرے کونے میں جل کر خاکستر ہو گئی ہے۔ اس اطلاع نے ایک دم سے سنسنی پھیلا دی۔ کوئی پولیس سے کھیل رہا تھا۔ ایسا کر کے وہ کیا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا؟ یہی وہ سوال تھا جو میرے ذہن میں نہیں آیا، بلکہ سبھی ایسا سوچ رہے تھے۔
اس وقت میں اپنے تھانے کی جانب لوٹ رہا تھا۔ دوپہر ہو گئی تھی۔ ناکامی اور لاحاصل مشقت نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں اپنے اندر اٹھتے ہوئے غصے کو محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ مجھے اس وقت تک مجھے پوری واردات کا بھی علم نہیں تھا۔ میں ابھی راستے ہی تھا کہ مجھے کال موصول ہوئی کہ میں فوری طور پر ایس پی صاحب کے آفس پہنچوں، وہاں ایک ہنگامی میٹنگ ہے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہاں کیا کہا جائے گا۔ ہماری ناکامی پر لمبی جھاڑ پلائی جائے گی، فوری مجرم پیش کرنے کا حکم ہوگا اور ہو سکتا ہے کوئی ایک آدھ معطل بھی ہو جائے۔ نا چاہتے ہوئے بھی مجھے وہاں جانا تھا۔ آخر میں پولیس کا ملازم تھا۔
ایس پی آفس کے میٹنگ ہال میں ڈی ایس پی سمیت میری طرح دو انسپکٹر کھڑے تھے۔ ایس پی صاحب نے سب کی کاروائی سن کر ہماری طرف دیکھا اور پھر گھمبیر لہجے میں بولا۔
"یہ اغوا، کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ جو شخص اغوا ہوا ہے، وہ عالمی سطح کا ایک پاکستانی سائنسدان ہے۔ اس کا نام حسن رضوی ہے۔ وہ بہت عرصہ پہلے لندن چلا گیا تھا اور وہیں رہائش پذیر تھا۔ آج صبح نو بجے

کے بعد جب وہ برطانیہ سے یہاں پہنچا تو ائر پورٹ کے پارکنگ ایریا سے چند نامعلوم افراد نے اسے اغوا کرلیا۔ حسن رضوی نے کافی مزاحمت کی، اس پر وہاں کی سیکورٹی والوں نے اس اغوا کو روکنے کی بھرپور کوشش کی لیکن اغوا کرنے والے پوری پلاننگ کے ساتھ آئے تھے۔ وہ تین گروپ میں تھے۔ انہوں نے ایک جیسی سیاہ فور وہیل جیپیں استعمال کی ہیں۔ ائیر پورٹ ہی سے انہوں نے تینوں جیپوں کو مختلف راستے پر ڈال دیا۔ اس وقت پتہ ہی نہ چل سکا کہ حسن رضوی کو کس جیپ میں لے جایا جارہا تھا۔ اسی دوران پولیس کو اطلاع دی گئی۔ ان تینوں کا تعاقب کیا گیا۔ آخر کار دو جیپیں جل کر خاکستر ہوگئیں اور تیسری میں ایک بوڑھا پایا گیا۔ جو بہر حال حسن رضوی نہیں تھا، وہ انہوں نے دھوکا دینے کے لیے اسے اغوا کیا ہوا تھا۔"

"سر ہم نے پوری کوشش کی، لیکن ہم بہت جلد انہیں پکڑ لیں گے۔" ڈی ایس پی نے مودب لہجے میں رٹا رٹایا بیان دے دیا۔

"نہیں شعیب، یہ ایسے نہیں چلے گا۔ یہ معاملہ بڑا گھمبیر ہے" ایس پی نے یوں کہا، جیسے وہ خود بھی خوف زدہ ہوگیا ہو۔

"ایسی کیا بات ہے سر؟" ڈی ایس پی شعیب نے گہری سنجیدگی سے پوچھا تو ایس پی تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

"یہ خبر میڈیا کے ہاتھ لگ گئی ہے اور ہم نے اسی بوڑھے کی وجہ سے میڈیا سے یہ کہا ہے کہ ہم نے حسن رضوی کو بازیاب کرلیا ہے اور وہ ہماری حفاظت میں ہے۔ جب تک مجرم نہیں پکڑے جاتے ہم انہیں منظر عام پر نہیں لائیں گے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ حسن رضوی ہمارے پاس نہیں ہے۔ اور اگر یہ خبر میڈیا کے ہاتھ لگ گئی تو یہ معاملہ یہاں تک نہیں رہے گا، عالمی سطح پر پہنچ جائے گا۔ اگر تم لوگ یہی چاہتے ہو کہ ہماری نوکریاں داؤ پر نہ لگیں، اسے ہر حال میں بازیاب کرنا ہوگا۔"

"ہم پوری کوشش کررہے ہیں سر۔" ڈی ایس پی نے پھر یقین دلایا

"چوبیس گھنٹے ہیں تمہارے پاس، اس کے لیے تمہیں جیسے بھی کرنا پڑے، کرو، اسے بازیاب کرو۔" ایس پی نے کہا اور اٹھ کر چلا گیا۔

"یہ ذمہ داری اب تم تینوں پر ہے، ہمارے پاس حسن رضوی کی اس تصویر کے علاوہ کوئی سراغ نہیں ہے۔" یہ کہہ کر ڈی ایس پی شعیب نے ہمارے سامنے ایک تصویر رکھ دی۔ وہ تصویر پہلے انسپکٹر دلشاد نے غور سے دیکھی، پھر انسپکٹر ظفر نے اور آخر میں جب وہ میری نگاہوں کے سامنے آئی تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

یہ تو وہی بوڑھا تھا، جسے وہ نوجوان لڑکی اسپتال لے جانا چاہتی تھی۔ تصویر اور اس بوڑھے میں فرق اتنا تھا کہ جس بیمار بوڑھے کو میں نے دیکھا تھا، وہ کافی حد تک کملایا ہوا اور کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ یک بارگی میں نے یہ بات ان سب سے شیئر کرنا چاہی، پھر اگلی ہی لمحے مجھے عقل آگئی۔ یہ بات میری شرمندگی کا باعث ہونے کے ساتھ ساتھ مجھ پر لعنت ملامت کی وجہ بھی بن سکتی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مجھے دھوکا ہورہا ہو۔ میں وہ بات ہی پی گیا۔ مجھے اپنے بے وقوف بن جانے پر دکھ کے ساتھ صدمہ بھی ہورہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد میں، انسپکٹر دلشاد اور انسپکٹر ظفر، تینوں پلان کے لیے ایک کمرے میں جا بیٹھے۔ پھر اس کے بعد ہمیں ڈی ایس پی سے ملنا تھا۔

میں نے اپنی کار گیراج میں بھیج کر اپنے ایک دوست کی کار مستعار مانگ لی۔ اس میں اپنے جونیئر

اور دو کانسٹیبل کو ساتھ لے کر پھر سے قدیمی شہر کی اسی گلی میں جا پہنچا۔ میری توقع کے مطابق قدیمی شہر کی اس ٹیڑھی میڑھی گلی کے اسی پرانے مکان میں کوئی نہیں تھا۔ اسے تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے اس پر بس نہیں کیا۔ ایک دوسرے گھر سے اُس گھر میں اتر کر کونہ کونہ چھان مارا۔ گھر میں کوئی ذی روح نہیں تھا۔ میں نے وہاں سامان کی تلاشی بھی لی، دو گھنٹے تک ٹامک ٹوئیاں مارتے رہنے کے بعد کچھ بھی ہاتھ نہیں لگا تو میں نے واپسی کا قصد کیا۔ بلاشبہ وہ اتنے وقت تک کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچ چکے تھے۔

اس وقت دن کے تین بج چکے تھے۔ بھوک سے براحال ہو رہا تھا، میں نے ناشتے میں چائے کا کپ لیا تھا۔ سوچا تھا کہ تھانے جا کر ڈٹ کے ناشتہ کروں گا مگر میری سوچ دھری رہ گئی اور یہ معاملہ گلے پڑ گیا۔ میں نے ایک ریستوران کے پارکنگ میں کار روکی اور اس کے ہال میں داخل ہو گیا تا کہ کچھ کھا پی کر دوبارہ سوچنے کے قابل ہو سکوں۔ میں نے ایک پر سکون گوشے کا انتخاب کیا اور اس کی جانب بڑھ گیا۔ میں وہاں بیٹھا ہی تھا کہ ویٹر آ گیا۔ میں نے کھانے کا آرڈر دیا اور اسی کیس کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسی دوران میرا سیل فون بج اٹھا۔ اجنبی نمبر میرے فون کی اسکرین پر روشن تھے۔ میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے نسوانی آواز میں بڑی تمیز سے میرے بارے میں پوچھا گیا۔

''آپ انسپکٹر جمال بات کر رہے ہیں؟''

''میں ہی ہوں، آپ کون؟'' میں نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

''وہی، جس نے اپنے نانا کو اسپتال لے جانے کی اجازت مانگی تھی۔ سوری، میں نے آپ کو دھوکا دیا۔'' اس نے دبے ہوئے لہجے میں بات کی۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے بات بڑھانے کے لیے پوچھا۔

''دھوکا تو خیر دیا لیکن اب مجھے کال کیوں کی؟''

''دیکھیں، آپ نے جو مجھے نانا سمیت جانے کی اجازت دی، میں جانتی ہوں کہ وہ آپ کی خالص ہمدردی کی وجہ سے تھا اور میری مجبوری تھی کہ مجھے وہاں سے نکلنا تھا۔ آپ سختی کر سکتے تھے۔ مجھے روک سکتے تھے۔ میں آپ سے سوری کرنا چاہتی تھی، اس لیے کال کی اور......'' اس نے کہتے ہوئے یوں بات روکی جیسے وہ مزید کچھ کہنا چاہتی ہو۔

''سوری، کیا ضرورت تھی؟'' میں نے طنزیہ لہجے کو باوجود کوشش کے نہ روک پایا

''میں نہیں چاہتی کہ آپ کا یہ اچھا پن ختم ہو جائے اور میرا دھوکہ کسی ضرورت مند کے آڑے آ جائے۔'' اس نے بھاری لہجے میں کہا۔

''کوئی مجرم اتنا شریف بھی ہوگا، یہ میں نے پہلی بار دیکھا ہے، اوہ نہیں سوری، سنا ہے۔'' میں نے پھر اسی طنزیہ لہجے ہی میں کہا۔

''میں مجرم نہیں ہوں مسٹر جمال۔'' اس نے ایک دم سختی سے کہا، پھر چند لمحے ٹھہر کر نرم لہجے میں بولی۔'' یہ وقت آنے پر پتہ چل جائے گا۔ اور دوسری بات غور سے سن لو، تم لوگ جتنی بھی کوشش کر لو، جب تک ہم نہیں چاہیں گے، تم لوگ ہم تک نہیں پہنچ سکتے ہو۔ کم از کم دو دن سے پہلے تک تو نہیں۔ اس کے بعد ہم منظر عام پر آ جائیں گے۔''

''یا تو تم بہت بھولی ہو یا پھر بہت احمق، میں تمہیں کل اس وقت سے پہلے تک اپنے سامنے لے آؤں گا۔'' میں نے اسے چیلنج دیتے ہوئے کہا

''بھول ہے تمہاری انسپکٹر اور میں تمہارے وقت دینے پر کوئی بحث نہیں کرنا چاہتی۔ ہاں اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ تمہیں پولیس میں نہیں، کسی این جی او میں کام

کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس وقت تم مجھے بھولے اور احمق لگ رہے ہو۔ یہ یاد رکھنا۔'' اس نے کہا اور کال ڈراپ ہوگئی۔

میں سیل فون کو گھورنے لگا۔ اس نے بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔ جسے میں نے بڑے تحمل سے سن لیا۔ غصہ کرنے کا یا جھنجلانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں سیل فون ایک جانب رکھ کر سوچنے لگا کہ کیا وہ چاہتی ہے؟ یہ کہ ہم اس کے پیچھے آئیں، یا وہ اس لیے اتنی با اعتماد ہے کہ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ یا وہ ہمیں اپنے مطلب کے کسی ٹریک پر ڈالنا چاہ رہی تھی؟ میں ایک دم سے کوئی فیصلہ نہیں کر پایا۔ میں اس وقت تک سیل فون کو گھورتا رہا، جب تک ویٹر نے میرے سامنے کھانا نہیں لا کر رکھ دیا۔ ویٹر کھانا رکھ گیا تھا۔ اس سے پہلے میں کھانا شروع کرتا، میں نے اپنے ایک دوست کو اس لڑکی کا فون نمبر دے دیا تھا کہ وہ لوکیشن کے ساتھ دوسری معلومات لے سکے۔ وہ کتنی رسائی رکھتی تھی، کچھ دیر میں پتہ چل جاتا۔ میں اس کے بارے میں سوچنے لگا۔

میں اس وقت ریستوران سے نکل کر باہر آ گیا تھا، جب میرے اس دوست کا فون ملا جسے میں نے معلومات لینے کے بارے میں کہا تھا۔

''جمال، یہ جو نمبر تم نے مجھے دیا ہے، یہ کہیں بھی ظاہر نہیں ہو رہا ہے، نہ اس کا کوئی ڈیٹا ہے اور نہ یہ کہیں رجسٹرڈ ہے۔ ظاہر ہے پھر لوکیشن کے بارے میں کیا پتہ چلنا ہے۔'' اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا تو اس کے ساتھ ہی مجھے سمجھ آ گئی یہ کیا معاملہ ہو سکتا ہے۔ وہ اتنے اعتماد سے بات کیوں کر رہی تھی۔ وہ خاصی جدید رسائی رکھنے والوں میں سے تھی۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ وہ کافی مشکل ثابت ہوگی۔ تبھی میں نے اپنے دوست سے پوچھا۔

''اس نے ابھی مجھے اسی نمبر سے کال کی تھی۔ تم کوشش کرتے رہنا۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ یہ نمبر......''

''میں سمجھ گیا۔ اس کے لیے تھوڑا محنت کرنا پڑے گی۔ یہ نمبر کیوں نہیں مل رہا، اس کا پتہ کرتا ہوں، لگتا ہے کوئی اپنی برادری کی ہے۔'' اس نے تیزی سے کہتے ہوئے قہقہہ لگا دیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اب یہ نمبر اس کے لیے بھی چیلنج بن گیا تھا۔ مجھے پوری امید تھی کہ وہ یہ نمبر تلاش کر لے گا۔

''تھینک یو۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

جدید دنیا میں جرم کافی تیز جا رہا ہے۔ مجرم کمپیوٹر دور کی سہولیات سے بہت زیادہ فائدہ اٹھانے لگا ہے۔ نت نئے سوفٹ ویئر سامنے آنے لگے تھے، جس کی مدد سے وہ ایسے ''چمتکار'' دکھاتے رہتے ہیں۔ اگرچہ یہ سوفٹ ویئر کسی جگہ بہت کام آ سکتے ہیں، اگر انہیں مثبت سرگرمیوں کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ لیکن چور بازار میں یہ سوفٹ ویئر بہت کم قیمت پر مل جاتے ہیں۔ اب چھری کا قصور نہیں کہ اس سے پھل کاٹا جائے یا کسی کا پیٹ۔ میں گاڑی میں بیٹھ کر نکلنے ہی والا تھا کہ مجھے اسی نمبر سے پھر کال آ گئی۔ میں نے رسیو کر لی تو دوسری طرف سے اسی لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آپ نے جو مجھ تک پہنچنے کا وقت دیا تھا وہ ابھی واپس لے لیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں خود آپ سے ضرور ملوں گی۔''

''تم کون؟'' میں نے اتنا ہی پوچھا تھا کہ وہ فون بند کر گئی۔ میں نے فون جیب میں رکھا اور سوچنے لگا کہ یہ کیس کوئی معمولی نوعیت کا نہیں لگتا۔ یہ بہت پھیلا ہوا ہو سکتا ہے۔

میں تھانے میں آ گیا۔ اس وقت دل چاہ رہا تھا کہ میں اپنے سرکاری گھر میں جاؤں اور جا کر اپنے

پر لیٹ جاؤں۔ میں چاہ رہا تھا کہ چند گھنٹے آرام کرنے کے بعد تازہ دم ہو کر ہی تھانے جایا جائے۔ اتنی بھاگ دوڑ کے بعد اتنا تو حق بنتا تھا لیکن میں ایسا کر نہیں سکتا تھا۔ ہم نے جو اپنے طور جو پلان کیا تھا، اس کے فیڈ بیک کے بعد ہمیں ایکشن میں آنا تھا۔ تھکا ہوا ہونے کے باوجود میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں اس کے مختلف پہلوؤں پر سوچ رہا تھا۔ میں تھانے میں اپنے آفس کی کرسی پر بیٹھا یہ سوچتا چلا جا رہا تھا کہ مجرم میرے سامنے سے گذر جائے، پھر اتنے اعتماد سے مجھے چیلنج کر رہا ہو کہ میں اس تک پہنچ نہیں سکتا اور پھر خود ملنے کی بات بھی کر رہا ہو، یہ نہ صرف میری انا پر کاری ضرب تھی بلکہ میری پیشہ وارانہ مہارت کو بھی آزمانے والی بات تھی۔ یہی سوچتے ہوئے مجھے ایک دم سے خیال آیا، وہ سائنسدان حسن رضوی اس لڑکی کے ساتھ یوں تھا جیسے اس لڑکی نے اسے اغوا نہیں کیا بلکہ وہ اپنی مرضی سے اس کے ساتھ ہو۔ وہ خود وہاں سے نکلنا چاہ رہا تھا۔ کیا اس کا یہ اغوا ڈرامہ تھا؟ کیا وہ خود اغوا ہوا تھا؟ اسے ایسی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟ میں چونک گیا۔ پہلے میرا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں تھا۔ جیسے ہی میری توجہ اس طرف گئی، کئی سوال خودرو پودوں کی مانند میرے ذہن میں سر اٹھانے لگے۔ اس میں جو سوال زیادہ مجھے چبھنے لگا وہ یہی تھا کہ اگر حسن رضوی خود اغوا ہونا چاہتا تھا تو کیوں؟ میں اسی ٹریک پر سوچتا چلا رہا کہ ڈی ایس پی صاحب کا بلاوا آ گیا۔

شام ہونے سے ذرا پہلے میں ان کے آفس پہنچا تو انسپکٹر دلشاد اور انسپکٹر ظفر بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے بیٹھتے ہی انسپکٹر دلشاد بولا۔

''کچھ پتہ چلا، کوئی سراغ، کوئی راستہ ملا؟''

''کچھ نہیں ملا، سوائے اس کے کہ یہ اغوا، بہت سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا گیا ہے۔'' میں نے جواب دیا تو اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ پھر خود ہی سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''وہ تو ہے، میں نے ائرپورٹ اور اس کی پارکنگ ایریا کے سارے سی سی کیمرے چھان مارے ہیں، ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔'' یہ کہہ کر وہ رکا پھر چونکتے ہوئے بولا۔ ''حیرت یہ ہے کہ اس واقعہ کی ریکارڈنگ تک نہیں ہوئی۔ صرف اس سائنس دان کی ائرپورٹ سے باہر نکلتے ہوئے کی ایک ذرا سی ریکارڈنگ ملی ہے۔''

''کیا تم وہ مجھے دکھا سکتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، یہ لو'' اس نے کہا اور اپنے سیل فون میں موجود وہ چھوٹا سا کلپ نکال کر مجھے دکھایا۔

وہ بیس سے پچیس سیکنڈ کا کلپ تھا۔ جس میں حسن رضوی کاؤنٹر سے باہر کی جانب آ رہا تھا۔ یہ وہی بوڑھا تھا۔ اس بار مجھے پورا یقین ہو گیا۔ کیونکہ اس کلپ میں بوڑھے نے وہی کپڑے پہنے ہوئے تھے، جب میں نے اسے دیکھا تھا۔ میں نے سیل فون واپس ہی کیا تھا کہ ڈی ایس پی صاحب آ گئے۔ ان کے ساتھ مقامی اسپیشل سیل کے تین آدمی تھے۔ وہ سب بیٹھ گئے تو ڈی ایس پی نے اب تک کی رپورٹ لی، جس میں سوائے چند باتوں کے کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ اغوا کیسے ہوا؟ اور دوسری یہ کہ اس میں استعمال ہونے والی فور وہیل جیپیں چوری کی تھیں۔ اور تیسری بات یہ تھی کہ مقامی جرائم پیشہ لوگوں سے پوچھ تاچھ شروع ہو گئی تھی۔ خفیہ کے لوگوں کا بہت زیادہ چوکس ہونے کے باوجود ابھی تک کوئی سراپتہ نہیں ملا تھا۔

''سر! یہ پلاننگ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ لیکن

سائنس دان کے اغوا کا مقصد ابھی تک سامنے نہیں آیا۔" انسپکٹر دلشاد نے کہا۔
"اور نہ ہی کسی مجرم کا سراغ مل سکا ہے، جس سے کم از کم یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ اس کا اغوا کون کر سکتے ہیں؟" انسپکٹر ظفر نے اپنا خیال بتایا تو ڈی ایس پی نے ہماری طرف دیکھا پھر اسپیشل برانچ کے ایک بندے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"یہ صاحب اس وقت ہمارے پاس اس لیے آئے ہیں کہ ابھی کچھ دیر پہلے برطانیہ سے یہاں معلومات پہنچی ہیں۔ ان معلومات کے مطابق، حسن رضوی اچانک گھر سے نکلے اور ائیر پورٹ جا پہنچے۔ وہاں سے وہ یہاں پاکستان آ گئے۔ یہ میڈیا پر جب شور ہوا تب ان برطانیہ والوں کو پتہ چلا کہ وہ سائنس دان اغوا ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے حسن رضوی کی طرف سے کوئی ایسی بات سامنے نہیں آئی، نہ کسی کی دھمکی، نہ کوئی ایسی بات۔" ڈی ایس پی نے کہا تو سبھی پر خاموش طاری ہوگئی۔ تب میں نے کہا۔
"سر۔! میری ایک سوچ ہے، ممکن ہے وہ بعد میں غلط ثابت ہو جائے، لیکن مجھے وہ بہت زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔"
"کیا ہے وہ سوچ؟" ڈی ایس پی نے پوچھا۔
"ممکن ہے حسن رضوی نے اپنے اغوا کا ڈرامہ خود ہی رچایا ہو؟ پوری پلاننگ کی ہو اس کے لیے اور وہ کسی کی بھی نگاہوں سے اوجھل ہونا چاہ رہے ہو؟" میں نے اعتماد سے کہا تو خصوصی سیل والے نے پوچھا۔
"آپ کی سوچ کو رد نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس سوچ کی بنیاد کیا ہے؟"
"دوسری بات یہ کہ وہ اپنے آپ کو کیوں اغوا کرائے گا، اس کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟" ڈی ایس پی نے پوچھا۔
"میں کوئی وجہ نہیں بتا سکتا۔ اس کا پتہ تو ان کے پچھلے دنوں سے لگ سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا
"انسپکٹر جمال کا خیال ٹھیک لگ رہا ہے۔" اس خصوصی سیل والے نے میری طرف دیکھتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا، جب کوئی نہ بولا وہ کہتا چلا گیا، "پتہ چلا ہے کہ تقریباً دو ماہ سے وہ اپنے گھر میں بند تھا اور یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ سائنسدان ایسا کرتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن گھر میں بند ہونے سے پہلے اس نے اس انسٹی ٹیوٹ کو چھوڑ دیا تھا، جس میں وہ پچھلے کئی برسوں سے کام کر رہا تھا۔ اس انسٹیوٹ کا مالک ڈاکٹر ایلکس تھا، وہ حسن رضوی کا دوست تھا اور اس کے مر جانے کے بعد بہت اُداس تھا۔ وہاں دوسرے کارکن یہی سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر ایلکس کے بعد اس کا دل یہاں نہیں لگتا تھا، اس لیے حسن رضوی نے وہ انسٹیٹیوٹ چھوڑا۔"
"تو پھر وہ وجہ اسی انسٹیوٹ سے ہی ملے گی۔ جس کے باعث یہ اغوا یا ڈرامہ یا جو بھی ہوا۔" میں نے کہا تو وہ خصوصی سیل والا سر ہلاتے ہوئے بولا۔
"برطانیہ میں اس پر تیزی سے کام ہو رہا ہے۔ ایک ٹیم اسی پر کام کر رہی ہے۔ میں انہیں یہ بات بھی بتا دیتا ہوں، ممکن ہے کوئی معلومات سامنے آ جائیں۔ ویسے ان کے دو آدمی کسی بھی وقت یہاں پہنچ جائیں گے۔"
"ٹھیک ہے آپ لوگ کریں کام، اور جلد از جلد مجرموں تک پہنچنے کی کوشش کریں، ہم نے چوبیس گھنٹے کا وقت دیا ہوا ہے، جس میں سے چھ گھنٹے سے زائد وقت گذر چکا ہے۔" ڈی ایس پی نے کہا اور اٹھ گیا۔
میں ڈی ایس پی کے دفتر سے نکل رہا تھا کہ میرے دوست کا فون آ گیا۔ اس نے مجھے اپنے پاس

لاایا تھا۔اسے کافی حد تک کامیابی ملی تھی۔ میں منٹ کے اندر اس کے پاس پہنچ گیا۔

''ہاں جلدی بتاؤ، کیا بنا؟''میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''وہ نمبر ٹریس نہیں ہوا، بلکہ لگتا ہے وہ مجھ سے بھی بڑا چیز ہے، میں جب اس نمبر تک پہنچا ہوں تو اس نے میرے کمپیوٹر کو ہیک کرنے کی کوشش کر ڈالی۔ بہت مشکل سے بچا ہوں۔'' اس نے تیز تیز انداز میں کہا۔

''مطلب، میں یہ سمجھوں کہ تم اس کا نمبر نہیں تلاش......'' میں نے کہنا چاہا مگر اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''میں تلاش تو ضرور کروں گا، لیکن یہ کس وقت ہو سکے گا، یہ میں خود بھی نہیں جانتا، میری اور اس کی جنگ جاری ہے۔'' اس نے کھردرے سے لہجے میں کہا جیسے وہ شکست کے بعد بھی اپنی ہار کو ذہنی طور پر تسلیم نہ کر رہا ہو۔

''ٹھیک ہے، تم اپنی کوشش جاری رکھو۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

شام ڈھل چکی تھی۔ شہر بھر کی روشنیاں جگمگا چکی تھیں۔حسن رضوی کو اغوا کیے سات گھنٹوں سے زیادہ وقت ہو گیا تھا۔لیکن ابھی تک کسی کو بھی کو سراغ نہیں ملا تھا کہ وہاں کہاں گیا؟ میں سمجھتا تھا کہ ایک مجھے ہی علم ہے کہ وہ لڑکی اور حسن رضوی دونوں میرے ہی پاس سے نکل کر گئے تھے۔ اگرچہ وہاں دوسرے اہلکار بھی تھے لیکن کسی کو اس بارے میں ابھی احساس نہیں تھا۔انہوں نے کون سا تصویر دیکھی تھی، مگر مجھے اتنا ضرور احساس تھا کہ جیسے ہی ان لوگوں میں سے کسی کو یہ پتہ چل گیا، تو اعلیٰ آفیسرز مجھ سے پوچھ تاچھ ضرور کریں گے کہ میں نے ان کے بارے میں کیوں نہیں بتایا۔ مجھے ایک دم سے بے چینی ہونے لگی۔ میں جلد از جلد ان تک پہنچ جانا چاہ رہا تھا لیکن میرے پاس اس کا کوئی سراغ نہیں تھا۔ میں نے سب کچھ اپنے ذہن سے نکالا اور اپنے سرکاری گھر کی طرف چل پڑا۔ میں تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کپڑے بدلے اور ایزی ہو گیا لیکن میں آرام نہ کر سکا۔ مجھے چین نہیں آیا اور میں اپنے دوست سے ملنے چل پڑا۔

جب میں اس کی طرف جانے لگا تو اسے اپنی آمد کے بارے میں فون کیا تھا، اس نے مجھے کہا کہ میں آتے ہوئے مارکیٹ سے کچھ کھانے پینے کو لیتا آؤں۔ میں مارکیٹ پہنچا، کار پارک کی اور ایک اسٹور کی جانب بڑھ گیا۔ میں جیسے ہی اسٹور میں داخل ہوا تو مجھے لگا کہ وہی لڑکی سامنے کاؤنٹر کے پاس کھڑی خریداری کر رہی ہے۔ پہلے تو میں نے اپنا وہم ہی سمجھا۔ مگر جلد ہی مجھے یقین ہو گیا کہ وہ وہی لڑکی ہے۔ ایک بہت بڑی کامیابی میرے ہاتھ لگ چلی تھی۔ مزید فورس بلوانے میں دیر ہو جانا یقینی تھا۔ میں نے خود اسے پکڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں گیٹ کے پاس رکنے کی بجائے اس کے بالکل پیچھے جا کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اپنا پسٹل نکالا اور اس کی گردن پر رکھتے ہوئے کہا۔

''لو جی ہم پہنچ گئے ہیں۔''

وہ مڑی نہیں۔ بلکہ بڑے سکون سے بولی۔

''میں تو چاہتی تھی کہ تم مصیبت میں نہ پڑو لیکن اب کیا کیا جائے۔ٹھیک ہے۔ کر لو گرفتار۔'' اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ میرے لاشعور میں تھا کہ وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ کیونکہ وہ کوئی انتہائی چالاک لڑکی ہے۔ ایک بار دھوکا دے چکی ہے۔ میں قطعاً رسک نہیں لیا اور بڑی بے دردی سے اسے پکڑ کر باندھ لیا۔ مارکیٹ

والوں نے ذرا بھی دخل اندازی نہیں کی۔ کرتے بھی تو میں اپنا آپ دکھا دیتا کہ میں کون ہوں، اس لیے کسی نے بھی کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی اور نہ کسی نے مزاحمت کی۔ جیسے ہی میں نے اسے کار کی اگلی نشست پر بٹھایا وہ بولی۔

''دیکھو! تم نے مجھے پکڑ لیا ہے۔ ظاہر ہے اب تم اب مجھ پر تشدد کرو گے کہ نانا جی کہاں ہیں؟ میں بتا دوں گی لیکن تھانے لے جانے سے پہلے تم کہیں بھی میری بات سن لو، پھر جو جی چاہے کرنا۔ چاہے یہیں کار میں بیٹھ کر میری بات سن لو۔''

''اوکے، میں سنتا ہوں تمہاری بات۔''

میں اسے تھانے لے جانے کی بجائے اپنے دوست کے گھر ہی لے گیا۔ وہ ایک لڑکی کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ میں اسے اسی کمرے میں بٹھا لیا۔

☆......☆......☆

''کیا کہا اس نے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی یہ اس کی ویڈیو ہے، آپ خود اس کی بات سن لیں۔'' اس نے سیل فون میں ویڈیو لگا کر مجھے دے دی۔ اس ویڈیو میں ایک نوخیز لڑکی، جس نے جین اور ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی فرش پر بندھی ہوئی بیٹھی کہہ رہی تھی۔

'' میرے نانا حسن رضوی عالمی رینک کے سائنس دان ہیں، انہوں نے بہت عرصہ ایلکس لیبارٹریز لندن میں کام کیا ہے۔ وہ اب وہاں سے بھاگ کر اپنے ملک آ گئے ہیں، کیونکہ ایلکس کی موت کے بعد موجودہ سربراہ ٹام سے اس کی نہیں بنی۔ وجہ تنازعہ ایک بہت پرانا تجربہ، جسے ٹام غلط استعمال کرنا چاہتا ہے۔ میں اس کی تفصیلات نہیں بتا سکتی۔ اگر یہ تجربہ روکا نہ گیا تو ایک بہت بڑی آفت دنیا میں پیدا ہو جائے گی۔ وہ تجربہ کسی جگہ پر ہو رہا ہے۔ جس کا ایک حصہ صرف میرے نانا کو معلوم ہے۔ ٹام اور اس کے اردگرد لوگ اسے منفی طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں، میرے نانا صرف اسی لیے چھپ گئے ہیں۔ تاکہ وہ تجربہ کسی طرح ناکام ہو جائے۔''

''اس تجربے کی تفصیلات کیا ہیں؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

'' مجھے معلوم نہیں اور اگر معلوم بھی ہوتا تو میں نہ بتاتی۔ کیونکہ کسی کو نہیں معلوم کہ وہ تجربہ کہاں ہو رہا ہے۔ میرے نانا بھی فقط اتنا جانتے ہیں کہ وہ کسی جزیرے میں ہو رہا ہے۔ انہوں نے اگر وہ آفت دنیا کے سامنے آ گئی تو ملک ہمارا بدنام ہو گا۔'' اس لڑکی نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''تو پھر اسے روکا کیسے جائے؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''چند دن تک خود ہی پتہ چل جائے گا۔'' لڑکی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

اس کے بعد وہ ویڈیو ختم ہو گئی۔

''وہ لڑکی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

'' کراچی میں، ابھی میرے دوست کے گھر ہے۔ یہ ابھی کل ہی کی تو بات ہے۔''

'' تم اس لڑکی کی گرفتاری کے بارے میں اپنے بڑوں کو نہیں بتا سکتے۔'' میں نے پوچھا تو اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

'' صرف اس لیے نہیں کہ میری نوکری چلے جائے گی۔ بلکہ اس لیے کہ اگر یہ سچ ہے تو وہ آفت کیا ہے کہاں ہے، کیسی ہے؟ اگر ہے تو اس سے مخلوق خدا کو بچایا جائے۔ پتہ تو چلے کہ یہ آخر ہے کیا؟''

'' پھر تو ڈاکٹر حسن رضوی سے ملنا بہت ضروری ہے۔'' میں نے تشویش سے کہا۔

"لیکن ایک بات ہے۔" فہیم نے تیزی سے کہا۔
"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔
"لڑکی نے کہا کہ وہ کسی جزیرے پر ہو رہا ہے۔ جب تک آپ حسن رضوی سے ملتے ہیں، تب تک ہم کوشش کریں کہ بحیرہ عرب میں کہیں وہ جزیرہ ہو۔"
"تم کیسے تلاش کرلو گے؟" میں نے پوچھا۔
"ہمارے پاس ایسا کچھ نظام ہے، کہ یہیں بیٹھ کر پورا بحیرہ عرب چھان ماریں گے۔" فہیم نے تیزی سے کہا تو انسپکٹر فوراً بول اٹھا
"یہ تو مجھے بھی یقین ہے کہ وہ بحیرہ عرب ہی میں ہوگا۔ میں نے کل ایسے ہی کسی جزیرے کے بارے میں چھان بین کی تھی ۔ ایک جزیرے کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ پندرہ سال سے اس پر کسی ایسی مخلوق کا سایہ ہے کہ جو بھی ان کے نزدیک جاتا ہے، وہ جل جاتا ہے ۔ اس کے بارے میں بہت ساری کہانیاں سننے کو ملی ہیں۔ ممکن ہے وہی ہو۔"
"بالکل، وہی ہوگا۔" فہیم نے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے پرجوش لہجے میں کہا۔ "میں اس کی کیمسٹری سمجھ گیا ہوں۔"
"تو پھر ٹھیک ہے تلاش کرو۔ ہم وہاں تک پہنچتے ہیں۔" میں نے کہا۔
"کیا ہم پہنچ جائیں گے؟" انسپکٹر نے جوش میں آتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں پہنچ جائیں گے، تم ایسا کرو، اس لڑکی سے بات کراؤ" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"اس کا سیل فون تو میرے پاس ہے۔" انسپکٹر نے جواب دیا، پھر ایک دم سے سوچتے ہوئے بولا۔" اپنے دوست کے ذریعے بات کرواسکتا ہوں۔"
یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا سیل فون نکالا اور نمبر پش کرتے ہوئے رابطہ کیا۔ پھر اس نے تعارف کرا کر اس لڑکی سے بات کروانے کے بارے میں کہا۔
رابطہ ہو گیا
"دیکھو۔! تمہارا نام کچھ بھی ہے، لیکن وہ آفت کیا ہے، یا جو بھی ہے، ہم تمہارے نانا کی حفاظت کی ذمہ داری لیتے ہیں۔ ہمیں بتاؤ۔ یا ڈاکٹر سے بات کرا دو۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔
"دیکھیں میں کیسے یقین کرلوں کہ....." اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
"اتنا تو میں جان گیا ہوں کہ یہ تجربہ بحیرہ عرب کے کسی جزیرے پر ہو رہا ہے۔ تم کیا چاہتی ہو، تمہارا نانا کیا چاہتے ہیں، میں اس بارے میں نہیں جانتا، زیادہ سے زیادہ ہم ایک گھنٹے تک اس جزیرے کو تلاش کرلیں گے۔ اس تک پہنچنے میں بھی اتنا وقت نہیں لگے گا۔ تو پھر کیا ہوگا، تم لوگ مشکوک ہو جاؤ گے۔" میں نے سمجھایا
"دیکھیں۔! جہاں تک میری معلومات ہیں، اس جزیرے پر ایک بہت بڑا طوفان آ چکا ہے۔ وہاں پر بہت سارے بہت گنا معصوم لوگ ہیں، کیا تم انہیں بچا پاؤ گے؟" اس نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا
"اب جبکہ تم لوگ کچھ بتا نہیں رہے تو ہم کیا کر پائیں گے، جو ہو سکا وہی کریں گے نا۔" میں نے اکتاتے ہوئے کہا۔
"شاید میں نہ بتاتی لیکن وہ آفت سر اٹھا چکی ہے ۔ میں آپ کو تفصیل سے بتا دیتی ہوں۔ پھر آپ کی مرضی کہ آپ اس ے روک سکتے ہیں یا نہیں۔" اس نے مردہ لہجے میں کہا۔
"بولو۔ میں سن رہا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اسپیکر آن کر دیا تا کہ سب سن سکیں۔"
وہ کہتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

تاحدِ نگاہ نیلگوں سمندر، دن کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ ساحل سے کئی سوناٹیکل مِل دُور وہ جزیرہ انتہائی سرسبز تھا۔ پندرہ برس سے پہلے کسی نے وہ جزیرہ دیکھا ہو، یا اس پر کوئی گیا ہو، تو اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن تقریباً پندرہ برس سے اس جزیرے کے بارے میں عجیب وغریب باتیں پھیل گئی ہوئی تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ اس پر روحوں کا ٹھکانہ بن گیا ہے۔ کسی نے کہا کہ اس پر جنوں کا قبضہ ہے۔ کوئی یہ قصہ سناتا کہ اس پر آسمانی مخلوق آن آباد ہوئی ہے۔ وہ مخلوق کسی کو جزیرے کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتی۔ یہ باتیں اس وقت پھیلیں، جب کوئی بھولے بھٹکے ماہی گیر اس جزیرے کی جانب گئے تو ان کی کشتی اچانک ٹوٹ پھوٹ گئی، یا اس میں آگ لگ گئی۔ اوپر تلے کئی لوگوں کے ساتھ ایسا واقعہ ہوا تو ایک دم سے لوگ خوف زدہ ہو کر سہم گئے۔ کچھ یار لوگ یہ تجربہ کرنے بھی گئے، ان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تو لوگوں نے ادھر جانا ہی چھوڑ دیا۔ پھر دھیرے دھیرے اس جزیرے کی طرف جانا ہی بھول گئے۔ کسی بھولے بھٹکے کے ساتھ کیا ہوا، یہ بھی کسی کو معلوم نہیں تھا۔

اس سرسبز وشاداب جزیرے پر انسانی زندگی تھی، جس کے بارے کسی کو معلوم نہیں تھا۔ وہ جزیرہ تقریباً چھ کلومیٹر لمبا، اور پانچ کلومیٹر چوڑا تھا۔ ساحل کے ساتھ ساتھ گھنا جنگل تھا۔ جس میں پام اور دوسرے کئی قسموں کے درخت ہوا میں جھومتے رہتے تھے۔ جھاڑیاں، جنگلی بوٹیاں اور پھول دار پودوں کی بہتات تھی۔ پہاڑیوں کے جیسے بڑے بڑے مٹی کے ڈھیر، کہیں گڑھے اور شمال مشرق کی طرف اونچی زمین سے پھوٹتا چشمہ، جس کا پانی جزیرے کے بالکل درمیان میں کافی ساری خالی جگہ سے ہوتا ہوا جنوب مغرب کی طرف سے سمندر میں گر جاتا تھا۔

اسی بہتے ہوئے پانی کے پاس لکڑی کا گھر بنا ہوا تھا۔ جس میں ایک مضبوط قد کاٹھ کی لمبی سی خوبصورت خاتون رہتی تھی۔ اس کا گورا رنگ اور نقوش ہی بتاتے تھے کہ وہ یورپی ملک سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی شہریت برطانیہ کی تھی اور اس کا نام ایملی تھا۔ یہاں آنے سے پہلے وہ برطانیہ کے ایک سکول میں پڑھاتی تھی۔ اس کے پاس پانچ بچے تھے۔ ایک تیرہ سال چند ماہ کا لڑکا، ہیری، پھر دو لڑکیاں بارہ اور گیارہ سال کی لورین اور جوزفین، پھر دس اور نو سال کے لڑکے جیشوا اور جیکب تھے۔ اس کا شوہر واٹسن بھی ان کے ساتھ رہتا تھا۔ لیکن اس کا زیادہ وقت اپنی لیبارٹری میں گذر جاتا جو ان کے گھر سے کچھ فاصلے پر بنی ہوئی تھی۔ وہ پیشے کے اعتبار سے الیکٹرونکس انجینئر تھا۔ وہ اپنی لیبارٹری میں تجربات کرتا رہتا تھا۔ ان پانچ بچوں میں سے چار بچے ان کی اولاد نہیں تھے لیکن وہ انہیں اولاد ہی کی مانند سمجھتے تھے۔ جب وہ جزیرے پر آئے تھے تو ان کے ساتھ ہیری تھا۔ یہی ان کا سگا بیٹا تھا۔ اس کے بعد ان تک بچے پہنچائے جاتے رہے۔ ان بچوں کو یہی بتایا گیا تھا کہ وہ سب آپس میں بہن یا بھائی ہیں۔

وہ بالکل نارمل زندگی گزار رہے تھے۔ ہر پندرہ دن بعد ایک ہیلی کاپٹر آتا اور ان کی مطلوبہ ضرورت کی چیزیں وہاں پہنچا جاتا۔ وہ ہیلی کاپٹر کبھی ٹھہر جاتا اور کبھی نہیں، کبھی ان کی چیزیں پھینک کر چلا جاتا یا پھر رکتا بھی تو بہت کم وقت کے لیے۔ پہلی بات تھی کہ ان میں سے کوئی بہت کم بیمار ہوا تھا۔ اگر کوئی معمولی بیمار ہو جاتا تو اس کے لیے دوائیں موجود تھیں۔ واٹسن کبھی کسی کے ساتھ براہ راست نہیں ملا تھا۔ اسے جو

چیز چاہیے ہوتی، وہ فون پر کہہ دیتا۔ بہت ضروری ہوتا تو ہیلی کاپٹر پندرہ دن سے پہلے بھی آجاتا۔ انہیں کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ سکون سے وہاں آباد تھے۔ ایملی اپنے گھر کے سارے کام ختم کر کے بچوں کو پڑھانے لگ جاتی۔ جب تک جی چاہتا وہ پڑھتے اور پھر کھیلتے کودتے رہتے۔ پچھلے پندرہ برس سے یہی معمول چلا آرہا تھا۔ یہاں آنے کے بعد ان میں سے نہ کبھی کوئی جزیرے سے گیا تھا اور نہ ہی انہیں باہر کی خبر تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ اگر کوئی معلومات ہوتی تھیں تو وہ واٹسن ہی جانتا تھا۔

قدرتی طور پر وہ اس پرسکون ماحول کے عادی ہو چکے تھے۔ بچے کھیلنے کے لیے دور نکل جاتے، انہیں وہاں کوئی ڈر نہیں تھا۔ واٹسن نے انہیں اجازت دے رکھی تھی۔ وہ کبھی مٹی کے گھر بناتے، کبھی بہتے ہوئے پانی پر پل بنانے لگتے، انہوں نے ایک کشتی بھی بنانی شروع کر دی تھی۔ جب انہیں کچھ سمجھ نہ آتا تو وہ کبھی واٹسن سے مدد لیتے اور کبھی ایملی سے۔ یہی ان کا کھیل تھا۔ واٹسن انہیں ایسے کھیل کھیلنے کو کہتا تھا، جس سے وہ سیکھ سکیں۔ انہوں نے ان بچوں میں سیکھنے کا جذبہ اور شوق بھر دیا تھا۔

وہ یہاں آئے کیسے؟ اس پر ایملی کبھی کبھی سوچتی تو حیران رہ جاتی۔ اگرچہ وہ یہاں اپنی مرضی سے آئی تھی، لیکن یہاں آکر وہ ایسی زندگی گذارے گی، اس بارے میں اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ لندن کی شور شرابے والی تیز زندگی سے نکل کر پرسکون ماحول میں آنا اسے اچھا لگا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے اکتاہٹ ہونے لگی۔ اس کے ساتھ اس کا شوہر واٹسن اور بیٹا ہیری تھا۔ وہ ان میں کھو کر رہ گئی، پھر پتہ ہی نہیں چلا کہ لگ بھگ چودہ سال کا عرصہ کیسے گذر گیا۔ یہاں تک کہ وہ اس ماحول کی عادی ہو گئی۔

ایملی کی واٹسن کے ساتھ شادی ہوئے چھ برس سے بھی زیادہ کا وقت گذر گیا تھا۔ دونوں ہی کو اپنی اولاد کی بہت چاہت تھی۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا جس سے ان کی کوئی امید بر آتی۔ دونوں ہی اپنی مصروف زندگی میں کھوئے ہوئے تھے۔ لیکن شام سے صبح ہونے تک دونوں ہی اپنے گھر کا سناٹا محسوس کرتے اور سرد آہ بھر کر رہ جاتے۔ فطری طور انہوں نے اولاد کے لیے ڈاکٹرز سے رجوع کیا، اپنا چیک اپ کروایا۔ سال بھر بعد انہیں شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کہ ایملی میں ماں بننے کی صلاحیت بہت کم ہے، اور واٹسن سے تو اس کی اولاد ہو ہی نہیں سکتی۔ اس خبر نے ان کی زندگی کو ڈسٹرب کر کے رکھ دیا تھا۔ انہوں نے اس حقیقت کا بہت اثر لیا۔

واٹسن نے بہت سوچ کر ایملی کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا، تاکہ وہ اپنی اولاد کی خواہش کو پورا کر سکے۔ لیکن ایملی ابھی مایوس نہیں ہوئی تھی۔ اس نے مزید ڈاکٹرز کو دکھانے اور ان سے مشورہ کرنے کی بابت کہا۔ اسی کوشش میں وہ ایک دن ڈاکٹر ایلکس سے جا ملے۔ وہ گائنا کالوجسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ جنیٹک انجینئر بھی تھا۔ چند ملاقاتوں اور بہت سارے ٹیسٹ کے بعد ایک دن ڈاکٹر ایلکس نے دونوں کو اپنے گھر ڈنر پر مدعو کر لیا۔

”میں نے تم دونوں کو اس لیے ڈنر پر بلایا کہ میں تفصیل سے بات کر سکوں۔ کیونکہ آخر کار فیصلہ تم دونوں نے کرنا ہے۔“ ڈاکٹر ایلکس نے انتہائی سنجیدہ لہجے میں کہا تو واٹسن نے پوچھا۔

”کیسی بات اور کیسا فیصلہ ڈاکٹر؟“

اس پر ڈاکٹر ایلکس نے ان دونوں کی طرف دیکھا اور پھر بڑے سنسنی خیز انداز میں ان سے کہا۔

”تم دونوں ماں باپ بن سکتے ہو مگر......“ یہ کہہ کر وہ

خاموش ہوگیا۔جس پر ایملی نے بےصبری سے پوچھا۔
''میں ماں بن سکتی ہوں، واٹسن باپ بن سکتا ہے مگر کیسے؟''

''وہی بتا رہا ہوں۔ظاہر ہے تم دونوں کے ہاں جو بچہ ہوسکتا ہے، وہ ٹیسٹ ٹیوب بے بی ہی ہوگا۔ مجھے امید ہی نہیں پورا یقین بھی ہے کہ تم صاحب اولاد ہو جاؤ گے اور اس کے بعد بھی تمہارے بچے ہوں یہ بھی ممکن ہے۔مگر، میں اور میری ٹیم ایک تجربہ کرنا چاہتے ہیں۔اگر تم لوگ تعاون کرو تو ہم دونوں کا کام ہوسکتا ہے۔''ڈاکٹر ایلکس نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''یہ کیسا تجربہ ہے اور ہمارا تعاون کیا ہوگا؟'' واٹسن نے پوچھا۔

''دیکھو، ہم یہ تجربہ کرنا چاہتے ہیں کہ چند بچوں کو ایسے ماحول میں رکھا جائے اور وہاں ان کی پرورش کی جائے جو ہر طرح کی آلودگی سے پاک ہو۔ بالکل فطری ماحول ہو۔ایک خاص عرصہ تک انہیں ایسے ماحول میں رکھنے کے بعد انہیں جانچا جائے، ان کا مشاہدہ کیا جائے کہ ان میں کس قسم کی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ جو یہاں کے ماحول میں نہیں ہوسکتی تھیں۔اس کے علاوہ اور بہت ساری اسٹڈی ہے، جو ہم کرنا چاہتے ہیں۔'' ڈاکٹر ایلکس نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

'' اس میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' ایملی نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ایملی کے بطن سے جو واٹسن کا بچہ ہوگا، اسے آپ ساتھ رکھیں۔ آپ دونوں کو مزید بچے دیئے جائیں گے۔انہیں بھی آپ کو پالنا ہوگا۔جس کا آپ کو باقاعدہ معاوضہ دیا جائے گا اور سہولیات بھی دی جائیں گیں۔لیکن آپ کو دنیا سے کٹ کر ایک بے آباد جزیرے میں تیرہ سے چودہ برس تک کے درمیان رہنا ہوگا۔'' ڈاکٹر ایلکس نے تفصیل سے انہیں بتا دیا۔

''اور ہم دونوں کا کیریئر؟'' واٹسن نے پوچھا۔

''ظاہر ہے اس کی قربانی دینا ہوگی۔ واٹسن اس دوران اپنا کام کرتا رہے۔ پندرہ برس بعد جب وہ یہاں واپس آئے تو پھر سے اپنے کام کا آغاز کرسکتا ہے۔ممکن ہے تمہیں کام کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے، ہم معاوضہ ہی اتنا دیں گے کہ بعد میں کام کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ایملی تو اپنا کام کرتی رہے گی، آخر اس نے بچوں کو پڑھانا بھی تو ہوگا، جو بعد میں یہاں کی معمول کی زندگی اپنا سکیں۔'' ڈاکٹر ایلکس نے حتمی انداز میں کہا اور دونوں کے سوالوں کا جواب دیتا رہا۔ یہاں تک کہ ڈنر کے بعد انہیں سوچنے کا وقت دے دیا گیا کہ وہ ایک ہفتے میں سوچ کر بتا دیں۔

وہ دونوں ہی انتہائی جذباتی کیفیت سے گزر رہے تھے۔ ہفتے بھر بعد انہوں نے ان تحقیقات میں شامل ہونے کا فیصلہ کر کے ڈاکٹر ایلکس کو بتا دیا کہ وہ راضی ہیں۔ اگلے ہفتے میں واٹسن اور ایملی کو ڈاکٹر ایلکس کے تحقیقی ادارے کے اسپتال میں رکھا گیا۔ ان کے مختلف ٹیسٹ ہوتے رہے۔ڈاکٹرز کی پوری ایک ٹیم ان کی دیکھ بھال کرنے لگی۔کوئی نرس بھی ان کے قریب نہیں جانے دی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ ایملی امید سے ہوگئی۔واٹسن کام پر جانے لگا اور ایملی کو ایک الگ گھر میں رکھا گیا۔ جہاں ہر وقت اس کی نگرانی کی جاتی۔اس کے کھانے پینے سے لیکر اس کی صحت تک۔اٹھنے بیٹھنے سے لیکر ورزش تک۔ ہر گھنٹے کی رپورٹ ڈاکٹر ایلکس کو جاتی تھی، چاہے وہ دنیا کے کسی کونے میں بھی ہوتا۔نو ماہ بعد اس کے ہاں ہیری پیدا ہوا۔ وہ بہت خوش تھی۔ ایک خواب پورا ہو

گیا تھا۔ جس کے عوض انہیں چودہ برس تک جلاوطنی اختیار کرنا تھی۔ جس کے لیے وہ پوری طرح تیار ہوگئی تھی۔

تین ماہ بعد وہ دن بھی آ گیا، جب انہیں ایک چارٹر طیارے میں بٹھایا گیا اور غیر معروف ائیر پورٹ تک لایا گیا۔ پھر اس کے بعد انہیں ہیلی کاپٹر میں بٹھایا گیا اور اس جزیرے پر لا کے انہیں ایک لکڑی سے بنے شاندار گھر میں چھوڑ دیا گیا۔ واٹسن کو کام کرنے کے لیے ایک لیبارٹری مل گئی۔ انہیں وہاں زندگی کی ضروریات کے ساتھ سہولیات بھی دے دی گئیں۔ وہ دونوں ہیری کے ساتھ ایک پرسکون زندگی گزارنے لگے۔ دو برس بعد ان کے پاس دو بچیاں لائی گئیں، اس طرح پھر دو بچے لائے گئے۔ اور ان کے پاس رونق بڑھ گئی۔ ہیری کے بعد ان کے اپنے بچے نہ ہو سکے تھے۔

اس رات جب واٹسن گھر واپس آیا تو ایملی نے ڈنر کے لیے میز سجایا ہوا تھا۔ ہیری اپنی ماں کی پوری طرح مدد کر رہا تھا۔ چھوٹی بچیاں بھی جہاں تک ہوسکتا تھا ان کے ساتھ مصروف تھیں۔ پورا گھر روشن تھا۔ ایملی کچھ زیادہ ہی خوش تھی۔ بہت خوشگوار ماحول میں ڈنر کر لیا گیا تو بچے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ تبھی ایملی کافی کا مگ لا کر واٹسن کے پاس بیٹھ گئی۔

''آج بہت خوش ہو؟'' اس نے کافی کا سپ لے کر پوچھا۔

''کیا تمہیں واقعی نہیں معلوم، کہ میں خوش کیوں ہوں؟'' ایملی نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

''مجھے نہیں لگتا کہ مجھے پتہ ہوگا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا تو وہ خوشی سے لرزتے ہوئے بولی۔

''واٹسن، جانتے ہو، ٹھیک آج رات کے بعد کل تک ہمارے یہاں رہنے کے چودہ سال پورے ہو جائیں گے۔''

''ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے ہنکارا بھرا، پھر اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہاں مجھے معلوم ہے۔ لیکن ہمارے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوگا کہ ان بچوں کو خود سے کیسے علیحدہ کر پائیں گے؟ انہیں برطانیہ کے ماحول میں ایڈجسٹ کیسے کر پائیں گے۔ تم پر بہت زیادہ بوجھ ہوگا۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں سب ٹھیک کر لوں گی، یہ بچے ہمارے ساتھ ہی رہیں گے۔ تم نے ڈاکٹر ایلکس کو پیغام دیا کہ وہ ہمیں واپس لے جانے کا بندوبست کرے۔''

''ہاں میں نے پیغام دے دیا ہے، وہ اس ہفتے میں کسی وقت آئیں گے۔ بس ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ ہمیں یہاں سے کچھ نہیں لے کر جانا۔ تم بچوں کو ذہنی طور پر تیار کرنا شروع کر دو۔'' واٹسن نے کہا تو ایملی ایک دم سے خوش ہوگئی۔ اس کے سامنے لندن کی زندگی ابھر آئی جس کے لیے وہ ترس کر رہ گئی تھی۔ ایملی رات بھر نہ سو سکی۔

اگلی صبح انہوں نے معمول کے مطابق اپنے دن کا آغاز کیا۔ واٹسن لیبارٹری میں چلا گیا اور بچے پڑھنے لگے۔ ایسے میں ایک ہیلی کاپٹر فضا میں آ گیا۔ اس کے پیچھے ہی ایک دوسرا ہیلی کاپٹر آ گیا۔ وہ دونوں لہراتے رہے، پھر کچھ دیر بعد وہ دونوں ہی میدان میں آن اُترے اور ان میں سے کئی سارے لوگ باہر آ گئے۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ واٹسن اپنی لیبارٹری میں سے نکل آیا۔ اس نے وہ بندہ تو پہچان لیا، جو یہاں سامان لے آتا تھا، لیکن باقی سب اجنبی تھے۔ ہیلی کاپٹر سے نکلے ہوئے آدمیوں نے سیاہ لباس پہنا ہوا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں گنیں تھیں۔ ان میں سے دو افراد واٹسن کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے اور باقی دس

بارہ لوگ ایملی کی جانب بڑھے، جو اپنے پانچوں بچوں کے ساتھ گھر سے باہر آکر ان سب کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ ان سب کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا۔ ایملی نے ایک دم سے خطرہ محسوس کرلیا۔ اس نے اپنے سارے بچوں کو فوراً اندر کی جانب دھکیلا ہی تھا کہ وہ سب ان کی طرف بھاگنے لگے، اس وقت تک ایملی انہیں اندر لے جانے میں کامیاب گئی۔ اس نے تیزی سے بولٹ چڑھا دیا۔ کچھ ہی منٹ بعد باہر سے آواز آئی

''ایملی دیکھو۔! باہر آجاؤ، ہم تم لوگوں کو لینے آئیں ہیں۔ مت ڈرو۔''

''نہیں تم لوگوں کے ارادے خطرناک لگ رہے ہیں۔ تم واپس جاؤ۔'' ایملی نے کہا تو چند منٹ تک یہی تکرار چلتی رہی۔ تبھی باہر سے ایک بندے نے زور سے کہا۔

''اگر تم ایک منٹ سے پہلے باہر نہ آئی تو میں تمہارے اس گھر کو آگ لگادوں گا۔ پھر تو باہر نکلوگی؟''

''تم ایسا نہیں کرسکتے ہو۔ جب تک ڈاکٹر ایلکس نہیں کہے گا، ہم باہر نہیں جائیں گے۔'' ایملی نے کہا۔

''تو پھر تیار ہو جاؤ'' یہ کہہ کر اس نے دروازے میں ایک برسٹ مارا۔ اس کے ساتھ ہی کھڑکیاں ٹوٹنے لگیں۔ دروازے کو دھکا دیا جانے لگا۔ کچھ لمحے بعد دروازہ ٹوٹ گیا۔ ایملی اپنے بچوں کے ساتھ سہمی ہوئی سامنے کھڑی تھی۔ حملہ آور آگے بڑھے اور انہوں نے سب کو پکڑا اور دھکے دے کر گھر سے باہر نکال لیا۔

وہ انہیں میدان کی طرف لے جا رہے تھے۔ ایملی چیخ رہی تھی، چھوٹے چاروں بچے سہمے ہوئے خوف زدہ رو رہے تھے۔ جبکہ ہیری خاموش تھا اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ کیسے حالات بن گئے ہیں؟ وہ ان سب کو اس میدان میں لے آئے جہاں کچھ فاصلے پر ہیلی کاپٹر کھڑے تھے۔ تبھی ایک شخص آگے بڑھا اور واٹسن کی طرف دیکھ کر ڈرامائی انداز میں بولا۔

''ڈاکٹر ایلکس مر چکا ہے اور اب ہمیں سوائے ہیری کے کسی دوسرے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں ہیری کیوں چاہیے، اس کا مجھے نہیں پتہ۔ تمہارے ساتھ اچھا سلوک یہ کیا جائے گا کہ ہمارے ساتھ ہیری کو جانے دو اور خود ان بچوں کے ساتھ دوسرے ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر یہاں سے چلے جاؤ، وہاں سے تم سب کو لندن پہنچا دیا جائے گا۔ ورنہ تم چھ لوگ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ہیری کو تو ہم لے ہی جائیں گے۔''

''تم ایسا نہیں کرسکتے، ہمیں یہیں رہنے دو۔ پلیز میرا بیٹا مجھ سے نہ چھینو۔'' ایملی نے ممتا بھری درد ناک صدا لگاتے ہوئے کہا تو اس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنے بندوں سے کہا۔

''لے جاؤ، ہیری کو، دوسرا ہیلی کاپٹر انہیں بعد میں لے جائے گا۔''

ہیری کو تین لوگوں نے پکڑا ہوا تھا۔ دو آدمیوں نے اس کے بازو قابو کیے ہوئے تھے۔ تیسرا اس کے پیچھے تھا۔ انہوں نے ہیری کو دھکا دیا۔ وہ ایک بار لڑکھڑایا اور چل پڑا۔ ایملی کی حالت غیر ہونے لگی۔ وہ زور زور سے چیختے ہوئے آگے بڑھی تو وہاں موجود حملہ آوروں نے اسے قابو میں کرلیا۔ وہ بن پانی کی مچھلی کی مانند تڑپنے لگی تھی۔ وہ زور زور سے چلّا رہی تھی۔

''میرا بیٹا مت لے جاؤ۔ میرا بیٹا مت لے جاؤ۔''

واٹسن صورت حال کو سمجھ رہا تھا۔ وہ اگر مزاحمت کرتے تو فائرنگ سے وہیں مر جاتے۔ ہیری کو انہوں نے پھر بھی لے جانا تھا۔ جس وقت حملہ آور

ہیری کو ہیلی کاپٹر کے قریب لے کر پہنچے اور اس کا دروازہ کھول کر اسے اندر بٹھانے لگے۔تب ایملی ایک دم سے یوں چیخی جیسے ذبح کردی گئی ہو۔

''ہیری ی ی ی ی......''

اس صدا میں نجانے کیا اثر تھا۔ ہیری نے ایک جھٹکے سے اپنے بازو چھڑا لیے۔اسے قابو کیے ہوئے لوگوں نے نوعمر لڑکے کی طرف یوں حیرت سے دیکھا جیسے یہ انہونی ہوگئی ہو۔مگر انہونی ہوگئی تھی۔انہیں سوچنے کا بھی موقعہ نہیں ملا تھا کہ ہیری نے گھوم کر پیچھے کھڑے بندے کو دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور یوں ہوا میں اچھال دیا، جیسے وہ بال پھینکتا تھا، وہ ہوا میں اڑتے ہوئے کئی میٹر دور جا گرا۔ایملی اسے یوں دیکھنے لگی، جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ اس کی چیخیں بند ہوگئیں تھیں اور وہاں حیرت زدہ کر دینے والا سکوت تھا۔

ہیری واپس پلٹ پڑا تو کئی سارے لوگ اس کی بڑھے۔وہ ایک گرانڈیل شخص تھا، جس نے ہیری کو پکڑا اور اسے قابو کرنے کی کوشش کی۔اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ہیری نے ایک گھونسہ اس کے منہ پر مارا تو اس شخص کا چہرہ پھٹ گیا۔وہ چکرایا اور زمین پر جا رہا۔ دو اس کے قریب آ چکے تھے۔ایک کو اس نے کمر سے اٹھایا اور زمین پر دے مارا۔ وہ دوبارہ نہیں اٹھ سکا۔ دوسرے کو اس نے نیچے رکھا، اس کی ٹانگ پر اپنی ٹانگ رکھی اور اسے چیر دیا۔سامنے چند لوگ کھڑے تھے۔جیسے ہی ہیری ان کی جانب بڑھا انہوں نے گنیں تان لیں اور فائرنگ کرنا شروع کر دی۔ اس وقت وہاں پر ہر شخص پاگل کر دینے والی حیرت سے ہیری کو دیکھنے لگا، گولیاں اس پر اثر نہیں کر رہیں تھیں۔بلٹ اس کے ساتھ جا کر لگ رہی تھیں۔ لیکن اس کے جسم میں پیوست ہو جاتیں اور وہاں سے ایک قطرہ خون بھی نہیں بہا۔ وہ بڑھتا گیا جو اس پر فائرنگ کر رہے تھے۔ لمحے سے بھی کم وقت میں وہ ان کے سر پر جا پہنچا۔اس نے ایک بندے کی دونوں ہاتھوں سے گردن پکڑ لی۔ اسے اوپر اٹھایا اور گھما کر دوسروں پر مارنے لگا۔یوں لگ رہا تھا جیسے ہرکولیس سے بھی کئی گنا طاقت اس میں آ گئی ہو۔

چند منٹ میں وہی بندے رہ گئے جو ہیلی کاپٹر میں موجود تھے۔تیرہ کے قریب بندے اس کے ہاتھوں یا تو مر گئے تھے یا ابھی تک تڑپ رہے تھے۔جیسے ہی ہیلی کاپٹر سٹارٹ ہوا، ہیری نے اس طرف دیکھا، پھر چشم زدن میں اس تک پہنچا۔ اسے یوں اپنی طرف آتے دیکھ کر پائلٹ نے ہیلی کاپٹر زمین سے اٹھا لیا۔ اس نے ہیلی کاپٹر کے پائے دان پکڑ لیے اور یوں زور لگانے لگا جیسے اسے نیچے کھینچ رہا ہو۔اس وقت تک وہ کافی اونچا جا چکا تھا۔ ہیری ہلکورے لینے لگا۔جس سے ہیلی کاپٹر ڈگمگا گیا۔اور پھر اس کا رخ زمین کی طرف ہوگیا۔اسی وقت ہیری نے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ وہ زمین پر ایسے آ رہا جیسے اس نے معمولی چھلانگ لگائی ہو۔ دوسرا ہیلی کاپٹر بھی زمین سے اٹھ کر فضا میں گم ہوگیا تھا۔ ایملی ، واٹسن اور بچے کبھی ہیری کو دیکھتے ،کبھی میدان میں بکھری ہوئی لاشوں کو اور کبھی دور دھڑ دھڑ جلتے ہوئے ہیلی کاپٹر کو۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، یہ سب کیسے ہوگیا؟ وہ ہیری کچھ دیر پہلے تک ایک عام سا بچہ تھا، یہ اچانک غیر فطری بچہ کیسے ہوگیا ہے؟ شدت حیرت سے ان کی آنکھیں پھٹ رہی تھیں۔

باقی آئندہ ماہ انشاءاللہ



چراغ

ریاض بٹ

ہماری سرزمین پر سب سے پہلا رونما ہونے والا جرم ایک انسان کے ہاتھوں دوسرے انسان کا قتل ہے۔تمام جرائم میں قتل سب سے گھناؤنا جرم ہے' ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے اور جہاں جرم سرزد ہوتاہے وہاں پولیس کو طلب کیا جانا لازمی امر ہے' اب یہ پولیس کا کام ہوتا ہے کہ وہ کس طرح ملزم کے خلاف اپنی تفتیش کا آغاز کرتی ہے۔

ٹیکسٹائل مل کے مالک کی بیٹی کا فسانۂ عجب جس کی موت معمہ بن گئی تھی' یہ قتل تھا یا خودکشی؟

اس واقعے کا چشم دید گواہ کہاں گیا' اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا؟

ویسے تو ہم پولیس والوں کی زندگی کے شب و روز مصروف ہی گزرتے ہیں لیکن جب فرصت کے لمحات میسر آتے ہیں اور یہ ذرا طویل ہونے لگتے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ پھر مصروفیات کے دن لوٹ آئیں وہ بھی ایسے ہی دن تھے۔سردی عروج پر تھی' کافی دنوں سے بارش نہیں ہوئی تھی ہر طرف گردوغبار تھا اور ڈاکٹروں کے وارے نیارے تھے۔ مجھے اس دن تھانے میں آئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ سپاہی انور نے آ کر مجھے سلیوٹ کیا اور گویا ہوا۔

''سر! ایک حادثے کی اطلاع آئی ہے۔''

میں اپنی کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور جن کاغذوں کی ورق گردانی کر رہا تھا ان کو ایک طرف رکھا اور سپاہی کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔

''بھئی کیسا حادثہ...... اور اطلاع لے کر کون آیا ہے؟''

''سر دو بندے آئے ہیں وہ کہتے ہیں مالکن نے تاکید کی ہے کہ صرف تھانیدار صاحب کو بتانا ہے۔''

''اچھا'' میں نے ہنکارا بھرا۔''ذرا ان کے درشن تو کراؤ۔'' سپاہی ''جی سر'' کہہ کر چلا گیا اور چند منٹوں بعد وہ جن دو بندوں کو لے کر آیا میں نے بغور ان کا جائزہ لیا۔

ایک جوان آدمی تھا' ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں' رنگ گندمی اور چہرہ ذرا لمبوترا تھا۔ دوسرا آدمی پٹھان تھا' رنگ لال سرخ تھا اور صحت مند تھا۔ پھرتیلا لگتا تھا' ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کر لیتا تھا' بہرحال انہوں نے بتایا کہ ان کی مالکن افسانہ نے انہیں بھیجا ہے ان کی بہن رضوانہ نے خودکشی کر لی ہے اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی تفصیل نہیں تھی۔

میں نے ضروری تیاری کی اور سپاہی انور کو ساتھ لے کر جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ یہ ایک وسیع و عریض کوٹھی تھی' آگے بڑھنے سے پہلے اس کوٹھی کے مکینوں کے متعلق کچھ بتا تا چلوں تو مناسب رہے گا۔

یہ کوٹھی ایک ٹیکسٹائل مل کے مالک رضوان صدیقی کی تھی' یہ ٹیکسٹائل مل اس شہر کے کونے میں واقع تھی اور بہت زیادہ پرافٹ میں جا رہی تھی۔ رضوان صدیقی وفات پا چکا تھا' اس کی بیوہ شبانہ کچھ عرصے سے بیمار تھی اس کے گردے فیل ہو گئے تھے۔

ان کی صرف دو بیٹیاں رضوانہ اور افسانہ تھیں' بیٹا کوئی نہیں تھا۔ رضوانہ نے اپنے کمرے میں خودکشی کی تھی اور



اس وقت ہم اسی کے کمرے میں تھے افسانہ اور اس کی پھوپی بھی اس وقت کمرے میں موجود تھیں۔ میں نے لاش کا بغور جائزہ لیا اس کو مرے پانچ چھ گھنٹے گزر چکے تھے اس نے شب خوابی کالباس پہن رکھا تھا۔ ریشم کی بنی ہوئی نفیس اور خوب صورت رضائی اس نے اوڑھ رکھی تھی جو ابھی میں نے ہٹائی تھی۔

جب میں نے یہ کہا کہ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے جائے گی تو افسانہ نے کہا۔

''تھانیدار صاحب آپ جو مناسب سمجھیں کریں' میں آپ کے کام میں مخل نہیں ہوں گی ویسے لگتا تو یہی ہے کہ رضوانہ نے خودکشی کی ہے۔''

''دیکھو بی بی! جب کوئی بندہ یا بندی غیر طبعی موت مر جاتی ہے تو پوسٹ مارٹم لازم ہو جاتا ہے۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''یہ بات تو تفتیش کے بعد ہی پتا چلتی ہے کہ اصل بات کیا ہے' ابھی میں آپ سے یہ ضرور پوچھوں گا کہ آپ کس بنا پر کہہ رہی ہیں کہ آپ کی بہن نے خودکشی کی ہے۔''

لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے کے بعد میں رضوانہ کے کمرے سے نکل آیا اور افسانہ مجھے ایک سجی سجائی بیٹھک میں لے آئی اس کی پھوپی زینت صدیقی شاید اندر افسانہ کی امی کی طرف چلی گئی تھی۔

بیٹھک میں بیٹھ کر یہ احساس ہوا کہ اس کوٹھی کے مکین نہ صرف آسودہ حال ہیں بلکہ سجاوٹ کے سامان کے انتخاب میں بھی اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔

سوال و جواب کی طرف آنے سے پہلے چند باتیں آپ کو بتا دیتا ہوں' رضوانہ کے کمرے کی باریک بینی سے تلاشی لینے کا پروگرام میں نے فی الحال اگلے دن پر رکھ چھوڑا تھا۔ پہلے میں افسانہ اور اس کی ماں کا انٹرویو لینا ضروری سمجھتا تھا۔ ویسے میں نے کمرے کو سربمہر کرنے کا بندوبست تو کرنا ہی تھا' سپاہی انور کو میں نے لاش کے ساتھ بھیجنے سے پہلے حکم دے دیا تھا کہ وہ تھانے سے ہو کر جائے اور کانسٹیبل وزیر کو میرے پاس بھیج دے ظاہر ہے اسے ضروری سامان کے سات آنا ہے۔

بیٹھک میں میں کرسی پر بیٹھ گیا اور افسانہ میرے سامنے چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''ہاں بی بی افسانہ! اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم کس بنا پر کہہ رہی ہو کہ تمہاری بہن نے خودکشی کی ہے؟'' چند لمحے تک وہ میری طرف خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی پھر گویا ہوئی۔

''تھانیدار صاحب! رضوانہ کافی دنوں سے پریشان تھی اور اکثر کہتی رہتی تھی کہ میں خودکشی کر لوں گی۔''

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی مجھے احساس ہوا ہے کہ

دولت کی یہاں فراوانی ہے' آسودہ حال ہے پھر بلاوجہ یا کسی ٹھوس وجہ کے بغیر کوئی اپنی یا کسی کی جان نہیں لیتا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھیں تھانیدار صاحب! دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔''

''بالکل' اس سے انکار ممکن نہیں اور بھی خواہشیں ہوتی ہیں' تقاضے ہوتے ہیں لیکن پھر وہی بات آجاتی ہے کہ بغیر وجہ......'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''دراصل وہ ایک لڑکے سے محبت کرتی تھی جس نے اس کا دل توڑ دیا۔''

''اوہ۔'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کون لڑکا؟''

''یہ تو مجھے پتا نہیں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے' وہ تمہاری بہن تھی جب اس نے تم سے کہا کہ اسے ایک لڑکے سے محبت ہے' اس نے اس کے ساتھ بے وفائی کی تو تم نے ضرور پوچھا ہوگا کہ وہ لڑکا کون ہے؟'' میں نے ذرا رعب سے کہا۔

''تھانیدار صاحب! وہ اپنی مرضی کی مالک تھی' میرے اور اس کے درمیان زیادہ بے تکلفی نہیں تھی۔ محبت والی بات اس نے مجھ سے نہیں بلکہ اپنی خاص نوکرانی آفعہ سے کہی تھی اور خودکشی کی بات بھی آفعہ سے ہی کہی تھی اور وہی حرافہ اس کی رازدار تھی۔'' آخر میں اس کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

''تمہیں آفعہ نے یہ ساری باتیں کب بتائی تھیں؟''

''تھانیدار صاحب! آج صبح' وہ بھی جب میں نے اس سے پوچھا۔''

''کیا مطلب؟ بات کچھ پلے نہیں پڑی۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''آفعہ یہاں ہی رہتی تھی' اس نے کہا تھا کہ اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ صبح سات بجے وہ رضوانہ کے لیے چائے لے کر جاتی تھی بقول اس کے آج وہ چائے لے کر گئی تو آوازیں دینے کے باوجود جب رضوانہ نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے چائے میز پر رکھی اور رضوانہ کی چارپائی کے قریب پہنچ گئی اور......'' یہاں پہنچ کر اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ خاموش ہوگیا آگے وہ جو کچھ کہنا چاہتی تھی میں سمجھ گیا تھا۔ ظاہر ہے اس نے گھر والوں کو اطلاع دی ہوگی اور دو بندے میرے پاس پہنچ گئے تھے۔

''وہ نوکرانی آفعہ کو ذرا میرے پاس لے کر آؤ۔''

''وہ تو چلی گئی' کہتی تھی پولیس مجھے پریشان کرے گی۔''

''تم نے اس کو روکا نہیں۔'' میں نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔

''اس وقت میرا دماغ ماؤف ہوگیا تھا' اگر وہی مجھے پہلے بتادیتی تو میں رضوانہ کو کبھی ایسا قدم نہیں اٹھانے دیتی' مجھے آفعہ پر بہت غصہ تھا۔''

''اب مجھے تم پر غصہ آرہا ہے' تم نے ایک بہت اہم گواہ کو جانے دیا۔'' مجھے واقعی اس پر بے تحاشہ غصہ آرہا تھا کبھی کبھی غصہ انسان کو ایسے ہی مقام پر لے آتا ہے کہ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھودیتا ہے' سیانے کہتے ہیں ''جب سانپ گزر جائے تو لکیر پیٹنے سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا'' لیکن ہم پولیس والے لکیر کا پیچھا ضرور کرتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے افسانہ سے نوکرانی کا حلیہ پوچھا تھا پھر اس کی جان چھوڑ کر اس کی امی سے ملا تھا۔ پھوپی پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی ان سے جو باتیں ہوئی تھیں ان کا ذکر آگے آئے گا۔ اس کے بعد میں نے کانسٹیبل وزیر کو (جو اس دوران وہاں پہنچ چکا تھا) ساتھ لیا اور کمرے کو سربمہر کروادیا۔

پھر ہم تھانے میں آگئے' یہاں اے ایس آئی شاید

میرے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا' حالانکہ افسانہ نے چائے کے لیے بہت زور لگایا تھا لیکن میں نے معذرت کرلی تھی۔ اپنے کمرے میں آ کر میں نے اے ایس آئی شاہد کے ساتھ چائے پی اور ہم اس کیس کے متعلق بات چیت کرنے لگے۔

''سر! نوکرانی کا ملنا بہت ضروری ہے۔'' اے ایس آئی نے انگلی سے ناک کھجاتے ہوئے کہا۔

''لیکن یہ بھوسے میں سوئی ڈھونڈنے والی بات ہوگی۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ سوئی تو ڈھونڈنی ہی پڑے گی سر! آپ مجھے ذرا نوکرانی کا حلیہ تو بتائیں۔'' پھر میں نے اسے نوٹ کیا ہوا حلیہ بتایا تھا اور وہ چلا گیا تھا۔

قارئین آپ حیران ہورہے ہوں گے کہ اس بار میں نے کچھ الٹا کیا تھا یعنی کمرے کی باریک بینی سے تلاش کا پروگرام کل پر کیوں چھوڑ دیا تھا؟ اس سلسلے میں عرض ہے کہ میں نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا انتظار کرنا تھا ویسے میں نے تلاشی تو لی تھی تکیے کے نیچے سے خواب آور گولیوں کی شیشی ملی تھی جو آدھی بھری ہوئی تھی وہ اس وقت میری جیب میں تھی جس کو تھانے میں پہنچ کر میں نے اپنی میز کی دراز میں رکھ دیا تھا۔ کمرے سے ایک ناول حنا اور پتھر بھی ملا تھا جو حمیدہ جبین کا تحریر کردہ تھا۔ سب کی نظر بچا کر وہ میں نے پار کرلیا تھا اور سپاہی انور کے حوالے کردیا تھا' وہ بھی اس وقت دراز میں موجود تھا۔

اس دن اس کیس کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی' اگلے دن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ گئی جس کے مطابق خواب آور گولیوں کی بہت زیادہ مقدار کھانے سے موت واقع ہوگئی تھی۔

خواب آور گولیوں کی جو بوتل مجھے ملی تھی وہ آدھی تھی' رپورٹ میں کوئی اور بات نہیں تھی صرف اتنا لکھا تھا کہ چائے کے ساتھ خواب آور گولیاں کھائی گئی تھیں' یہ اشارہ بھی دیا گیا تھا کہ شاید گولیاں پیس کر ڈالی گئی تھیں۔ ضروری کاغذی کارروائی کے بعد میں نے لاش ورثاء کے حوالے کردی۔

یہ اسی شام کی بات ہے کہ میں اور کانسٹیبل وزیر رضوانہ کے کمرے میں موجود تھے' ہمارے ساتھ محلے کے دو معزز گواہ' افسانہ اور اس کا ایک ایک کزن بھی موجود تھا۔

کانسٹیبل میرے کہنے اور حکم کے مطابق چیزیں اٹھا اٹھا کر دیکھ رہا تھا' چائے میز پر نہیں تھی وہ میں نے کل لیبارٹری بھجوادی تھی جس کی رپورٹ ابھی نہیں آئی تھی یہ میں نے احتیاطاً ایسا کیا تھا ورنہ مجھے ذرا بھی شک نہیں تھا کہ اس میں کچھ ہوگا۔

جس چارپائی پر لاش ملی تھی اس کا گدا الٹا کر دیکھا نیچے کچھ بھی نہیں تھا' اردگرد بھی کوئی خاص چیز نہیں ملی۔ اب ایک خالص چمڑے کا بنا ہوا سوٹ کیس رہ گیا تھا' جو لاک تھا۔ میں نے گواہوں کی موجودگی میں تالا توڑ دیا' اندر زنانہ استعمال کی چیزیں اور قیمتی کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ سوٹ اور کپڑے باہر کے لگتے تھے' بعد میں افسانہ سے پوچھنے پر پتا چلا تھا کہ یہ سوٹ کیس اور کپڑے ایک سال پہلے باہر سے لائے تھے اس کے پاپا۔

کپڑوں کے نیچے آخر مجھے کام کی چیز مل ہی گئی' یہ ایک خوب صورت ڈائری تھی جو بالکل سادہ تھی لگتا تھا ابھی ابھی خریدی گئی ہے۔ میرا تجربہ یہ بھی کہتا تھا کہ شاید یہ کسی نے تحفہ دیا ہو' میں جب اس کی ورق گردانی کررہا تھا تو اچانک ایک تصویر اس میں سے نکل کر فرش پر گر گئی' میں نے اٹھا کر دیکھا یہ ایک وجیہہ جوان کی تصویر لگتی تھی وہ بلیک اینڈ وائٹ کا دور تھا۔ میں نے جب افسانہ کو یہ تصویر دکھائی تو وہ بے ساختہ بول اٹھی۔

''یہ تو حمید ہے' ہماری مل میں جنرل منیجر ہے۔''

''اوہ......'' میں نے معنی خیز نظروں سے اس کی

طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر میں نے ڈائری اور تصویر کا مشیر نامہ تیار کیا اور دونوں گواہوں کے دستخط کروالیے۔

جب ہم تھانے میں واپس پہنچے تو رات کے آٹھ بج چکے تھے' سردیوں کے آٹھ بجے یوں لگتا ہے جیسے آدھی رات ہوگئی تھی۔ ڈائری اور تصویر کو میں نے دراز میں خواب آور گولیوں کی بوتل' حنا اور پھر ناول کے ساتھ رکھ کر لاک کردیا اور آرام کرنے گھر چلا گیا۔

سونے سے پہلے میں اس کیس کے سلسلے میں اپنے ذہن میں پلان بنا چکا تھا اگر کوئی بندہ خودکشی کرتا ہے تب بھی پولیس کو تفتیش تو کرنی ہی پڑتی ہے۔ اس کیس میں تو مجھے ایک شخصیت نے کہا تھا کہ آپ تفتیش ضرور کریں' ابھی میں اس شخصیت کا نام ظاہر نہیں کروں گا۔

اگلی صبح سردی کچھ کم ہوئی تھی' سورج وقت پر نکلا تھا اور ہر طرف اپنی چمکیلی دھوپ سے موسم کی خنکی کو کچھ کم کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ جب اے ایس آئی شاہد میرے کمرے میں آیا تو کچھ بجھا بجھا سا لگتا تھا جیسے ناکامی کے جھکڑ نے اس کی آس کے سب دیپ بجھا دیے ہوں۔

''کیوں بھئی' منہ کیوں لٹکا ہوا ہے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑھتے ہوئے کہا۔

''سر! نوکرانی کا کوئی سراغ نہیں مل رہا۔'' اس نے میرے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر گویا گرتے ہوئے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

''بھئی جو کچھ بھی ہو' امید کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ یہ لو۔'' میں نے میز کی دراز سے تصویر نکالتے ہوئے کہا۔ ''تم اس پر طبع آزمائی کرو' نوکرانی والا معاملہ میں کانسٹیبل وزیر کے حوالے کرتا ہوں اس کی بیوی اس قسم کے کاموں میں ماہر ہے۔''

''سر! اس تصویر کا جغرافیہ کیا ہے۔'' اس نے تصویر کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

پھر میں نے اسے تصویر کے جغرافیہ سے آگاہ کرتے ہوئے کہا ''تم نے اس کی تاریخ سے آگاہی حاصل کرنی ہے۔'' میں نے لہجے کو معنی خیز بناتے ہوئے کہا۔

''آپ بالکل فکر ہی نہ کریں سر!'' پھر وہ اجازت لے کر چلا گیا میں نے کانسٹیبل وزیر کو بلا کر نوکرانی والا معاملہ اس کے سپرد کردیا۔ شام کو اے ایس آئی شاہد آیا تو اس کے چہرے پر بشاشت تھی۔

''سر! حمید صاحب نے اقرار کرلیا ہے کہ رضوانہ سے ان کی محبت چل رہی تھی لیکن تصویر اور ڈائری والے معاملے سے انہوں نے لاعلمی ظاہر کی ہے۔''

''پھر......'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تصویر اور ڈائری اس کے بیڈ تک کیسے پہنچی؟''

''میرا خیال ہے سر اسے تھانے میں بلالیتے ہیں۔ یہاں کا ماحول شاید اسے راس آجائے ویسے میرا خیال ہے وہ کچھ باتیں چھپا رہا ہے۔'' اے ایس آئی نے خیال انگیز لہجے میں کہا۔

''آج ذرا اسے دوبارہ نہ ہی چھیڑیں تو بہتر ہے' کل سپاہی بھیج کر بلالیں گے۔ باقی مل کے متعلق تم نے کیا معلومات حاصل کیں۔''

''سر! تقریباً سات ماہ پہلے رضوان صدیقی صاحب کا انتقال ہوا تھا' اس کے بعد رضوانہ ہی مل کا نظام سنبھالے ہوئے تھی اور یہ منیجر (حمید) اس کا دایاں ہاتھ تھا۔''

''اوہ......'' کیا رضوانہ مرنے سے پہلے روانہ مل میں جاتی تھی' میں نے ایک خیال کے تحت پوچھا۔

''دوسرے تیسرے دن سر!''

''منیجر نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ اس نے رضوانہ کا دل توڑ دیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''سر! اس نے گول مول باتیں کی ہیں' اس لیے تو

بس کہتا ہوں کہ اسے ذرا تھانے کی سیر کروائی جائے۔"
"ٹھیک ہے کل یہ کام ہو جائے گا پھر دیکھیں گے کہ
ں کی کتنی باتیں گول ہیں اور کتنی مول ہیں۔" میں نے
تمی لہجے میں کہا۔
رضوانہ کے پاس ہر آسائش موجود تھی لیکن محبت
رنے والوں کے متعلق کوئی بات حتمی طور پر نہیں کہی
جا سکتی کہ وہ محبت میں ناکامی کی صورت میں کیا کر
گزریں گے؟ کہتے ہیں تلوار کا زخم بھر جاتا ہے لیکن
زبان کا زخم نہیں بھرتا' یہ تو محسوس کرنے کی بات ہے۔
انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے' اگلے دن
جب میں نے کانسٹیبل وزیر کو مل میں منیجر حمید کو بلا کر
لانے کے لیے بھیجا تو اس نے آ کر بتایا۔
"سر! حمید صاحب ایک ہفتے کی چھٹی لے کر چلے
گئے ہیں۔"
"چھٹی لے کر چلا گیا ہے....." میں نے زیر لب
دہرایا۔ "لیکن کیوں' ایسی کون سی مجبوری آن پڑی تھی۔"
"سر! مل میں کوئی کھل کر بات نہیں کر رہا' مجھے تو دال
میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔" کانسٹیبل نے کچھ سوچتے
ہوئے کہا۔ کانسٹیبل وزیر ایک ذہین اور سمجھ بوجھ رکھنے
والا بندہ بلکہ پولیس اہلکار تھا۔
"بھئی عجیب معاملہ ہے لگتا تو مجھے بھی یہی ہے کہ
کہیں کچھ گڑبڑ ضرور ہے اور یہ سیدھا سادہ خودکشی کا کیس
نہیں ہے۔" میں نے اپنے سامنے رکھے کاغذات کی
طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔
اس کے بعد میں نے اسے جانے کا اشارہ کرتے
ہوئے کاغذات نمٹائے تھے اور سوچوں کے گھوڑے
دوڑانے لگا تھا۔ بات کچھ الجھ سی گئی تھی نہ جانے کیوں
میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی تھی کہ منیجر کا اچانک جانا
خالی از مصلحت نہیں ہو سکتا اور ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہو رہا
تھا کہ مل میں پوچھ گچھ کا کچھ فائدہ نہیں ہونا۔
یہاں پر آ کر یعنی کیس کی اس اسٹیج پر آ کر میں ذرا
رک گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ تفتیش کے گھوڑے کس سمت
موڑے جائیں۔ آخر کافی سوچ بچار کے بعد میں نے
کانسٹیبل وزیر کو ساتھ لیا اور رضوانہ صدیقی (مرحومہ) کی
کوٹھی میں پہنچ گیا۔
سب سے پہلے افسانہ سے ملاقات ہوئی وہ ہمیں
بیٹھک میں لے گئی اور اس بار ہمارے منع کرنے کے
باوجود نوکروں کو ہماری خاطر مدارت کے لیے کہنے لگی اور
جب گاجر کا حلوہ' اُبلے ہوئے انڈے اور کشمیری چائے
ہمارے سامنے آئی تو اس نعمت خداوندی کو ٹھکرانا ہمارے
لیے ممکن نہیں رہا' ساتھ ساتھ باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔
"بی بی! حمید صاحب اچانک کیوں چلے گئے؟"
"تھانیدار صاحب کل رات کو تقریباً سات بجے وہ
کوٹھی میں آیا اور بتایا کہ پیچھے گھر مین کوئی مسئلہ ہو گیا ہے
شاید کوئی لڑائی جھگڑا ہوا ہے۔ وہ چھٹی کی درخواست
ساتھ لے کر آیا تھا۔" افسانہ نے تفصیل بتاتے ہوئے
کہا۔
"اوہ!" میں نے سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔
"اچھا یہ بتاؤ' اس کا گھر کہاں ہے؟"
"وہ شیخوپورہ کا رہنے والا ہے لیکن تھانیدار صاحب
آپ نے اس سے کیا پوچھنا ہے؟"
"بی بی آخر اس کیس کو ختم تو کرنا ہے نا' اس سے چند
باتیں پوچھنی ہیں تم مجھے اس کا پتہ لکھوا دو۔" اس نے جو
پتہ بتایا وہ میرے کہنے پر کانسٹیبل وزیر نے نوٹ کر لیا
جب ہم رخصت ہونے لگے تو افسانہ نے کہا۔
"ویسے تھانیدار صاحب میں اب حمید کو مل سے
نکالنے کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔"
"کیوں؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھتے
ہوئے کہا۔
"دیکھیں نہ تھانیدار صاحب! اس بے وفا کی وجہ

سے میری بہن نے خودکشی کرلی اگر میرے بس میں ہوتو میں اسے گولی ماردوں۔"

"بی بی! ایک تھانیدار کے سامنے ایسی خطرناک باتیں نہ کرو یہ نہ ہو کہ......؟" میں نے مزاح کے لہجے میں کہا وہ خاموش ہوگئی۔

"دیکھو بی بی! جب تک دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی نہیں ہو جاتا تم کوئی قدم نہیں اٹھاؤ گی تم پہلے ہی ایک حماقت کر چکی ہو۔" میں نے اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے ذرا ترش لہجے میں کہا۔

"کون سی حماقت تھانیدار صاحب؟"

"نوکرانی کو نہ روکنے والی حماقت۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"سوری تھانیدار صاحب! میں شرمندہ ہوں دراصل میرا دماغ ماؤف ہوگیا تھا۔"

"خیر جو ہوا سو ہوا۔ میں جلدی اس کیس کی فائل بند کردوں گا۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

پھر ہم تھانے میں واپس آگئے ویسے میں اچھی طرح اطمینان کرنے سے پہلے اس کیس کی فائل کو بند کرنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے اے ایس آئی شاہد کو شیخوپورہ بھیجنے کا فیصلہ کرلیا تھا یہاں یہ بات بھی بتا تا چلوں کہ ابھی تک نوکرانی کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ اس کا کوئی اتا پتا تو تھا نہیں ہم نے اپنے طور پر کوٹھی کے ملازمین سے بھی کچھ معلوم کرنے کی سعی کی تھی لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات نکلا تھا۔

محبت والی بات کسی کے علم میں نہیں تھی البتہ روشنی کی ایک چھوٹی سی لکیر نظر آئی تھی لیکن اس لکیر کو بڑے خفیہ طریقے سے استعمال کرنا چاہیے تھا۔ ایک نوکر سے رضوانہ کی کسی شازیہ نامی سہیلی کا پتا چلا تھا وہ بھی ایک امیر ماں باپ کی بیٹی تھی۔

میں نے اس سے خود بات کرنے کی بجائے کانسٹیبل وزیر کی بیوی کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ اگلے دن میں نے اے ایس آئی شاہد کو شیخوپورہ بھیج دیا اب اس نے ایک دن گزار کے آنا تھا۔

کہتے ہیں جب کوئی سبب ہونا ہوتا ہے تو موقع خود بخود بن جاتا ہے۔ کانسٹیبل وزیر کی بیوی نے اطلاع بھجوائی کہ شام ڈھلے فلاں محلے میں آجائیں۔

میں اور کانسٹیبل وزیر شام ڈھلے وہاں پہنچ گئے یہ وہ وقت تھا جب دن کا اجالا شام کے اندھیرے میں مدغم ہو رہا تھا دکانوں پر بلب جل چکے تھے۔ سردی عروج پر تھی ہم سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے مکمل تیاری کے ساتھ آئے تھا۔ یہ محلّہ مین بازار کے عین درمیان میں واقع تھا اور ہمارے تھانے کی حدود میں آتا تھا یہاں مزدور طبقہ لوگ یا بڑے بڑے بیوپاری رہائش پذیر تھے جو مکان ہماری منزل تھا وہ محلے کے وسط میں تھا۔

مکان کے اندر جس کمرے میں ہم بیٹھے تھے وہاں دن کو بھی روشنی یعنی بلب جلانے کی ضرورت تھی۔ عجیب سیلن زدہ کمرہ تھا جو اس بات کا گواہ تھا کہ یہاں سورج کی روشنی نہیں پہنچتی۔ میں نے اپنے سامنے بیٹھی خاتون کا جائزہ لیا یہ بلاشبہ وہی تھی جس کا حلیہ افسانہ نے ہمیں بتایا تھا اور یہ حلیہ مجھ سے براستہ کانسٹیبل وزیر اس کی بیوی تک پہنچا تھا۔ یہاں اس بات کی وضاحت کردوں کہ ہم سادہ لباس میں تھے ہمارے ساتھ وزیر کی بیوی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیے وزیر کی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر یہ وزیر کی بجائے بادشاہ ہوتا تو میں تمہیں ملکہ کہتا لیکن اب......" میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"صاحب! میں تو ان کے چرنوں میں ہی خوش ہوں۔" عورت عقل مند تھی فوراً میرا مقصد سمجھ کر وزیر کی طرف ہنس کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"سر! لیکن اصل وزارت تو اس کے پاس ہے یعنی

سرهم کی بیگم والی۔'' میں ہنس پڑا اور میں نے دیکھا کہ خاتون کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی ہے یہ ایک گوری چٹی' بیضوی چہرے اور تیکھے نقوش والی خاتون تھی۔ جس قسم کا ماحول میں چاہتا تھا وہ بن گیا تھا۔ بات وزیر کی بیوی نے شروع کی۔

''صاحب آفعہ آج کل ملازمت کی تلاش میں ہے' دو دن پہلے میرے پاس آئی تھی۔'' اس نے خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن آپ تو کہتی تھی کہ دو عورتیں آئیں گی' لیکن یہ تو......''

''بی بی! اس بات کو چھوڑو کہ اس نے کیا کہا اور تم نے کیا سنا۔ ہم اپنا تعارف کروا دیتے ہیں' میں اس علاقے کا تھانیدار ہوں اور یہ کانسٹیبل وزیر اور یہ اس کی بیوی ہے۔'' میں نے وقت ضائع کرنے کی بجائے اپنا تعارف کروانا مناسب سمجھا۔

''تھانیدار......'' اس کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔

''کیوں...... تم ڈر کیوں رہی ہو' کیا تم نے کوئی جرم کیا ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... لیکن اس طرح......؟''

''دیکھو بی بی! سیدھی بات یہ ہے کہ جس کوٹھی میں تم ملازمت کرتی تھیں یعنی جس لڑکی کی تم ملازمہ تھیں اس نے خودکشی کر لی تھی اور تم منظر سے غائب ہو گئی تھیں' ہمیں تمہاری تلاش تھی۔ اس لیے یہ سب کچھ کرنا پڑا۔'' میں نے اسے جملہ پورا نہیں کرنے دیا۔

یہاں یہ بات بتانا مناسب ہوگا کہ کانسٹیبل وزیر کی بیوی نے پیغام کے ساتھ یہ بات بھی ہم کو پہنچائی تھی کہ تقدیراً آفعہ کو اس کے در پر لے آئی تھی' کبھی کبھی ایسے بھی ہوتا ہے کہ مطلوبہ بندہ یا بندی خود چل کر قانون تک پہنچ جاتا ہے۔ اتفاقات شاید اسی کا نام ہے۔

''لیکن تھانیدار صاحب! میں نے کوئی جرم نہیں کیا' جب میں صبح چائے لے کر مالکن کے کمرے میں گئی تو......'' پھر اس نے وہی باتیں بتائیں جو ہمارے علم میں آ چکی تھیں۔

''دیکھو آفعہ بی بی! تم یہ بتاؤ کہ پولیس کے پہنچنے سے پہلے تم کوٹھی سے کیوں گئیں؟''

''میں خود نہیں آئی' افسانہ نے کہا تھا کہ تمہاری مالکن مر چکی ہے اس لیے اب تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دوسرے تمہیں پولیس بلاوجہ پریشان کرے گی۔'' اس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''کیا تم نے مستقل رہائش وہاں رکھی ہوئی تھی۔''

''جی ہاں! میرا آگے پیچھے تو ہے کوئی نہیں' خاوند فوت ہو چکا ہے ایک بیٹا تھا اس کو اپنا زیور بیچ کر باہر بھیجا اس نے چھ ماہ تو خطوط لکھے اور تھوڑے سے پیسے بھیجے پھر اس کا کچھ اتا پتا نہیں ملا۔ میں نے دو ماہ پہلے خط لکھا لیکن آج تک جواب نہیں ملا۔'' اس نے انتہائی دکھی لہجے میں کہا۔ وہ اندر سے بہت دکھی لگتی تھی ایسے کردار ہمارے معاشرے میں مل جاتے ہیں۔

''کیا تم نے آخری رات یعنی جس رات تمہاری مالکن (رضوانہ) نے خودکشی کی' تم نے اس کے اندر کوئی غیر معمولی بات محسوس کی تھی۔''

''غیر معمولی......'' آفعہ نے زیرلب دہرایا پھر بولی۔

''تھانیدار صاحب! وہ اس رات بہت خوش تھی کہہ رہی تھی تقریباً ایک ماہ بعد اس کی شادی اس کے محبوب سے ہو جائے گی۔''

''محبوب سے یعنی حمید سے......'' میں نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے کہا۔ میں نے ابھی اس سے محبت والی بات نہیں پوچھی تھی یعنی افسانہ نے جو کہا تھا کہ آفعہ نے مجھے بتایا تھا کہ رضوانہ منیجر (حمید) سے محبت کرتی تھی اور اس نے اس کا دل توڑ دیا تھا بات چلتے

چلتے خود ہی اس اسٹیج پر آ گئی تھی۔

"تھانیدار صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ مالکن تو اپنے پھوپی زاد سے محبت کرتی تھیں اور اس سے شادی کا کہہ رہی تھیں۔" آخر میں آفعہ نے میرے سوال کے جواب میں ایک بات اور کہی تھی جس کا ذکر ابھی مناسب نہیں۔ ہم وہاں سے اٹھ کر تھانے میں واپس آ گئے۔

یہ کیس تو کسی اور سمت ہی چل پڑا ہے اور خودکشی انتہائی پُراسرار ہو گئی تھی۔ اگلے دن سہ پہر سے ذرا پہلے اے ایس آئی منیجر (حمید) سمیت واپس آیا۔

اس نے جب تفصیل سے سارے حالات بتائے تو یہ کیس خودکشی کا نہیں رہا بلکہ قتل کا کیس بن گیا تھا پھر قاتل کو بھی ہم نے گرفتار کر لیا اور اس سے اقبال جرم بھی کروالیا۔

لیجیے جناب! معزز قارئین دھیرے دھیرے پردے اٹھاتا ہوں۔

جیسا کہ ذکر آ چکا ہے رصوان صدیقی کی صرف دو اولادیں تھیں یعنی رضوانہ اور افسانہ۔ افسانہ کی ماں صاعقہ اسے جنم دینے کے چند گھنٹے بعد اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں رضوان صدیقی بیوی کے مرنے کی وجہ سے پریشان تو تھے ہی بچی کی وجہ سے مزید پریشان ہو گئے۔ ظاہر ہے افسانہ کو بوتل کے دودھ پر لگانا پڑا تھا' لیکن اتنی معصوم بچی کو سنبھالنا ان کے بس سے باہر تھا فل ٹائم ایک آیا رکھ لی گئی۔ رضوان کے بزرگوں نے سوچا ایسے کام نہیں چلے گا سوتیلی ماں لانے کا مسئلہ بھی ٹیڑھا ہی تھا آخر سوچ بچار کے بعد صاعقہ کی چھوٹی بہن شبانہ کا انتخاب کیا گیا۔ وہ رضوان کی بیوی بن کر گھر میں آ گئی اور دو ماہ کی بچی یعنی اپنی بھانجی کو گود لے لیا۔ اس وقت افسانہ دو ماہ کی ہو گئی تھی۔

وقت کا پنچھی اپنی مخصوص رفتار سے چلتا رہا تقریباً ایک سال بعد شبانہ نے رضوانہ کو جنم دیا جب افسانہ نے ہوش سنبھالا تو اسے پتا چلا کہ اس کی ماں مر چکی ہے' اب آگے کی کہانی افسانہ کی زبانی سنیے۔

"تھانیدار صاحب! میں نے جب ہوش سنبھالا اور مجھے ساری بات کا پتا چلا تو میں نے سوچا کہ شکر ہے ڈیڈی کوئی غیر عورت نہیں لے کر آ گئے۔ میں مطمئن اور خوش تھی۔" وہ چند لمحے رکی اپنا سانس درست کیا اور بولی۔

"لیکن جس طرح کہتے ہیں جوں جوں کمبل گیلا ہوتا ہے اس کے وزن کا پتا چلتا ہے مجھے بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ احساس ہوتا گیا کہ میری خالہ (موجودہ سوتیلی ماں اور پھوپی) مجھے منحوس سمجھتے ہیں اور اپنی بھاوج بہن اور میری ماں کی موت کا مجھے ذمہ دار سمجھتے ہیں۔" یہاں آ کر اس کی آواز بھرا گئی' میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھ میں گزرے لمحوں کی یادیں پانی بن کر مچل رہی ہیں۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور دوبارہ گویا ہوئی۔ "مجھے زیادہ دکھ اس بنا پر ہے کہ میرے ابو نے اپنی محبت اور التفاؤ کا جھکاؤ رضوانہ کی طرف رکھا اور مجھے نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ اب یہی دیکھ لیں کہ ابو کے مرنے کے بعد مل کے معاملے میں رضوانہ سیاہ و سفید کی مالک تھی۔

میں بچپن سے محبت کو ترسی ہوئی تھی' میری زندگی میں صرف خزاں ہی خزاں تھی اچانک میرا کزن (پھوپی زاد) میری زندگی میں بہار بن کر آیا۔ اس نے مجھے اتنی محبت دی' اتنا پیار اور توجہ دی کہ میں ماضی کو بھول گئی لیکن اچانک یہ خبر کسی بم کی طرح میرے سر پر پھٹی کہ رضوانہ کی شادی پھوپی زاد سے ہو رہی ہے جب میں نے پھوپی زاد سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔

"میں امی کی وجہ سے مجبور ہوں تم بھی سب کچھ بھول جاؤ۔"

میں پاگل ہو گئی تھانیدار صاحب! میرے دماغ میں

صرف ایک بات آئی کہ رضوانہ میری خوشیوں کی قاتل ہے اور میں نے......" اتنا کہہ کر وہ رونے لگ گئی۔ کافی دیر بعد اس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کر دیئے اور بولی۔
"مجھے گرفتار کرلیں اور مجھے پھانسی سے کم سزا نہ دلوائیں۔"

سزا تو اس کو قانون کے مطابق ملنی تھی لیکن قارئین یقین جانئے مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی لیکن میں اپنے فرض سے مجبور تھا۔ قانون جذبات کو نہیں مانتا اس نے ایک انسان کی جان لی تھی میں اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

چلتے چلتے یہ بھی بتا تا چلوں کہ اس نے یہ سب کچھ کیسے کیا تھا جب اس کو پتا چلا کہ اس کی زندگی کی واحد خوشی بھی رضوانہ کی جھولی میں ڈالی جا رہی ہے تو وہ سراپا انتقام بن گئی۔ وہ اس قتل کو خودکشی کا رنگ دینا چاہتی تھی' اس نے خود ہی یہ کہانی مشہور کروادی کہ رضوانہ منیجر سے محبت کرتی تھی اور اس نے اس کا دل توڑ دیا تھا۔

وہ کوئی عادی مجرم یا قاتل تو تھی نہیں وقتی اشتعال سے مجبور ہو کر اس نے یہ سب کچھ کیا تھا۔ منیجر کی نوکری سے نکال دینے کی دھمکی دے کر اس بات پر مجبور کیا تھا کہ وہ وقتی طور پر منظر سے غائب ہو جائے اور اگر کبھی پولیس کے ہتھے چڑھ جائے تو یہی بیان دے کہ واقعی وہ اور رضوانہ محبت کرتے تھے لیکن جب رضوان نے اسے شادی کے لیے مجبور کیا تو اس نے صاف صاف بتا دیا کہ وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا' وہ بال بچے دار ہے لیکن جب اے ایس آئی شاہد اس کے گھر شیخوپورہ پہنچ گیا تو وہ پریشان ہو گیا اور گھبرا بھی گیا۔ اس نے اے ایس آئی کی منت کی کہ وہ یہاں زیادہ بات نہ کرے وہ اس کے ساتھ جانے کو تیار ہے پھر اس نے یہاں (تھانے) میں آ کر ہمیں حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ آپ نے وہ سوال و جواب بھی پڑھ لیے ہوں گے جو آفعہ (نوکرانی) سے ہوئے تھے۔

ایک بات جو میں نے اس وقت نہیں بتائی تھی وہ یہ ہے کہ جس رات یہ واردات ہوئی تھی' افسانہ نے آفعہ سے کہا تھا کہ رضوانہ مجھ سے اکھڑی اکھڑی رہتی ہے۔ آج چائے لے کر میں خود جاؤں گی۔ اس طرح اس نے جو خواب آور گولیوں کی بوتل خریدی تھی اس کی آدھی گولیاں چائے میں ملادی تھیں اور باقی آدھی بوتل صبح سرہانے کے نیچے رکھ دی جو چائے صبح آفعہ لے کر گئی تھی وہ صاف تھی۔

افسانہ نے اس بات کا بھی اقرار کیا تھا کہ اس کو سوٹ کیس کھولنے والے نمبروں کا پتا تھا' ایک دن اس نے موقع دیکھ کر منیجر (حمید) کی تصویر اور ڈائری (جو اس نے بازار سے خریدی تھی) سوٹ کیس میں رکھ دی تھی۔ تصویر اس نے منیجر سے حاصل کی تھی یہ سب بے وقوفی والی باتیں تھیں۔

ایک بات کی وضاحت نہیں ہو سکی تھی کہ رضوانہ نے یہ کیوں کہا تھا اپنی نوکرانی آفعہ سے کہ وہ بہت خوش ہے اس کی شادی اس کے محبوب سے ہو رہی ہے۔ کزن نے ایسی کسی بات سے لاعلمی ظاہر کی تھی اس بات کی وضاحت کے لیے رضوانہ دوبارہ اس دنیا میں نہیں آ سکتی تھی یہ قیاس ہی کیا جا سکتا ہے کہ ہو سکتا ہے وہ خاموش محبت کرتی رہی ہو اور اقرار کی نوبت ہی نہ آئی ہو۔ قارئین آپ کا کیا خیال ہے؟ جس شخصیت نے تفتیش کے لیے کہا تھا وہ افسانہ کی پھوپی تھی البتہ ایک بار ضرور پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔



آخری قسط

ھدف

نوشاد عادل

انسان کی زندگی کی اہمیت اب ہمارے ہاں سکہ سے بھی کم رہ گئی ہے اور اس کی وجہ حکمران ہیں جو اپنی حکومت بچانے اور پیسہ بنانے کے لیے معصوم جانوں سے کھیل کر عوام کو اس طرف الجھا دیتے ہیں اور خود بہت خاموشی سے اپنی چال چل جاتے ہیں۔ مگر ان کی یہی حرکات کئی موضوعات کو جنم دے کر انہیں پھنسا دیتے ہیں۔

نوشاد عادل نے معاشرے میں ہونے والی سرگرمیوں اور دہشت گردی پر بہت غوروفکر کے بعد قلم اٹھایا ہے۔

سیاسی جرائم نمبر کے لیے بطور خاص ایک چشم کشا تحریر جسے آپ نظر انداز نہیں کر سکیں گے۔

راستے میں اس نے کریم خان کا نمبر ملایا مگر اس کا فون سوئچ آف تھا۔ اعیان کی چھٹی حس کسی گڑبڑ کا احساس دلا رہی تھی۔

جس وقت اعیان نے کریم خان کو فون کرنے کے لیے موبائل جیب سے نکالا تھا اسی وقت اس نے اپنے موبائل پر ہانیہ کی گیارہ مس کالیں دیکھ لی تھیں مگر اس نے کال بیک اس لیے نہیں کیا کہ وہ تو جا ہی وہیں رہا تھا۔

جب کریم خان کا نمبر مسلسل سوئچ آف ملنے لگا تو اس نے رئیس علی نواز کے بنگلے پر موجود ایک سپاہی کا نمبر ڈائل کیا‘ جس نے بتایا کہ کریم خان ایک گھنٹہ پہلے گھر کے ایک ملازم سچل کے ساتھ کہیں گیا ہے۔

سپاہی سے بات کرتے ہوئے اعیان نے کریم خان کے گھر تک پہنچنے کے لیے چھبیس اسٹریٹ کا راستہ شارٹ کٹ کے لیے چنا تھا اور جب وہ نیلم کالونی والے چوراہے سے آگے پہنچا تو اسے ایک گلی میں کریم خان کی کار کھڑی نظر آئی۔ اس نے برابر میں لا کر اپنی کار روکی اور اتر ہی رہا تھا کہ اس کے موبائل پر پھر ہانیہ کا نام چمکنے لگا۔ اعیان نے کال ریسیو کر کے ہانیہ کو کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر کہا۔ ’’ہانی ابھی میں بہت مصروف ہوں۔ بعد میں بات کرتا ہوں۔‘‘ اور اس نے کال کاٹ دی۔

اعیان نے کریم خان کی کار میں جھانکا‘ وہ خالی تھی۔ کار کو چیک کرنے کے بعد اعیان اسی گلی میں آگے بڑھتا گیا۔ گلی میں کئی چھوٹے بڑے گھر تھے۔ وہ کنفیوز ہو رہا تھا کہ کریم خان یہاں کس گھر میں آیا ہوگا۔ اس نے دیکھا کہ ایک بچہ گلی میں پتنگ اڑانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اعیان نے اس کی پتنگ کو پکڑ کر درکائی دی اور بچے سے پوچھ تاچھ کی تو بچے نے ایک گھر کی طرف اشارہ کیا اور جلدی سے وہاں سے بھاگ گیا‘ جیسے اس ڈر ہو کہ اس کو مخبری کی سزا مل سکتی ہے۔

سامنے ہی ایک گھر کا دروازہ تھا جو کھلا ہوا تھا۔ اعیان نے دروازے کو ہلکے سے دھکا دیا اور اندر داخل ہوگیا۔ یہ دو کمروں کا ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا جبکہ دوسرے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اعیان نے پہلے اس کمرے کو چیک کیا جس کا دروازہ بند تھا‘ مگر وہاں کچھ نہیں ملا تو وہ دوسرے کمرے کی طرف بڑھا‘ اس کمرے کا تقریباً پورا فرش خون میں نہایا ہوا تھا۔

اعیان کمرے میں داخل ہوگیا۔ سامنے والی دیوار پر خون سے کچھ لکھا ہوا تھا۔ اعیان اسے پڑھنے لگا۔



''کریم خان کی لاش کو ریڑھی گوٹھ والی جھاڑیوں کے جنگل سے لے آنا۔''

یہ پڑھ کر اعیان آنکھیں بند کر کے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے فرش پر بیٹھتا چلا گیا اور وہ کافی دیر تک ایسے ہی بیٹھا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ الگ کرتے ہوئے آنکھیں کھولیں۔ اس کی دونوں آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ چہرہ جذبات اور غصے کی شدت سے تمتما رہا تھا اور اس کے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔

وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ اس کے موبائل پر پھر سے ہانیہ کی کال آنے لگی۔

''تمہیں ایک بار سمجھ میں نہیں آتا کیا۔ کیوں بار بار کال کر رہی ہو؟'' اعیان نے غصے سے چیختے ہوئے کہا۔

''میں نے تو یہ جاننے کے لیے کال کی تھی کہ تم کہاں ہو۔'' اعیان کے غصے سے ہانیہ ڈر سی گئی تھی۔ وہ مری مری آواز میں بولی۔

''یہ پوچھنے والی' تم ہوتی کون ہو۔'' اعیان نے ایک دم سے اس کے سارے حق چھینتے ہوئے کہا۔

''میں...... میں...... میں۔'' ہانیہ سے جواب دیتے نہیں بن رہا تھا۔ وہ اعیان کے اس اچانک رویے پر بوکھلا کر رہ گئی تھی۔

''اپنی حد میں رہو اور زیادہ سر پر چڑھنے کی کوشش مت کرو۔ ورنہ بہت برا ہو گا۔'' اعیان غصے میں جانے کیا کیا بک رہا تھا۔

''اعیان۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں نے کون سی حد پار کی ہے۔'' ہانیہ صدمے کی سی حالت میں تھی۔

''دماغ خراب مت کرو۔'' اعیان نے اسے ایک گالی دے کر خود ہی حد پار کر لی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے غم اور غصے کی وجہ سے اس کے دماغ نے کام کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

''کک...... کیا کہا۔ تم نے۔'' ہانیہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اعیان نے اسے گالی دی ہے۔

''سالی بہری ہے کیا؟'' اس وقت اعیان پاگل سا لگ رہا تھا۔ وہ ہانیہ کو گالیاں بکے جا رہا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ اس کی اس بکواس کا ہانیہ کے دل پر کیا اثر ہو گا۔ مگر سوچتا تو وہ تب' جب اس کا دماغ اس کے قابو میں ہوتا۔ اس وقت تو اسے کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔ کریم خان کی لاش کے ذکر نے جیسے اس کے تمام حواس چھین لیے تھے۔

''اگر میں ایسی ہی بری لڑکی ہوں تو تم نے مجھ سے محبت کیوں کی؟''

''چپ کر سالی۔ کیا محبت محبت لگا رکھی ہے۔ کون کرتا ہے تم سے محبت۔ میں اور محبت۔ وہ بھی تم جیسی پاگل سے۔ کبھی نہیں۔ جاؤ اپنے دماغ کا علاج کرواؤ۔'' اعیان چیخ کر بول رہا تھا۔ لگتا تھا وہ کریم خان کے صدمے کا غصہ ہانیہ پر اتار کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر رہا تھا۔

''مجھے نفرت ہو چلی ہے تم سے۔ امی۔ اعیان۔'' ہانیہ نے روتے ہوئے لائن کٹ کر دی۔

ہانیہ کی کال ختم ہوتے ہی اعیان نے اپنا موبائل پوری طاقت سے سامنے والی دیوار پر دے مارا اور موبائل ٹوٹ کر ٹکڑوں کی شکل میں کمرے میں بکھر گیا۔ وہ باہر نکلا اور تھوڑی ہی دیر میں اس کی کار ریڑھی گوٹھ کے جھاڑیوں والے جنگل کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔

❀......۞......❀

''کیا ہوا ہانی۔ کیوں رو رہی ہو۔'' ہانیہ کے رونے کی آواز سن کر ثوبیہ نے اس کے کمرے میں آتے ہوئے پوچھا۔ جہاں ہانیہ اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے بری طرح روئے جا رہی تھی۔

''کک...... چچ...... کچھ...... چچ...... کچھ نہیں...... چچ چچ۔'' ہانیہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی اور اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔

''ارے بابا' بتاؤ نا کیا ہوا؟'' ثوبیہ نے بڑے پیار سے کہا اور آگے بڑھ کر ہانیہ کو گلے سے لگا لیا۔

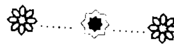
ثوبیہ کے گلے سے لگتے ہی ہانیہ ٹوٹ گئی اور روتے روتے سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

''ارے پاگل۔ تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔'' ثوبیہ نے چین کی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ہانیہ کو اس طرح روتے دیکھ کر وہ گھبرا گئی تھی۔ ''ارے بابا تم جانتی ہو کہ اعیان کو مذاق کرنے کی بڑی گندی عادت ہے۔ وہ ضرور مذاق کر رہا ہوگا۔'' ثوبیہ نے اپنی انگلیوں سے ہانیہ کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

ثوبیہ کی بات پر ہانیہ نے اسے ایسا دیکھا جیسے اس کی بات پر بالکل نہ آیا ہو وہ چلا کر بولی۔ ''نہیں۔ نہیں۔ وہ سب مذاق نہیں تھا۔'' روتے روتے ہانیہ کا گلا بیٹھ چکا تھا۔ اس لیے اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکل رہی تھی۔

''ارے یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اعیان تو اس سے بھی زیادہ گندے گندے مذاق کرتا رہتا ہے۔ جس کا شکار اکثر ہم سب ہوتے ہیں۔ وہ ایسا ہی ہے۔ تم اس کی باتوں کو دل پر مت لو۔ آنے دو اسے۔ کان پکڑ کر معافی منگواؤں گی تم سے۔ تم سفر میں تھک گئی ہوگی' چلو تھوڑا آرام کرلو۔'' ثوبیہ نے کہا اور اسے تسلی دے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

ہانیہ لیٹ کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ کافی دیر تک وہ کچھ سوچتی رہی' پھر ایک فیصلہ کر کے اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ جیسے ہی اس کی پلکیں بند ہوئیں' اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹوٹ کر اس کے گالوں پر بہہ نکلے۔



اعیان کی کار گولی کی سی تیزی سے ریڑھی گوٹھ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ اس وقت غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا اور اس غصے کی حالت میں اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی معدوم ہو چکی تھی۔

کریم خان اور اعیان کی دوستی بے مثال تھی۔ وہ دونوں ہر دم ایک دوسرے پر جان نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ اگر اس وقت اعیان کی جگہ کریم خان ہوتا اور اسے پتہ چلتا کہ اعیان مر چکا ہے تو وہ بھی دیوانہ ہو چکا ہوتا۔ بس فرق اتنا ہوتا کہ اس نے اپنے ہوش و حواس غصے کی بجائے غم اور دکھ کی وجہ سے کھوئے ہوتے۔

کچھ ہی دیر میں وہ ریڑھی گوٹھ کے قریب جھاڑیوں کے جنگل میں داخل ہو چکا تھا۔ جنگل میں راستے کے بیچوں بیچ ایک کار کھڑی تھی۔ جس میں خون سے سنی کریم خان کی شرٹ ٹنگی ہوئی تھی۔ جس نے اعیان کو کار روکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

وہ اپنی کار سے اتر کر تیزی سے اس کار تک پہنچا۔ کار کے دروازے لاک نہیں تھے۔ اس نے کھول کر دیکھا' پچھلی سیٹ خون سے تر تھی۔ وہ ابھی کار دیکھنے میں مصروف ہی تھا کہ ٹھیک اسی وقت جنگل کے اندرونی حصے سے اسے گولی چلنے کے ساتھ کسی کے بہت زور سے چلانے کی آواز آئی۔

اس آواز کا اعیان کے کانوں میں پڑنا تھا کہ وہ پاگلوں کی طرح اس سمت دوڑنے لگا' جدھر سے گولی اور کسی کے چلانے کی آواز آئی تھی۔

اس وقت وہ اپنے حواس میں نہیں تھا۔ ورنہ وہ ایسی بے وقوفی کبھی نہ کرتا۔ دیوار پر خون سے پیغام لکھ کر جنگل میں بلانا۔ کار کا راستے کے بیچوں بیچ کھڑا ہونا۔ کار کی کھڑکی سے کریم خان کی شرٹ کا ٹنگا ہونا اور اس کے بعد گولی چلنے اور کسی کا چلانا۔ یہ سب عوامل کسی سازش کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔

یہ اس بات کا بھی اشارہ تھا کہ کوئی اسے اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتا ہے۔ چونکہ اعیان اپنے آپ میں نہیں تھا اس لیے وہ بے خود سا ان اشاروں پر ناچ رہا تھا۔

وہ اندھا دھند بھاگ رہا تھا کہ اس کا پیر کسی جنگلی بیل میں الجھا اور وہ موٹے موٹے کانٹوں والی جھاڑی پر گرا۔ موٹے اور لمبے نوکیلے کانٹے اس کے جسم میں گھستے چلے گئے اور درد کی ایک لہر اس کے پورے بدن میں دوڑ گئی۔

مگر وہ اپنے درد پر قابو پاتے ہوئے اٹھا اور دوبارہ دوڑنے لگا۔ مگر اب اس کی رفتار میں وہ پہلے کی سی تیزی بہت کم ہوچکی تھی۔ کیونکہ ایک تو اس کی اپنی جسمانی اور ذہنی حالت اوپر سے جھاڑیاں بھی بہت گھنی ہو چلی تھیں۔ اتنی گھنی کہ دن میں بھی نیم اندھیرا سا ہو چلا تھا۔ دوسرے یہ کہ جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ جنگلی بیلوں کا بھی ایسا جال پھیلا ہوا تھا کہ آدمی بہت احتیاط سے اور بہت سنبھل سنبھل کر نہ چلے تو بیلوں میں الجھ کر گر پڑے اور گرنے کا مطلب کانٹوں کا شکار ہونا لازمی امر تھا۔

اعیان نے اپنی رفتار بڑھانی چاہی تو وہ پھر الجھا' پھر گرا اور ایسا بار بار ہوتا رہا۔

بار بار کانٹوں پر گرنے سے اعیان کا بدن بری طرح چھلنی ہو رہا تھا اور اس کے کپڑے خون میں تر ہو رہے تھے اور ناقابلِ برداشت تکلیف اس کے پورے بدن میں پھیلنے لگی تھی' جس سے اس کی جسمانی طاقت میں بھی کمی آتی جا رہی تھی۔

مگر اس پر نہ جانے کیسی دیوانگی سوار تھی کہ وہ کسی بات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ بلکہ گر گر کر بڑھ رہا تھا کہ اسی وقت ایک اور گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔

آواز اعیان کے داہنی طرف سے آئی تھی۔ اعیان فائر کی سمت مڑنے ہی والا تھا کہ اسے ایسا لگا جیسے اس سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر کوئی ہے جو ایک پیڑ کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اعیان اسی طرف بھاگا۔ اعیان کو دیکھ کر پیڑ کے پیچھے چھپے ہوئے آدمی نے بھاگنے کی کوشش کی' مگر اس کی قسمت خراب تھی۔ اس نے مشکل سے تین چار قدم ہی بڑھائے ہوں گے کہ اس کا پیر ایک جنگلی بیل میں الجھا اور وہ چیخ مارتا ہوا منہ کے بل گرا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔

آدمی اٹھا لیکن اس کا پیر بہت بری طرح بیل میں الجھا ہوا تھا۔ وہ جھک کر بیل کو اپنے پیر سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا اور ساتھ ساتھ اعیان کے روپ میں اپنی طرف بڑھتی موت کو بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ جوں جوں اعیان اس کے قریب پہنچ رہا تھا اس کا چہرہ خوف کے مارے کاغذ کی طرح سفید ہوتا جا رہا تھا۔

اعیان اس کے بہت قریب آ چکا تھا کہ زندگی نے اس آدمی کا ذرا سا ساتھ دیا اور اعیان بھی اپنا پیر بیل میں الجھنے کی وجہ سے اس آدمی سے دو قدم پہلے نیچے گر گیا۔ اعیان نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ کسی اژدھے کی طرح رینگتے ہوئے اس آدمی طرف بڑھا۔ آدمی کا ایک پیر تو بیل میں الجھا ہوا تھا اس نے اپنا دوسرا پاؤں اعیان کے سر پر مارنا چاہا۔

اعیان نے اس کا پاؤں پکڑ لیا اور تیزی سے اٹھ کر اسے گھمایا۔ پاؤں میں پھنسی بیل ٹوٹ گئی اور وہ آدمی چاروں طرف گھومنے لگا اور ہر طرف پھیلی ہوئی کانٹے دار جھاڑیوں نے اس کا لباس تار تار کر دیا اور بدن پر جا بجا کانٹوں کی خراشیں ابھرنے لگی تھیں اور اس کا سر زناٹے کے ساتھ اس پیڑ کے تنے سے ٹکرایا جس کے پیچھے وہ چھپا ہوا تھا۔ جنگل میں اس کی دردناک چیخ گونج اٹھی۔

اس آدمی کا پاؤں ابھی بھی اعیان کے ہاتھوں میں تھا۔ جس درخت سے آدمی کا سر ٹکرایا تھا اس کے برابر میں ایک سوکھا ہوا درخت تھا جس میں سوکھی اور نوکیلی شاخیں نکلی ہوئی تھیں۔ اس بار اعیان نے اسے پوری طاقت سے اس سوکھے درخت پر دے مارا اور ایک نوکیلی شاخ اس آدمی کے سینے کو چیرتی ہوئی پیٹھ سے پار ہوگئی۔ اس نے ایک دل ہلا دینے والی چیخ ماری اور جہنم کے سفر پر روانہ ہوگیا۔

اعیان اس وقت غصے کی حالت میں جانور بن چکا تھا۔ اس نے مرنے کے بعد بھی اس آدمی کو نہیں بخشا۔ اس نے آدمی کو اوپر اٹھایا اور دوبارہ نوکیلی شاخ پر دے مارا اور ٹھیک اسی وقت ایک لات اعیان کی کمر پر پڑی اور وہ

نیچے گر گیا۔ اس کی پنڈلی میں کوئی نوکیلی چیز اندر تک دھنستی چلی گئی۔

اعیان نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پانچ افراد خونخوار نظروں سے اسے گھور رہے تھے۔ اعیان خود کو سنبھال کر کھڑا ہوا۔ اس کی پنڈلی میں کلہاڑی گھسی ہوئی تھی۔ یہ کلہاڑی کسی نے جان بوجھ کر اسے نہیں ماری تھی۔ بلکہ یہ شاید کسی لکڑہارے کی تھی، جو وہ یہاں بھول گیا ہوگا اور گرنے کی وجہ سے اس کا پھل اوپر کو اٹھا اور اعیان کی پنڈلی میں دھنس گیا تھا۔ اعیان نے کھینچ کر کلہاڑی کو اپنی پنڈلی سے نکالا تو خون تیزی سے بہنے لگا۔

اعیان کلہاڑی لے کر ان پانچوں کی طرف بڑھا۔ ان سے ایک نے جلدی سے ریوالور نکال کر اس کا رخ اعیان کی طرف کرتے ہوئے ٹرائیگر دبانا چاہا۔ مگر کلہاڑی اس کے ہاتھ پر پڑی اور اس کا ہاتھ کٹ کر دور جا گرا۔ اس سے پہلے کہ باقی کے چار اعیان پر حملہ آور ہوتے۔ اعیان ہی پہل کرتے ہوئے ان پر ٹوٹ پڑا۔ کلہاڑی کا وار ایک کی گردن پر پڑا اور گردن دھڑ سے الگ ہو کر زمین پر جا گری۔

باقی تینوں کے پاس ریوالور تھے۔ مگر اعیان نے کسی کو بھی ریوالور استعمال کرنے کا موقع نہیں دیا اور وہ بھی اعیان کے طوفانی حملے سے بوکھلا کر رہ گئے تھے اور ان کی بوکھلاہٹ کا فائدہ اٹھا کر اعیان نے ان کو بھی دنیا کے جھمیلوں سے چھٹکارا دلا دیا۔

ان چاروں کو ختم کرنے کے بعد اعیان کلہاڑی لے کر اس آدمی کی طرف بڑھا جس کا اس نے سب سے پہلے ہاتھ کاٹا تھا۔ اعیان کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ آدمی چلانے لگا۔ ”مجھے مت مارو۔ کریم خان مرا نہیں۔ زندہ ہے۔“

اعیان کے بڑھتے ہوئے قدم خود کار نظام کے تحت رک گئے۔ ”کریم خان زندہ ہے۔ تم نے اسے کہاں رکھا ہے؟“

اس آدمی نے اعیان کو بتا دیا۔

”تم لوگوں نے مجھے جنگل میں کیوں اور کس کے کہنے پر بلایا تھا؟“ اعیان نے پوچھا۔

”تمہاری بے بسی کا مزا لینے کے لیے۔ ہم خود ہی تمہیں یہاں تک لائے تھے۔ مگر یقین کرو۔ ہم تمہیں نقصان......“

اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات پوری کرتا۔ اعیان کا ہاتھ حرکت میں آیا اور اس کا سر جسم سے الگ ہو کر لڑھک گیا۔



”رانی بیٹا۔ میں ایک دوست کے پاس جا رہا ہوں۔ واپسی میں شاید دیر ہو جائے۔ تم ڈنر پر میرا انتظار مت کرنا۔“ بڑے پاپا نے رانی سے کہا۔

”ٹھیک ہے بڑے پاپا۔“ رانی نے جواب دیا اور بڑے پاپا مسکراتے ہوئے باہر چلے گئے۔

بڑے پاپا کے جانے کے بعد رانی چھت پر آ گئی اور یونہی آس پاس کے گھروں میں نظر دوڑانے لگی۔ ان میں سے ایک گھر پر جا کر اس کی نظر رک گئی۔ جس میں اس کا بچپن گزرا تھا۔ وہاں کے چپے چپے پر اس کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ اپنے گھر پر نظریں جمائے وہ ماضی میں بہت دور پہنچ گئی۔

”بھائی ممی پاپا کہاں ہیں۔“ اسکول سے واپسی پر رانی نے ممی پاپا کو گھر پر موجود نہ پا کر اپنے بھائی سے پوچھا۔

”تمہیں معلوم ہے کہ آج وہ دونوں کہاں گئے ہیں۔“ بھائی نے شرارتی لہجے میں جواب دیا۔

”نہیں تو۔“

”گیس کرو۔“

”مجھے بہت تیز بھوک لگ رہی ہے۔ بتانا ہے تو جلدی بتاؤ۔ ورنہ میں تو جا رہی ہوں کھانا کھانے۔“ رانی تنگ کر بولی۔

”وہ دونوں آج ایک ساتھ شاپنگ کرنے گئے ہیں۔“

''واؤ۔آج تو کمال ہوگیا'' رانی حیرت سے بولیاور حیرانی کی بات بھی تھی۔ کیونکہ پاپا کو شاپنگ کرنا بالکل بھی پسند نہیں تھا۔ پاپا کی شاپنگ بھی ممی ہی کرتی تھیں۔ ہر دوسرے دن اس بات کو لے کر ممی پاپا کے درمیان نوک جھوک ہوتی رہتی تھی۔ آج بھی ممی یقیناً زبردستی پاپا کو شاپنگ کے لیے لے گئی ہوں گی۔

دونوں بہن بھائی ٹی وی آن کر کے کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ٹی وی پر خبریں آ رہی تھیں۔

''ابھی ابھی ایک معروف شاپنگ سینٹر میں پولیس اور ڈاکوؤں کے درمیان فائرنگ کے تبادلے میں پانچ معصوم لوگ اپنی جانیں گنوا بیٹھے۔''

ٹی وی پر مرے ہوئے لوگوں کی لاشیں دکھائی جا رہی تھیں۔لاشیں دیکھ کر دونوں بہن بھائی کی چیخ نکل گئی۔ کیونکہ مرنے والوں میں ان کے ممی پاپا بھی شامل تھے۔

رانی کے موبائل پر بجنے والی بیل اسے ماضی کے جھروکوں سے واپس کھینچ لائی۔ بیتا ہوا وقت یاد کرتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھیں پونچھیں اور موبائل کی اسکرین پر دیکھا۔ کال ثوبیہ کی تھی۔

''جی بھابھی۔کیسے یاد کیا؟''

''رانی غضب ہوگیا ہے۔ ہانی شام کو پارک میں گھومنے گئی تھی۔ دو گھنٹے سے اوپر گزرنے کے بعد بھی وہ نہیں لوٹی تو میں اسے ڈھونڈنے گئی۔ مگر وہ وہاں نہیں تھی۔لوگ کہہ رہے ہیں کہ کچھ لوگ ایک لڑکی کو زبردستی کار میں ڈال کر لے گئے ہیں۔ کریم اور اعیان کا نمبر سوئچ آف ہے۔ میں کیا کروں' کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ پتہ نہیں وہ لوگ کون تھے اور ہانی کو کیوں اغوا کیا گیا ہے۔'' ثوبیہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔

''بھابھی' میں وہیں آ رہی ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا'' رانی نے جواب دیا۔



اعیان کی حالت بہت خراب تھی۔کانوں سے اسے جو زخم آئے تھے ان سے خون نکلنا تو اب بند ہوگیا تھا مگر کلہاڑی سے اس کی پنڈلی میں بہت گہرا زخم آیا تھا۔ جس سے ابھی بھی کافی خون بہہ رہا تھا۔

اعیان نے ان لوگوں میں سے ایک کی شرٹ پھاڑ کر اپنے زخم پر باندھی اور سڑک کی طرف چلنے لگا۔اسے قدم اٹھانے میں بھی بہت دقت ہو رہی تھی۔

اسے اپنی کار تک پہنچنے کے لیے اچھا خاصا راستہ طے کرنا تھا۔مگر اس کا جسم اس کا ساتھ نہیں دے پا رہا تھا۔ اس کی چال دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے اب گرا کہ تب گرا۔

کسی نہ کسی طرح خود کو کھینچتے ہوئے اعیان اپنی کار تک پہنچا اور ہاتھ کٹنے والے شخص کے بتائے ہوئے پتے پر روانہ ہوگیا۔آتے وقت اس نے اس کی جیب سے مذکورہ مکان کی چابی بھی نکال لی تھی۔

اعیان نے بتائے ہوئے مکان پر پہنچ کر تالا کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ایک کمرے میں اسے کریم خان اس حالت میں بیڈ پر پڑا ہوا ملا کہ اس کے ہاتھ پاؤں اور منہ بندھا ہوا تھا۔

اعیان کو دیکھ کر کریم خان کے چہرے پر چمک سی آ گئی۔مگر جب اس نے اعیان کی حالت کا جائزہ لیا تو اس کے چہرے کی چمک ماند پڑنے لگی۔ اعیان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ یہاں تک صرف اپنی قوتِ ارادی اور دوستی کے جذبے کے تحت پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح کانپتے ہاتھوں سے کریم خان کی بندشیں کھول دیں۔

ہاتھ کھلتے ہی کریم خان نے اپنے منہ پر بندھی ہوئی پٹی کھولی اور فکرمندی سے بولا۔''اعیان۔تمہاری یہ حالت کیسے ہوئی؟''

''میری بات۔ہانی۔سے۔کر۔کرواؤ'' اعیان اپنی بات پوری نہیں کر سکا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔



انیتا تفتیش کے لیے ظریف چوہدری کے گھر گئی تھی۔ وہاں ڈرائنگ روم میں اس نے ظریف کی تصویر دیکھی تو اسے ایسا لگا جیسے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

انیتا یاد کرنے لگی تو اسے میکس کی بات یاد آئی۔ اس نے اعیان کو بتایا تھا کہ بند فیکٹری میں دیکھے گئے آدمی کی شکل ظریف چوہدری سے ملتی تھی۔ انیتا نے اپنی جیب سے میکس کا موبائل نکالا جس میں اس کے ساتھیوں کی تصویریں تھیں۔ ان میں سے ایک اسی لمبے آدمی کی بھی تھی۔ انیتا اس تصویر کا ظریف چوہدری کی تصویر سے موازنہ کرنے لگی۔ دونوں میں بہت زیادہ مشابہت تھی۔ انیتا کو شک ہونے لگا اور اس نے باتوں باتوں میں مسز ظریف سے پوچھا تو اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ ظریف چوہدری کی کلائی پر بھی سات کا عدد گدا ہوا ہے تو اس کا شک یقین میں بدل گیا۔

اور اب اسے یہ بھی یقین ہو رہا تھا کہ ظریف چوہدری کا اغوا محض ایک ڈرامہ ہے۔ اس نے خود پر سے پولیس کا دھیان ہٹانے کے لیے یہ چال چلی تھی۔ انیتا نے ظریف کے گھر اور فیکٹری پر پولیس تعینات کر دی اور ہر وہ جگہ جہاں اس کے پائے جانے کا شبہ ہوسکتا تھا' وہاں بھی سپاہیوں کو نگرانی پر لگا دیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ مسز ظریف اور اس کے قریبی ملنے جلنے والوں سے کڑی تفتیش کروانے لگی۔



رانی نہایت تیزی سے کار دوڑاتی ہوئی کریم خان کے گھر پہنچی۔ ثوبیہ گھر کے باہر ہی بے صبری سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک خاتون اور بھی کھڑی تھی۔

ابھی رانی کار سے اتری ہی تھی کہ ثوبیہ اس کے پاس پہنچ گئی۔ رانی نے اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''بھابھی۔ آپ سے کن لوگوں نے کہا ہے کہ ہانیہ کو غنڈے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ مجھے ان سے ملنا ہے۔''

''آؤ ملواتی ہوں۔'' ثوبیہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسی خاتون کی طرف چل دی جس کے ساتھ وہ کھڑی تھی۔

''آپ کے پاس ہانیہ کی فوٹو ہوگی؟''

''فوٹو۔ ہاں ہے۔ ایک فوٹو تو آج ہی کی ہے۔ آج وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی تو میں نے اس کی ایک فوٹو کھینچ لی تھی۔'' ثوبیہ نے موبائل میں ہانیہ کی فوٹو اوپن کرتے ہوئے کہا اور موبائل رانی کے ہاتھ میں دے دیا۔

رانی نے ہانی کی تصویر دیکھی۔ واقعی ہانیہ بہت خوبصورت تھی۔

''آنٹی کیا یہ وہی لڑکی ہے جسے غنڈے اٹھا کر لے گئے تھے؟'' اس خاتون کے قریب آ کر رانی نے انہیں موبائل ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔ یہ وہ لڑکی نہیں ہے۔''

''ٹھیک سے دیکھیے۔''

''ارے ٹھیک سے ہی دیکھ رہی ہوں۔ اس لڑکی کا چہرہ تو ایک فیصد بھی اس تصویر سے میل نہیں کھا رہا۔''

ایک دو منٹ اور باتیں کرنے کے بعد وہ خاتون اپنے گھر چلی گئی۔ پھر رانی کے کہنے پر ثوبیہ نے اسے دو تین اور لوگوں سے ملوایا جنہوں نے ایک لڑکی کے اغواء کے بارے میں اسے بتایا تھا۔ سب کا جواب یہی نکلا کہ وہ لڑکی ہانیہ نہیں تھی۔

''آخر ہانیہ گئی تو گئی کہاں۔ وہ تو یہاں کسی کو جانتی بھی نہیں۔ میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے۔ کہیں اس کے ساتھ کچھ غلط نہ ہو جائے۔ اس شہر میں ویسے بھی آج کل جانے کیا کیا انہونیاں ہو رہی ہیں۔'' ثوبیہ کے چہرے پر ہانیہ کے لیے پریشانی اور فکرمندی جھلک رہی تھی۔

''بھابھی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ ہانیہ شاید اعیان کے ساتھ باہر گئی ہوگی۔'' رانی نے اس کی پریشانی کم کرنے کے لیے کہا۔

''اگر ایسا ہوتا تو وہ کم از کم مجھے بتا کر تو جاتی۔'' ثوبیہ کی بات بھی صحیح تھی۔

اسی وقت ثوبیہ کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے دیکھا کال کسی نئے نمبر سے آ رہی تھی۔

''ہیلو'' دوسری طرف سے کریم خان کی آواز آئی۔

''کہاں ہو تم اور تمہارا موبائل کیوں سوئچ آف ہے۔ جلدی گھر آؤ۔''

''سٹی اسپتال میں ہوں۔ کیا ہوا۔ تم پریشان سی لگ رہی ہو۔''

''سٹی استپال۔ اسپتال میں کیا کر رہے ہو؟'' ثوبیہ کی پریشانی اور بڑھ گئی۔

''اعیان یہاں ایڈمٹ ہے۔ اسی کے پاس ہوں۔''

''کیا۔ کیا ہوا اعیان کو؟'' یہ سن کر رانی کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔

''شدید زخمی ہے۔ یہ سب کیسے ہوا معلوم نہیں۔''

''او مائی گاڈ۔ میں ابھی اسپتال آ رہی ہوں۔''

''آ جاؤ۔'' کریم خان نے کہا اور لائن کاٹ دی۔

اعیان کے زخمی ہونے کا سن کر ثوبیہ کریم خان کو ہانیہ کے بارے میں بتانا بھی بھول گئی تھی۔

''کیا ہوا؟'' رانی نے بے تابی سے پوچھا۔

''اعیان بھائی سٹی اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔'' ثوبیہ نے کہا۔

باتیں کرتے ہوئے دونوں گھر کے اندر آ گئیں۔

جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئیں فیضی خوشی سے ''ممی ممی'' چلاتا ہوا رانی سے آ کر لپٹ گیا۔

رانی نے فیضی کو باہوں میں بھر لیا۔ رانی نے فیضی کو جنم تو نہیں دیا تھا لیکن اس نے اس بن ماں باپ کے بچے کی ایک ماں کی طرح ہی پرورش کی تھی۔ اس نے پیار سے فیضی کے گالوں کو چومتے ہوئے پوچھا۔ ''کیسا ہے میرا راجہ بیٹا۔''

''بہت بہت اچھا۔ پاپا کہاں ہیں۔'' فیضی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''پاپا آپ کو اپنے پاس بلا رہے ہیں۔ چلو پاپا کے پاس چلتے ہیں۔''



ظریف کی کار اس بنگلے میں داخل ہو رہی تھی جس میں اس نے کچھ دن پہلے زاہد علی کو قید کر رکھا تھا۔

کار سے اتر کر ظریف اسی کمرے میں آیا جہاں وہ اپنی انگوٹھی سوئچ بورڈ پر لگا کر راستہ کھولتا تھا۔ کچھ لوگ سوچتے تھے کہ کیا یہ کوئی جادوئی انگوٹھی ہے جس کے بورڈ پر لگاتے ہی فرش اپنی جگہ سے ہٹ کر نیچے جانے کا راستہ بنا دیتا ہے۔ ایسا کچھ نہیں تھا۔ دراصل یہ سارا گھر ایک کمپیوٹر آپریٹ کرتا تھا۔ جس کے کچھ فنکشن کو اس ریموٹ جیسی ڈیوائس جو کہ ظریف کی جیب میں رہتی تھی اور وہ انگوٹھی جو وہ اپنی انگلی میں پہنے رہتا تھا' ان سے استعمال کیا جا سکتا تھا۔

ظریف نے انگوٹھی کو ایک مخصوص جگہ پر لگایا اور ہلکی سی آواز کے ساتھ کمرے کا فرش بیچ سے پھٹا اور کچھ اندھیری اور کچھ روشن سیڑھیاں نظر آنے لگیں اور ظریف کے قدم ان سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

اوہ گڑبڑ ہو گئی۔ ایک بات تو میں آپ سب کو بتانا ہی بھول گیا اور آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ کیسا گھامڑ رائٹر ہے۔ پھر آپ نے بھی تو یاد نہیں دلایا۔ خیر چلیں کوئی بات نہیں۔ ابھی بھی کوئی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ اب بتا دیتا ہوں۔ جو شاید آپ میں سے کسی کسی نے ہی نوٹ کی ہوگی یہ بات۔

جن کو پچھلی اقساط یاد ہوں گی ان کے دماغ میں یہ بات چل رہی ہوگی کہ ظریف کو تو دن دھاڑے کچھ غنڈوں نے اغواء کر لیا تھا۔ پھر یہ کھلے سانڈ کی طرح آزاد کیسے گھوم رہا ہے۔ اگر یہ اغوا کاروں کی قید سے آزاد ہوا تو کب اور کیسے؟

ارے ارے میرے یاد دلاتے ہی دماغ کلبلانے لگا نا۔ بڑی بے صبری ہو رہی ہے نا جاننے کی۔ بتاتا ہوں بھائی بتاتا ہوں' ذرا سانس تو لینے دو۔

صبح جب ظریف اپنے گھر سے نکلا تھا تو اس نے ایک ہیلمٹ پہنے آدمی کو اپنے بنگلے سے ٹھیک پیچھے بنگلے کے سامنے کھڑی بائیک پر بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ ظریف کے شیطانی دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔ مگر وہ اپنے چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر اپنی بی ایم ڈبلیو میں بیٹھا اور آگے بڑھ گیا۔ اس نے اپنی کار کے بیک ویو مرر میں دیکھ لیا کہ اس کے آگے بڑھتے ہی بائیک سوار نے بھی اپنی بائیک اسٹارٹ کر کے اس کے پیچھے ڈال دی تھی۔

اپنی فیکٹری میں داخل ہونے تک ظریف نے اس بائیک پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ جو مسلسل اس کا پیچھا کر رہی تھی۔

فیکٹری میں آتے ہی ظریف نے پہلا کام وہی کیا جو اس صورت حال میں کوئی دوسرا کرتا۔ اس نے اپنے آدمیوں سے پتہ کروایا۔ جس سے معلوم ہوا کہ سب انسپکٹر سرفراز' ظریف پر نظر رکھ رہا ہے اور اس وقت بھی شاید سرفراز اس فیکٹری کے آس پاس کہیں رک کر ظریف کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہا ہے۔

ظریف کو یہ بات سمجھنے میں ذرا سی بھی دیر نہیں لگی کہ اعیان کو اس پر شک ہو چکا ہے۔ اس لیے سرفراز کے ذریعے اس کی نگرانی کروائی جا رہی ہے۔ اب ظریف کو کچھ ایسی پلاننگ کرنی تھی کہ اعیان کا شک اس پر سے خود بخود ہٹ جائے۔

اس نے باس کے روپ میں اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ ظریف چوہدری کو اغوا کر کے شہر سے باہر واقع ان کے اڈے کے کمرہ نمبر تین میں پہنچا دیا جائے اور اس کے گھر فون کر کے تاوان طلب کیا جائے اور جیسا اس نے حکم دیا تھا اس کے آدمیوں نے ویسا ہی کیا۔

ظریف نے خود کو کمرہ نمبر تین میں اس لیے قید کروایا تھا کہ اس کمرے میں ایک خفیہ راستہ تھا' جس کے بارے میں اسٹار کے علاوہ خود اسی کو پتہ تھا۔ اسی خفیہ راستے کے ذریعے وہ باہر نکل آیا تھا۔ باہر آ کر اس نے جگہ چھپائی ہوئی کار کے ڈیش بورڈ سے موبائل نکال کر اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ پولیس کو ان کے اس اڈے کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے اس لیے وہ سب فوراً وہاں سے نکل جائیں' رہا ظریف چوہدری تو اسے وہ خود نکال لے گا۔ جیسے ہی تاوان کی رقم مل جائے گی ظریف کو اس کے گھر پہنچا دیا جائے گا۔

یوں وہ اپنے آدمیوں سے کام نکال کر اپنے اس خفیہ ٹھکانے کے تہہ خانے میں آ چکا تھا۔ یہاں سے وہ یہ جان سکتا تھا کہ اس کے گھر میں کیا ہو رہا ہے کیونکہ اس کے گھر میں جگہ جگہ چھپے ہوئے کیمروں کو یہاں سے کمپیوٹر کے ذریعے کنٹرول کیا جاتا تھا۔

ایک دروازے کے سامنے رک کر ظریف نے پاس ورڈ ڈالا جس سے دروازہ خودکار انداز میں کھلتا چلا گیا۔ کمرے کے چاروں طرف بڑی بڑی ٹی وی اسکرین لگی ہوئی تھیں۔ جو سب بند تھیں۔ ظریف کے کمرے میں قدم رکھتے ہی سب ایک ساتھ آن ہو گئیں اور کمرے میں "ویل کم" کی آواز گونج اٹھی۔ یہ آواز اس ماسٹر کمپیوٹر سے گونجی تھی جو اس سارے سسٹم کو کنٹرول کر رہا تھا۔

ظریف ایک کی بورڈ کے کئی بٹن دبانے لگا جس سے دیواروں پر لگی اسکرینز پر اس کے گھر کے مختلف حصوں کا منظر اجاگر ہونے لگا۔ ساری اسکرینز پر عام منظر دکھائی دے رہا تھا۔ صرف ایک اسکرین ایسی تھی جس پر ماحول کچھ گرم نظر آ رہا تھا۔ جسے دیکھ کر ظریف کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔

اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اسے اپنی بیوی کو اتنی بری حالت میں بھی دیکھنا پڑے گا۔ روکھے سوکھے بکھرے بال' مرجھایا ہوا چہرہ۔ دونوں گالوں پر چھپے انگلیوں کے لال لال نشان' دونوں سروں سے پھٹے ہوئے ہونٹوں سے رستا ہوا ہلکا ہلکا خون' بیلٹ کی مار سے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے کپڑے اس کی بیوی گھر کے ایک

کمرے کے فرش پر ڈری سہمی سی بیٹھی تھی۔

اس کے سامنے ہاتھ میں بیلٹ لیے انیتا کھڑی تھی' جو اسے شدید نفرت سے گھورتی ہوئی ظریف کے بارے میں سوال کر رہی تھی۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ظریف بہت اچھے انسان ہیں۔ وہ ایسے کام کبھی نہیں کر سکتے۔''

جتنی بار بھی انیتا نے ظریف کے بارے میں اس کی بیوی سے سوال کیا' اس کی زبان سے ایسے ہی الفاظ نکل رہے تھے۔

''یہ ایسے نہیں بتانے والی۔ ذرا اپنے ہاتھوں کا جادو دکھاؤ اور اس کا سر چکنا کر دو۔'' انیتا نے اپنے پیچھے کھڑے سپاہی کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

یہ حکم نہ تو ظریف کی بیوی کی سمجھ میں آیا تھا اور نہ ظریف کے کچھ پلے پڑا تھا۔ مگر شاید وہ سپاہی سمجھ گیا تھا۔ کیونکہ وہ انیتا کی بات سنتے ہی کمرے سے باہر چلا گیا تھا اور جب لوٹا تو وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ تین سپاہی اور تھے۔ جن میں سے ایک کے ہاتھ میں استرا تھا۔

استرا دیکھتے ہی ظریف سمجھ گیا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ اسے اپنی بیوی کی لمبی سیاہ گھنی زلفیں بہت پسند تھیں۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی بیوی کو گنجا ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جیسے ہی انیتا کے اشارے پر وہ سپاہی اس کی بیوی کی طرف بڑھے۔ ظریف نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کرسی پر ڈھ سا گیا۔

آنکھیں بند ہوئیں تو دل میں بند یادوں کے خزانے سے کچھ خوبصورت لمحے اسے دکھائی دینے لگے۔

''جان۔ جب میں تمہاری زلفوں کے سائے میں لیٹا ہوں تو اپنی ہر پریشانی ہر غم بھول جاتا ہوں۔ آخر ایسا کیا جادو ہے تمہاری ان زلفوں میں کہ کبھی میں کتنا ہی پریشان ہوں' مگر جب بھی ان ریشمی دھاگوں سے کھیلنے لگتا ہوں' پرسکون ہو کر سو جاتا ہوں۔'' ظریف اپنی بیوی کی زلفیں اپنے چہرے پر ڈالے' اپنی انگلیوں سے اس کی لٹیں سلجھاتے ہوئے اس راز کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔

''آپ بھی نا..... جانے کیا کیا سوچتے رہتے ہیں۔'' وہ ہلکا سا ہنستی تھی۔

''بتاؤ نا پلیز۔'' ظریف نے پلیز کو کچھ زیادہ ہی طویل کرتے ہوئے ضد کی۔

''آپ کے ہاتھ جب جب میرے بالوں کو چھوتے ہیں۔ ایک خوشبو چھوڑ جاتے ہیں۔ جو میرے پیار میں مل جاتی ہے اور.....''

''نہیں۔ ایسا مت کرو پلیز.....''

ڈر اور درد میں ڈوبی ہوئی ہلکی سی چیخ نے ظریف کی یادوں کے سفر سے جڑا رشتہ توڑ ڈالا۔

یہ چیخ کسی اور کی نہیں اس کی بیوی کی ہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ تین سپاہیوں نے اس کی بیوی کو اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ وہ ہل تک نہیں پا رہی تھی اور ایک سپاہی اس کے سر پر استرا پھیر رہا تھا اور استرا اپنی ہر حرکت کے ساتھ اپنا کمال دکھا رہا تھا۔

ظریف کی بیوی بالکل بے بس تھی اور عورت جب بے بس ہوتی ہے تو وہ رونے کے سوا اور کر بھی کیا سکتی ہے اور یہی وہ اس وقت کر رہی تھی۔ اس کے آنسو آنکھوں سے کاجل کو بہاتے ہوئے گالوں میں سیاہ لکیریں ڈالتے جا رہے تھے۔

''سب کچھ سچ سچ بتا دو تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا ورنہ.....'' انیتا نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

یہ منظر دیکھ کر ظریف تڑپ سا گیا۔ غصے سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ اس وقت اس کی ایسی حالت ہو رہی تھی جیسے پنجرے میں پہلی بار قید ہونے والے شیر کی ہوتی ہے۔ جو پنجرے میں دہاڑتا رہتا ہے' غصے سے پاگل سا ہوا رہتا ہے' مگر چاہ کر بھی کچھ نہیں کر پاتا۔ وہ کچھ دیر تک یونہی مٹھیاں بھینچتا رہا' تڑپتا رہا۔ پھر اسے کچھ یاد آیا اور اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ تیزی سے جھپٹ کر کی بورڈ جیسی ڈیوائس پر جھکا۔

جس عمارت کے تہہ خانے میں اس وقت ظریف موجود تھا۔ اسی عمارت کے ایک دوسرے کمرے میں شیشے کی چھوٹی سی الماری میں گہرے نیلے رنگ کی ایک پندرہ سینٹی میٹر لمبی اور نو سینٹی میٹر چوڑی ڈیوائس رکھی تھی۔ ایک ہلکی سی بیپ ہوئی اور اس ڈیوائس میں لگا ایک چھوٹا سا سرخ بلب جل اٹھا۔

کچھ دیر بعد اس کا رنگ سبز ہوگیا اور جیسے ہی بلب کا رنگ سرخ سے سبز ہوا' الماری اپنے آپ کھل گئی اور وہ ڈیوائس آہستہ آہستہ ہوا میں اٹھی اور پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکلتی چلی گئی۔



ثوبیہ خاصی رفتار سے کار ڈرائیو کررہی تھی اور رانی فرنٹ سیٹ پر فیضی کو اپنی گود میں لیے بیٹھی تھی۔ ان کا رخ اسپتال کی طرف تھا اور ثوبیہ خاموشی سے اپنی تمام تر توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کیے ہوئے تھی۔

''ممی مجھے وہاں آپ کی بہت یاد آتی تھی۔ اب میں کبھی آپ سے دور نہیں جاؤں گا۔''

''مجھے بھی تمہاری یاد بہت ستاتی تھی۔ اب میں بھی تم کو کبھی خود سے جدا نہیں ہونے دوں گی۔'' رانی نے پیار سے فیضی کو اپنے سینے سے چپکا لیا۔

رانی اور فیضی کی باتیں سن کر ایکدم ثوبیہ کے دماغ میں کئی سوچیں ابھر رہی تھیں۔ اعیان۔ ہانی اور رانی کے بیچ فیضی کا کیا ہوگا؟ کیا ان تینوں نے اس معصوم کے بارے میں کچھ سوچا ہے۔ نہیں سوچا ہوگا اور پھر ان کے پاس ایسی باتیں سوچنے کا وقت ہی کہاں ہے۔ ایک کے بعد ایک مصیبت ان کے پیچھے ہے۔ ایسی حالت میں وہ یہ بات کیسے سوچ سکتے ہیں۔ لیکن انہیں فیضی کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ مگر ابھی۔ ابھی تو سب سے بڑا مسئلہ ہانی ہے۔ آخر یہ ہانی کی بچی گئی تو کہاں گئی۔ بالکل پاگل ہے۔ کہیں کچھ الٹا سیدھا نہ کر بیٹھے۔ کہیں وہ واپس اپنے گھر تو نہیں چلی گئی؟ نہیں اگر ایسا ہوتا تو وہ مجھے بتا کر ضرور جاتی۔ کیا وہ اس طرح اپنا سارا سامان یہاں تک کہ اپنا موبائل بھی میرے گھر چھوڑ جاتی۔ یا اللہ۔ ہانی جہاں بھی ہو صحیح سلامت ہو۔ ابھی تو یہ سوچنا ہے کہ اگر اعیان نے ہانی کا پوچھ لیا تو کیا جواب دوں گی۔ کیا میرے پاس کوئی جواب ہے؟ نہیں۔ کوئی جواب نہیں ہے۔ ویسے غلطی تو اعیان کی ہی ہے۔ اسی نے تو ہانی کو برا بھلا کہا تھا۔ کیا وہ جھگڑا ہی ہانی کے غائب ہونے کی وجہ ہے؟ یا کوئی اور بات ہے؟

انہی سوچوں میں ڈوبتے ابھرتے ثوبیہ کی کار اسپتال کے احاطے میں داخل ہوچکی تھی۔ اعیان ابھی بھی بے ہوش تھا اور کریم خان اس کے لیے بہت فکر مند ہو رہا تھا مگر ہانی کے غائب ہونے کا سن کر اس کی پریشانی مزید بڑھ گئی تھی۔ ثوبیہ نے اعیان اور ہانی کی محبت سے لے کر چھوٹا سا جھگڑا ہونے اور اس کے بعد ہانی کے غائب ہونے کی پوری داستان کریم خان کو سنا دی تھی۔ کریم خان نے انہیں اسپتال میں ہی چھوڑا اور خود ہانی کی تلاش میں نکل پڑا۔ کریم خان کے جانے کے کچھ دیر بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ اعیان کو ہوش آچکا ہے اور اب وہ چاہیں تو اس سے مل سکتے ہیں۔

فیضی' رانی اور ثوبیہ آگے پیچھے اعیان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ہوش میں آنے کے بعد اعیان کی نظریں بھی دروازے پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔ ان تینوں کے اندر آنے کے بعد بھی اس کی نگاہیں دروازے پر کسی کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔

شاید اسے کسی اور کے بھی اندر آنے کی امید تھی۔ شاید اسے کسی اور کا بھی انتظار تھا۔ جب کسی اور کے اندر آنے کی امید ٹوٹی تو اعیان کی آنکھوں میں مایوسی چھانے لگی اور اس نے سوالیہ نظروں سے ثوبیہ کی طرف دیکھا تو ثوبیہ نے نظریں چرالیں۔

ثوبیہ بخوبی جانتی تھی کہ اعیان کی نظروں میں کون سا سوال مچل رہا ہے اور وہ کس کے بارے میں جاننے

لیے تڑپ رہا ہے۔ مگر جس کے بارے میں وہ جاننا چاہتا ہے' وہ کہاں ہے؟ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ پھر اعیان کو کیا جواب دیتی۔

ماحول عجیب سا بوجھل بوجھل ہو رہا تھا۔ سب ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے اور کمرے میں خاموشی کا راج تھا۔ پھر اس خاموشی کو فیضی کی معصوم آواز نے توڑا۔ "پاپا۔ آپ کو معلوم ہے۔ یہاں لوگ چلنے والی کرسیوں پر بیٹھ کر گھوم رہے ہیں۔ مجھے ایک ایسی کرسی چاہئے۔ میں بھی ایسی کرسی چلاؤں گا......"



دھیرے دھیرے اندھیرا اپنے پر پھیلاتا جا رہا تھا۔ ظریف چوہدری کا گھر' جہاں ہر طرف نوکروں کی چہل پہل دکھائی دیتی تھی۔ آج سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ بس لان میں دو سپاہی کھڑے نظر آ رہے تھے جو آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

"یار تارا۔ مجھے لگتا ہے میڈم انیتا پاگل ہو چکی ہے۔ اس نے بیچاری ظریف کی بیوی کا کتنا برا حال کر دیا ہے۔ اگر وہ کچھ جانتی تو اتنے ٹارچر کے بعد کب کا بک چکی ہوتی۔"

"ہاں ماجد بات تو تیری ٹھیک ہے۔ مگر تم اپنی زبان بند رکھا کرو۔ اگر ہماری باتیں میڈم کے کانوں تک پہنچ گئیں تو کھال ...... آہ مر گیا۔" تارا اپنی بات پوری بھی نہیں کر پایا تھا کہ کہیں سے ایک گولی آئی اور سیدھی اس کے سینے میں دھنس گئی۔ تارا ایک آہ کے ساتھ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

ماجد سمجھ ہی نہیں پایا کہ ہوا کیا ہے؟ وہ اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر پاگلوں کی طرح چاروں طرف گھوم گھوم کر گولی چلانے والے کو دیکھنے لگا۔ مگر دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ابھی ماجد گولی چلانے والے کو تلاش کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ ایک گولی اس کے سر میں راستہ بناتی ہوئی نکل گئی اور ماجد ایک دل دھلا دینے والی چیخ کے ساتھ زمین پر ڈھیر ہو کر تڑپنے میں اپنے ساتھی تارا کا ساتھ دینے لگا۔

ان کی آوازیں اندر کمرے میں ظریف کی بیوی سے تفتیش کرتے دو سپاہیوں تک بھی پہنچ گئیں۔ وہ دوڑ کر باہر آئے اور اپنے دو ساتھیوں کی لاشیں دیکھ کر خوف ان کے چہروں پر پھیل گیا اور وہ گھبرا کر ادھر ادھر قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگے۔

ان میں سے ایک کی نظر کھلے آسمان پر گئی تو اندھیرے میں ایک چھوٹی سی ہرے رنگ کی روشنی دکھائی دی۔ جو آہستہ آہستہ انہی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ابھی وہ اپنے ساتھی کو اس کے بارے میں بتانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اسی روشنی کی طرف سے ایک کے بعد ایک کئی گولیاں آئیں اور ان دونوں کے بدن میں کئی روشندان ایک ساتھ کھل گئے اور وہ دونوں بھی تارا اور ماجد کے پیچھے پیچھے اس دنیا کو چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔

وہ ہری روشنی جسے مرنے سے پہلے اس سپاہی نے دیکھا تھا۔ وہی ڈیوائس تھی جو اس بنگلے سے اڑتی ہوئی نکلی تھی' جس میں ظریف موجود تھا۔ کیا یہ ڈیوائس اپنے آپ ہوا میں تیرتی ہوئی یہاں تک پہنچی تھی؟ کیا ایسا ہو سکتا تھا کیا وہ ڈیوائس کسی قسم کی جادوگری کا نمونہ تھی؟ نہیں۔ ایسا بالکل نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہی ایسا ہوا تھا۔ دراصل یہ ایک ایڈوانس ٹیکنالوجی کی حامل گیجٹ تھی۔ جس کے بنانے والے نے اسے ڈی گن کا نام دیا تھا۔ اسے دو سے تین کلومیٹر کے احاطے میں کمپیوٹر کے ذریعے باآسانی کنٹرول کر کے کہیں بھی لے جایا جا سکتا تھا اور یہی کام اس وقت کمپیوٹر کے آگے بیٹھا ظریف انجام دے رہا تھا اور اس کے چہرے پر عجیب سا جوش اور تمتماہٹ نظر آ رہی تھی۔

اس ڈیوائس میں چھوٹے چھوٹے ہائی کوالٹی کیمرے نصب تھے۔ جس کی مدد سے ڈی گن کے پچاس سے ستر میٹر دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔ ڈی گن میں ایک

سائلنسر بھی لگا ہوا تھا جس سے نکلنے والی بے آواز گولیاں اپنے شکار کو شور کرنے پر مجبور کر دیتی تھیں۔

ان چاروں سپاہیوں کی موت کے بعد بھی ظریف کے غصے میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اس کا غصہ تب تک ٹھنڈا ہونے والا نہیں تھا جب تک وہ ہر اس شخص کی جان نہیں لے لیتا جس نے اس کی جان سے زیادہ پیاری بیوی کو تکلیف پہنچائی تھی۔

اب ظریف نے ڈی گن کا رخ اس اسپتال کی طرف موڑ دیا تھا جہاں اعیان ایڈمٹ تھا۔ کیونکہ کچھ دیر پہلے اس نے ایک سپاہی کو کہتے سنا تھا کہ وہ انیتا کو وہیں جانے کا کہہ رہا تھا۔



ویسے تو اعیان بڑے لگاؤ سے فیضی کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا۔ مگر اس کے دل میں کیا خیال اٹھ رہے ہیں۔ یہ کمرے میں موجود رانی اور ثوبیہ اچھی طرح سے جانتی تھیں۔ کیونکہ اعیان کی آنکھوں سے چھلکتی بے چینی ان دونوں سے چھپی نہیں تھی۔

فیضی سے باتیں کرتے کرتے وہ بار بار بڑی بیقراری سے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے ہانیہ کا انتظار تھا۔ اس کا دل ہانیہ کے قدموں کی آہٹ سننے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ مگر ہانیہ تھی کہ نہ آ کر اس کی بے تابی کو بڑھائے ہی چلی جا رہی تھی۔ وہ رانی اور ثوبیہ سے ہانیہ کے بارے میں جاننا چاہتا تھا مگر جانے کیا بات تھی کہ وہ چاہ کر بھی کچھ پوچھ نہیں پا رہا تھا۔

فیضی کے سامنے ہانیہ کے بارے میں کچھ پوچھنا اعیان کو کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ حالانکہ فیضی ابھی بچہ تھا' اعیان اس کے سامنے بڑے آرام سے کچھ بھی پوچھ سکتا تھا۔ مگر جانے کیوں اسے کوئی سوال کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

رانی جو اعیان کے چہرے کو دیکھ کر اس کے دل کا حال جان لیتی تھی' جو اعیان کی ہر مشکل کا حل تھی۔ ایک بار پھر وہ ہی اعیان کی مدد کو آگے بڑھی۔ اعیان کی یہ حالت دیکھ کر رانی ذرا سا مسکرائی اور اعیان پر ترس کھاتے ہوئے فیضی کو باہر لے گئی۔

''بھابھی۔ ہانی کہاں ہے؟ وہ کیوں نہیں آئی؟'' رانی اور فیضی کے کمرے سے باہر نکلتے ہی اعیان نے نہایت بے صبری سے پوچھا۔

''وہ کیوں آئے گی؟ اور تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟ تمہیں تو اس سے محبت ہی نہیں ہے۔'' غصے سے ثوبیہ نے الٹا اسی پر چڑھائی کر دی۔

''بھابھی پلیز مجھے شرمندہ مت کرو۔ اس وقت میں غصے میں تھا اور آپ تو میری فطرت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ میں غصے میں پاگل ہو جاتا ہوں۔'' اعیان واقعی شرمندہ تھا اور اس کی یہ حالت جھکی ہوئی گردن بخوبی بیان کر رہی تھی۔

''تمہارا غصہ بھی خوب ہے۔ پتہ ہے تمہاری وجہ سے وہ کتنا روئی تھی۔''

''کیا ہوا۔ کون رویا تھا'' اعیان کے جواب دینے

سوال

ایک سفید پوش آدمی ایک مالدار کے پاس پہنچا اور بولا ''جناب بے روزگار ہوں، روزگار دلوا دیجیے۔''

مالدار آدمی بگڑ کر بولا۔ ''ابے میں نے لوگوں کو روزگار دلانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے کیا؟'' اس شخص نے نہایت عجز و انکساری سے کہا۔

''جناب میں تین روز سے بھوکا ہوں روزگار نہیں دلوا سکتے تو روٹی کے لیے ہی کچھ پیسے دیجیے۔''

مالدار آدمی اور بھی غصہ اور طیش میں آ کر کہنے لگا۔

''کیا بک بک لگا رکھی ہے؟ دفع ہو جاؤ یہاں سے، ہر روز تم جیسے کئی فراڈیے آتے رہتے ہیں یہاں۔'' یہ سن کر سائل نے جیب سے پستول نکالا اور کہنے لگا

''اب تو غالباً میری مالی مدد کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا......؟

انتخاب: جاوید احمد صدیقی......راولپنڈی

سے پہلے ہی ایک آواز ان کے کانوں میں پڑی۔ دونوں نے چونک کر دیکھا' انیتا دروازے سے اندر آ رہی تھی۔

ثوبیہ کے لیے انیتا انجان تھی' اس لیے وہ سوالیہ نظروں سے اعیان کو دیکھنے لگی۔

''بھابھی ان سے ملیے۔ یہ ہیں ہماری نئی ڈی ایس پی صاحبہ اور میڈم یہ ہیں کریم خان کی وائف۔'' اعیان نے تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''واؤ۔ کریم خان نے کیا خوب نصیب پایا ہے۔ آپ سچ میں بہت خوبصورت ہیں۔'' انیتا نے ثوبیہ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

پھر کچھ دیر تک ایک دوسرے کا حال چال پوچھا جاتا رہا۔ اس کے بعد اعیان نے ثوبیہ سے کہا۔ ''بھابھی ذرا دیکھنا تو یہ رانی کہاں رہ گئی۔''

ثوبیہ سمجھ گئی کہ اعیان کسی کیس کے بارے میں انیتا سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے اس لیے بنا کچھ کہے اٹھ کر باہر نکل گئی۔

ثوبیہ کے جانے کے بعد انیتا نے اعیان کو وہ سب بتا دیا جو اسے ظریف چوہدری کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔ ابھی وہ دونوں ظریف کے بارے میں باتیں کر رہے تھے کہ اچانک باہر سے لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ انیتا وجہ جاننے کے لیے تیزی سے باہر کی طرف لپکی۔ مگر ابھی وہ دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ اعیان نے دیکھا کہیں سے دو تین گولیاں آئیں اور ایک کے بعد ایک انیتا کے سینے میں اترتی چلی گئیں۔ انیتا چیخ مار کر فرش پر گر پڑی۔

انیتا کے گرتے ہی ڈی گن کمرے میں گھس آئی۔ اعیان غور سے اسے دیکھنے لگا۔ تبھی ڈی گن سے ایک خاموش گولی نکلی جو اعیان کے سر سے بمشکل ایک فٹ اوپر سے ہوتے ہوئے سیدھی دیوار سے جا ٹکرائی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ نشانہ اعیان ہی تھا۔ مگر نشانہ...... نشانے پر نہ لگ سکا۔ اب یہ اعیان کا نصیب تھا یا ڈی گن کنٹرول کرنے والے کی غلطی۔

ڈی گن کا نشانہ تو اعیان کا سینہ تھا' مگر جیسے ہی ڈی گن سے گولی نکلنے والی تھی' جانے کیسے اس کا رخ ذرا سا اوپر کی طرف ہو گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ گولی جو دیوار سے ٹکرائی تھی' اعیان کے سینے میں اپنا گھر بنا چکی ہوتی اور ابھی اعیان بالکل بھی اس حالت میں نہیں تھا کہ کسی بھی طرح گولی سے بچنے کی کوشش کر سکتا۔

وہ ابھی بھی ڈی گن کی طرف دیکھ رہا تھا جو کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ اعیان اسے دیکھتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔ ''کیا یہ وہی ڈی گن ہے جو پروفیسر دلاور چینہ بنانا چاہتا تھا؟''



ظریف نے ڈی گن کو اس اسپتال میں پہنچا دیا' جس کے بارے میں اس نے سپاہی کی زبانی سنا تھا۔ مگر پورے اسپتال میں بہت تلاش کرنے پر بھی انیتا نہیں مل رہی تھی۔ اب سوال یہ اٹھ رہا تھا کہ اتنے بڑے اسپتال میں انیتا کو کیسے تلاش کیا جائے؟

جتنا وقت گزر رہا تھا ظریف کے غصے اور جھلاہٹ میں مزید اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جب وہ ہر طرح سے انیتا کو ڈھونڈنے میں ناکام رہا تو اس نے جھلا کر جو سامنے دکھائی دیا اس پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔

کئی لوگ بری طرح زخمی ہو کر چلانے لگے۔ جن کی آوازیں سن کر انیتا' اعیان کے پاس سے اٹھ کر باہر کی طرف لپکی تھی۔ جیسے ہی انیتا دروازے پر آئی' ظریف کی نظر اس پر پڑ گئی اور اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر انیتا کا سینہ گولیوں سے چھلنی کر دیا۔

انیتا کا کام تمام کر کے بھی ظریف کا غصہ سرد نہیں ہوا تھا۔ وہ ڈی گن کو اسی کمرے میں لے گیا جہاں سے انیتا نکلی تھی۔ وہاں اس نے اعیان کو بستر پر لیٹا ہوا دیکھا۔ اعیان کو دیکھ کر ظریف غصے سے بے قابو ہو گیا۔ کیونکہ اسے برباد کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ تو اعیان کا ہی

تھا۔ غصے میں وہ یہ بھی بھول گیا کہ اسٹار نے اعیان کو کوئی نقصان نہ پہنچانے کا حکم دیا ہے۔
اس نے اعیان کو نشانے پر لے کر اس کی بورڈ جیسی ڈیوائس کا بٹن دبایا۔ گولی چلی مگر نہ جانے کیسے نشانہ خطا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے بادل چھا گئے۔ کیونکہ آج تک کبھی ڈی گن کا نشانہ خالی نہیں گیا تھا۔ ظریف نے جلد ہی حیرت پر قابو پاتے ہوئے اعیان کو نشانے پر لیتے ہوئے دوبارہ بٹن دبایا' مگر یہ کیا؟ ڈی گن سے گولی نکلنے کی بجائے' خود ڈی گن کمرے سے باہر کی طرف جانے لگی۔
ظریف مختلف بٹن دبا دبا کر ڈی گن کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر کر نہیں پا رہا تھا۔ ڈی گن پوری طرح اس کے کنٹرول سے باہر ہو چکی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ کسی اور نے ڈن گن کو ہیک کر لیا ہے۔
دیکھتے ہی دیکھتے ڈی گن استال سے باہر نکل گئی اور باہر آتے ہی ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ ہوا میں کسی پٹاخے کی طرح پھٹ گئی۔ ظریف بے بسی سے یہ سب دیکھنے کے علاوہ کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھا۔ جو ہوا تھا اور جو ہو رہا تھا' ظریف اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ تبھی پورے کمرے میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی اور کمرے میں لگی ساری اسکرینوں پر نہ جانے کون سی کوڈنگ سی رن ہوتی نظر آنے لگی۔ یہ دیکھ کر ظریف گھبرا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس عمارت کے ہر حصے میں نہایت طاقتور بم فٹ تھے۔ جنہیں ضرورت پڑنے پر کبھی بھی بلاسٹ کر کے عمارت کا نام ونشان مٹایا جا سکتا تھا اور ظریف اسی لیے گھبرا رہا تھا کہ یہ کوڈنگ انہی بموں کو ایکٹی ویٹ کرنے کے لیے رن ہو رہی تھی۔ وہ اپنے سامنے رکھے کی بورڈ کے سارے بٹن دبا کر اسے ڈنگ کو روکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔
کچھ دیر بعد ایک اسکرین پر 100 سے الٹی گنتی شروع ہو چکی تھی۔ اس عمارت میں فٹ ایک طاقتور بم چارج ہو چکا تھا' جو ٹھیک سو سیکنڈ بعد پھٹنے والا تھا۔ ظریف نے بٹنوں کو دبا کر ایک بار پھر بم کو پھٹنے سے روکنے کی کوشش کی' مگر روک نہیں پایا۔ الٹا اس عمارت میں فٹ سارے بم ایک کے بعد ایک ایکٹی ویٹ ہوتے چلے گئے۔
اور ٹھیک سو سیکنڈ بعد' ایک کے بعد ایک کئی زوردار دھماکے ہوئے اور پوری عمارت ملبے کے ڈھیر میں بدل گئی۔



ڈی گن کے کمرے سے نکلتے ہی اعیان اٹھ کر انیتا کی حالت دیکھنے کے لیے سوچ ہی رہا تھا کہ رانی دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ جو یقیناً انیتا کی چیخ سن کر آئی تھی۔ اس کا ڈرا ڈرا اور گھبرایا سا چہرہ اس وقت بہت پیارا لگ رہا تھا۔ رانی کا یہ روپ دیکھ کر' اعیان یہ بھی بھول گیا کہ یہاں کیا قیامت ٹوٹ چکی ہے۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا کہ وہ ٹکٹکی باندھے رانی کو دیکھتا رہے' لیکن اگر وہ رانی کو اس طرح سے دیکھتا تو کیا یہ بے وفائی نہ ہوتی؟ اور وہ خواب میں بھی ہانیہ سے بے وفائی کا نہیں سوچ سکتا تھا۔ لامحالہ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ رانی کو دیکھ کر کبھی کبھی اس کا دل اسی طرح مچل جایا کرتا تھا۔ رانی تھی بھی اتنی پیاری کہ کسی کا بھی ایمان ڈول جائے۔
اعیان کا ایمان تو اکثر ڈول جایا کرتا تھا۔ مگر صرف چند لمحوں کے لیے' اس کے بعد وہ خود پر قابو پا لیا کرتا تھا۔ اعیان کو صحیح سلامت پا کر رانی نے چین کی سانس لی اور جھک کر انیتا کی نبض ٹٹولنے لگی۔ اعیان نے خود پر قابو پا کر آنکھیں کھولیں تو اس نے رانی کو انیتا پر جھکا ہوا پایا اور وہ سوالیہ نظروں سے رانی کی طرف دیکھنے لگا۔ جواب میں رانی نے نا میں گردن ہلا دی۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ انیتا اب اس دنیا میں نہیں رہی۔



گزرے ہیں عشق میں ہم' اس مقام سے
نفرت سی ہوگئی ہے' محبت کے نام سے

لوگ کہتے ہیں محبت خوشیاں دیتی ہے۔ غلط کہتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر اس کے حصے میں کبھی خوشیاں کیوں نہیں آئیں۔ وہ نو سال تک مسلسل تڑپتی رہی' انتظار کی سولی پر لٹکی پل پل مرتی رہی۔ نو سال بعد انتظار تو ختم ہوگیا' مگر سزا نہیں۔ اس کی محبت نے بڑی بے رحمی سے اس کے پیار کو اپنے قدموں تلے روند ڈالا تھا۔ بڑی بے رحمی سے اس کے دل کو کرچی کرچی کر ڈالا تھا۔

لوگ کہتے ہیں محبت زندگی دیتی ہے۔ اگر یہ سچ تھا تو اس کی محبت نے اس کا قتل کیسے کر ڈالا۔ کیسے اس ہانیہ کو مار ڈالا تھا' جس کا جنم نو سال پہلے اس کی محبت نے اسے ایک خط دے کر کیا تھا۔

لوگ کہتے ہیں محبت جان دے دیتی ہے' مگر لیتی نہیں۔ اگر ایسا تھا تو اس کی محبت نے اس کی جان کیسے لے لی تھی۔

ہانیہ نے محبت نہیں' بلکہ عبادت کی تھی۔ اعیان کے ایک اشارے پر وہ بنا کوئی پروا کیے آگ تک میں کود سکتی تھی۔ اگر وہ کہتا کہ میں زمین پر پاؤں نہیں رکھنا چاہتا تو ہانیہ اس کی چاہت پوری کرنے کے لیے اپنے نازک ہاتھ زمین پر بچھا دیتی۔

مگر اس کے محبوب نے بڑی بے رحمی سے اس کا دل توڑ دیا تھا۔ اب اسے محبت کے نام سے ڈر سا لگنے لگا تھا۔ اسے محبت کے نام سے نفرت ہوگئی تھی۔

اندھیری رات میں ہانیہ بنا کسی مطلب کے ادھر ادھر بھٹک رہی تھی۔ جو راستہ سامنے آتا وہ اسی پر چل دیتی۔ شاید جو لوگ منزل طے کرکے نہیں چلتے' وہ ایسے ہی اندھے راستوں پر چلتے رہتے ہیں۔

ہانیہ جب سے ثوبیہ کے گھر سے نکلی تھی۔ مختلف راستوں پر آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ یا تو وہ اپنے ہوش میں نہیں تھی۔ یا پھر خود کو سزا دے رہی تھی۔ چلتے چلتے وہ تھک چکی تھی۔ مگر ابھی اس کا دوبارہ لوٹ کر ثوبیہ کے گھر واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس بے مطلب کے سفر سے اسے کچھ حاصل نہیں ہو رہا تھا۔ مگر اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اس نے تو اپنی پوری زندگی ہی بے مطلب گزاری ہے۔ اگر وہ ایک رات آوارہ گردی کرتے ہوئے سڑکوں پر گزار دے گی کیا ہوجائے گا۔

یونہی چلتے ہوئے وہ خود بہت ہلکا محسوس کر رہی تھی۔ اعیان کی محبت اس کے دل و دماغ سے غائب ہوچکی تھی۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے اور اگر بات حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو انسان کے دل بدل جایا کرتے ہیں' پلٹ جایا کرتے ہیں۔

کچھ ایسا ہی اس وقت ہانیہ کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اعیان کی باتیں ہر حد پار کرگئی تھیں۔ جب محبت میں ستم حد سے گزر جاتے ہیں' تو یہی ستم دل محبت کے خاتمے کا سبب بن جاتے ہیں۔

جب محبت میں ستم حد سے گزر جاتے ہیں
لوگ پھر ہوش میں آتے ہیں' سنور جاتے ہیں

ہانیہ اس شعر کو کئی بار پڑھ چکی تھی' مگر کبھی اس کا مطلب نہیں سمجھ پائی تھی اور آج وہ شعر اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ اس پر عیاں ہوچکا تھا۔ ہانیہ کے دل میں اس وقت اعیان کے لیے ذرا سی بھی چاہت نہیں تھی اور اس بات پر وہ خود حیران بھی تھی اور خوش بھی۔ اسے اس بات کا ڈر بھی تھا کہ کہیں ثوبیہ کے گھر لوٹتے ہی اس کا دل پھر سے بدل نہ جائے۔ اس لیے بھی وہ ابھی گھر واپس نہیں جانا چاہتی تھی۔

وہ ہلکے ہلکے قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی کہ ایک کھمبے کی روشنی میں سامنے سے ایک بہت ہی خوفناک صورت آدمی کو تیز قدموں سے اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس آدمی کا پورا جسم اور چہرہ بری طرح جلا ہوا تھا اور اس کی ڈراؤنی بڑی بڑی لال آنکھوں سے درندگی

رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کوئی انسان نہیں، کوئی بھوت ہو۔

اسے دیکھ کر ڈر کے مارے ہانیہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ حلق خشک ہو رہا تھا اور بدن پسینے پسینے ہونے لگا تھا۔ بھوت کو سامنے پا کر، پتہ ہی نہیں چلا کہ ایک رات آوارہ بننے کا بھوت سر سے اتر کر کب کا بھاگ چکا تھا۔

وہ بھوت تیزی سے اس کی طرف جھپٹتا ہوا آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ہانیہ کے قریب پہنچتا، ہانیہ مڑی اور پوری طاقت سے دوڑنے لگی۔ حالانکہ وہ اتنا تھک چکی تھی کہ مشکل سے چل پا رہی تھی، مگر بھوت کے خوف سے وہ جتنی تیزی سے دوڑ سکتی تھی، اس سے بھی زیادہ دوڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ابھی ہانیہ تھوڑی ہی دور جا پائی تھی کہ اسے سامنے سے ایک کار اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ جسے دیکھ کر ہانیہ مدد کے لیے چلانے لگی۔

کار بالکل اس کے پاس آ کر رکی اور اس میں سے اترنے والا شخص کریم خان تھا جو ہانیہ کو یہاں وہاں تلاش کرتا پھر رہا تھا۔

کریم کو دیکھ کر ہانیہ اس کی طرف بھاگی اور اس کے پیچھے چھپتے ہوئے بولی۔ ''مجھے بچالو کریم بھائی۔ وہ آدمی۔ نہیں وہ آدمی نہیں بھوت ہے۔ مجھے پکڑنے آ رہا ہے۔''

''کون سا آدمی۔ کہاں ہے بھوت۔'' کریم خان نے دیکھا دور دور تک کوئی نہیں تھا۔

ہانیہ نے ڈرتے ڈرتے کریم خان کے پیچھے سے جھانک کر دیکھا، سڑک پر واقعی کوئی نہیں تھا۔ وہ خوفناک شکل آدمی غائب ہو چکا تھا۔

''ابھی وہاں کوئی تھا۔'' ہانیہ اپنی نازک سی انگلی اٹھا کر سامنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''ڈر مت ہانی، وہاں کوئی نہیں ہے۔ تمہیں شاید کوئی وہم ہوا ہے۔ چلو کار میں بیٹھو۔ گھر چلتے ہیں۔''

ہانیہ چپ چاپ کار کا دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی اور کریم خان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے کار آگے بڑھا دی۔ وہ ہانیہ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ یہاں کیسے، کیوں اور کیا کرنے آئی تھی؟ لیکن ہانیہ کی حالت دیکھ کر اس نے کوئی سوال کرنا فضول سمجھا اور چپ چاپ گھر کی طرف ڈرائیو کرتا رہا۔



اسپتال میں ہونے والے حادثے کو دیکھ کر فیضی بہت ڈرا ہوا تھا اس لیے اعیان نے ثوبیہ اور رانی دونوں کو گھر جانے کو کہا۔ لیکن ثوبیہ نے اعیان کی بات پوری نہیں مانی، وہ خود وہیں رک گئی اور رانی کو چابی دے کر فیضی کے ساتھ اپنے گھر بھیج دیا۔ رانی جانا تو نہیں چاہ رہی تھی مگر فیضی کی وجہ سے مجبور تھی، اس لیے اسے جانا ہی پڑا۔

رانی کے جانے کے بعد اعیان نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پروفیسر دلاور چنہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ جبکہ اعیان کے بستر کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھی ثوبیہ کی سوچ کا مرکز ہانیہ تھی۔ وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ وہ کہاں ہوگی۔ اس نے جان بوجھ کر اعیان کو ہانیہ کے غائب ہونے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ اگر اس نے اعیان کو بتا دیا تو وہ پاگل اپنی حالت کی پروا نہ کرتے ہوئے اسی حال میں ہانی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوگا۔

اعیان کے دماغ میں سو سوچیں چل رہی تھیں۔ پروفیسر دلاور چنہ کسی کالج کے پروفیسر نہیں تھے بس ایسے ہی لوگ ان کے نام کے ساتھ پروفیسر لگاتے تھے۔ کیوں؟ اس کا جواب تو خود دلاور چنہ بھی نہیں جانتا تھا۔

پروفیسر دلاور چنہ ایک بہت مشہور اور قابل سائنسدان تھا۔ جو اپنے سے آگے کے زمانے کے ہتھیاروں کی ایجاد میں لگا رہتا تھا۔ اس نے پاک فوج کو بہت سے ایڈوانس ہتھیار بھی دیئے تھے۔ جن کی وجہ سے اس کا نام پوری دنیا میں مشہور ہو چکا تھا۔ پروفیسر کی اپنی ایک ذاتی لیبارٹری تھی۔ جس میں ملک کے دس سب سے زیادہ ماہر

سائنسدان ان کی ماتحتی میں ریسرچ کیا کرتے تھے۔

تقریباً دس سال پہلے کی بات ہے' ان دنوں وہ ڈی گن کے پروجیکٹ پر کام کر رہے تھے۔ انہی دنوں پولیس کو اطلاع ملی کہ پروفیسر کا ایک دوسرا چہرہ بھی ہے۔ جو کہ ایک بہت بڑے مجرم کا ہے۔ پولیس پروفیسر پر نظر رکھنے لگی اور ان کے خلاف ثبوت اکٹھے کرنے میں جت گئی' لیکن انہیں کوئی کامیابی نہیں ملی۔ کیونکہ انہی دنوں ایک رات جب پروفیسر دلاور چنہ اپنے دس ماتحتوں کی ٹیم کے ساتھ ڈی گن پر کچھ تجربات کر رہے تھے' جانے کیسے لیبارٹری میں آگ لگ گئی۔ آگ اتنی بھیانک تھی کہ جب تک اسے بجھانے کا انتظام کیا جاتا' لیب پوری طرح تباہ ہو چکی تھی اور لیب میں موجود لوگوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکا تھا۔

اعیان اسی بارے میں سوچ رہا تھا۔ ''پروفیسر دلاور چنہ تو دس سال پہلے ہی مر چکا ہے۔ پھر اس ڈی گن کو کس نے بنایا ہے؟ اتنی قابلیت کس میں ہو سکتی ہے؟ انیتا کو مارنے کے لیے اس ڈی گن کو استعمال کیا گیا ہے' تو اس کا مطلب ہے کہ اس کام کے پیچھے ضرور ظریف چوہدری یا اسٹار کا ہاتھ رہا ہوگا۔ اب سوچنے والی بات یہ ہے کہ ڈی گن ان کے پاس کہاں سے آئی؟ کیا اسٹار کوئی سائنسدان ہے؟ یہ بھی ممکن ہے کہ مرنے سے پہلے پروفیسر دلاور چنہ ڈی گن کامیابی سے ایجاد کر چکا ہو۔ جو اب کسی طرح اسٹار گینگ کے ہاتھ لگ گئی ہو۔''

سوال بہت تھے جن کے جواب اعیان کو تلاش کرنے تھے۔ پروفیسر اور ڈی گن کے بارے میں سوچتے سوچتے' دوائیوں کی غنودگی اعیان کو نیند کی آغوش میں لے گئی۔

صبح سویرے ہی اعیان کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ پاس والے بیڈ پر کریم خان سو رہا تھا۔ اعیان کچھ دیر تک بستر پر لیٹا کچھ سوچتا رہا پھر آہستہ سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ پورے اسپتال میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اعیان کو کافی کمزوری محسوس ہو رہی تھی مگر پھر بھی کل کی نسبت کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔

اعیان پارکنگ میں آیا تو اسے اپنی کار کھڑی نظر آئی' شاید کریم خان اسی کی کار میں آیا تھا۔ کار لاک تھی اور چابی اس کے پاس نہیں تھی۔ لیکن چابی کے بغیر لاک کھولنا بھلا اعیان کے لیے کون سی مشکل بات تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ کار کو اپنے گھر کی طرف دوڑائے جا رہا تھا۔ گھر پہنچ کر اس نے کپڑے بدلے اور پھر سے کار میں بیٹھ کر سڑکیں ناپنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے کار ایک چھوٹے سے گھر کے سامنے روک دی۔ گھر رقبے میں چھوٹا تھا مگر بہت ہی شاندار بنا ہوا تھا۔ اعیان نے اپنی انگلی گھر کی ڈور بیل پر رکھ دی اور اس وقت تک نہیں ہٹائی جب تک اندر سے دروازہ کھول نہیں دیا گیا۔ گیٹ کھولنے والا پچاس ساٹھ سال کا ہٹا کٹا شخص تھا۔ وہ اعیان کو اوپر سے نیچے تک گھورتا ہوا بولا۔ ''کہیے۔''

''آئی لو یو۔''

''یہ کیا بکواس ہے۔ کون ہو تم؟'' وہ آدمی جھلا کر بولا۔

جواب میں اعیان بے پروائی سے ادھر ادھر گردن گھمانے لگا جیسے جاننا چاہتا ہو کہ وہ کون ہے جو بکواس کر رہا ہے۔

''تم سے پوچھ رہا ہوں۔'' اعیان کی حرکت پر وہ آدمی اور جھلا گیا۔

''کیوں؟'' پھر ایک سوال۔ جو سامنے والے کا دماغ خراب کرنے کے لیے کافی تھا۔

''کیونکہ...... کیونکہ۔'' وہ ایک پل کو رکا پھر بولا۔ ''کیونکہ تم میرے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو وہ بھی اتنے سویرے سویرے۔''

''اگر بیٹھ جاؤں تو نہیں پوچھو گے؟''

اعیان کے جواب پر اس کا دل چاہا کہ اپنا سر دیوار سے دے مارے۔ وہ چڑ کر چلاتا ہوا بولا۔ ''آخر تم چاہتے کیا ہو؟''

''اس رات کا راز جاننا چاہتا ہوں ہارون مرزا۔ جس رات تم دس دوستوں نے چار معصوم زندگیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا تھا۔''

''کک..... کون سی رات کی بات کر رہے ہو تم۔'' ہارون مرزا کی زبان ذرا سا لڑکھڑائی اور اس کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کر گزر گیا۔

''کمال ہے۔ تم اتنی بڑی بات بھول گئے۔ سات لوگوں کی موت کی رات بھلا کوئی کیسے بھول سکتا ہے؟''

''کک..... کیسی موت..... کون سی رات۔ کیا اناپ شناپ بکے جا رہے ہو۔'' بوڑھے نے اپنے چہرے کی بدلتی رنگت کو لہجے کی سختی میں چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''آج سے پچیس سال پہلے کی ایک رات۔ رئیس علی نواز کا گھر۔ چار عورتیں۔ تین مردوں کی ننگی لاشیں۔ اب کچھ یاد آیا؟''

اعیان کی بات سن کر ہارون مرزا کے رہے سہے ہوش بھی اڑ گئے۔ چہرے پر ہلدی چھانے لگی اور وہ مری ہوئی آواز میں ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔ ''بھائی کون ہو تم۔ تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟'' ہارون مرزا کو احساس ہو چکا تھا کہ سامنے والا بہت کچھ جانتا ہے اس لیے جھوٹ سے کام نہیں چلے گا۔

''اندر چلو۔'' اعیان نے حکم دیا' جسے ہارون مرزا نے بلا چوں چرا مان لیا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں ڈرائنگ روم میں صوفوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

''میں اس رات کی کہانی جاننا چاہتا ہوں۔ اس رات کیا ہوا تھا اور کیوں ہوا تھا؟'' اعیان نے ایک ساتھ کئی سوال کرتے ہوئے کہا۔

''اگر میں نہ بتاؤں تو تم کیا کر لو گے۔'' چوہا بل میں آ کر شیر بن گیا تھا یا شاید وہ جاننا چاہتا تھا کہ سامنے والا کتنے پانی میں ہے اور اگر اس کی بات نہ مانی جائے تو وہ کس حد تک جا سکتا ہے۔



''آپ کا مریض کہاں ہے؟'' کمرے میں کسی کی آواز گونجی اور کریم خان نے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے ایک نرس کھڑی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کریم خان کی نگاہیں اس سے ہوتے ہوئے اپنے پاس والے بستر پر گئیں' جہاں رات کو اس نے اعیان کو سوتا پایا تھا۔ اور خالی بیڈ کو دیکھ کر وہ بڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ ہی دیر میں سارا اسپتال چھان مارا گیا مگر اعیان کہیں نہیں ملا۔ ملتا تو تب' جب وہ وہاں ہوتا۔

کریم خان پارکنگ میں آیا تو اس نے دیکھا کہ اعیان والی کار غائب ہے۔ کار کو بھی غائب پا کر کریم خان نے سکون کی سانس لی۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اعیان کے ساتھ کچھ غلط نہیں ہوا ہے بلکہ وہ خود ہی کہیں گیا ہے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کار کا بند لاک کھولنا اعیان کے لیے بچوں کی سی بات تھی۔

کریم خان نے اسپتال کے لینڈ لائن فون سے گھر کا نمبر ملایا۔ ''ہیلو۔''

''ہیلو۔''

''ہیلو ثوبی! میں کریم۔ اعیان گھر آیا ہے کیا؟''

''نہیں تو کیا ہوا؟''

''وہ اپنی کار سمیت یہاں سے غائب ہے۔ کیا وہ گھر نہیں آیا؟''

''بتایا نا کہ نہیں آیا۔''

فون بند کر کے وہ باہر سڑک پر آ گیا۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جانا چاہئے اور کیا کرنا چاہئے۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں بے خیالی میں سڑک پر آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا کہ تب ہی وہاں سے گزرتی ایک بائیک کو دیکھ کر وہ بری طرح چونک گیا۔

''چراغ۔ چراغ یہاں کیا کر رہا ہے۔ اسے تو آصف کے پاس اسپتال میں ہونا چاہئے تھا۔ یہ کراچی کب آیا۔ اور اس نے اپنی آمد کے بارے میں مطلع

کیوں نہیں کیا۔'' ایسے ہی سوال کریم خان کے دماغ میں گردش کر رہے تھے۔



وہ بھوت جسے دیکھ کر ہانیہ ڈر گئی تھی' کوئی اور نہیں ظریف چوہدری تھا۔ اس عمارت میں ایک ایسا بنکر تھا جس پر دھماکے کا اثر بہت کم ہوتا تھا۔ بم پھٹنے سے پہلے ظریف کسی طرح اس بنکر تک پہنچ کر چھپنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مگر وہ بم اتنے طاقتور تھے کہ وہ بنکر بھی اس کی پوری حفاظت کرنے میں ناکام رہا تھا' لیکن ہاں اس بنکر کی وجہ سے وہ زندہ بچنے میں کامیاب ضرور ہو گیا تھا۔ مگر وہ اتنی بری طرح جھلس چکا تھا کہ اس کی حالت ایک جیتے جاگتے بھوت سے بھی بدتر ہو چکی تھی۔

وہ اس وقت ایک پرانے سے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ اسے اتنا پتہ تھا کہ اسٹار اس گھر میں رہتا ہے' مگر اس گھر کے اندر جانے کا اسے کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ کیونکہ اسٹار کی سخت ہدایت تھی کہ وہ اس گھر کے آس پاس بھی نہ بھٹکے۔ اگر اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ بچا ہوتا تو وہ اب بھی یہاں نہ آتا۔ اس کا راز کھل چکا تھا۔ اس کا گینگ تباہ ہو چکا تھا۔ اور اوپر سے یہ بات کہ کل سے اس کا اسٹار سے کوئی رابطہ بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ کئی بار اسٹار کا نمبر ڈائل کر کے تھک چکا تھا۔ پہلے تو کئی بار اسٹار کے فون پر بیل جاتی رہی مگر ریسیو نہیں کی گئی بعد میں فون سوئچ آف آنے لگا۔ اس لیے ظریف کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں بچا تھا کہ وہ خود یہاں آ کر اسٹار سے ملے۔

یہ گھر پرانی حویلی کے طرز پر بنا ہوا تھا۔ اونچی اونچی قلعے نما دیواریں' لکڑی کا ایک لمبا چوڑا دروازہ' جس میں کوئی ڈور بیل نہیں لگی تھی۔ شاید دروازہ پیٹ کر یا زور سے آواز دے کر اندر اطلاع کی جاتی ہوگی۔ ظریف نے دروازے پر زور زور سے دستک دی اور انتظار کرنے لگا لیکن اندر سے کوئی باہر نہیں آیا' اس نے دوبارہ دستک دی' تھوڑا تھوڑا رک کر اس نے کئی بار دستک دی مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اندر سے نہ تو دروازہ کھولا گیا اور نہ ہی کوئی آواز سنائی دی۔

ظریف نے غصے میں آ کر ایک زور کی لات دروازے پر دے ماری اور دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ تھوڑا سا کھل گیا۔ یوں لگا جیسے دروازہ اندر سے بند ہی نہ تھا۔ ظریف تھوڑی دیر تک دروازے کو گھورتا رہا پھر کچھ سوچ کر کواڑوں کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ یہ حویلی کسی محل سے کم نہیں تھی' دور تک کمرے پھیلے ہوئے تھے جن سے ایک کو چھوڑ کر سب کے دروازے بند تھے۔

یہ سوچ کر کہ اسٹار اس کمرے میں ہوگا' ظریف اس کھلے ہوئے کمرے کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ کچھ ہی آگے بڑھا تھا کہ ایک عجیب سی بدبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی' ایسی بدبو جو کسی چیز کے سڑنے پر آتی ہے۔ جوں جوں ظریف کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا' بدبو کے بھبکے بھی بڑھتے جا رہے تھے۔ اور جب قریب پہنچ کر اس نے بھڑے ہوئے کواڑ کھولے تو اتنی تیز بدبو اس کے دماغ میں چڑھنے لگی کہ اگر اس نے فوراً رومال نکال کر اپنی ناک پر نہ رکھ لیا ہوتا تو بے ہوش ہو چکا ہوتا۔

اندر ہولناک نظارہ اس کا منتظر تھا۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ جس کے پورے بدن پر چھوٹے چھوٹے سیکڑوں کیڑے گھوم رہے تھے۔ لاش کا پورا بدن پھول چکا تھا اور چہرہ کیڑوں کی مہربانی سے ناقابل شناخت ہو چکا تھا۔ پہچاننا مشکل ہو رہا تھا کہ لاش کس کی ہے۔ اور کافی دیر تک لاش کا معائنہ کرنے کے بعد اور لاش کے قد کاٹھ اور چہرے کی بناوٹ کو دیکھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی ظریف کو ماننا پڑا کہ یہ لاش اسٹار کی ہے۔



گھی کبھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلتا۔ ہمیشہ انگلیوں کو ٹیڑھا کرنے پر ہی بات بنتی ہے۔ ہارون مرزا کمرے میں آنے کے بعد پھر سے رنگ دکھانے لگا تھا۔

"اپنا موبائل دو۔" اعیان نے ہارون مرزا کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیا؟"

"میں نے فرنچ نہیں بولی جو تمہیں کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔"

اعیان کے چہرے اور لہجے دونوں سے غصہ چھلکنے لگا تھا۔

"اگر نہ دوں تو......" اس سے پہلے کہ ہارون مرزا کی بات پوری ہوتی۔ اعیان کا ایک زوردار ہاتھ اس کے گال پر پڑا۔

کچھ دیر تو وہ حیرت سے اعیان کو دیکھتا رہا پھر کسی چیل کی طرح اعیان پر جھپٹا۔ مگر بیکار...... اگلے ہی پل وہ کسی فٹ بال کی طرف ہوا میں اڑتا ہوا ڈرائنگ روم کی دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گرا اعیان کو گھور رہا تھا۔

اعیان نے بے پروائی سے میز پر رکھا ہارون مرزا کا موبائل اٹھالیا اور کوئی نمبر ملا کر موبائل کان سے لگالیا اور رابطہ ہوتے ہی بولا۔ "کہاں ہو؟ ٹھیک ہے۔ جلدی سے ہارون مرزا کے بنگلے پر پہنچو۔ اور اس کی بڑی بیٹی کا سر کاٹ کر یہاں لے آؤ۔" پھر اس نے دوسری طرف والے کو ہارون مرزا کے گھر کی لوکیشن سمجھاتے ہوئے کہا۔

"جلدی کرو۔" اور فون کان سے ہٹا کر لائن کاٹ دی۔

"رکو...... کیا کررہے ہو۔ پلیز ایسا مت کرو۔ میری بیٹی کو کچھ مت کرو پلیز۔ میں سب بتانے کو تیار ہوں۔" فون پر کی جانے والی اعیان کی باتیں سن کر ہارون مرزا لرز اٹھا تھا اور اس کی ساری اکڑ ہوا بن کر اڑ چکی تھی۔

"تو دیر کس بات کی ہے۔ شروع ہوجاؤ۔" اعیان صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔

"پہلے اپنے آدمیوں کو تو روک دو۔" ہارون گڑگڑایا۔ وہ آہستہ سے اٹھا اور اعیان کے سامنے والے صوفے پر آکر بیٹھ گیا اور رحم مانگتی آنکھوں سے اعیان کو دیکھنے لگا۔

اس کی بات سن کر اعیان نے دوبارہ موبائل پر نمبر ملایا۔ "ہیلو ہاں کہاں ہو؟ اچھا رکو۔ ابھی کچھ مت کرو۔ میری اگلی ہدایت کا انتظار کرو۔ ہاں ہاں تم وہیں رک کر میرا انتظار کرو۔ او کے۔" اتنا کہہ کر اعیان نے لائن کاٹ کر موبائل صوفے پر پھینک دیا اور اس انداز میں ہارون کو دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ "ہاں میاں۔ اب شروع ہوجاؤ۔"

ہارون مرزا کچھ دیر تک خاموشی سے بیٹھا الفاظ کی ترتیب جوڑتا رہا پھر شروع ہوگیا۔ "شراب اور جنس کا نشہ جب ایک ساتھ انسان کے دماغ پر حاوی ہوتا ہے تو وہ پاگل سا ہوجاتا ہے' جانور بن جاتا ہے۔ کیا صحیح ہے؟ کیا غلط ہے؟ کیا کرنا چاہئے؟ کیا نہیں کرنا چاہئے؟ اسے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ خواہشوں کا غلام بن چکا ہے۔ اپنی حدیں بھول جاتا ہے۔ اس کی گندی خواہشیں جو حکم دیتی ہیں وہ کرتا جاتا ہے۔ چاہے آگے چل کر اس کی کوئی بھی قیمت چکانی پڑے۔ اس رات ہم سب بھی اپنی اپنی خواہشوں کے شکار ہوچکے تھے۔ شہر سے دور جنگل میں' ہم سب دوست راج فارم ہاؤس پر جمع ہوئے تھے۔ شراب کا دور چل رہا تھا' سب ہی نشے میں بری طرح دھت' کنواری اور کمسن لڑکیوں کا انتظار کررہے تھے' جن کو ہم نے اپنے جسم کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ایک رات کے لیے خریدا تھا۔ ہماری جنسی بھوک بڑھتی جارہی تھی۔ مگر لڑکیوں نے آنے میں توقع سے زیادہ دیر کردی تھی۔ تب فارم ہاؤس پر فون آیا' اس بری خبر کے ساتھ کہ ہمیں لڑکیاں سپلائی کرنے والے کو پولیس نے گرفتار کرلیا تھا۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ اب کوئی لڑکی نہیں آئے گی۔

اور یہ خبر سن کر سب کا دماغ خراب ہوچکا تھا۔

سب ہی غصے میں مغلظات بک رہے تھے اور پھر آپس میں ایک دوسرے کو مختلف گالیوں سے نوازتے ہوئے سب اپنے اپنے گھروں کے لیے نکل پڑے۔ جسم میں جنس کی آگ اس حد تک بھڑک چکی تھی کہ دماغ

نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ اور سب کے دماغ صرف لڑکیوں کے تصور کے گرد ہی طواف کر رہے تھے۔ شیطانی طواف اور پھر شاید شیطان کو ہم جیسے چیلوں پر رحم آ گیا۔ راستے میں ہمیں سڑک کے درمیان میں ایک گاڑی کھڑی نظر آئی، جس کے پاس کچھ لوگ پریشان سے کھڑے تھے۔ وہ کل ملا کر آٹھ افراد تھے۔ چار مرد اور چار عورتیں۔ ان کی گاڑی خراب ہوگئی تھی۔ ہم نے اپنی گاڑی ان کے پاس روک کر انہیں لفٹ کی آفر کی۔ ہمیں نشے میں دھت دیکھ کر وہ ہمارے ساتھ آنے سے کترا رہے تھے۔ مگر ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔ اس جنگل میں رات بھر رکنا اور وہ بھی خواتین کے ساتھ، کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ اس لیے وہ ہماری کاروں سوار ہوگئے۔ میری کار میں بڈھا آ کر بیٹھ گیا۔ بات چیت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کا بیٹا شہر میں رہتا ہے۔ وہ سب اسی کے پاس جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک بڈھے کی بیوی، ایک بیٹا اور بیٹی تھے اور جو لڑکا شہر میں رہتا تھا، ایک اس کی بیوی۔ بیٹی اور بیٹا تھے اور لڑکا جوان کے ساتھ تھا، اس بڈھے کا دور کا رشتے دار تھا شہر تک پہنچتے پہنچتے رات کے دو بج چکے تھے۔ ہم نے ان سے کہا کہ اتنی رات کو کہاں جاؤ گے۔ صبح سویرے نکل جانا۔ اور یوں ہم انہیں راج کے گھر لے گئے۔ انہوں نے ابھی رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ ہم نے کھانے کا انتظام کیا۔ مردوں کے لیے باہر لان میں کھانا لگایا گیا اور خواتین کے لیے اندر ہی کھانا پہنچا دیا گیا۔ ان کے کھانے کے انتظام کے ساتھ ہم نے ان کی عورتوں کو اپنے قبضے میں کرنے کا انتظام بھی کرلیا تھا۔ اور اسی انتظام کے تحت وہ سب کھانا کھاتے کھاتے بے ہوش ہوگئے۔ ہم سب ان عورتوں کو زبردستی اٹھا کر راج کے ساؤنڈ پروف کمرے میں لے گئے۔ رات بھر ہم انہیں بری طرح سے روندتے رہے اور تھک ہار کر وہیں سو گئے۔ صبح جب ہماری آنکھ کھلی تو ہوش اڑ گئے۔

بڈھے کے پورے خاندان کی برہنہ لاشیں فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔ اور ان کے جسم سے بہتا خون پورے کمرے میں پھیلا ہوا تھا۔ اور بڈھے کا دور کا رشتے دار لڑکا وہاں سے غائب تھا۔''

''بڈھے کا دور کا رشتے لڑکا، تمہارے اپنے دماغ کی تخلیق ہے نا؟'' ہارون مرزا ذرا سانس لینے کے لیے رکا تو اعیان نے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔

''تم سوچ رہے ہو کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔''

''اس میں سوچنے والی کون سی بات ہے۔''

''میں اپنی جان سے پیاری بیٹی کی قسم کھا کر کہتا ہوں، میرا یقین کرو، میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ ہم نے ان میں سے کسی کی جان نہیں لی تھی، باقی عزت لوٹنے کا اعتراف میں کر چکا ہوں۔ وہ لڑکا ہی ان سب کو قتل کر کے غائب ہوگیا تھا۔ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ میرے نو دوست مر چکے ہیں۔ یہ راز میرے سینے میں دفن تھا اور یہ راز میں نے جوں کا توں تمہارے حوالے کر دیا ہے۔''

''بڈھے کے اس لڑکے کا کیا نام تھا جس کے پاس وہ جا رہے تھے؟ کہاں رہتا تھا۔ اور کیا کرتا تھا؟''

''اس کا نام آزاد تھا۔ سیکٹر پندرہ میں رہتا تھا۔ کیا کرتا تھا، یہ نہیں معلوم۔''

''سیکٹر پندرہ میں کس جگہ؟''

''ہم نے ایڈریس نہیں پوچھا تھا۔''

''مرنے والوں میں سے کسی کا نام یاد ہے؟''

''نہیں۔''

''اور بڈھے کے اس دور کے رشتے دار لڑکے کا نام؟''

ہارون مرزا تھوڑی دیر سوچتا رہتا پھر بولا۔ ''اس کا نام شاید کریم تھا۔''

''کریم۔ ہم......م......م......م۔'' اعیان نے ایک لمبا ہنکارا بھرا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر بعد بنا کچھ کہے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اعیان کے کمرے سے باہر نکلتے ہی ہارون مرزا نے جھپٹ کر صوفے پر پڑا اپنا موبائل اٹھایا اور اس میں ڈائل نمبر دیکھنے لگا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس میں کوئی ریسنٹلی کال نہیں تھی۔ کوئی نمبر ڈائل ہی نہیں کیا گیا تھا۔ ڈیلیٹ کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس کی آنکھوں کے سامنے اعیان نے موبائل کان سے ہٹا کر صوفے پر پھینک دیا تھا۔ ابھی وہ حیران ہی کھڑا تھا کہ اسے باہر کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ وہ دوڑتا ہوا باہر آیا تو اعیان جا چکا تھا۔

گہری سوچ میں غلطاں اعیان..... کریم کے گھر پہنچا۔ بیرونی گیٹ کھلا تھا۔ اعیان نے کار پارک کی۔ گھر میں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے کچن میں جھانکا' وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ ڈرائنگ روم بھی خالی تھا۔ اعیان جب ثوبیہ کے بیڈ روم میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ان کے بستر پر فیضی سو رہا تھا۔

''آخر یہ سب کے سب کہاں چلے گئے؟'' وہ حیرت سے سوچتے ہوئے گیسٹ روم کی طرف بڑھا۔ باہر سے ہی نظر آرہا تھا کہ رانی ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی ہے۔ اعیان اندر آیا تو اس نے دیکھا کہ ہانیہ بستر پر سوئی ہوئی ہے۔ اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر زردی پھیلی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے نیچے ہلکے ہلکے حلقے ابھرے ہوئے تھے۔ اس انداز سے سوئی ہوئی ہانیہ' اعیان کو بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اور اب اس کا دھیان ثوبیہ پر گیا جو ہانیہ کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹی رکھ رہی تھی۔ قدموں کی آواز پر دونوں نے پلٹ کر دیکھا اور اعیان کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ نظریں پھیر لیں۔

ہانیہ کو اس حالت میں دیکھ کر اعیان تڑپ اٹھا۔ ''کیا ہوا میری ہانی کو؟'' مگر اس کی بات کا کوئی جواب نہیں ملا۔ اعیان نے باری باری دونوں کو دیکھا جو ایسے ظاہر کر رہی تھیں جیسے انہوں نے کچھ سنا ہی نہیں ہے۔

سفارش

جائز و ناجائز حلال و حرام اور گناہ کا امتیاز اٹھ جانے کی وجہ سے سفارش کرانا اور کرنا ایک فیشن' رسم اور رواج کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ حالانکہ سفارش صرف حق کے لیے جائز ہے ورنہ ناجائز سفارش حرام اور گناہ ہے۔ جن امور حق کے لیے سفارش جائز ہے ان کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ سفارش اس طریق پر کرے کہ مخاطب آزادی میں رائی برابر خلل نہ پڑے اسے اس کے لیے مجبور نہ کرے۔ اس پر زور نہ دے۔ اس کے قرابت داروں یا دوستوں کو بار بار اس کے پاس نہ بھیجے اور نہ سفارش کرنے کے لیے لوگوں کو رشوت پہنچائے' جیسے بڑے آدمیوں کے عزیز و اقارب ان کے معتقد یا زیر اثر لوگوں سے کام نکلوانے کے لیے چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ تحائف دیتے ہیں جو رشوت ہی کی ایک قسم ہے' اس طرح دوسروں کو بددیانتی اور حق تلفی کے لیے مجبور کرنا ہوتا ہے۔

انتخاب: احتشام شکیل..... ناظم آباد کراچی

''یہاں میری جان نکلی جا رہی ہے اور تم دونوں مزے لے رہی ہو۔ کیا ہوا ہے ہانی کو۔ ڈاکٹر کو دکھایا یا نہیں؟''

اس بار بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ ثوبیہ مسلسل ہانیہ کے ماتھے پر پٹیاں رکھ رہی تھی اور رانی کسی سوچ میں گم ہانیہ کے چہرے کو دیکھے جا رہی تھی۔

''مت بتاؤ۔ میں ہانی کو اس حال میں نہیں دیکھ سکتا۔ میں خودکشی کر لیتا ہوں۔ بعد میں میری لاش کو سب بتاتی رہنا تم دونوں۔'' اعیان کا غصہ انتہا کو پہنچ رہا تھا۔ اس کے لہجے سے بھی ایسا لگ رہا تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہے کر گزرے گا۔ اعیان دیوانہ وار بیڈ کی طرف بڑھا جہاں وہ اپنے ریوالور رکھ کر بھول گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ اعیان گن اٹھاتا' رانی نے جھپٹ کر گن اٹھالی اور غصے سے بولی۔ ''پاگل مت بنو۔ کچھ نہیں ہوا ہے تمہاری ہانی کو۔ بس ذرا سا بخار ہے۔ اور ڈاکٹر ابھی دیکھ کر گیا ہے۔'' غصے سے رانی کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اسے اعیان کی یہ حرکت بالکل بھی اچھی نہیں لگی تھی۔ رانی کچھ دیر تک کھڑی اعیان کو گھورتی رہی پھر

ریوالور لے کر گیسٹ روم سے باہر نکل گئی۔ رانی کے جانے کے بعد بھی اعیان تھوڑی دیر تک خالی دروازے کو تکتا رہا۔ وہ سمجھ گیا کہ رانی کو اس کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی۔ مگر اس وقت اسے ہانیہ کی فکر ہو رہی تھی۔ اس لیے اس نے رانی کے اس انداز پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

وہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا ہانیہ کے پاس پہنچا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اعیان کے لمس نے اثر دکھایا اور ہانیہ نے کسمسا کر ہلکی سی آنکھ کھولی اور دوبارہ بند کر لی۔

''کیوں تنگ کر رہے ہو۔ سونے دو اسے۔'' ثوبیہ نے ہانیہ کا ہاتھ اعیان کے ہاتھ چھڑاتے ہوئے ناراض لہجے میں کہا۔

''تو آپ بھی مجھ سے ناراض ہیں۔'' اعیان نے سوچا اور ایک اداس سی نظر بھابھی پر ڈالی۔ اور بے بسی سے اسی کرسی پر بیٹھ کر جس پر کچھ دیر پہلے رانی بیٹھی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھا پہلو بدلنے لگا۔ اس کا دل ہانیہ کو چھونے' بانہوں میں بھرنے اور پیار کرنے کو چاہ رہا تھا۔ مگر بھابھی کی وجہ سے وہ اپنی حد میں رکا ہوا تھا۔ جو پہلے ہی سے ناراض نظر آ رہی تھیں اور وہ کوئی الٹی سیدھی حرکت کر کے انہیں مزید غصہ نہیں دلانا چاہتا تھا۔

''بھابھی۔ لائیے مجھے دیں۔ میں رکھ دیتا ہوں ہانیہ کے ماتھے پر پٹیاں۔'' اعیان نے درخواست کرتے ہوئے کہا۔

ثوبیہ نے اعیان کے چہرے پر نظر ڈالی' جس پر اداسی اور پریشانی ڈیرے ڈالے ہوئے تھی۔ اس نے کچھ دیر کے لیے اعیان کو ہانیہ کے پاس اکیلا چھوڑنا بہتر سمجھا۔ ''ٹھیک ہے۔ مگر اسے پریشان مت کرنا۔'' وہ بستر سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ ان کے جانے کے بعد اعیان ہانیہ کے بیڈ پر سرہانے آ کر بیٹھ گیا اور ہانیہ کے سر کو بڑے پیار سے تکیے سے اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا' ماتھا ہلکا گرم ہو رہا تھا۔ پھر وہ ہلکے ہلکے ہانیہ کے گالوں پر انگلیاں پھیرنے لگا' شاید اسے ڈر تھا کہ دباؤ ڈالنے سے کہیں اس کے گالوں پر نشان نہ پڑ جائیں۔ پھر اعیان کی انگلیوں نے اپنا اثر دکھایا اور ہانیہ کے بے سدھ جسم میں حرکت ہونے لگی اور اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ خود کو اعیان کی گود میں پا کر ایک لمحہ تو ہانیہ کو بہت اچھا لگا لیکن دوسرے ہی لمحے جانے کیا ہوا کہ وہ جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا ہے میری جان کو؟'' اعیان نے بڑے پیار سے پوچھا۔

''کچھ نہیں' میں ٹھیک ہوں۔ ثوبی کہاں ہے؟'' اس کا لہجہ سپاٹ اور چہرے سے ناگواری ٹپک رہی تھی۔

''بھابھی شاید کچن میں ہے۔''

جواب میں ہانیہ کچھ نہ بولی' چپ رہی' شاید بنا کہے وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ اس سے بات نہیں کرنا چاہتی۔

مگر اعیان سمجھنا نہیں چاہتا تھا یا شاید سمجھ کر بھی انجان بنا ہوا تھا۔ ''کیا سوچ رہی ہو۔ تھک جاؤ گی۔ آرام کرو۔'' اعیان کی آنکھوں اور لہجے سے دنیا جہان کا پیار جھلک رہا تھا۔

''ہونہہ۔ دیکھو کتنی محبت جتا رہا ہے۔ جیسے اس سے زیادہ محبت کوئی کر ہی نہیں سکتا۔'' ہانیہ دل ہی دل میں خود سے مخاطب ہوئی مگر اعیان کو کوئی جواب نہیں دیا۔

ہانیہ کچھ دیر سر جھکائے بستر پر بیٹھی رہی پھر آہستہ سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔ مگر اس نے باہر جانے کے لیے دوسرا قدم ہی اٹھایا تھا کہ اسے چکر آیا اور وہ گرنے لگی۔ اعیان نے بجلی کی طرح لپک کر اسے تھام لیا اور اسے کسی گڑیا کی طرح اٹھا کر بستر پر بٹھاتے ہوئے بولا۔ ''اتنی کمزوری ہو رہی ہے اور تم کہاں جا رہی ہو؟''

''ثوبی کو بلاؤ پلیز۔'' ہانیہ بیزاری سے بولی۔ انداز ایسا تھا جیسے نہ چاہتے ہوئے بھی اعیان سے بولنا پڑ رہا ہے۔

ویسے تو ہانیہ اپنے دل میں اعیان کے لیے کوئی جذبہ محسوس نہیں کر رہی تھی لیکن پھر بھی اسے اعیان کا چھونا

ابھارا گا تھا۔

''کیوں۔ بھابھی سے کیا کام ہے؟''

''ثوبی...... ثوبی...... ثوبی۔'' ہانیہ خود ہی ثوبیہ کو آوازیں لگانے لگی۔

''کیا ہوا؟'' ثوبیہ دوڑتی ہوئی گیسٹ روم میں آئی۔

''مجھے فریش ہونا ہے۔''

''ارے تو اس کے لیے میری کیا ضرورت تھی۔ اعیان بھائی ہے نا۔ اس سے کہو۔'' یہ کہہ کر ثوبیہ واپس جانے کے لیے پلٹی۔

''ارے سنو تو۔'' ہانیہ آواز دیتی رہ گئی مگر ثوبیہ نے اس کی بات ان سنی کردی۔

اب تو اور کوئی آپشن رہ ہی نہیں گیا تھا۔ ہانیہ نے ایک بیزاری نگاہ اعیان پر ڈالی لیکن کہا کچھ نہیں۔

اعیان کو ہانیہ کے برتاؤ اور رویئے سے دکھ تو بہت ہو رہا تھا لیکن اس نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ہانیہ کو اٹھایا اور ہلکے قدموں سے واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ انسان بڑے بڑے دعوے کرنے لگتا ہے مگر اپنے چھوٹے سے دل کو نہیں جان پاتا۔ کبھی دل اِس کی چاہ کرتا ہے تو کبھی اُس کی۔ ایک پل میں جو برا لگتا ہے دوسرے ہی پل وہ اچھا لگنے لگتا ہے۔ ہانیہ بھی اپنے ننھے سے دل کے ہاتھوں پریشان تھی۔ ویسے تو اسے اعیان کا ساتھ بہت ناگوار گزر رہا تھا لیکن جب اعیان اسے اپنی بانہوں میں اٹھانے کے لیے بڑھا تو وہ چاہنے کے باوجود بھی اعیان کو روک نہیں پائی۔ اعیان کی بانہوں میں آ کر اس کے انگ انگ میں سکون سا اترنے لگا تھا۔

❀......◈......❀

''آخر کون ہے؟ جو چوٹ پہ چوٹ دیئے جا رہا ہے۔ کیا اعیان؟ نہیں وہ تو اسپتال میں داخل ہے۔ تو پھر کریم خان؟ نہیں۔ نہ تو کریم خان میں اتنی ہمت ہے اور نہ ہی وہ قانون توڑا کرتا ہے۔ تو آخر یہ گمنام دشمن کون ہے؟ وہ کھل کر سامنے کیوں نہیں آ رہا؟ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟ کہیں یہ سب کیا دھرا اسی انفارمر کا تو نہیں؟ ہاں وہ ہی ہے۔ وہی ہے اسٹار گینگ کا دشمن۔ اسی نے ہمیں تباہ کیا ہے۔ مگر اسٹار گینگ کے بارے میں اتنا کچھ تو صرف کوئی خاص۔ بہت خاص ممبر ہی جان سکتا ہے۔ اور ایسا تو میرے علاوہ کوئی اور نہیں ہے۔ پھر انفارمر ہمارے بارے میں اتنا کچھ کیسے جان جاتا ہے۔ آخر وہ کون ہے۔ کون ہے؟'' اسی حویلی میں جہاں اسٹار کی لاش پڑی تھی' ظریف چوہدری ایک دوسرے کمرے میں بیٹھا گہری سوچ میں گم تھا۔ لیکن اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ جتنا سوچتا جا رہا تھا' اتنا ہی الجھتا جا رہا تھا۔

آخر تھک ہار کر اس نے کمرے میں رکھا ٹی وی آن کر دیا۔ اور ٹی وی اسکرین پر بھی ایک قیامت اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ایک رپورٹر بڑے جوش سے اسکرین پر بولے جا رہی تھی۔ ''چوہدری فیملی پر ایک کے بعد ایک قیامت ٹوٹ رہی ہے' ابھی کل ہی ظریف چوہدری کو اغواء کیا گیا تھا۔ اور کچھ نقاب پوش ان کی بیٹی کو بھی اغواء کر کے لیے گئے۔ آخر ہمارا پولیس ڈپارٹمنٹ کیا کر رہا ہے۔''

❀......◈......❀

رئیس علی نواز کے گھر کی نگرانی کرنے والے چاروں سپاہی بڑے شوق سے صبح کی چائے کی چسکیاں لے رہے تھے اور سڑک کے دوسرے کنارے پر ایک کار میں بیٹھا آدمی بڑے غور سے ان چاروں کو تک رہا تھا۔ چائے پیتے پیتے ان چاروں کا سر چکرانے لگا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ چاروں بے ہوش ہو کر لڑھک گئے۔

کار میں بیٹھے اس آدمی نے ان کی چائے میں بے ہوشی کی دوا ملا دی تھی۔ جیسے ہی وہ بے ہوش ہوئے' وہ جلدی سے کار سے اترا اور رئیس علی نواز کے گھر میں داخل ہو گیا۔

کچھ دیر بعد وہ گھر سے نکلا تو اس کی آنکھوں اور

چہرے پر ایک خاص چمک تھی۔ جب وہ آدمی گھر کے گیٹ سے باہر نکل رہا تھا تبھی سرفراز کی بائیک گھر سے کچھ دور تھی اس نے وہیں بریک لگا دیا اور اس کے منہ سے ایک ہی نکلا۔ ”ظریف..... ظریف چوہدری یہاں کیا کر رہا ہے؟ ضرور کوئی گڑبڑ کرنے آیا ہوگا۔“

سرفراز نے ظریف کو دیکھتے ہوئے سوچا جو تیزی سے رئیس علی نواز کے گھر سے کچھ دوری پر کھڑی اپنی کار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ”اگر یہ آج نکل گیا تو پھر ہاتھ آنا مشکل ہوگا۔“ سرفراز نے خود سے کہا اور بائیک اسٹارٹ کر کے ظریف کی طرف دوڑا دی۔ جب سرفراز کی بائیک ظریف کے قریب پہنچی تو وہ اپنی کار تک پہنچ کر کار کا دروازہ کھولنے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا۔

ٹھیک اسی وقت سرفراز نے ایک زوردار ہاتھ اس کے سر پر مارا جس کی شدت سے ظریف کا سر کار کی چھت سے ٹکرایا اور اس کے سر سے خون بہنے لگا اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا اور وہ بے ہوش ہوگیا۔ سرفراز ہمیشہ اپنی بائیک کی سائیڈ جیکٹ میں رسی کا گچھا رکھا کرتا تھا' شاید ایسے ہی لمحات کے لیے۔ سرفراز نے اچھی طرح سے ظریف کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے اسی کی کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ اس کام سے نمٹ کر سرفراز' رئیس کے گھر کی طرف بڑھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ظریف یہاں کون سی گڑبڑ کر کے گیا ہے۔ اسے گیٹ کے پاس ہی چاروں سپاہی بے ہوش پڑے نظر آئے۔ ان کے پاس ہی چائے کے پیالے پڑے تھے۔ سرفراز کو یہ سمجھتے دیر نہ لگی کہ ان کی چائے میں کچھ ملایا گیا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑا رہ کر انہیں دیکھتا رہا پھر کچھ سوچ کر رئیس علی نواز کے بیٹے سہراب کے بیڈ روم کی طرف چل پڑا۔

بیڈ روم کا منظر دل ہلا دینے والا تھا۔ بیڈ پر سہراب کی لاش پڑی تھی اور آس پاس خون بکھرا ہوا تھا۔ سرفراز تیزی سے پلٹا اور پولیس اسٹیشن انفارم کرتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔

ظریف چوہدری کے سر سے کافی تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔ سرفراز اسے لے کر ایک اسپتال پہنچا جہاں جب تک ڈاکٹر اس کے ماتھے کی پٹی کرنے کے لیے خون صاف کر رہے تھے تو معلوم ہوا کہ اس کے چہرے پر میک اپ ہے۔ کچھ ہی دیر میں اس کا میک اپ صاف کر کے اصلی شکل سامنے نکل آئی۔ یہ ظریف چوہدری نہیں بلکہ اس کے میک اپ میں کوئی اور ہی تھا۔ سرفراز نے سوچا اعیان کو اطلاع کرنی چاہیے۔ لیکن پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ پہلے جان تو لوں کہ یہ کون ہے' اس کے بعد اطلاع کرتا ہوں۔ ڈریسنگ کے بعد سرفراز اسے لے کر پولیس اسٹیشن پہنچا اور اسے حوالات میں ڈال کر اسی کے پاس بیٹھ کر اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ اسے ہوش آنے لگا۔

”کون ہو تم؟“ ہوش میں آنے کے بعد جب وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تو سرفراز نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”شرافت شاہ۔“

سرفراز کو اس کی تلاشی میں ایک ریوالور ملا تھا جس پر ایس ایس کندا تھا۔ جس سے وہ اس کے نام کا کچھ کچھ اندازہ کر چکا تھا۔ بس وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ سچ بولتا ہے یا جھوٹ۔

”تمہاری رئیس سہراب نواز سے کیا دشمنی تھی؟“

”کچھ نہیں۔“

”تو پھر اسے کیوں مارا؟“

”اسٹار کا حکم تھا۔“

”او کے۔ ظریف چوہدری کو جانتے ہو؟“

”نام اور حلیے کی حد تک۔“

”تم نے ظریف چوہدری کا میک اپ کیوں کیا ہوا تھا؟“

”اسٹار نے ایسا ہی حکم دیا تھا۔“

”اسٹار۔ اسٹار۔ اسٹار۔ کون ہے یہ اسٹار؟“ سرفراز چڑ

ر بولا۔

''معلوم نہیں۔ ابھی تک کسی نے اسے دیکھا نہیں ہے۔''

''تم لوگوں تک اس کا حکم کس طرح پہنچتا ہے؟''

''فون کے ذریعے۔''

''کس نمبر سے کال آئی تھی؟'' سرفراز اس کے موبائل فون کی کال ہسٹری چیک کرتے ہوئے بولا۔

''آخری ریسیو کال اسٹار کی ہی تھی۔''

آخری ریسیو کال دیکھ کر سرفراز کا سر گھوم گیا۔

کیوں؟

کیونکہ آخری ریسیو کال کریم خان کی تھی۔ انسپکٹر کریم خان کی۔



''مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ میرے کمرے میں آؤ۔'' کریم خان یہ کہہ کر گیسٹ روم سے نکل گیا۔

اس وقت اعیان بڑے پیار سے ہانیہ کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جو ناشتہ کرنے کے بعد دواؤں کے زیر اثر دوبارہ سوگئی تھی۔ وہ اٹھا اور کریم خان کے بیڈروم میں پہنچ گیا۔

''اعیان! میں ابھی ابھی زاہد علی سر سے مل کر آرہا ہوں۔ حالات بہت خراب ہوچکے ہیں۔ ڈپارٹمنٹ ہماری قربانی دے کر اپنی عزت بچانے کے موڈ میں نظر آرہا ہے۔''

''فکر مت کرو۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا'' اعیان بڑے سکون سے بولا۔ جہاں ایک طرف کریم خان کے چہرے پر تناؤ صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ وہیں دوسری طرف اعیان بہت پرسکون تھا۔

''کیوں۔ کیوں نہیں ہوگا۔ شہر بھر میں موت کا بازار گرم ہے۔ ایک لاش ابھی دفن بھی نہیں ہوتی کہ دوسری پہلے سے تیار ہوتی ہے۔ اور ہم کچھ نہیں کر پارہے ہیں۔ عام آدمی کو تو چھوڑو خود پولیس والے ہی محفوظ نہیں ہیں۔''

''یار کوئی نئی بات کرو۔ جو مجھے معلوم نہ ہو۔'' اعیان تو اعیان ہی تھا۔ کتنی بھی سنجیدہ بات ہو وہ مذاق کرنے سے باز نہیں آتا تھا۔

''ایک سوال پوچھوں۔'' اعیان کا جواب سن کر وہ چند لمحے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے بولا۔

''ہوں۔ پوچھو۔''

''تم مجھ پر بھروسہ کیوں نہیں کرتے۔'' کریم خان کو یہ شکوہ تھا کہ اعیان اس سے کیس کے بارے میں کوئی بات کیوں نہیں کرتا۔

''کیوں کرنا چاہئے؟'' اعیان نے الٹا سوال جھڑ دیا۔

''کیونکہ میں تمہارے ساتھ اس کیس پر کام۔ نہیں۔ بلکہ میں تمہارا دوست ہوں۔'' اعیان کا عجیب سا جواب سن کر کریم خان کی سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔ جب کچھ نہ سوجھا تو دوستی کی دہائی دینے لگا۔

''یار۔ دوست۔ تمہاری بات سے یاد آیا۔ یہ ہانیہ کو آج کیا ہوگیا ہے؟ یہ ایسا رویہ کیوں رکھے ہوئے ہے۔'' بات کو گھمانے کے فن میں تو اعیان ماہر ہی تھا۔ یہاں ہانیہ کا کوئی ذکر نہیں تھا لیکن اعیان زبردستی باتوں میں ہانیہ کا تذکرہ لے ہی آیا تھا۔

''وہ تم سے بہت ناراض ہے۔'' رانی کمرے میں داخل ہوئی اور اعیان کے برابر میں آکر بیٹھ گئی۔ رانی کے آجانے سے کریم خان اعیان کو گھور کر رہ گیا۔

''رانی۔ آج کل میں کسی نے ڈی گن پر کام کیا ہے کیا'' کریم خان کو نظر انداز کرتے ہوئے اعیان رانی کی طرف گھوم گیا۔

''میری معلومات کے مطابق تو ڈی گن کا باب پروفیسر دلاور جینا کی موت کے ساتھ ہی ختم ہوگیا تھا۔''

''ہاں یار۔ مگر کل کے واقعے نے سوچنے پر مجبور کردیا

ہے۔"

"کوئی مجھے بتائے گا۔ یہ ڈی گن کا کیا قصہ ہے۔؟" کریم خان نے دونوں کا دھیان اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

"ڈن گن ایک ایسی گن تھی، جسے ریموٹ سے کنٹرول کیا جاسکتا تھا۔اس پر پروفیسر دلاور چنہ کام کررہا تھا۔آپ نے ان کا نام تو سنا ہی ہوگا۔تقریباً دس سال پہلے پروفیسر کی موت ہوجانے کی وجہ سے ڈی گن پر کام ادھورا ہی رہ گیا تھا۔اس کے بعد کبھی ڈی گن پر کام نہیں کیا گیا۔مگر کل رات کوانیتا کو ڈی گن کے ذریعے ہی گولی ماری گئی تھی اور اعیان پر حملہ بھی ڈی گن سے ہی کیا گیا تھا۔" اعیان تو کچھ بتانے کے موڈ میں نظر نہیں آرہا تھا اس لیے رانی کو ہی بتانا پڑا۔

"واہ میری جان ۔تمہاری معلومات تو کمال کی ہے۔" اعیان نے باقاعدہ رانی کی کمر ٹھوک کر شاباشی دی۔جس پر رانی نے ایک کھا جانے والی نظر اعیان پر ڈالی پھر مسکرادی۔

"بولو کیا کرنا ہے مجھے؟" رانی اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ شاباشی بغیر کسی وجہ کے تو دی نہیں گئی ہے۔اعیان اس سے کوئی نہ کوئی کام تو لینا چاہتا ہے۔اس لیے مسکا لگا رہا ہے۔

"پروفیسر دلاور چنہ کن غیر قانونی دھندوں میں لپٹ گیا تھا؟ کیا سچ میں اس کی موت کے وقت تک ڈی گن پر کام مکمل نہیں ہو پایا تھا اور کیا پروفیسر نے کوئی دوسری لیب بھی بنائی ہوئی تھی؟ چاہے وہ کوئی بہت پرانی لیب ہو۔" اعیان ایک دم اپنے مطلب کی بات پر آ گیا۔

"اوکے۔اور کچھ؟" وہ تو ہمیشہ اعیان کی مدد کے لیے تیار رہتی تھی۔

"اور جو بھی پروفیسر کے بارے میں پتہ کرسکو۔" تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد وہ کریم خان سے مخاطب ہوا۔"تم رانی کے ساتھ رہو گے۔"

اس سے پہلے کہ رانی یا کریم خان کوئی جواب دیتے ثوبیہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

"اعیان بھائی۔سرفراز کی کال ہے۔آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

"ہاں سرفراز۔بولو۔" اعیان نے ثوبیہ سے موبائل لیتے ہوئے کہا۔

"سر۔رئیس سہراب نواز کا مرڈر ہوگیا ہے۔"

"بہت اچھی خبر ہے۔ہوگیا نا۔ہوجانے دو۔یہ بتاؤ جو میں نے کہا تھا وہ کیا؟"

"ہاں۔"

"پتہ بتاؤ۔کہاں ہو تم۔" اعیان کے پوچھنے پر سرفراز نے اسے اپنی لوکیشن سمجھادی۔

"پرندوں پر نظر رکھنا۔میں آرہا ہوں وہاں۔" یہ کہہ کر اعیان نے لائن ڈس کنکٹ کردی۔

"کیا ہوا؟" کریم خان نے پوچھا۔

اعیان نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔"میں ایک کام نمٹا کر آتا ہوں۔تم دونوں بھی کام پہ لگ جاؤ۔" اعیان دونوں کو یہ ہدایت دے کر جانے لگا۔

"کہاں جارہے ہو۔مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔" اعیان کو جاتا ہوا دیکھ کر کریم خان جلدی سے بولا۔

کریم خان کی بات پر اعیان پلٹ کر بولا۔"ابھی ٹائم نہیں ہے۔ضروری بات بعد میں کر لینا۔" پھر کچھ یاد آتے ہوئے اعیان ثوبیہ سے بولا۔"بھابھی ایک کام کروگی؟"

کیا؟"

"میری طرف سے ہانیہ سے معافی مانگ لینا۔"

"اور تمہاری طرف سے پیارا سے کریم خان کرلے گا۔ویسے بھی سالی ہے اور آدھی گھر والی سمجھ کر کریم خان کا بھی کچھ حق تو جتا ہی سکتا ہے۔" ثوبیہ نے شرارت سے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے کسی کو اس کے پاس جانے

میں خود ہی معافی مانگ لوں گا۔" اعیان ایک دم بول پڑا اور اس کے اس انداز پر سب ہنسنے لگے۔



اعیان جس ضروری کام کو نمٹانے نکلا تھا اسی سلسلے میں اس کی کار تھوڑی دیر بعد ہارون مرزا کے گھر کے آگے رک رہی تھی۔ ویسے تو ہارون مرزا چار پانچ سال پہلے دوسرے شہر منتقل ہو چکا تھا لیکن کل وہ اپنے دوست رئیس علی نواز کے بیٹے سے ملنے کراچی آیا تھا۔ کچھ آفس کا کام بھی تھا۔ اس لیے وہ اپنے پرانے گھر میں رکا ہوا تھا۔

ڈور بیل کی آواز پر ہارون مرزا نے دروازہ کھولا تو سامنے اعیان کو کھڑا پایا۔ اسے دیکھ کر ہارون مرزا کو پہلے تو تھوڑی حیرت ہوئی پھر غصہ آنے لگا۔ وہ چلاتے ہوئے بولا۔ "تم...... تم پھر آ گئے۔ آخر تم چاہتے کیا ہو۔ کہیں تم مجھے بلیک میل تو نہیں کرنا چاہتے۔ رکو ابھی پولیس کو بلاتا ہوں۔"

جواب میں کچھ کہنے کی بجائے اعیان نے جیب سے کارڈ نکالا اور ہارون مرزا کے آگے کر دیا۔

"انسپکٹر اعیان۔" ہارون مرزا کارڈ پڑھ کر حیرت اور ڈری ڈری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ جس پولیس کی وہ تڑی لگا رہا تھا وہ اعیان کے روپ میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔

اعیان نے ہارون مرزا کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتے ہوئے اپنی کار کی طرف لے جانے لگا۔

"ارے ارے۔ سنو تو۔ میں بے گناہ ہوں۔ میری عزت مٹی میں مل جائے گی۔ تم بس منہ کھولو۔ کتنا پیسہ چاہیے۔ یہ گھر۔ جو بھی چاہیے۔ ایک بار بولو تو۔" ہارون مرزا اسے خریدنے کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ اور ایک سے بڑھ کر ایک دل لبھانے والی پیشکش اعیان کے رکھتا جا رہا تھا۔

اعیان نے اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف کر کے ہتھکڑی لگا دی اور اسے کار کی پچھلی سیٹ پر دھکیل دیا۔

"میں نے تمہیں جو کہانی سنائی تھی۔ جھوٹ نہیں تھی۔ تم جانتے ہو میں قاتل نہیں ہوں پھر کیوں میری عزت نیلام کرنا چاہتے ہو۔ ایسا کر کے تمہیں کیا مل جائے گا۔" ہارون مرزا ریڈیو کی طرح بجتا چلا جا رہا تھا۔ اب اس ریڈیو کو بند کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ اعیان نے ٹیپ سے اس کا منہ بند کر دیا اور اس کے منہ سے غوں غاں نکلنے لگی۔

اس کام سے فارغ ہو کر اعیان نے کار اسٹارٹ کی اور سڑک پر دوڑانے لگا۔ پچھلی سیٹ پر آڑھا ترچھا بیٹھا ہارون مرزا یہ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا کہ ان کا رخ پولیس اسٹیشن کی طرف نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد اس کی کار سیکٹر ستائیس کی ایک سنسان گلی میں داخل ہو رہی تھی۔ ایک گھر کے سامنے رک کر اعیان نے ہارن دیا۔ بمشکل تیس سیکنڈ ہی گزرے ہوں گے کہ دروازہ کھلا اور دو آدمی کار کے پاس آ گئے۔ اعیان نے پچھلی سیٹ کی طرف اشارہ کیا اور انہوں نے بنا کچھ پوچھے۔ بنا کوئی سوال کیے کار کا پچھلا دروازہ کھولا اور ہارون مرزا کو اٹھا کر لے گئے۔ گھر کا دروازہ بند ہوتے ہی اعیان نے بھی کار آگے بڑھا دی۔

اب اعیان کی کار کا رخ پولیس اسٹیشن کی طرف تھا۔

جب وہ پہنچا تو چراغ اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"ہاں باس کیا رہا۔" اعیان نے ہلکے پھلکے انداز میں بات شروع کی اور اپنا دایاں ہاتھ ملانے کے لیے آگے بڑھا دیا۔

"کچھ لکھی لکھائی باتوں اور دم توڑتی تصویروں کے علاوہ کچھ نہیں ملا۔" چراغ نے بھی اسی کے لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

"مطلب یہ کہ تم بھی ادھوری کہانی سنانے والے ہو۔ چلو شروع کرو۔" دونوں باتیں کرتے ہوئے اعیان کے کیبن کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"پچیس سال پہلے آزاد نام کے ایک آدمی نے

سات افراد کے لاپتہ ہونے کی رپورٹ لکھوائی تھی۔ بہت تفتیش کی گئی تھی لیکن نتیجہ صفر نکلا۔ اور ان ساتوں کی لاشیں ڈھونڈنے میں بھی پولیس ناکام رہی تھی۔" اب وہ اعیان کے کیبن میں آ چکے تھے۔ چراغ نے ایک فائل اعیان کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "سر یہ دیکھیں ان لوگوں کی کچھ تصویریں جو لاپتہ ہوئے تھے۔"

اعیان تصویریں دیکھنے لگا اور چراغ نے اپنی بات جاری رکھی۔ "آزاد پچیس سال پہلے سیکٹر پندرہ میں رہتا تھا مگر اس حادثے کے بعد اس نے وہ گھر چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ زندہ ہے یا نہیں۔ کوئی نہیں جانتا۔ میں نے اس کے گھر کی تلاشی بھی لی مگر ہمیں وہاں سے کوئی کارآمد چیز نہیں ملی۔ پڑوسیوں سے معلوم کیا تو انہوں نے بتایا کہ پچھلے پچیس سال سے وہ گھر ایسے ہی بند پڑا ہے۔"

"یعنی آگے بڑھنے کے لیے ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔ اوکے۔ کوئی بات نہیں۔ اگر خدا ہماری مدد کرنا چاہتا ہے تو خود ہی کوئی راستہ دکھا دے گا۔"

"آپ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر انتظار کرنے والوں میں سے نہیں ہو سر۔ کچھ نہ کچھ تو آپ کریں گے ہی۔ بتائیے اب مجھے کیا کرنا ہے۔" چراغ جانتا تھا کہ اعیان ان افسروں میں سے نہیں ہے جو بیٹھ کر مجرموں کے اگلے قدم کا انتظار کرتے ہیں۔ بلکہ وہ ایسی چالیں چلتا تھا کہ مجرم اس کے اشاروں پر ناچنے لگتے تھے۔

"میرے جانے کے بعد تم پورے پولیس اسٹیشن میں یہ خبر پھیلا دینا کہ انفا رمر کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اور ہم اسے ایک خفیہ جگہ رکھ کر تفتیش کر رہے ہیں۔"

اعیان کی بات سن کر چراغ کی آنکھیں پھیل گئیں اور اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

"اوکے باس۔ ہو جائے گا۔"

"تم اس کام پہ لگو میں چلتا ہوں۔" اعیان جانے کے لیے اٹھ کر باہر کی طرف بڑھا۔ تب ہی چراغ کو کچھ یاد آ گیا۔

"ارے سر رکیئے۔" اس نے ہلکے سے چلاتے ہوئے آواز دی۔

اعیان دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ رک کر اس کی طرف پلٹا اور آنکھوں کے اشارے سے پوچھا کیا ہوا؟

چراغ جلدی سے اعیان کے پاس پہنچا۔ "سر آپ کا موبائل تو پرزے پرزے تھا بس یہ سم ہی کام کی لگی لے آیا۔"

اعیان کے کہنے پر چراغ وہاں سے موبائل لینے گیا تھا جہاں کل رات ہانیہ سے بات کرتے ہوئے غصے سے دیوار پر مار کر توڑ دیا تھا۔

"تھینکس یار۔" اعیان نے سم لیتے ہوئے کہا۔

"سر اس بار کوئی سستا سا موبائل خریدنا۔ غصہ آئے گا تو نقصان کم ہوگا۔" چراغ نے ہنس کر کہا اور اعیان بھی مسکرا دیا۔

سم مل گئی تھی تو اب موبائل بھی ضروری ہو گیا تھا۔ بغیر دیر کیے وہ موبائل مارکیٹ جا پہنچا اور ایک مہنگا والا سیٹ لے لیا۔ موبائل میں سم لگاتے ہی اس کے دل میں اپنی جان، اپنی محبت۔ اپنی روح ہانیہ سے بات کرنے کی خواہش کروٹ لینے لگی۔ اس نے جھٹ سے ہانیہ کا نمبر ڈائل کیا لیکن جانے دل میں کیا آئی کہ بیل جانے سے پہلے ہی لائن کاٹ دی اور ثوبیہ کا نمبر ڈائل کیا۔

"ہیلو۔" دوسری طرف سے ثوبیہ کی آواز ابھری۔

"بھابی۔ ہانیہ کی طبیعت کیسی ہے اب۔"

"اچھی ہے۔"

"ابھی تک سو رہی ہے کیا؟"

نہیں جاگ رہی ہے اور فیضی کے ساتھ کھیل رہی ہے۔"

"ذرا بات تو کروائیں۔"

"ارے ہانی لے اعیان کی کال ہے بات کر لو۔" اعیان کو ثوبیہ کی آواز سنائی دی۔ ہانیہ شاید موبائل لے نہیں رہی تھی اس لیے بھابھی کی آواز پھر سے آئی تھی۔

"لے لو۔اب زیادہ نخرے مت دکھاؤ۔"
اس بار ہانیہ نے موبائل لے لیا اور سپاٹ سی آواز اعیان کے کان تک پہنچی۔"ہیلو۔"
"کیسی ہو؟" اعیان نے نہایت خوشگوار انداز سے بات شروع کی۔
"ٹھیک ہوں۔" ہانیہ کا لہجہ خشک ہی تھا۔
"سوری یار۔ کچھ کام تھا۔اس لیے آنا پڑا۔"
"کوئی بات نہیں۔"
"کھانا کھالیا تم نے۔"
"ہاں۔"
نہ کوئی سوال نہ کوئی شکایت۔ ہانیہ بڑی بے رخی سے اس کے ہر سوال کا جواب دے رہی تھی۔ وہ ایسی تو نہیں تھی۔ اعیان کو اس کے اس رویئے سے بہت دکھ ہو رہا تھا۔ آخر کب تک وہ خود کو سنبھالے رہتا۔ صبح سے ہانیہ نے یہی رویہ اپنایا ہوا تھا۔ وہ بکھر گیا۔"یار پلیز معاف کر دو نا۔ مجھ سے ایسے غیروں کی طرح بات نہ کرو۔ بہت تکلیف ہو رہی ہے مجھے۔کل میں ہوش میں نہیں تھا۔ تمہیں جانے کیا کیا کہتا چلا گیا۔ مگر جب ہوش آیا تو بہت افسوس ہوا مجھے۔ بہت پچھتایا۔ پلیز اس بار معاف کر دو۔ آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں ہوگی۔ چاہے جو سزا دے لو۔ کوئی بھی سزا۔" بڑی سے بڑی مصیبت کے سامنے چٹان کی طرح کھڑے رہنے والا شخص ایک نازک سی لڑکی کے سامنے ٹوٹ کر بکھر رہا تھا۔
"یہ آپ سے کس نے کہا کہ میں ناراض ہوں۔" ہانیہ نے اس کی باتوں کا کوئی اثر لیے بغیر کہا۔ اس کے لہجے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ ابھی تک اسی طرح خشک اور روکھے انداز سے بات کر رہی تھی۔
"ناراض نہیں ہو تو پھر یہ اجنبی پن کیوں۔تم نے کوئی شکوہ بھی نہیں کیا۔ کوئی شکایت بھی نہیں کی......وہ پہلے والی ہانیہ کہاں گئی جو ذرا سی بات پر تڑپ جایا کرتی تھی۔ جو جان جان کہہ کر پیار بھری باتیں کیا کرتی تھی۔"
"مر گئی۔" وہی روکھا جواب۔
"کیا۔" اعیان چلا اٹھا۔
"کچھ نہیں۔"
"ہانی۔ پلیز مان جاؤ نا۔ ایسا مت کرو میرے ساتھ۔ آج سے تم جو کہو گی' میں وہی کروں گا۔ تمہیں میری یہ پولیس کی نوکری پسند نہیں ہے نا' چھوڑ دوں گا۔" اعیان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ کر ہانیہ کو منائے۔ ایسا کیا کرے جس سے ہانیہ کی ناراضگی دور ہو جائے۔ ہانیہ کی بیگانگی اس کی جان لیے جا رہی تھی۔
"وعدہ کرتے ہو۔ جو کہوں گی کرو گے۔" ہانیہ کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ اعیان سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہو۔
"ہاں وعدہ کرتا ہوں۔" ہانیہ کو منانے کے لیے اس وقت اعیان کچھ بھی کر گزرنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے جھٹ سے وعدہ کر لیا۔
"تو۔ جب تک میں یہاں ہوں۔ تم ثوبیہ کے گھر نہیں آؤ گے۔" ہانیہ نے سزا سنا دی۔ جبکہ اعیان اب ایک پل بھی الگ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ ہانیہ کی بات سن کر اعیان کو ایسا لگا جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ دیا ہو۔ وہ تڑپ اٹھا۔
"پلیز ہانی۔ ایسا مت کرو۔ میں اب تم سے دور نہیں رہ سکتا۔"
"معافی چاہتے ہو نا؟" ہانیہ کی آواز کی سختی بتا رہی تھی کہ وہ بالکل بھی رعایت کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔
"ہاں۔"
"تو جو میں نے کہا ہے وہ کرنا ہوگا۔" اتنا کہہ کر دوسری طرف سے ہانیہ نے کوئی جواب سنے بغیر لائن ڈس کنکٹ کر دی۔
اعیان موبائل کو گھورتا رہ گیا۔ اسے لگ رہا تھا کہ چھوٹی سی غلطی کی بہت بڑی سزا سنائی گئی ہے۔ اس کے لیے تو جدائی کے ایک لمحے کے بارے میں سوچنا بھی جان لیوا تھا' جبکہ یہاں تو کئی دن' کئی راتیں تڑپنا تھا۔ اور

اس کی بھی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ یہ سزا کاٹ لینے کے بعد کوئی اور سزا نہیں ملے گی۔ مگر ہانیہ کو منانے کے لیے اعیان ایسی کتنی ہی سزائیں کاٹنے کو تیار تھا۔

جانے کتنی دیر تک اعیان اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اپنی غلطی پر پشیمان ہوتا رہا' غصہ کرتا رہا۔ لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا' جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔ اب اس کے افسوس کر لینے سے صورت حال تبدیل ہونے سے تو رہی۔

آخر تھک ہار کر اس نے اپنی کار اسٹارٹ کی اور شہر سے باہر جانے والے راستے پر ڈال دی۔ بیس پچیس منٹ بعد اس کی کار شہر کو پیچھے چھوڑ چکی تھی۔ تقریباً دو یا تین کلومیٹر آگے جانے کے بعد اعیان نے کار کی رفتار کم کی اور کار کو مین روڈ سے ایک چھوٹے کچے راستے پر اتار دیا۔ کچھ دور سیدھ میں چلنے کے بعد اعیان نے اونچی نیچی جھاڑیوں کے بیچ کار کو روک دیا۔ ان جھاڑیوں میں چھپی کار مین روڈ سے نظر نہیں آ سکتی تھی' کیونکہ دور دور تک سر سے اونچی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

وہ کار سے اترا اور جھاڑیوں کے بیچ راستہ بناتے ہوئے پیدل ہی آگے بڑھنے لگا۔ کچھ دور پیدل چلنے کے بعد اعیان کو سامنے جھاڑیوں میں چھپا ہوا ایک آدمی نظر آیا جس کی پیٹھ اعیان کی طرف تھی' قدموں کی آہٹ پر وہ آدمی پلٹا جو کوئی اور نہیں سرفراز تھا۔ ''ارے سر آپ آ گئے۔''

''ہاں سرفراز اعظم۔ بتاؤ کیا رہا؟''

''سر۔ سامنے مین روڈ پر جو ڈھابا ہے اور اس ڈھابے کے پیچھے جو کمرہ ہے۔ ظریف چوہدری کی بیٹی کو اس میں رکھا گیا ہے۔ کل تین افراد ہیں۔ اور تینوں اس وقت وہیں موجود ہیں۔'' سرفراز نے مفصل رپورٹ دیتے ہوئے کہا۔

''مطلب یہ کہ آسانی سے پکڑ میں آ سکتے ہیں تمہارے پاس کتنے آدمی ہیں؟''

''دو سپاہی سڑک کی دوسری طرف سے ڈھابے پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔''

''ان سے کہو ایکشن میں آ جائیں۔ ہم پیچھے سے آگے بڑھتے ہیں۔ وہ سامنے سے مورچہ سنبھال لیں۔'' اعیان نے ہدایات دیتے ہوئے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے سر۔ مگر میں آپ کو ایک بہت ضروری بات بتانا چاہتی ہوں۔''

''ضروری بات بھی ضرور کریں گے۔ مگر آگے بڑھتے ہوئے۔'' اس نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

سرفراز بھی اس کے پیچھے لپکتے ہوئے سپاہیوں کو کال کرنے لگا۔ بات کرتے ہوئے وہ اعیان سے کچھ پیچھے رہ گیا۔ کال سے فارغ ہو کر وہ تیز قدموں سے اعیان کے قریب پہنچ گیا۔

''سر آپ کو معلوم ہے رئیس سہراب نواز کا قتل کس نے کروایا ہے؟''

''نہیں۔''

''سر کریم خان نے۔''

''کیا۔ کیا کہا تم نے۔'' اعیان رک گیا۔ اسے لگا شاید اس سے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

وہیں کھڑے رہ کر سرفراز نے اسے شرافت شاہ کی گرفتاری اور اس سے کی جانے والی تفتیش کے نتیجے میں سامنے آنے والی تمام باتیں اعیان کے گوش گزار کر دیں۔

اسی دوران ڈھابے کے اندر ہلکا سا شور مچا اور کوئی ڈھابے کی پچھلی دیوار پھلانگ کر جھاڑیوں میں بھاگنے لگا۔

اعیان نے اس آدمی کے پیچھے دوڑ لگاتے ہوئے سرفراز سے کہا۔ ''تم اندر سنبھالو۔'' اور اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے سرفراز ڈھابے کی دیوار پھلانگ کر اندر کود گیا۔

اعیان کی رفتار بہت تیز تھی اور آگے بھاگنے والا جی توڑ کوشش کے باوجود اعیان سے تیز نہیں بھاگ پا رہا

تھا۔اس لیے لمحہ بہ لمحہ دونوں کے بیچ کا فاصلہ کم سے کم ہوتا جارہا تھا۔دیکھتے ہی دیکھتے اعیان اس کے بالکل قریب پہنچ گیا اور قریب پہنچتے ہی پیچھے سے اسے زوردار دھکا دیا جس کی وجہ سے وہ قلابازیاں کھاتا ہوا آگے کی طرف گر پڑا۔اعیان رک کر اسے دیکھنے لگا جو اس کی توقع کے برخلاف جلد ہی اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا اور دوسرے ہی پل اعیان پر حملہ آور ہو چکا تھا' مگر اعیان اس کے لیے پہلے سے تیار تھا۔مخالف اپنی جان چھڑانے کے لیے بڑھ بڑھ کر حملے کررہا تھا مگر اعیان کے آگے اس کی ایک نہ چلی اور وہ زیادہ دیر تک اعیان کے آگے نہ ٹک سکا اور بے ہوش ہوکر زمین پر ڈھیر ہوگیا۔اسے وہیں بے ہوش چھوڑ کر اعیان ڈھابے کی طرف بڑھ گیا۔ بھاگتے بھاگتے وہ کافی دور نکل آئے تھے اس لیے واپس ڈھابے تک جانے میں اسے کچھ وقت لگ گیا۔ جب وہ اندر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ باقی بچے دو بھی حراست میں لیے جاچکے تھے۔اور بچی بالکل محفوظ تھی۔

اعیان نے دونوں سپاہیوں کو ان ملزموں کے ساتھ پولیس اسٹیشن روانہ کردیا اور بچی کو سرفراز کے ساتھ اس کے گھر بھیج دیا۔یہاں سے فارغ ہوکر وہ دوبارہ ڈھابے کے پیچھے جھاڑیوں میں پہنچا جہاں وہ تیسرے ملزم کو بے ہوش چھوڑ کر آیا تھا۔ چلتے چلتے اس نے موبائل پر چراغ کو ہدایت کی اور لوکیشن سمجھا کر جلد سے جلد پہنچنے کو کہا۔

اتنی دیر میں اعیان اس بے ہوش ملزم کے پاس پہنچ چکا تھا۔اعیان نے اس آدمی کو اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور اپنی کار کی طرف قدم بڑھا دیئے۔کار کے پاس پہنچ کر اس نے ملزم کو پچھلی نشست پر ڈالا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر کار کو گھما کر مین روڈ پر لاکر روک دیا اور چراغ کا انتظار کرنے لگا۔اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا اور چراغ اپنی بائیک پر وہاں پہنچ گیا۔

اعیان نے اپنی کار کی چابی اس کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔''یہ رہا انفارمر۔اسے خفیہ ٹھکانے پر پہنچادو۔'' یہ کہتے ہوئے اعیان نے اسے ایک پتہ سمجھایا اور اس کی بائیک کی چابی لے کر اس پر سوار ہوگیا۔اور دونوں اپنے اپنے راستے پر چل پڑے۔



کریم خان' رانی کو لے کر پولیس اسٹیشن پہنچ چکا تھا جہاں رانی پروفیسر دلاور چنہ کی فائل کا مطالعہ کرنے لگی اور کریم خان ایسے ہی بیٹھا رہا۔ پولیس کو شک تھا کہ پروفیسر منشیات کا اسمگلر تھا مگر ان کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔اور پروفیسر کی موت کے بعد تو یہ کیس ہی لپیٹ کر ایک طرف ڈال دیا گیا تھا۔ اس فائل میں پروفیسر کی کسی دوسری لیب کا ذکر نہیں تھا۔فائل سے فارغ ہوکر رانی کے کہنے پر وہ دونوں پروفیسر کے رشتے داروں سے ملنے گئے۔جہاں سے انہیں پروفیسر کے آباؤاجداد کی ایک بہت پرانی حویلی کے بارے میں پتہ چلا۔ساری تفتیش کا ذمہ رانی نے ہی اٹھایا ہوا تھا جبکہ کریم خان تو صرف پخ کے طور پر اس کے ساتھ گھوم رہا تھا۔

حویلی کی طرف جاتے ہوئے کریم خان نے پوچھا۔''ہم وہاں کیا کرنے جارہے ہیں۔کیا لینے جا رہے ہیں۔آخر اب وہاں ہمارے کام کا کیا ملنے والا ہے۔رانی ہم خواہ مخواہ ہی اپنا وقت برباد کررہے ہیں۔''

''کریم بھائی۔چل کر دیکھ لیتے ہیں۔کیا پتہ کچھ مل ہی جائے۔'' رانی نے کہہ تو دیا تھا مگر اتنے عرصے کے بعد اس حویلی میں کام کی کوئی چیز ملتی اس کا امکان بہت ہی کم تھا۔

''اعیان تو بالکل پاگل ہے۔کچھ پتہ نہیں چلتا کہ جانے کیا کیا کرتا پھرتا ہے۔اسے تو کبھی اتنی توفیق ہی نہیں ہوتی کہ ڈھنگ سے بیٹھ کر کیس کے بارے میں کوئی بات ہی کرلی جائے۔ایک دوسرے کی رائے لی جائے اور کیس کو حل کرنے کا کوئی راستہ تلاش کیا جائے۔ ناجی نا۔اسے تو بس اپنا ہی کام کرنا ہوتا ہے۔کمینہ خود کو ہٹلر سمجھتا ہے۔اور ہم اس کے سپاہیوں کی طرح اس کا حکم

ماننے پر مجبور ہیں۔'' اعیان کے بات نہ کرنے پر کریم خان کا غصہ ابھی بھی برقرار تھا۔

رانی جانتی تھی کہ کریم خان کا یہ غصہ کچھ ہی وقت کے لیے ہے' پھر خود ہی اتر جائے گا۔ اس لیے اس نے کریم خان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

پندرہ بیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد کریم خان نے کار ایک پرانی' بہت پرانی حویلی کے آگے روک دی۔ حویلی کی دیواریں بہت اونچی اونچی تھیں جو دھوپ اور بارش کی مار جھیل جھیل کر سیاہی مائل کائی زدہ ہو چکی تھیں۔

حویلی کا مین گیٹ مضبوط لکڑی کا نہایت رعب دار قسم کا تھا۔ دونوں تھوڑی دیر تک دروازے کے آگے کھڑے اسے دیکھتے رہے' پھر رانی آگے بڑھی اور دروازے کو ہلکا سا دھکا دے کر دیکھنا چاہا کہ دروازہ اندر سے کہیں بند تو نہیں۔ لیکن دھکا لگتے ہی ایک ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ تھوڑا سا کھل گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور رانی نے پہل کرتے ہوئے اندر قدم بڑھا دیئے۔ کریم خان بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔

سامنے ایک اچھا خاصہ میدان تھا' جو اس حویلی کے ابتدائی دنوں میں یقیناً ایک شاندار باغ رہا ہوگا۔ وہ دونوں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ ابھی تھوڑا ہی آگے گئے تھے کہ ایک نہایت ہی ناگوار بو ان کی ناک سے ٹکرائی۔ اس میدان کے پار ایک قطار میں کئی کمرے بنے ہوئے تھے اور یہ بد بو اسی طرف سے آ رہی تھی۔ رانی نے اپنی ناک پر رومال رکھا اور کچھ سوچ کر بد بو کی سمت بڑھنے لگی کریم خان بھی اس کے پیچھے تھا۔ میدان پار کر کے وہ اس کمرے کے سامنے پہنچ گئے جہاں سے بد بو کے بھبکے اٹھ رہے تھے اور دروازے کے باہر سے بھی کچھ کیڑے رینگتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ رانی نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول دیا اور کمرے کے بیچوں بیچ فرش پر پڑی لاش ان کا انتظار کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد سنسان رہنے والی اس حویلی کی قسمت چمک چکی تھی۔ ہر طرف زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ماہرین نے لاش کا معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ اسے مرے چھ یا سات دن گزر چکے ہیں۔

حویلی کے دوسرے کمروں کی تلاش کے دوران ایک کمرے سے طرح طرح کے ماسک' میک اپ کا سامان اور کپڑے برآمد ہوئے۔ باقی کے کمرے خالی تھے۔ اس حویلی میں ایک بہت بڑا ہال نما کمرہ بھی تھا جس کا دروازہ بڑی مشکلوں کے بعد کھولا گیا۔ اس ہال میں سے بڑی تعداد میں جدید اسلحہ برآمد ہوا۔ اور حیرت کی بات یہ تھی کہ ان میں سے زیادہ تر ہتھیار پروفیسر دلاور چنہ کے ایجاد کردہ تھے۔ ہال میں ایک جدید کمپیوٹر بھی پایا گیا جس کی سیکورٹی نہایت شاندار تھی اور ہیکنگ کے ماہرین کی کوششوں سے اس کی سیکورٹی توڑی گئی تو اس کمپیوٹر کے ذریعے اسٹار گروپ کی تمام تفصیل ان کے سامنے موجود تھی۔

تفصیل کو پڑھنے کے بعد سب کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ وہ گروپ تمام جرائم بزنس کی طرح منظم طریقے سے انجام دیتا تھا۔ الگ الگ کاموں کے لیے الگ الگ ڈپارٹمنٹ تھے۔ اس گروپ کے کل چار ڈپارٹمنٹ تھے۔ کوبرا گینگ۔ گولڈن گینگ۔ کنگ گینگ اور چوتھے گینگ یا ڈپارٹمنٹ کو کوئی نام نہیں دیا گیا تھا۔ جانو ٹی ٹی کوبرا گینگ کو سنبھالتا تھا۔ امان خان گولڈن گینگ کو' فواد سلیم کنگ گینگ کو اور گمنام گینگ کی کمان اجمل کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ کمال اور ریڈ 001 (شفقت چینا) ان چاروں سے کام لیتے تھے۔ اور اس پورے بزنس کو سنبھالنے کے لیے کسی کامیاب بزنس مین کی ضرورت تھی۔ اس لیے یہ کام ظریف چوہدری کو سونپ کر اسے اسٹار گینگ کا باس بنایا گیا تھا۔

سب سے حیرانی والی بات جو دیکھنے کو ملی تھی وہ یہ تھی کہ اسٹار گینگ کے ہر ایمپلائی کو ان کے عہدے کے

حساب سے ماہانہ تنخواہ دی جاتی تھی۔
حالانکہ اس کمپیوٹر سے بہت سی باتیں صاف ہوگئی تھیں لیکن ابھی بھی کئی راز برقرار تھے۔ جن میں سے ایک راز یہ کہ اسٹار کون ہے؟ اور وہ لاش کس کی تھی جو اس حویلی کے کمرے سے برآمد ہوئی تھی؟
لاش کی پہچان کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ رات ہوتے ہوتے یہ معلوم کرلیا گیا کہ وہ لاش پروفیسر دلاور چنہ کی تھی۔ یہ بات سب کو چونکا دینے کے لیے کافی تھی اور کسی کو بھی اس بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔ مگر کسی کے یقین نہ کرنے سے سچائی بدل نہیں سکتی تھی۔ ڈاکٹرز کے مطابق پروفیسر کی موت ہارٹ اٹیک کے باعث ہوئی تھی۔ اور اب یہ سوچنے کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی کہ اسٹار کون تھا۔
اس بڑی کامیابی پر سب ہی خوش تھے۔ پورے پولیس ڈپارٹمنٹ میں جشن کا سا سماں تھا۔ مگر اس بھیڑ میں ایک شخص ایسا تھا جس کے ماتھے پر فکر کی لکیریں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اور وہ تھا انسپکٹر اعیان۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر پروفیسر دلاور چنہ اسٹار تھا تو وہ تو سات دن پہلے مر چکا تھا۔ پھر اس کے نام پر یہ سارا کھیل کون کھیل رہا تھا؟
کیا پروفیسر واقعی میں طبی موت مرا تھا؟
یا اسے مارا گیا تھا؟
ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ پروفیسر اسٹار نہ ہو؟
یا پروفیسر کی موت کے بعد کوئی اور اسٹار بن گیا ہو؟
یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ کوئی پروفیسر کو مار کر اس کی جگہ اسٹار بن گیا ہو؟
اسٹار کوئی بھی تھا..... مگر وہ اسے کیوں بچا رہا تھا آخر وہ اس سے چاہتا کیا تھا..... اعیان کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔
اتنا بڑا کارنامہ انجام دینے پر خود آئی جی صاحب موقعہ واردات پر پہنچ گئے تھے۔ وہ اس کیس پر کام کرنے والے دونوں انسپکٹرز اعیان اور کریم خان سے ملنا چاہتے تھے۔ اعیان تو صاف کنی کترا گیا اس لیے اکیلے کریم خان کو ہی آئی جی صاحب سے ملنا پڑا۔



شہری آبادی سے دور، جنگل میں بنے ایک چھوٹے سے گھر میں انفارمر (تیسرے ملزم) کو رکھا گیا تھا۔ گھر کے سامنے ریت کی بوریوں سے بھری چھوٹی چھوٹی دیواریں بنائی گئی تھیں۔ جس کے پیچھے چار مستعد سپاہی متعین تھے۔ چراغ اندر انفارمر کے پاس تھا۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ اور چاند کی چودھویں رات کی وجہ سے چار سو خوشگوار چاندنی بکھری ہوئی تھی جو اس جنگل کی وحشت کو کسی قدر کم کرنے کا باعث بن رہی تھی۔ تقریباً نو بج کر پانچ منٹ پر پیڑوں کے پیچھے سے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کچھ لوگ سوکھے پتوں پر چل رہے ہوں۔
سرسراہٹ کی آوازیں سن کر گیٹ پر کھڑے سپاہی چوکنے ہوگئے۔ ''کون ہے وہاں؟'' ایک سپاہی نے چیخ کر کہا۔ اور جواب میں ان پر فائرنگ شروع کردی گئی۔ فائرنگ کی آواز سن کر چراغ بھی باہر کی طرف بھاگا۔ حملہ آور پیڑوں کا سہارا لے کر فائرنگ کر رہے تھے اور ریت کی بوریوں کے پیچھے محفوظ سپاہی بھی ان کا مقابلہ کر رہے تھے۔ باہر آتے ہی چراغ بھی اپنے سپاہیوں کے ساتھ اس مقابلے میں شامل ہوگیا۔
سامنے دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کو مرنے مارنے پر تلی ہوئی تھیں۔ اور ادھر کوئی تھا جو گھر کی پچھلی دیوار پھلانگ کر اس گھر میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ چوروں کی طرح دیواروں کے سائے میں چھپتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی تیزی سے ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے کسی کی تلاش ہو۔ سامنے ایک کمرے کے کھلے دروازے سے نظر آتے ایک شخص پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں چمکنے لگیں، جو کرسی پر رسیوں کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔

وہ احتیاط اور تیزی دونوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے اندر پہنچا اور ریوالور کی نال اس کی کنپٹی سے لگاتے ہوئے بولا۔ ''خاموش رہنا۔ آواز نکلی تو گولی۔''

اس نے جلدی جلدی انفارمر کو کھولا اور اس کی کمر سے ریوالور ٹکا کر اسے اسی راستے پر دھکیلنے لگا جہاں سے وہ داخل ہوا تھا۔

''چلو اوپر چڑھو اور دوسری طرف کود جاؤ۔'' دیوار کے پاس پہنچتے ہی اس نے حکم دیا اور انفارمر نے اس کی تعمیل میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ البتہ وہ حیران ضرور تھا کہ یہ اجنبی مہربان ہے کون۔ مہربان بھی ہے یا؟

انفارمر کے کودنے کے بعد وہ بھی دیوار پر چڑھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ تب ہی پیچھے سے ایک آواز سنائی دی۔ ''اتنی جلدی کہاں چل دیئے سر۔ چائے ٹھنڈا تو پی کر جانا۔''

وہ تیزی سے پلٹا تو دیکھا کہ سامنے اعیان کھڑا مسکرا رہا تھا۔ دیوار پر چڑھنے کے لیے اس نے اپنی ریوالور بیلٹ میں اڑس لی تھی۔ اس کا ہاتھ تیزی سے بیلٹ پر گیا۔ مگر ریوالور وہاں سے غائب تھی اور اعیان کے ہاتھ میں نظر آ رہی تھی۔

''ارے رے۔ بابا ایسے مت گھورو۔ مجھے بہت جلدی نظر لگ جاتی ہے۔ اور آج تو میں کالا ٹیکا لگانا بھی بھول گیا ہوں۔'' اعیان کے گورے گورے گال شرم سے سرخ ہو رہے تھے۔ اجنبی نے کوئی جواب نہیں دیا' بس وہ اعیان کو گھورے جا رہا تھا۔

''ارے گرو۔ اتنا غصہ کیوں کرتے ہو۔ جسے آپ نے بھگایا ہے اسے بھی پکڑ لیا جائے گا۔'' اعیان نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ دراصل وہ اسے جتانا چاہتا تھا کہ انفارمر بھی بچ کر بھاگ نہیں پائے گا۔

''بچے کیوں اپنی موت کو دعوت دے رہے ہو۔ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تم میرے راستے میں مت آؤ۔'' اس اجنبی نے پہلی بار لب کشائی کرتے ہوئے کہا۔ اعیان کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر بھی وہ مرعوب نہیں ہوا تھا' الٹا اسے ہی دھمکا رہا تھا۔

''ارے گرو۔ یہ تو بتا دیں کہ آپ ہیں کون۔'' اعیان کے چہرے پر ایسے تاثرات نظر آ رہے تھے جیسے وہ اس سے بہت زیادہ مرعوب ہو گیا ہو۔ جبکہ اصل میں وہ اسے واقعی میں پہچان نہیں پایا تھا۔ اس آدمی کا چہرہ آگ سے بری طرح جھلسا ہوا تھا۔ چہرے کا جو حصہ جھلسنے سے بچ گیا تھا اس کی بناوٹ ظریف چوہدری کے چہرے جیسی تھی۔ لیکن اعیان ابھی بھی یقین کے ساتھ اسے ظریف چوہدری نہیں مان رہا تھا۔

''باس یا ظریف چوہدری۔ جو نام سنا ہو۔ دونوں میرے ہی نام ہیں۔'' وہ بولا۔

''باس۔ ہوں۔ آپ سے ملنے کی تو بہت ہی تمنا تھی سرکار۔ آ گئے ہو تو آؤ۔ چائے شائے پیتے جانا۔'' اعیان ایسی خوشی کا اظہار کر رہا تھا جیسے کسی دیرینہ دوست سے بہت عرصے بعد ملاقات ہو رہی ہو۔ لیکن اندر ہی اندر اعیان کچھ حیران بھی تھا کیونکہ ابھی تک باس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی اور نہ ہی اس سے بھڑنے کی۔ وہ جہاں کھڑا تھا وہاں سے ایک انچ بھی نہیں ہلا تھا۔ اعیان اس کے چہرے سے اس کی سوچ کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''زیادہ ناٹک مت کرو برخوردار۔ ورنہ میرے ذرا سا بٹن دباتے ہی' اس سامنے والے کمرے میں لگا بم اس گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔'' ظریف کے ہاتھ میں اس وقت ایک ریموٹ نظر آنے لگا تھا۔ جو اس نے اپنی پینٹ کی جیب سے نکالا تھا۔

''ماننا پڑے گا باس۔ ٹکر کے آدمی ہو۔ خیر اب بازی تمہارے ہاتھ میں ہے۔ چاہو تو بھاگ سکتے ہو۔ یا ہم سب کو اپنے اس ریموٹ کے بل پر۔ اپنے اشاروں پر نچا سکتے ہو۔'' اعیان نے مسکین سے لہجے میں کہا۔ جیسے بم کی دھمکی سن کر وہ واقعی خوفزدہ ہو گیا ہو۔

''اپنے آدمیوں سے کہو ہتھیار پھینک دیں۔''

ظریف نے حکم دیتے ہوئے کہا۔
''میں نہیں کہتا۔'' اعیان کسی ضدی بچے کے سے انداز میں بولا۔
''انجام کے ذمہ دار تم خود ہوگے۔ میرے ایک بٹن دباتے ہی کیا ہوگا۔ تم جانتے ہو؟''
''ارے یار بٹن دبا بھی دو...... ڈرا ڈرا کر ہی جان لینے کا ارادہ ہے کیا۔''
ظریف کو ایسے جواب کی امید نہیں تھی۔ ایک لمحے کو اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہوئے مگر اس نے جلد ہی خود پر قابو پالیا۔ اور غصے سے تیوریاں چڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ مذاق نہیں ہے برخوردار اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان پیاری ہے تو جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔''
''تمہارے بس کی بات نہیں ہے استاد۔ لاؤ یہ نیک کام بھی میں ہی کیے دیتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اعیان اس کی طرف ایسے بڑھا جیسے اس کے ہاتھ میں دبے ریموٹ کو جھپٹنا چاہتا ہو۔
ظریف فوراً پیچھے ہٹنے لگا اور دیوار سے جالگا...... اس لیے کہ یہ صرف اس کی گیدڑ بھبکی تھی۔ اس نے کہیں کوئی بم فٹ نہیں کیا تھا۔ اسے اس کام کے لیے اتنا وقت ہی نہیں ملا تھا۔ یہ ریموٹ تو ہر وقت اس کی جیب میں موجود رہتا تھا، جس سے وہ اپنے بنگلے کے کئی حصوں کو کنٹرول کرتا تھا۔ اپنا ریوالور اعیان کے ہاتھ میں دیکھ کر اسے ریموٹ کا خیال آیا تھا اور اس نے یہ اندھی چال چلنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اعیان کے سامنے اس کی ایک نہ چل سکی۔ کیونکہ جب سے وہ دیوار کود کر اندر آیا تھا اعیان بغور اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔
اب باہر سے بھی گولیوں کی آوازیں آنی بند ہوگئی تھیں۔ اعیان نے پہلے سے ہی اپنے کچھ سپاہیوں کو جنگل میں چھپا دیا تھا جو بے پاؤں حملہ آوروں کے سر پر پہنچ کر انہیں اپنے بس میں کر چکے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد سرفراز بھی انفار مرکو لیے اعیان کے پاس پہنچ گیا۔
اعیان نے چراغ، سرفراز اور باقی کے سپاہیوں کو ملزموں کے ساتھ پولیس اسٹیشن بھیج دیا اور سیکورٹی کے انتظامات نہایت سخت کرنے کی ہدایت کردی تھی۔ ابھی اعیان کو ظریف سے بہت کچھ پوچھنا تھا مگر وہ ہانیہ کی وجہ سے بہت ڈسٹرب تھا، اس لیے اپنی عادت کے برخلاف اس نے آج کا کام کل پر ٹال دیا۔ سب کے جانے کے بعد اعیان پیڑوں کے جھرمٹ میں چھپی چراغ کی بائیک تک پہنچا اور اس پر سوار ہوکر شہر کی طرف چل دیا۔



کریم خان اور رانی کو گھر پہنچتے رات کے دس بج گئے تھے۔ ثوبیہ نے کھانا تیار کرلیا تھا۔ گھر پہنچ کر رانی کچھ دیر فیضی سے باتیں کرتی رہی پھر فریش ہونے واش روم میں گھس گئی۔ کچھ دیر بعد وہ سب کھانے کی میز پر اکٹھے بیٹھے تھے۔ کریم خان، ثوبیہ اور ہانیہ کھانا کھاتے ہوئے آپس میں ہلکی پھلکی باتیں کررہے تھے۔ جبکہ رانی بالکل چپ تھی۔ جانے کیوں جب بھی اس کی نظر ہانیہ پر پڑتی تھی اس کا موڈ آف ہوجاتا تھا۔ اور جب جب وہ اعیان اور ہانیہ کو ایک دوسرے کے نزدیک دیکھتی تھی اسے غصہ آنے لگتا تھا۔ اور اس کی وجہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ اور وہ اس کی وجہ جاننا چاہتی تھی۔ اور اسی کوشش میں گم تھی۔ اس کی خاموشی کو سب ہی نوٹ کررہے تھے۔ آخر ثوبیہ نے پوچھ ہی لیا۔ ''کیا بات ہے رانی۔ تم پریشان کیوں ہو؟''
''کچھ نہیں۔'' رانی نے مسکرانا چاہا مگر وہ کامیاب نہ ہوسکی۔
''کچھ تو ہے۔'' کریم خان نے بھی ٹوکا۔
''وہ مجھے اعیان کی فکر ہورہی ہے۔ ابھی تک نہیں آیا۔ اس کا فون بھی سوئچ آف ہے۔''
''ارے اب تمہیں اعیان کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی فکر کرنے والی آچکی ہے۔'' ثوبیہ نے ایک شرارت بھری مسکراہٹ ہانیہ کی طرف اچھالتے

ہوئے کہا۔

''جی۔'' ثوبیہ کی بات سے اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ اعیان پر اب اس کا کوئی حق نہیں رہا تھا۔ یہ خیال بھی جان لیوا تھا۔ اس کی زندگی تو اعیان سے شروع ہوکر اعیان پر ہی ختم ہوجاتی تھی۔ اگر اعیان نہ رہا تو پھر اس کی زندگی میں اور کیا رہ جائے گا۔ کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔

کھانے کے بعد رانی نے فیضی کو سلا دیا تھا مگر نیند اس کی اپنی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ اندر ہی اندر بہت پریشان تھی۔ اور اسے اپنی پریشانی کا سبب بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس نے اعیان کو کال ملائی' اس بار اس کا موبائل کھلا ہوا تھا۔ دوسری طرف سے کافی دیر کے بعد کال ریسیو کی گئی۔

''ہیلو۔'' اعیان کی تھکی تھکی سی آواز رانی کو سنائی دی۔

''کہاں ہو؟''

''اپنے گھر۔''

''یہاں کیوں نہیں آئے۔''

''دل نہیں کررہا تھا۔''

''تمہارا دل تو اب اس کا ہوچکا ہے۔'' رانی ہنسی مگر اس کی ہنسی بہت ہی پھیکی تھی' بالکل کھوکھلی۔

''اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔''

''ہاں۔ بس جلدی سے یہاں آجاؤ۔''

''کیوں۔''

''تم سے بات کرنی ہے۔''

''کرتو رہا ہوں۔''

''زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش مت کرو۔ سمجھے۔''

''رانی میں کریم کے گھر نہیں آسکتا۔''

''کیوں۔ راستہ یاد نہیں رہا کیا۔''

''نہیں۔ ہانیہ نے وعدہ لیا ہے کہ جب تک وہ وہاں ہے۔ میں نہ آؤں۔''

''تو کیا ہوا۔ وعدہ توڑدو۔''

''میں نہیں توڑ سکتا۔''

''تمہیں توڑنا ہی پڑے گا۔'' رانی کی آواز تیز ہوگئی تھی۔

''کیوں۔''

''کیونکہ میں کہہ رہی ہوں۔'' رانی دوٹوک لہجے میں بولی۔

اعیان جواب دینے کی بجائے چپ رہا۔ رانی کی بات نے اسے عجیب سے دوراہے پر لاکھڑا کردیا تھا۔ اس کے سامنے دو ہی راستے تھے' مگر مشکل یہ تھی کہ وہ کوئی بھی راستہ نہیں چن سکتا تھا۔ ہانیہ سے کیے گئے وعدے کو توڑنے کے بارے میں تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اور نہ ہی وہ رانی کو نا کہہ سکتا تھا۔

کافی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ دونوں میں سے کوئی کچھ نہیں بولا۔ جلد ہی رانی کو احساس ہوگیا کہ وہ غلط کررہی ہے۔ اعیان بیچارہ تو پہلے سے ہی دکھی ہے۔

''آخر چل کیا رہا ہے دونوں کے بیچ۔'' رانی نے جھنجلاتے ہوئے خاموشی کو توڑا۔

''وہ مجھ سے ابھی تک ناراض ہے۔''

''تو کیا تم یہ سوچ رہے ہو کہ تم اس سے دور رہو گے تو وہ مان جائے گی؟''

''پتہ نہیں۔''

''کھانا کھالیا تم نے؟'' آواز سے اعیان جتنا دکھی نظر آرہا تھا اسے دیکھتے ہوئے رانی کو لگا کہ اس نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہوگا۔

اور رانی کا سوچنا بالکل صحیح تھا۔ ''نہیں۔ دل نہیں کررہا کچھ بھی کھانے پینے کو۔''

''دیکھو۔ دور رہ کر کسی کو بھی نہیں منایا جاسکتا۔ یہ وعدے شادے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ تم جتنا اس کے پاس رہو گے اتنا ہی جلدی اسے منا سکتے ہو۔''

''مگر میں اس سے وعدہ کرچکا ہوں۔'' اعیان کو بھی رانی کی بات درست لگ رہی تھی مگر پھر بھی اس کا دل

نہیں مان رہا تھا کہ وہ ہانیہ سے کیا ہوا وعدہ توڑ دے۔
''اچھا ایک بات تو بتاؤ۔ اگر ہانیہ آج ہی مان جائے تو کیا یہ وعدہ کوئی حقیقت رکھتا ہے۔''
''نہیں۔''
''تو بس جلدی سے آجاؤ۔ میں کھانا گرم کر رہی ہوں۔''
ٹھیک بیس منٹ کے بعد اعیان' کریم خان کے گھر کی ڈائننگ ٹیبل پر موجود ڈنر کر رہا تھا جبکہ رانی اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اعیان کے چہرے پر پھیلے دکھ اور بے چینی کو صاف محسوس کر رہی تھی۔
''ہانیہ سے شادی کب کر رہے ہو؟'' رانی نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔
''کیا۔'' اعیان کے منہ میں جاتا نوالہ جہاں کا تہاں رک گیا۔
''کیا کبھی ہانیہ سے شادی نہیں کرو گے تم۔''
''نہیں...... ہاں...... ہاں۔'' اعیان گڑبڑا گیا۔ رانی نے سوال ہی اتنا اچانک کیا تھا۔
''اور مجھ سے شادی کب کر رہے ہو۔'' رانی کا ایک اور تابڑ توڑ حملہ۔
''یہ تم آج کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔'' اعیان نے حیرانی سے پوچھا۔
''ہانیہ کی حد تک تو اچھی بات تھی۔ میری باری آئی تو بہکی بہکی بات۔ واہ۔'' رانی نے تیز نظروں سے اعیان کو گھورا۔
''مجھے نیند آرہی ہے۔'' رانی کی باتوں سے بچنے کے لیے اسے یہی ایک آسان راستہ نظر آیا۔ کھانا تو وہ کھا ہی چکا تھا۔ جلدی سے اٹھا اور رانی کے کمرے کی طرف جانے لگا۔
''ادھر کہاں جارہے ہو۔ تمہاری معشوقہ تو گیسٹ روم میں لیٹی ہوئی ہے۔''
''او کے۔'' اعیان تو ویسے بھی اس وقت رانی کی باتوں سے بچنا چاہتا تھا' ایک دم پلٹا اور گیسٹ روم کی طرف چل پڑا۔
رانی نم سی آنکھوں سے اعیان کو دیکھتی رہی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اعیان کو روک لے اور اس چڑیل کے پاس نہ جانے دے۔ مگر دماغ بغاوت کر رہا تھا۔ اس کی رائے تھی کہ اعیان ہانیہ کے پاس زیادہ خوش رہے گا۔
گیسٹ روم کا دروازہ بند نہیں تھا۔ اعیان نے اندر داخل ہوکر سب سے پہلے موبائل اور ریوالور میز پر رکھ دیئے۔ اب وہ ہانیہ کی طرف پلٹا' جو بے ترتیبی سے سوئی ہوئی بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر اعیان کا پیار امڈ کے باہر آرہا تھا۔ اس سے برداشت نہ ہوسکا اور اس نے آگے بڑھ کر اپنے تپتے ہونٹ ہانیہ کے ماتھے پر رکھ دیئے جس سے ہانیہ کی آنکھ کھل گئی۔ کسی کو اپنے اوپر جھکا پا کر اس کا خون کھول گیا اور دماغ نے کام کرنا بند کر دیا۔ اس نے بنا یہ دیکھے کہ کون ہے' بس سامنے والے کو ایک تیز دھکا دے دیا اور اعیان بہت زور سے دیوار سے جا ٹکرایا اور اپنا سر تھام کر فرش پر بیٹھتا چلا گیا۔
ہانیہ نے جب دیکھا کہ سامنے اعیان ہے تو دھک سے رہ گئی۔ وہ اعیان سے چاہے کتنی بھی ناراض سہی لیکن اسے کسی قسم کی چوٹ پہنچانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ تڑپ کر ایک دم سے اعیان کے قریب پہنچ گئی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔
''چوٹ تو نہیں لگی آپ کو۔''
اعیان سمجھ رہا تھا کہ ہانیہ نے یہ سب جان بوجھ کر کیا ہے۔ اس نے ہانیہ کا ہاتھ جھٹکا اور اٹھ کر گیسٹ روم سے باہر نکلتے ہوئے زور سے دروازہ بند کر گیا۔
اعیان کے اس طرح ہاتھ جھٹکنے پر ہانیہ کو بھی غصہ آگیا۔ ''آخر سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔ خود کچھ بھی کہے کچھ بھی کرے تو کوئی بات نہیں اور میں......'' وہ جانے

کیا کیا بڑبڑاتی ہوئی واپس اپنے بستر پر چلی گئی۔ مگر اب نینداس کی آنکھوں سے روٹھ چکی تھی۔

اعیان کو ہانیہ کے کمرے میں بھیجنے کے بعد رانی اپنے بستر پر آنکھیں بند کیے لیٹی کڑھ رہی تھی۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دھم سے دروازہ کھلنے اور قدموں کی آہٹ کمرے میں گونجنے لگی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور اعیان کو دیکھ کر رانی کے دل میں ایک سکون سا پھیلتا چلا گیا۔ اب اس کے دل میں جلن کی بجائے خوشی نے لے لی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ بھاگ کر اعیان سے لپٹ جائے۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اعیان بھی چپ چاپ اس کے برابر میں آ کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

رانی کو نہ جانے کیوں اعیان پر اس وقت بہت پیار آ رہا تھا۔ اس کا دل اعیان کو اپنی بانہوں میں بھرنے کے لیے مچلنے لگا تھا۔ وہ ذرا سا آگے کو کھسکی اور اعیان سے لپٹ گئی۔ دونوں کی سانسیں ایک دوسرے میں الجھ گئیں اور پھر وہ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔



ایک تو ہانیہ نیند نہ آنے سے پریشان ہو رہی تھی اوپر سے موبائل کی ٹیں ٹیں نے اسے تنگ کر دیا۔ وہ موبائل ایجاد کرنے والے کے لیے نئی نئی گالیاں ایجاد کرتی ہوئی اٹھی اور لائٹ جلا کر دیکھا تو میز پر رکھا ہوا موبائل بج رہا تھا۔ جو یقیناً اعیان کا تھا۔ جب تک وہ موبائل کی کال ریسیو کرتی وہ بیچارہ بج بج کر خاموش ہو چکا تھا۔

ہانیہ پلٹ کر بیڈ پر جانے لگی تھی کہ موبائل دوبارہ بجنے لگا۔ وہ پلٹی اور کال ریسیو کر لی۔ ''ہیلو۔''

''اعیان سر سے بات کرنی ہے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''صبح کال کر لینا۔''

''ابھی اور اسی وقت سر سے بات کرنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ پرابلم ہو جائے گی۔''

''دس منٹ بعد کال کر لینا۔'' ہانیہ نے کال کٹ کی اور وال کلاک پر نظر ڈالی۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ ہانیہ نے ایک پل کے لیے سوچا کہ اعیان کس کمرے میں ہوگا۔ پھر اسے رانی کا خیال آیا تو سلیپر پیروں میں ڈال کر اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ رانی جس کمرے میں سو رہی تھی اس کے دروازے پر پہنچ کر ہانیہ ایک پل کو رکی اور دروازے کو ہلکا سا دھکا دے کر یہ کنفرم کیا کہ دروازہ اندر سے بند تو نہیں۔ دروازہ بند نہیں تھا' ہانیہ نے اندر آ کر کمرے کی لائٹ آن کی اور جب اس کی نظر بیڈ پر پڑی تو اس کے سر پر جیسے آسمان سا ٹوٹ پڑا۔

سامنے بیڈ پر اعیان اور رانی نازیبا حالت میں ایک دوسرے میں گم تھے۔ ہانیہ غم اور غصے سے بیڈ کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اسی دوران موبائل ایک بار پھر بجنے لگا' جسے سن کر ہانیہ ہوش میں آئی اور موبائل بیڈ پر پھینکتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

وہی موبائل جس نے کچھ دیر پہلے ہانیہ کی نیند خراب کی تھی' اس نے اعیان کو بھی جگا ڈالا اور جاگتے ہی اس نے سب سے پہلے جو بات نوٹ کی وہ یہ تھی کہ رانی برہنہ حالت میں اس کے سینے پر سر رکھے سو رہی تھی۔ اعیان نے دھیرے سے اس کا سر اٹھا کر تکیے پر رکھا اور اپنے پیروں کے پاس پڑے موبائل کو اٹھا لیا۔ جو بند ہو کر دوبارہ بجنے لگا تھا۔ ''ہیلو۔''

''سر ہارون مرزا کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ کیا کریں؟''

''اوہ۔'' اعیان نے ایک پل کو سوچا۔ ''اسے یونیورسل اسپتال میں داخل کروا دو۔ میں وہیں آ رہا ہوں۔'' اعیان نے کیا اور کیسے جیسے سوالوں میں اپنا وقت برباد نہیں کیا۔ اس نے جلدی سے کپڑے پہنے اور موبائل جیب میں رکھ کر ایک چادر رانی کے بدن پر ڈالتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔



دن کے دس بج رہے تھے' کریم خان اور اعیان دونوں پولیس اسٹیشن پر موجود ظریف چوہدری سے تفتیش کر رہے تھے۔ درحقیقت تفتیش تو صرف کریم خان ہی کر رہا تھا۔ جبکہ اعیان تو جانے کس دنیا میں کھویا ہوا صرف اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔

''ہمیں تم سے زیادہ پوچھ تاچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں تمہارے خلاف کئی ثبوت مل چکے ہیں۔ بس کچھ سوال ہیں جن کے جواب نہیں مل رہے۔ اور ہم وہی جاننا چاہتے ہیں۔''

''تو اس میں میرا کیا فائدہ ہوگا۔''

اس بات کا جواب کریم خان کے پاس نہیں تھا۔

''بتاؤ...... مجھے کیا ملے گا تمہارے سوالوں کے جواب دے کر۔ کیا فائدہ ہوگا مجھے۔ بتاؤ۔ میں تمہارے ہر سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔'' ظریف نے کہا۔

''اس کے بدلے میں' انفارمر کو تمہارے حوالے کر دیا جائے گا۔'' خاموش بیٹھے اعیان نے اچانک کہا۔

اعیان کی بات سن کر ظریف خاموش ہو گیا۔ خود اس کے دماغ میں ایسے ہزاروں سوال تھے' جنہیں سوچ سوچ کر اس کا دماغ خراب ہو چکا تھا' مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ان سوالوں کے جواب صرف اور صرف انفارمر ہی دے سکتا تھا۔ اس لیے اس نے یہ ڈیل منظور کر لی۔

''اسٹار کون ہے؟'' کریم خان نے پوچھا۔

''کیا تم یہ سوچ رہے ہو کہ اسٹار کوئی ایک آدمی ہے؟''

''کیا مطلب؟'' کریم خان نے چونکتے ہوئے کہا۔

''مطلب یہ کہ اسٹار کوئی ایک شخص نہیں بلکہ تین یا چار لوگ ہیں۔'' ظریف بولا۔

کریم خان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''تین یا چار لوگ۔ ہم......م......م۔ تم کتنوں سے مل چکے ہو۔ کن کن کو جانتے ہو؟''

کریم خان حیران تھا مگر اعیان کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی اس بات کا اندازہ لگا چکا تھا۔

''ملا تو تین سے ہوں۔ مگر جانتا صرف ایک کو ہی ہوں۔''

''کیا بکواس ہے۔ تین سے ملے ہو مگر جانتے صرف ایک کو ہی ہو۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' کریم خان نے غصے سے کہا۔

''بچے۔ کچھ جاننا چاہتے تو آواز نیچی رکھو۔ ورنہ جا سکتے ہو۔'' ظریف کا لہجہ سرد تھا۔ وہ اپنی مرضی سے سب بتا رہا تھا اور نہ وہ کسی کی زور زبردستی ماننے والا نہیں تھا۔

''سوری۔ ان میں سے وہ ایک کون ہے جسے تم جانتے ہو؟'' کریم خان نے اپنا لہجہ تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔

''پروفیسر دلاور چنہ کو۔ باقی کے دو سے کئی بار ملا مگر وہ کون ہیں' کبھی معلوم نہیں ہو سکا۔''

''مگر تم نے کہا کہ تین یا چار...... کیا۔''

ظریف نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''چوتھے سے میں کبھی نہیں ملا۔ اس سے صرف فون پر بات ہوتی تھی۔ وہ کبھی اسٹار اور کبھی اسٹار کے خاص آدمی کی حیثیت سے بات کرتا تھا۔''

''پروفیسر تو دس سال پہلے مر چکا تھا۔ اس کی کہانی سمجھ میں نہیں آئی۔''

''دس سال پہلے پروفیسر پولیس کے شک کے دائرے میں آ چکا تھا تو ظاہر سی بات ہے کہ اس کی نگرانی بھی کی جاتی' اور اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کوشش کرنے پر جلد یا بدیر اس کے خلاف پولیس کو ثبوت مل ہی جاتے۔ ایک اسٹار کے پکڑے جانے کا مطلب پورے گینگ کا پکڑے جانا تھا۔ اس لیے کوئی تجربہ کرتے ہوئے پروفیسر نے لیب میں آگ لگا دی اور دنیا کی نظروں میں جل کر مر گیا۔''

''رئیس علی نواز کی پارٹی میں تم لوگوں نے ایسا کیا کیا

تھا کہ 100 سے زیادہ لوگ ایک ساتھ ہارٹ اٹیک کا شکار ہو گئے تھے۔'' کریم خان نے پوچھا۔

''ان کے کھانے میں ایک خاص پوڈر ملایا گیا تھا۔''

''پوڈر۔ کیسا پوڈر؟'' کریم خان نے حیرت سے کہا۔

''وہ پوڈر پروفیسر نے بھیجا تھا۔ پہلے تو مجھے بھی نہیں پتہ تھا کہ اس پوڈر سے کیا ہوگا۔ مگر اگلی صبح جب لوگوں کی موت کے بارے میں سنا تو اس پوڈر کا کام معلوم ہو گیا۔''

''وہ پوڈر کس نے بنایا تھا؟''

''شاید پروفیسر نے۔''

''اب سب سے اہم سوال۔ بیک وقت اتنے لوگوں کی موت کے پیچھے کیا مقصد تھا؟''

''معلوم نہیں۔''

''اچھا رئیس علی نواز کے فنگر پرنٹس وہاں کیسے پہنچے جبکہ وہ تو اسپتال میں داخل تھا۔''

''یہ کام کمال نے کیا تھا۔ وہ ایسے کاموں میں ماہر تھا۔''

''ایسا کیوں کیا گیا؟'' کریم خان معاملے کی تہہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔

''محض پولیس کا دماغ چکرانے کے لیے۔ کمال کے علاوہ دوسرے فنگر پرنٹس جو ملے تھے وہ میرے تھے۔''

''کیا رئیس علی نواز کو بھی تم ہی لوگوں نے مروایا تھا؟''

''نہیں وہ اپنی موت آپ مرا تھا۔''

کریم خان چپ ہو کر سوچ میں پڑ گیا۔

''کوئی اور سوال؟'' اسے چپ دیکھ کر ظریف نے پوچھا۔

''میکس کو تم نے کیوں مارا تھا؟'' اعیان نے بیچ میں دخل دیتے ہوئے کہا۔ وہ کافی دیر سے خاموش بیٹھا ان کے سوال جواب ایسے سن رہا تھا جیسے ظریف جو کچھ بتا رہا ہے وہ ان کے بارے میں پہلے سے جانتا ہو۔

''کیونکہ وہ تمہارا ساتھی بن گیا تھا۔ اب یہ مت پوچھنا کہ مجھے کیسے معلوم ہوا۔ ایسے بچوں والے سوال تمہارے منہ سے اچھے نہیں لگیں گے۔''

''بار بار مجھے کیوں زندہ چھوڑا گیا۔ جبکہ میں تمہارے گینگ کو تباہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔''

''معلوم نہیں۔ اسٹار ایسا چاہتا تھا۔''

''کون سا اسٹار۔ کیا پروفیسر؟'' اعیان نے پوچھا۔

''پروفیسر بھی اور دوسرا بھی۔''

''اچھا بابو! اب چلتے ہیں۔'' اعیان جانے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہوا۔

''انفارمر سے مجھے کب ملوا رہے ہو؟'' اسے جاتے دیکھ کر ظریف پوچھ بیٹھا۔

''اس سے مل کر تم نے کون سا اس سے کریلے چھلوانے ہیں۔ ارے بھائی وہ جعلی انفارمر ہے۔''

''کیا مطلب؟'' ظریف چلاتے ہوئے بولا۔

ظریف کے ساتھ ساتھ کریم خان بھی اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

''تمہاری بیٹی کو میں نے ہی غنڈوں کے ذریعے اغواء کروایا تھا۔ انفارمر کی گرفتاری کی افواہ بھی میں نے ہی پھیلائی تھی۔ اور اس بات کا تم تک پہنچنا یقینی تھا۔ اور اس سارے گورکھ دھندے کا مقصد تھا تم کو تمہارے بل سے باہر نکالنا۔ اور اس کے نتیجے میں دیکھ لو آج تم میرے سامنے ہو۔''

اعیان کی بات سن کر ظریف چوہدری سر پکڑ کر رہ گیا۔

''اب ان کا کیا کرنا ہے۔'' کچھ دیر بعد اپنے کیبن میں کریم خان نے اعیان سے پوچھا۔

''ان کا کن کا؟''

''اس نقلی انفارمر اور اس کے ساتھیوں کا۔''

''وہ مجرم ہیں۔ ان کو سزا ملے گی۔'' اعیان نے کہا۔

''مگر انہوں نے تو پولیس کی مدد کی تھی۔''

''یہ صرف ہم جانتے ہیں' وہ نہیں۔ انہوں نے

ظریف چوہدری کی بیٹی کو پیسوں کے لیے اغواء کیا تھا۔ اس کی سزا تو انہیں ضرور ملے گی۔"

"اچھا ایک بات تو بتاؤ...... یہ آج تک اتنے کھوئے کھوئے کیوں ہو؟" کریم خان نے آخر کار پوچھ ہی لیا۔ وہ صبح سے اعیان کی حالت پر غور کر رہا تھا۔

"یار رات کو مجھ سے ایک گناہ سرزد ہو گیا ہے۔" اعیان نے ایک پل کے لیے کریم خان کی آنکھوں میں دیکھا پھر اپنی نظریں دوسری طرف گھما کر بولا۔

"گناہ۔ کیسا گناہ؟" کریم خان چونکا۔

اور اعیان نے سب کچھ اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔

"کیا ہانیہ کو تمہارے اس کرتوت کے بارے میں علم ہے؟" اعیان کے چپ ہونے پر کریم خان نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا اور اعیان نے ہاں میں گردن ہلا دی۔

"چلو تم ٹینشن مت لو۔ میں کرتا ہوں کچھ۔" کریم نے اعیان کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"وہ مان تو جائے گی نا؟" اعیان کی آواز میں ایک ڈر سا تھا۔

کریم نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کسی اور ہی سوچ میں تھا۔ "ایک بات پوچھوں؟" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کریم نے پوچھا۔

"پوچھو۔"

"کیا تم رانی سے محبت نہیں کرتے؟"

"کیا بات کر رہے ہو یار۔ رانی میری دوست ہے۔ تیری طرح۔ بس۔" اعیان نے بس کو کچھ زیادہ ہی لمبا کھینچتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ شکایتی تھا۔ "کم سے کم تم سے ایسی بات کی امید نہیں تھی مجھے۔"

کریم خان مسلسل اعیان کے چہرے پر نظریں ٹکائے ہوئے تھا۔ اعیان کے اس ردعمل کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ "مگر مجھے لگتا ہے کہ رانی تم سے بہت محبت کرتی ہے۔"

"اب مذاق مت کر یار۔" اعیان کو لگا کہ کریم خان اسے گھسیٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔

"میں مذاق نہیں کر رہا۔ میں نے ہمیشہ رانی کی آنکھوں میں تمہارے لیے پیار دیکھا ہے۔ کیا تم نے کبھی محسوس کرنے کی کوشش نہیں کی کہ تمہیں ذرا سی چوٹ لگ جانے پر اس کی جان کیوں نکل جاتی ہے۔ کیا کبھی تم نے غور کیا کہ تمہاری اداسی اسے اداس کیوں کر دیتی ہے کیا کبھی تم نے......"

"کیونکہ وہ میری بہت اچھی دوست ہے۔ اس لیے جذباتی طور پر مجھ سے بہت زیادہ منسلک رہتی ہے۔" اعیان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ کریم کی باتوں سے اسے وحشت سی ہونے لگی تھی۔

"دوست۔ ہونہہ۔" کریم بولا۔ ذرا سوچو اگر وہ تم سے پیار نہیں کرتی تو اپنا آپ تمہیں کیوں سونپا۔"

"یار پلیز تم ایسی باتیں مت کرو۔ ایک تو صبح سے دماغ خراب ہے اوپر سے تم جانے کیا کیا بکے جا رہے ہو۔"

اس سے پہلے کہ کریم کچھ کہتا اس کا موبائل گنگنانے لگا۔ اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

"ہیلو ثوبی۔ بولو۔"

"آپ جلدی سے گھر آ جائیں۔"

"کیا ہوا، تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو۔"

"وہ۔ ہانیہ کو جانے کیا ہو گیا ہے۔ پاگلوں جیسی حرکتیں کر رہی ہے۔ چاقو لے کر رانی کی جان لینے پر تلی ہوئی ہے۔"

"او کے۔ میں آ رہا ہوں۔" کریم بیچ میں بول پڑا۔

"کیا ہوا۔ کس کی کال تھی؟" کریم کو گھبرا کر کھڑے ہوتے دیکھ کر اعیان نے پوچھا۔ اور کریم نے اسے ثوبی کی کال کے بارے میں بتا دیا۔ کریم کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اعیان باہر کی جانب دوڑ لگا چکا تھا اس لیے کریم کو بھی اس کے پیچھے بھاگنا پڑا۔



''کیا ہوا۔ کہاں بھاگے جا رہے ہو؟'' سرفراز کو اسپتال کے مین سے گیٹ سے تیزی سے نکلتے دیکھ کر چراغ نے روک کر پوچھا۔

''وہ۔وہ۔وہ۔'' سرفراز اتنا بدحواس تھا کہ ٹھیک سے بول بھی نہیں پا رہا تھا۔

''کیا ہوا۔تم اتنے بوکھلائے ہوئے کیوں ہو؟''

''وہ۔ہارون مرزا بھاگ گیا۔''

''کیا بک رہا ہے۔کیسے؟''

''پتہ نہیں۔دس منٹ پہلے تو بیڈ پر تھا۔اب وہ اپنے بیڈ سے غائب ہے۔''

''مر گئے۔اعیان سر اب ہم دونوں کو نہیں بخشیں گے۔'' چراغ بھی اب بوکھلا چکا تھا۔

''اب بکواس بعد میں کرتے رہنا۔ پہلے اسے ڈھونڈنا بھی ہے۔'' سرفراز نے جھلا کر کہا اور وہ دونوں اسپتال میں ہارون مرزا کو تلاش کرنے لگے۔ہر جگہ دیکھ لیا مگر ہارون مرزا نہ ملنا تھا اور نہ ملا۔ٹھیک ایک گھنٹے بعد سرفراز اور چراغ پھر سے اسپتال کے سامنے کھڑے تھے۔دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''سب تیری بے پرواہی کی وجہ سے ہوا ہے۔ایک نگرانی کا کام تم ٹھیک سے نہیں کر سکے۔میں تھوڑی دیر کے لیے باہر کیا گیا' ہارون مرزا کو بھاگنے کا موقع مل گیا۔'' چراغ نے سرفراز پر چڑھائی کرتے ہوئے کہا۔

''میں تو وہیں تھا۔نہ جانے کیسے اور کہاں غائب ہوگیا۔'' سرفراز بولا۔

چراغ کوئی جواب دینے کی بجائے چپ رہا۔

''اب کیا کریں؟''

''کرنا کیا ہے۔اعیان سر کو بتانا پڑے گا۔'' چراغ نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

تب ہی ان کے کانوں میں ''بچاؤ۔بچاؤ۔مجھے مار ڈالے گا۔وہ مجھے مار ڈالے گا۔'' کی چیخ سنائی دینے لگی۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا تو ہارون مرزا تیزی سے ان ہی کی طرف بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔

ہارون مرزا کو دیکھتے ہی دونوں کے چہرے کھل اٹھے اور وہ اس کی طرف لپکے۔

''کیا ہوا۔کیوں چلا رہے ہو؟ تمہیں کون مار ڈالے گا؟'' چراغ نے اسے پکڑتے ہوئے کہا۔

''وہ۔شاہ رخ خان۔'' ہارون مرزا نے ڈرتے ڈرتے ایک کار کی طرف اشارہ کیا۔کار میں بیٹھا ایک آدمی ان کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔وہ شاہ رخ خان ہی تھا۔اور ان کے دیکھتے ہی دیکھتے کار ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

چراغ اور سرفراز حیران تھے۔بے حد حیران۔یقین کرنا آسان نہیں تھا کہ جو انہوں نے دیکھا وہ سچ تھا یا محض ان کی آنکھوں کا دھوکا تھا۔ہارون مرزا بھی اب پرسکون ہو چکا تھا اور چپ چاپ ان کے ساتھ کھڑا تھا۔ کچھ دیر بعد جب حیرانگی دور ہوئی تو وہ ہارون مرزا کو واپس اسی کمرے میں لے آئے جہاں سے وہ غائب ہوا تھا۔ہارون مرزا کو بیڈ پر لٹا کر وہ دونوں بھی بیڈ کے ساتھ کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے۔

''آخر تم یہاں سے باہر نکلنے میں کامیاب کیسے ہوگئے تھے؟'' کمرے سے نکلنے کا صرف ایک ہی دروازہ تھا جس کے باہر سرفراز موجود رہتا تھا۔ پھر ہارون مرزا کہاں سے اور کیسے بھاگ نکلا تھا' اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''تمہارے سامنے' دروازے سے ہی تو باہر نکلا تھا۔'' ہارون مرزا نے حیرت سے سرفراز کو دیکھتے ہوئے کہا۔وہ دروازے سے ہی گیا تھا اور اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جب وہ دروازے سے نکل کر جا رہا تھا تو سرفراز اسے دیکھ کر مسکرایا بھی تھا۔

''تم کو مذاق کرنے کو میں ہی ملا ہوں؟'' سرفراز نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔اگر ہارون مرزا گردے میں

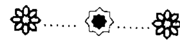
پتھری کی تکلیف کی وجہ سے اسپتال میں داخل نہ ہوتا تو جواب میں وہ اس کے ساتھ پولیس والوں کا روایتی سلوک ضرور کرتا۔

''وہ سب چھوڑو' یہ بتاؤ تم گئے کہاں تھے۔ اور بھاگ ہی گئے تھے تو پھر واپس کیوں آ گئے؟'' جو بات چراغ کو ہضم نہیں ہو رہی تھی اس نے وہ بات ہارون مرزا سے پوچھ لی۔

''اسپتال سے نکلنے کے بعد میں پیدل ہی سڑک کے کنارے کنارے جا رہا تھا کہ سامنے سے شاہ رخ خان آ گیا۔ وہ مجھے مارنے لگا۔ اس نے مجھے بہت مارا۔ وہ مجھے جان سے مار ڈالنا چاہتا تھا۔ بس کسی طرح جان بچا کر واپس اسپتال کی طرف بھاگ پڑا۔'' شاہ رخ کو یاد کرتے ہوئے ہارون مرزا کے چہرے اور آنکھوں میں ڈر ابھر آیا تھا۔

''مگر تمہیں دیکھ کر تو نہیں لگتا کہ تمہیں کسی نے چھوا بھی ہو۔'' سرفراز نے اس کا اچھی طرح سے معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

''میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ شاہ رخ نے مجھے مارا تھا۔ خوب مارا تھا۔'' ہارون مرزا کے چہرے اور لہجے سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔



جب اعیان اور کریم خان تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے گھر پہنچے تو ثوبیہ گھر کے دروازے پر ان کا انتظار کر رہی تھی۔ فیضی ایک کونے میں دبکا ہوا تھا۔ رانی بھی گم صم کھڑی تھی۔ اس کے جسم پر کئی جگہ گھاؤ لگے ہوئے تھے اور فرش پر خون آلود چاقو گرا ہوا تھا۔ اعیان نے ادھر ادھر نظر دوڑائی مگر اسے ہانیہ کہیں نظر نہیں آئی۔

''کیا ہوا تھا؟'' کریم نے ثوبیہ سے پوچھا۔

''وہ سب بعد میں بتاؤں گی پہلے رانی کو اسپتال تو لے چلو۔'' ثوبیہ نے کریم کو جواب دے کر اعیان کی طرف رخ کیا۔ ''اعیان تم ہانیہ کے پاس رہنا۔ میں اور کریم' رانی کو ڈاکٹر کے لے جا رہے ہیں۔''

''نہیں۔ میں۔'' اعیان نے کچھ کہنا چاہا۔

''سمجھا کرو۔ اس وقت ہانیہ کو تمہاری ضرورت ہے۔'' رانی نے اعیان کو کچھ کہنے سے روک دیا۔

''مگر وہ ہے کہاں؟''

''میں نے اسے اندر بند کر دیا ہے۔'' رانی نے گیسٹ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس کا دروازہ باہر سے بند تھا۔

''فیضی کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جاؤ تو بہتر ہے۔'' اعیان کی یہ بات مانتے ہوئے وہ تینوں فیضی کو اپنے ساتھ لے گئے۔

سب کے چلے جانے کے بعد اعیان نے گیسٹ روم کا دروازہ کھولا۔ اندر ہانیہ گھٹنوں میں سر دیئے فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اعیان بھی اس کے سامنے فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا مخاطب ہوا۔ ''ہانی۔'' ہانیہ کے بدن میں کچھ ہلچل سی ہوئی۔ ''ہانی۔ کیا ہوا'' اعیان نے پوچھا اور اس کے شانے تھام لیے۔

ہانیہ نے سر اوپر اٹھایا اور اعیان کو ایسے انداز میں دیکھنے لگی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ کچھ لمحوں تک اس کی آنکھوں میں اجنبی پن چھایا رہا پھر ایک دم چمک سی ابھری اور اس نے اعیان کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور گھٹنوں کے بل کھڑی ہو کر اعیان سے لپٹ گئی۔

اعیان کچھ دیر تک ہانیہ کے الگ ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ مگر اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر ایک خاص قسم کی چمک اور خوشی بکھری ہوئی تھی۔

اعیان نے اسے خود سے الگ کرنے کی کوشش کی تو ہانیہ نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک ڈر سا نظر آ رہا تھا۔ اعیان نے اسے گود میں اٹھا کر بستر پر بٹھا دیا اور خود فرش پر اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ''غلطی میری تھی۔ تمہارا گنہگار میں ہوں۔ مجھے مارو۔'' اعیان نے کہا۔

ہانیہ نے جھٹ سے ایک زوردار تھپڑ اعیان کے گال پر جڑ دیا۔ اعیان کو اس کی امید نہیں تھی' وہ بے یقینی سے ہانیہ کو دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ کسی بھی قسم کے جذبات سے یکسر عاری تھا۔ اعیان زبردستی ایک پھیکی سی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجاتا ہوا بولا۔ ''دیکھو تم میری غلطی کی سزا بھی دے چکی ہو۔ اب غصہ تھوک دو۔''

اور ہانیہ نے اعیان کے چہرے پر ہی تھوک دیا۔ اعیان کو ہانیہ کی اس حرکت پر بہت غصہ آرہا تھا مگر اس نے خود پر ضبط کرلیا۔ اس نے خاموشی سے رومال نکال کر اپنا چہرہ صاف کیا۔ ہانیہ خالی خالی نظروں سے اعیان کو دیکھے جارہی تھی۔ اعیان کو کسی بھی طرح اس کی حالت نارمل نہیں لگ رہی تھی۔ پھر اس نے سوچا شاید غصے کی شدت کی وجہ سے وہ ایسی حرکتیں کررہی ہے۔

''اچھا بابا' جلدی سے فریش ہوجاؤ۔ پھر ساتھ ہی کھانا کھاتے ہیں۔ بہت تیز بھوک لگ رہی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اعیان اٹھ کھڑا ہوا اور ہانیہ کی طرف دیکھنے لگا۔ ہانیہ کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے اسے کچھ سمجھ ہی نہ آرہا ہو۔ اعیان کا ماتھا ٹھنکا۔ اسے اب یقین ہونے لگا تھا کہ ہانیہ نارمل نہیں ہے۔ ''چلو اٹھو بھی۔ منہ پر پانی کا چھپکا مار کر فریش ہوجاؤ۔''

ہانیہ اٹھی اور الجھی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اعیان نے اس کا ہاتھ پکڑا اور واش روم کی طرف لے گیا۔ ہانیہ واش روم میں چلی تو گئی لیکن دروازہ بند نہیں کیا۔ اعیان نے دیکھا کہ وہ حیرانی سے ادھر ادھر دیکھے جارہی تھی۔ اعیان دکھ بھری نظروں سے ہانیہ کو دیکھتا رہا پھر خود بھی واش روم میں چلا آیا اور نلکے سے پانی نکال کر ہانیہ کے چہرے پر مارنے لگا۔ اور اچھے سے اس کا منہ دہلانے کے بعد اس کے بالوں میں کنگھی کی اور اسے ڈائننگ ٹیبل پر لے آیا۔ ہانیہ کسی بے جان روبوٹ کی طرح اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ اعیان نے اسے کرسی پر بٹھایا اور خود کچن میں جاکر پلیٹ میں کھانا نکال کر ہانیہ کے سامنے رکھ دیا۔ ہانیہ ہر چیز سے انجان بن ہوئی تھی۔ اعیان اپنے ہاتھوں سے اسے کھانا کھلانے لگا۔ اور وہ بھی اچھی بچی کی طرح کھانے لگی۔ اچانک ہانیہ نے بھی ایک نوالہ توڑ کر اعیان کی طرف بڑھایا جسے اعیان نے مسکرا کر کھالیا۔ اب دونوں باری باری ایک دوسرے کو نوالہ کھلانے لگے۔

❀ ...... ۞ ...... ❀

رانی کی مرہم پٹی کروانے کے بعد وہ گھر واپس لوٹ رہے تھے۔ کریم خان جس الجھن میں تھا اسے سلجھانے کے لیے پوچھ ہی بیٹھا۔ ''آخر ہوا کیا تھا صبح۔ اب تو بتا دو۔''

''رانی صبح دیر تک سوتی رہی تھی۔ اس کی طبیعت چونکہ ٹھیک نہیں تھی اس لیے میں نے بھی اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ آپ کے جانے کے بعد وہ اٹھ کر اپنے کمرے سے باہر اور چاروں طرف عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی۔ میں نے کئی بار اسے آواز دی لیکن اس نے جیسے سنا ہی نہ ہو۔ اور جب اس کی نظر رانی پر پڑی تو اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہوگئیں' اس نے جھپٹ کر ڈائننگ ٹیبل سے چھری اٹھائی اور رانی پر وار کرنے لگی۔ یہ دیکھ کر میری تو جان ہی نکل گئی۔ رانی نے کسی نہ کسی طرح اس کے ہاتھوں سے چھری چھین لی اور پھر ہم دونوں نے مل کر بڑی مشکل سے اسے کمرے میں بند کردیا۔'' ثوبیہ نے صبح کی واردات بتاتے ہوئے کہا۔

❀ ...... ۞ ...... ❀

یونیورسل اسپتال کے ایک کمرے میں ہارون مرزا بیڈ پر آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ سرفراز اور چراغ دین اس کے بیڈ کے پاس کرسیوں پر بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ تب اچانک ہی ہارون مرزا بیڈ سے اچھل کر چلانے لگا۔

''بچاؤ۔ بچاؤ۔''

''کیا ہوا۔ کیوں چلا رہے ہو۔'' چراغ دین کرسی

اٹھتے ہوئے غصے سے بولا۔
''وہ۔وہ۔وہ۔'' ہارون مرزا نے تھرتھر کانپتے ہوئے چھت کی طرف اشارہ کیا۔اس کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔
چراغ دین نے چھت کی طرف دیکھا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا اور پورے بدن میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔
چھت سے چھپکلی کی طرح کوئی چپکا ہوا تھا' اور اس کی للچائی ہوئی نظریں ان تینوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔اس کی آنکھیں لال اور ٹیبل ٹینس کی بال جتنی بڑی بڑی تھیں۔ چہرہ انتہائی بھیانک اور زبان تلوار جتنی لمبی اور بالکل سیاہ تھی' جسے وہ سانپ کی طرح ہوا میں لہرا رہا تھا۔جبکہ منہ سے خون کی بوندیں فرش پر ٹپک رہی تھیں۔اس کی کمر سے نیچے کا بدن بھی غائب تھا۔چراغ کا تو برا حال تھا ہی سرفراز نے بھی چھت کی طرف دیکھا مگر اسے چھت پر گھومتے ہوئے سیاہ رنگ کے پنکھے کے علاوہ کچھ نظر نہیں آیا۔
''کیا ہوا۔ایسے کیوں کانپ رہے ہو۔تم تو ایسے بھووووت......بھووووت......بھووووت۔'' سرفراز چراغ کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بول رہا تھا کہ اس نے اچانک چراغ کے پیچھے وہی بھوت نمودار ہوتے دیکھا جسے چراغ اور ہارون مرزا چھت سے چپکے دیکھ چکے تھے۔اسے دیکھ کر سرفراز کے حلق سے اپنے آپ ہی چیخیں نکلنے لگیں۔
ان کی چیخیں سن کر کافی لوگ کمرے میں گھس آئے کہ ماجرا کیا ہے۔تینوں نے بھیڑ کو دیکھا اور اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی' بھوت کہیں نہیں تھا۔ساتھ ہی فرش سے خون بھی صاف ہو چکا تھا۔
''میڈیا کو بلاؤ...... مجھے کچھ بتانا ہے۔'' ہارون مرزا نے بھیڑ پر توجہ نہ دیتے ہوئے چراغ اور سرفراز سے کہا۔ وہ تینوں ابھی بھی کافی ڈرے ہوئے تھے۔
تھوڑی ہی دیر میں اسپتال کے باہر میڈیا کے نمائندوں کی بھیڑ جمع ہو چکی تھی اور ہارون مرزا انہیں بتا رہا تھا کہ اس نے اور اس کے دوستوں نے آزاد کی فیملی کے ساتھ کیا کیا تھا۔اس کا اعترافی بیان سن کر چراغ اور سرفراز سمیت سبھی حیران ہو رہے تھے۔اپنی بات ختم کر کے ہارون مرزا نے ایک نظر ہجوم پر ڈالی اور مین روڈ کی طرف دوڑ لگا دی۔اس سے پہلے کہ کوئی سمجھ پاتا وہ سڑک پر آیا اور تیز رفتاری سے آتی ہوئی ایک بس کے سامنے کود گیا۔

❀......✹......❀

''لگتا ہے انہیں کسی بات سے گہرا صدمہ پہنچا ہے۔'' اعیان اس وقت شہر کے معروف سائیکالوجسٹ ذاکر علی کے سامنے بیٹھا تھا۔''کیا میں جان سکتا ہوں کہ ان کے ساتھ کیا ہوا ہے؟''
اعیان سوچ میں پڑ گیا۔
''دیکھیں اگر آپ بتا دیں گے تو میں ان کا ٹریٹمنٹ بہتر طریقے سے کر پاؤں گا۔''
اعیان نے ایک گہری سانس لی اور ڈاکٹر کو اصلی وجہ بتا دی۔
''ہوں۔ جتنا ہو سکے اس لڑکی کو ان سے دور رکھنا ورنہ یہ پھر اس کی جان لینے کی کوشش کر سکتی ہے۔اور آپ جتنا ہو سکے ان کے پاس رہنا۔آپ کی ہمراہی ان کے لیے دوا کا کام کرے گی۔ میں کچھ میڈیسنز لکھ کے دے رہا ہوں' امید ہے بہت جلد نارمل ہو جائیں گی۔''
ڈاکٹر نے اپنی بات پوری کی ہی تھی کہ اعیان کا موبائل بجنے لگا۔
اعیان معذرت کرتا ہوا اٹھا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ کال سرفراز کی تھی۔اعیان دوسری طرف سے ساری بات سننے کے بعد لائن کاٹ کر ثوبیہ کے پاس آیا۔''بھابھی مجھے کچھ دیر کے لیے باہر جانا ہے۔'' ثوبیہ اس وقت ہانیہ کے سرہانے بیٹھی تھی جسے انجیکشن دے کر سلا دیا گیا تھا۔رانی بھی اس کے برابر میں بیٹھی تھی۔

’’بے فکر ہو کر جاؤ۔ میں ہوں ہانیہ کے پاس۔‘‘ ثوبیہ بولی۔ ’’اور ہاں رانی کو گھر ڈراپ کرتے ہوئے جانا۔ یہ کھانے کا انتظام کر لے گی۔‘‘

’’چلیں۔‘‘ رانی اٹھ کھڑی ہوئی۔

’’رانی میں کل کے لیے معافی چاہتا ہوں۔‘‘ اعیان صبح سے رانی سے آنکھ نہیں ملا پا رہا تھا۔ مگر رانی سے دور بھی نہیں رہ سکتا تھا اس لیے کار میں آتے ہی کسی طرح ہمت کر کے بول ہی دیا۔

’’چلو معافی مانگ لی نا۔ اب بار بار وہی گھسے پٹے جملے مت بولتے رہنا۔ ارے یہ کیا۔‘‘ بولتے بولتے رانی کی نظر سامنے ڈیش بورڈ پر رکھے سفید لفافے پر گئی تو وہ اسے اٹھا کر دیکھنے لگی۔

’’پچیس سال پہلے جو سات لوگ لاپتہ ہوئے تھے ان کی تصویریں ہیں۔‘‘ اعیان نے لفافے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ یہ تصویریں اسے چراغ دین نے فراہم کی تھیں۔

’’کون سات لوگ۔‘‘ رانی لفافے سے تصویریں نکال کر دیکھنے لگی۔ ’’ارے یہ تصویریں تمہارے پاس کہاں سے آئیں۔‘‘ رانی تصویریں دیکھتے ہوئے حیرت سے بولی۔

’’کیا تم انہیں جانتی ہو؟‘‘ اعیان چونک کر بولا۔

’’ہاں۔‘‘

’’کون تھے یہ لوگ؟‘‘

رانی نے جب ان کے بارے میں بتایا تو اعیان کے پیر کا دباؤ خود بخود بریک پر بڑھتا گیا۔



اعیان کی کار ایک بڑے سے بنگلے کے سامنے رکی۔ رانی اور اعیان اپنی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اترے۔ اعیان نے آگے بڑھ کر ڈور بیل بجائی کافی بار بیل بجانے کے بعد بڑے پاپا نے دروازہ کھولا اور اعیان اور رانی کو دیکھتے ہی خوشی سے ان کی باچھیں کھل گئیں۔ ’’ارے بچو تم۔ آؤ آؤ۔‘‘

اعیان مسکراتے ہوئے بڑے پاپا کے گلے لگ گیا جبکہ رانی اپنی جگہ پر ہی کھڑی رہی۔ اس کی تیکھی نظریں بڑے پاپا پر ٹکی ہوئی تھیں۔

’’کیا ہوا۔ میری بچی کچھ ناراض ناراض سی لگ رہی ہے۔‘‘ بڑے پاپا مسکراتے ہوئے رانی کی طرف بڑھے۔

مگر رانی بڑے پاپا کو نظر انداز کرتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہو گئی۔ بڑے پاپا کچھ حیران کچھ مسکراتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے آنے لگے اور تینوں ڈرائنگ روم میں آ کر صوفوں پر براجمان ہو گئے۔

’’بڑے پاپا۔ آپ تو بہت بڑے کھلاڑی ہیں۔‘‘ اعیان نے بہت کو کھینچتے ہوئے کہا۔

’’کھلاڑی۔ ہاہاہا۔ کیا کہا تم نے کھلاڑی۔ ہاہاہا۔‘‘ بڑے پاپا کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ آج وہ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

’’بڑے پاپا۔ انہیں تو آپ اچھی طرح سے جانتے ہوں گے۔‘‘ اعیان نے تصویروں والا لفافہ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

بڑے پاپا نے ہنستے ہوئے لفافے سے تصویریں نکالیں اور جیسے ہی ان کی نظر تصویروں پر پڑی تو ان کی ہنسی حیرانی میں بدل گئی۔ وہ فوراً اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے بولے۔ ’’رانی بیٹا ذرا تین کپ کافی تو بنا لو۔‘‘

’’آپ جو کہنا چاہتے ہیں، میں بھی وہ سننا چاہتی ہوں۔‘‘ رانی وہاں سے ٹلنے کو تیار نہیں تھی۔

’’میں نے کیا کہنا ہے اور تم نے کیا سننا ہے۔‘‘ بڑے پاپا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’سب کچھ۔‘‘ رانی جلدی سے بولی۔

’’کیا سب کچھ۔‘‘ بڑے پاپا ایسے بولے جیسے کچھ سمجھ میں نہ آیا ہو۔

’’آپ بتاتے ہیں یا میں بے شرمی اور بے حیائی کی تمام حدیں پھلانگنا شروع کر دوں۔‘‘ رانی کے تیور ایک

دم بدل گئے تھے۔

"کیا مطلب؟" بڑے پاپا نے گھبرا کر پوچھا۔ اعیان بھی گردن گھما کر رانی کو دیکھنے لگا۔ اور پھر جو رانی نے کیا اس نے اعیان اور بڑے پاپا دونوں کے ہوش اڑا دیئے۔

رانی صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ایک جھٹکے سے اپنا ٹاپ اتار کر پھینک دیا اور صرف بریزیئر میں ان کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے رانی۔" اعیان بھی گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔

"بیٹی بند کرو یہ سب۔ میں بتاتا ہوں۔" بڑے پاپا نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے کہا۔

رانی نے اعیان کو آنکھ ماری اور اپنا ٹاپ دوبارہ پہن لیا۔ اعیان مسکرا کر رہ گیا۔ بلیک میل کرنے کا یہ طریقہ اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔

بڑے پاپا نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "بتاؤ۔ کیا جاننا چاہتی ہو؟"

ہارون مرزا نے بتایا تھا کہ بڑی ممی اور آپ کے خاندان کے باقی افراد کا قتل انہوں نے نہیں کیا تھا۔ بلکہ ایک لڑکے نے کیا تھا۔ جو اس رات آپ کے خاندان کے ساتھ تھا۔ کون تھا وہ؟" پہلا سوال اعیان نے پوچھا۔

"کریم خان۔"

"مذاق نہ کریں۔ پچیس سال پہلے تو وہ پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ صرف چوبیس سال کا ہے۔"

"بیٹا وہ دوسرا کریم خان تھا۔ میرا ایک دور کا رشتے دار۔ وہ بچپن سے ہی ایب نارمل تھا۔ اس کا دماغ پوری طرح سے کام نہیں کرتا تھا۔ یوں کہہ لو کہ آدھا پاگل تھا۔ جب رئیس علی نواز، ہارون مرزا اور ان کے دوستوں نے میرے خاندان کو اپنے گھر لے جا کر ان کی عزت لوٹی، وہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہاں جو ہوا، اسے دیکھ کر وہ پورا پاگل ہوگیا۔ بجائے اس کے کہ وہ رئیس علی نواز، ہارون مرزا اور ان کے دوستوں کو قتل کرتا اس نے میرے ہی خاندان کو مار ڈالا اور وہاں سے بھاگ نکلا...... مجھے بھی پتہ نہیں تھا کہ میرے خاندان کے ساتھ کیا ہوا؟ راتوں رات سب کہاں غائب ہوگئے۔ زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ اتفاق سے پانچ سال پہلے ایک دن کریم خان مجھے ٹکرا گیا۔ اس حادثے کے بعد وہ پورا پاگل ہو چکا تھا۔ لیکن پندرہ سال ایک پاگل خانے میں گزارنے کے بعد وہ کسی حد تک ٹھیک ہو چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ میرے خاندان کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ کیسے ہوا تھا، جسے سن کر میرے اندر آگ بھڑک اٹھی اور میں نے اسے مار ڈالا۔ مگر پھر افسوس ہوا۔ وہ بیچارہ تو پاگل تھا، ان کی موت کی وجہ تو رئیس علی نواز اور اس کے دوست تھے۔ میں انتقام کی آگ میں جلنے لگا۔ جس طرح میرا پورا خاندان ایک ساتھ مارا گیا تھا، میں بھی سب کو ایک ساتھ مارنا چاہتا تھا۔ ان پانچ سالوں میں رئیس اور اس کے دوستوں کو طرح طرح سے ڈراتا رہا، موت کیسی ہوتی ہے، محسوس کراتا رہا۔ مگر ان کی جان نہیں لی۔ میں ایسا موقع چاہتا تھا کہ وہ سب اور ان کا خاندان ایک ساتھ ہو اور ایسا موقع آیا پورے پانچ سال کے طویل انتظار کے بعد۔ وہ سب رئیس علی نواز کی پارٹی میں اکٹھے ہوئے تھے۔ ان پانچ سالوں میں، میں نے ایک ایسا پوڈر بنا لیا تھا جسے اگر کسی کے کھانے میں ملا دیا جائے تو اس وقت تو کچھ نہیں ہوتا، لیکن دو گھنٹے بعد دھیرے دھیرے کھانے والے کا دل کام کرنا بند کر دیتا ہے۔ اور پانچ سے چھ گھنٹے کے بعد اس پوڈر کا اثر اپنے آپ کھانے اور انسانی بدن سے ختم ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے کتنے بھی ٹیسٹ کروا لیے جائیں کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔ میں رئیس علی نواز کو آسان موت نہیں دینا چاہتا تھا۔ جیسے میں تڑپا تھا اسے بھی پل پل تڑپا کر مارنا چاہتا تھا۔ میں نے واردات والے دن سے ایک دن پہلے ہی اس کے کھانے میں کچھ ملا کر اس کی طبیعت خراب کر دی اور اسے اسپتال میں

داخل ہونا پڑا، مگر وہ پارٹی والے حادثے کو جھیل نہیں پایا اور وہ برین ہیمرج کا شکار ہوگیا۔“

رانی اور اعیان سانس روکے بڑے پاپا کی باتیں سن رہے تھے۔ خاص طور پر رانی، کیونکہ بڑے پاپا نے رانی کو یہ ہی بتا رکھا تھا کہ ان کے خاندان کی موت ایک ٹریفک حادثے میں ہوئی تھی۔

”یہ سب آپ نے اسٹار گینگ کی مدد سے کیا۔ ان سے آپ کا کیا تعلق تھا؟“

”پانچ سال پہلے تک کوئی تعلق نہیں تھا۔ پروفیسر دلاور چینہ میرا بچپن کا دوست تھا۔ اس لیب والے حادثے کے بعد بھی ہم اکثر ملتے رہتے تھے۔ میں نے کئی بار مختلف تجربات میں اس کی مدد بھی کی تھی۔ پانچ سال پہلے جب مجھے یہ سب پتہ لگا تو میں اس کی پناہ میں پہنچ گیا۔ کیونکہ ایک وہی تھا جو بدلہ لینے میں میری مدد کرسکتا تھا اور اس نے کی بھی۔“ بڑے پاپا لفافے میں سے اپنی بیوی، بیٹی، بہن، بھائی، پاپا، ممی، بھابھی اور بیٹے کی فوٹو دیکھتے ہوئے بولے جا رہے تھے۔ ”دھیرے دھیرے پروفیسر کی مدد سے میں بھی اس کے جیسا بن گیا۔ پارٹی میں رئیس علی نواز کے آٹھ دوست اپنی پوری فیملی کے ساتھ موت کی نیند سو چکے تھے۔ رئیس بھی اسپتال میں دم توڑ چکا تھا۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا، تب ہی نہ جانے کہاں سے انفارمر ٹپک کرآ گیا۔ جس نے دو ہی دن میں کمال اور شفقت چینا (ریڈ 001) کا گیم بجا دیا اور باقی چار کو بھی گرفتار کروا دیا۔ اپنے گینگ کو تباہ ہوتا دیکھ کر پروفیسر پگلا گیا۔ وہ ہر حالت میں انفارمر کی موت چاہتا تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو کتے کی طرح انفارمر کی تلاش میں لگا دیا۔ مگر سب ناکام رہے پھر اعیان بیٹا، انفارمر تک پہنچنے کے لیے پروفیسر نے تمہارا انتخاب کیا۔ مگر تم انفارمر کو تلاش کیا کرتے الٹا اسٹار کو ہی کنارے لگانے لگے۔ اپنے گینگ کی تباہی سے پروفیسر پہلے ہی زخمی شیر بنا ہوا تھا۔ اور تم تھے کہ چوٹ پہ چوٹ دیئے جا رہے تھے۔ جس سے وہ بھڑک گیا اور تمہیں مارنے کا پلان بنانے لگا۔ میں نے اسے سمجھانا چاہا مگر وہ نہیں مانا۔ پروفیسر سے زیادہ مجھے تم عزیز تھے۔ تمہیں بچانے کا میرے پاس ایک ہی راستہ بچا تھا، اور میں نے پوڈر کی مدد سے پروفیسر کو ہی مار ڈالا۔ پروفیسر کی موت کے بعد اسٹار گینگ کی کمان میں نے سنبھال لی اور اپنے مقصد کو پورا کرنے میں لگ گیا۔ میں نے پہلے رئیس سہراب کے بیٹے اور پھر اس کی بیوی کو مروا دیا، مگر تم بار بار درمیان میں آئے جا رہے تھے، اور مسلسل اسٹار گینگ کو نشانہ بنائے جا رہے تھے۔ میں تمہیں مار نہیں سکتا تھا اس لیے تمہیں دور رکھنے کے لیے طرح طرح کے جال پھیلانے کی کوشش کرتا رہا۔ اسی بیچ تم نے جانے کیسے پتہ لگا لیا کہ ظریف چوہدری ہی باس ہے۔ مگر وہ بھی پکا کھلاڑی تھا اس سے پہلے کہ تم اس تک پہنچ پاتے وہ غائب ہوگیا۔ تمہاری ڈی ایس پی انیتا اپنے عاشق میکس کی موت کا بدلہ لینے کے لیے ہاتھ دھو کر ظریف چوہدری کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ اور جب وہ ظریف تک نہیں پہنچ پائی تو اس کی بیوی کو سزا دینے لگی۔ ظریف اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا اس لیے وہ آپے سے باہر ہوگیا اور ڈی گن سے انیتا کا سینہ چھلنی کردیا۔ اتفاق سے اس دن میں حویلی میں تھا۔ مجھے اطلاع ملی کہ دوسری عمارت میں جو پروفیسر نے ظریف کو دے رکھی تھی، اس میں کوئی ہے۔ میں نے کمپیوٹر کی مدد سے دیکھا تو وہ ظریف تھا۔ وہ ڈی گن کے ذریعے اسپتال میں قہر برپا کر رہا تھا۔ انیتا کو ختم کرنے کے بعد اس نے تمہاری جان لینی چاہی۔ اور وہ تمہاری جان لے بھی لیتا اگر میں عین وقت پر ڈی گن کو اپنے کنٹرول میں نہ لے لیتا۔ میں نے ڈی گن کو تباہ کردیا اور وہ عمارت بھی اڑا دی جس میں ظریف موجود تھا۔“ بڑے پاپا کچھ دیر سانسیں ترتیب میں لانے کے لیے رکے پھر گویا ہوئے۔ ”اعیان بیٹا۔ مجھے ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں تم مجھ تک نہ پہنچ

جاؤ۔ اس لیے میں نے رئیس سہراب کو مارنے کے لیے ظریف کے میک اپ میں اپنا آدمی بھیجا اور اسے کریم خان کے موبائل سے کال کی جو میرے آدمیوں نے کریم سے چرا کر مجھ تک پہنچایا گیا تھا۔ مقصد تھا تمہیں پریشانی میں ڈالنا۔ یہ تو تم جان ہی چکے تھے کہ کوئی ہے جو رئیس کے دوستوں کے پیچھے پڑا ہے۔ جب ہارون مرزا' سہراب سے ملنے آیا تو تمہیں لگا کہ مجھ تک پہنچنے کا وہ ہی آخری راستہ ہے۔ اور اس سے پہلے کہ میں اس تک پہنچتا تم نے اسے غائب کر دیا۔ مگر قسمت میرے ساتھ تھی' اس لیے وہ بیمار ہوا اور تمہیں اسے اسپتال میں داخل کروانا پڑا۔ لیکن وہ اب بھی میری پہنچ سے بہت دور تھا' چراغ دین اور سرفراز بہت ہوشیار پولیس والے ہیں۔ پھر مجھے اس ڈیوائس کا سہارا لینا پڑا جو پروفیسر نے مرنے سے کچھ دنوں پہلے ایجاد کی تھی۔ اس سے ہم کسی بھی انسان کے دماغ کو ایک مخصوص رینج کے اندر کنٹرول کر سکتے ہیں۔ وہ ہماری مرضی کے مطابق سوچنے پر مجبور ہوگا اور اسے وہی دکھائی دے گا جو ہم اسے دکھانا چاہیں گے۔ اس ڈیوائس کی مدد سے میں نے اسے اسپتال سے نکالا اور اسے دکھایا کہ شاہ رخ خان اسے مار رہا ہے۔ چراغ دین اور سرفراز کو بھی میں نے کنٹرول میں کر رکھا تھا اس لیے انہوں نے بھی شاہ رخ خان کو دیکھا اور حیران ہوتے رہے کہ بالی ووڈ کا اتنا بڑا اسٹار یہاں کیا کر رہا ہے۔ میرے خاندان کے ساتھ رئیس علی نواز اور اس کے ساتھیوں نے جو کچھ کیا تھا' میں اسے دنیا کے سامنے لانا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے ان تینوں کو پھر کنٹرول کیا اور بھوت کا دیدار کروایا۔ پھر میڈیا کے آگے ہارون مرزا کی زبان سے سب سچ اگلوایا اور پھر اسے بس کے آگے کودنے پر مجبور کر کے خودکشی کا رنگ دیا۔ میں نے سب کچھ نہایت پلاننگ اور ہوشیاری سے ترتیب دیا تھا مگر پھر بھی ان تصویروں کی مدد سے تم مجھ تک پہنچ ہی گئے۔''

اعیان کو اپنے سارے سوالوں کے جواب بنا پوچھے ہی مل گئے تھے۔ مگر دو سوال ایسے تھے جن کے جواب نہیں مل رہے تھے پہلا یہ کہ آزاد کون تھا' اور باقی اسٹار کون کون ہیں۔ اعیان نے یہ سوال بھی پوچھ لیے۔

''آزاد میرا ہی پیار کا نام ہے۔ میں نے اس وقت اسی نام سے پولیس میں رپورٹ درج کروائی تھی۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا' ورنہ تم بہت پہلے مجھ تک پہنچ چکے ہوتے۔ اور رہی بات اسٹار کی تو اسٹار صرف ایک ہی تھا اور وہ تھا خود پروفیسر دلاور چند وہ آوازیں بدل بدل کر ظریف چوہدری سے بات کرتا تھا اور کسی نہ کسی کو اسٹار بنا کر ظریف چوہدری سے ملواتا تھا۔ اس لیے اسے بھی لگتا تھا کہ تین یا چار لوگ اسٹار ہیں۔ مگر حقیقت میں اسٹار صرف پروفیسر ہی تھا۔ وہ ایسا کیوں کرتا تھا' میں نے اس بارے میں کبھی پوچھا نہیں......'' بڑے پاپا کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے۔ ''کچھ بھی ہو مگر اس سارے کھیل میں مزا بہت آیا۔ لیکن اس بات کا افسوس رہے گا کہ میں پروفیسر کے گینگ کو تباہ کرنے والے انفارمر کی حقیقت کو نہیں جان پایا۔''

''اس بات کا افسوس تو مجھے بھی رہے گا۔'' اعیان نے کہا جس پر رانی نے عجیب سی نظروں سے اعیان کی طرف دیکھا مگر کچھ بولی نہیں۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں بڑے پاپا سے رخصت ہو کر کار میں سفر کر رہے تھے۔ ''تم نے بڑے پاپا سے جھوٹ کیوں بولا۔''

''اور کیا کرتا۔ کیا یہ سچ بتا دیتا کہ میں ہی انفارمر ہوں۔ اور اپنے خاندان کی موت کا بدلہ لینے کے لیے انفارمر بننا پڑا۔ تم ہی بتاؤ' یہ سب انہیں بتا کر کچھ حاصل ہوتا کیا۔ نہیں نا۔'' اعیان نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر مجھے سچ کیوں بتایا تھا۔ اس سے بھی تو تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوا ہوگا۔''

''تمہاری بات اور ہے۔ تم سے میں کبھی جھوٹ نہیں

بول سکتا۔ تم میری زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہو۔"

"کیا ہانیہ سے بھی زیادہ۔" رانی کے منہ سے جانے کیوں نکل گیا۔"

رانی کی بات پر اعیان چونکا' پھر پوری ایمانداری سے بولا۔ "ہاں۔ ہانی سے بھی زیادہ۔ بے شک ہانی میری زندگی ہے' مگر وہ کبھی مجھے سمجھ ہی نہیں پائی۔ جب سے ہم ملے ہیں' تب سے ہم نے پیار کی اتنی باتیں نہیں کیں جتنے جھگڑے کیے ہیں۔ جبکہ تم تو بنا کہے میری ہر بات سمجھ جاتی ہو۔ تم نے میرے لیے کیا نہیں کیا۔ اگر میں خود کو......"

"بند کرو یہ بیکار کی باتیں۔" رانی اس کی بات کاٹتی ہوئی بولی۔ "ممی پاپا کی موت کے بعد بڑے پاپا ہم سے ملے' یہ پاپا کے دور کے رشتے دار تھے انہوں نے ہمیں سنبھالا' ہمیں نئی زندگی دی' اور میرے بھیا' بڑے پاپا کے بھروسے پر مجھے چھوڑ کر امریکا ایسے گئے آج تک لوٹ کر نہیں آئے۔ اور بڑے پاپا بھی میرے ساتھ زیادہ کہاں رہے' وہ زیادہ تر بیرون ملک ہی رہتے تھے۔ تب تمہارے ممی پاپا' بھیا' بھابھی نے ہی میرا خیال رکھا' ان سب نے مجھے ہمیشہ اپنے خاندان کا ہی ایک فرد سمجھا۔ تم سے بھی زیادہ وہ سب مجھے پیار کرتے تھے۔ اس لیے اب ایسی کوئی بکواس مت کرنا۔ میں نے جو بھی کیا اپنے خاندان کے لیے کیا۔ تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔"

پھر تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی اور اعیان سڑک پر نظریں جمائے کار دوڑاتا رہا۔ پھر رانی اچانک بولی۔ "بس یہیں روک دو۔" اور اعیان نے بریک پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔

"اعیان۔ آخری بار گلے نہیں ملو گے۔ آج کے بعد شاید ہم پھر کبھی نہ ملیں۔" رانی نے نیچے اتر کر اپنی بانہیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب۔" اعیان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"اعیان۔ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں' اس کا اندازہ مجھے کل ہوا۔ مگر میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی' کیونکہ ہانیہ بالکل پاگل ہے۔ اگر تم اسے نہ ملے تو وہ مر جائے گی۔ اس لیے میں تم دونوں کے بیچ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بہت دور جا رہی ہوں۔" رانی نے اعیان کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جدائی کے آنسو۔

"کہاں جاؤ گی' رک جاؤ پلیز۔" اعیان نے التجائی لہجے میں کہا۔ اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

"نہیں اعیان۔ مجھے مت روکو۔ میں تمہیں ہانیہ کو دے تو رہی ہوں مگر اتنا بڑا دل نہیں ہے میرا کہ تم کو اس کے ساتھ دیکھ سکوں۔ اس لیے مجھے جانا ہی ہوگا اور ہاں فیضی کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ اسے میں نے پالا ہے۔ وہ میرا بیٹا ہے اور میرے ہی ساتھ رہے گا۔" رانی اعیان سے الگ ہو کر ایک طرف چل دی۔ اعیان سے کچھ بولا نہیں گیا وہ بس بھیگی آنکھوں سے رانی کو جاتا ہوا دیکھتا رہا' جب تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔

اعیان نے اپنی آنکھیں پونچھیں اور کار میں بیٹھ کر اسپتال روانہ ہوگیا جہاں ہانیہ کو داخل کروایا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ہانیہ بہت جلد ٹھیک ہوجائے گی اور اسے معاف بھی کردے گی۔ وہ ہانیہ کو اب اتنا پیار دینا چاہتا تھا کہ کوئی بھی دکھ' کوئی بھی غم چاہ کر بھی ہانیہ کے آس پاس نہ پھٹک سکے۔ اور انہی سوچوں میں اس کی کار طویل سڑک پر دوڑتی چلی گئی۔



طلب

حسیب جواد علی

انسان خواہشات کا غلام ہے' یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی ہر خواہش پوری نہیں ہوسکتی پھر بھی وہ اپنی حد سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتا ہے۔
خواہشوں پر زندگی وار دینے والوں کا قصہ

''بھائی صاحب! ساجدہ بہت ضد کررہی ہے' میں سوچتا ہوں آزمالیتے ہیں' اولاد بھی تو زندگی میں بہت ضروری ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟'' شبیر جان نے بہت رازداری کے ساتھ مجھ سے مشورہ مانگا۔

اس وقت جدہ کے ایک اسپتال کا بہت شہرہ تھا' مصنوعی تولیدگی کی تکنیک اور متعلقہ جدید آلات سے آراستہ اسپتال میں ڈاکٹروں کی ایک پوری ٹیم موجود تھی۔ ایک دوسرے سے مختلف میدانوں کے ماہر لیکن اجتماعی نتیجہ دینے والے ڈاکٹر دنیا کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ مزید تحقیق کرلی جائے لیکن دونوں میاں بیوی کو اتنی جلدی تھی کہ اگلے دن ہی انہوں نے فون پر رابطہ کیا۔

ڈاکٹروں نے تاریخ دے دی' کچھ ہدایات دیں' دوائیں اور کچھ ابتدائی ٹیسٹ بتائے جو اس چھوٹے شہر میں ہی ہوسکتے تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ سفر کا تھا' جدہ بہت دور تھا تقریباً گیارہ گھنٹے کا سفر اور اس چھوٹے شہر سے قریب ترین ائرپورٹ دوسو کلومیٹر پر تھا۔ علاج کے بعد اسپتال سے ائرپورٹ اور پھر دوسرے ائیرپورٹ سے گھر تک یہ سب سے زیادہ تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ایک اسٹیشن ویگن قسم کی گاڑی حاصل کی جائے جس میں بستر کا انتظام ہوتو گیارہ سو کلومیٹر کا بذریعہ سڑک سفر زیادہ مناسب رہے گا۔ خرچے کا اندازہ لگایا تو وہ ہزاروں میں آرہا تھا لیکن یہ سب شبیر جان کی کاروباری نوعیت کی وجہ سے قابل عمل تھا۔

شبیر جان سے میری ملاقات نماز جمعہ کے بعد مسجد کے باہر ہوئی تھی۔ میں کسی کا انتظار کررہا تھا کہ سلام کی آواز کان میں پڑی اس نے مجھے نام لے کر مخاطب کیا تھا۔ ضرور کسی نے اس سے میرا غائبانہ تعارف کرایا ہوگا۔

''آپ کراچی کے ہیں نا؟''

اس نے بات اسی طرح شروع کی تھی' اس خوب صورت ساحلی شہر میں کراچی سے تعلق رکھنے والے گنے چنے لوگ ہی تھے۔ زیادہ تر شمالی علاقوں اور پنجاب کے رہنے والے تھے' باہر کسی بھی ملک میں' عام طور پر علاقائی لسانی عصبیت اور بہت حد تک اور بہت دیر تک پاکستانیت کے جذبے میں چھپی رہتی ہے اور لوگ ایک دوسرے سے بہت خلوص اور محبت سے ملتے ہیں۔ کسی سیاسی جماعت سے وابستگی اور پھر سیاسی بحث ومباحثہ اور بعض اوقات مالی معاملات اور قضیے اس پردے کو کبھی کبھی چاک بھی کردیتے ہیں لہٰذا ملنے جلنے میں لوگ بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں لیکن مجھے مخاطب کرنے والا نہ سندھی تھا نہ پٹھان اور نہ پنجابی' بلوچ وغیرہ...... کراچی کا تو بالکل بھی نہیں لگا۔ اردو میں بات کرنے کے باوجود میں نے ایک بے تکا سوال کردیا۔

''آپ کون ہے...... میرا مطلب ہے کہ آپ پاکستانی ہیں؟'' اس کے نامانوس خدوخال اور لہجے نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ جواب میں اس نے کہا۔

''میں روسی ہوں۔ ہم لوگ ازبکستان سے افغانستان اور پھر وہاں سے پاکستان آئے تھے۔ جنگ کی وجہ سے ہم تتر بتر ہو گئے اور اب میں اور میرا ایک بھائی یہاں ہیں اور والدہ دوسرے بھائی بہنوں کے ساتھ کسی اور ملک میں ہیں۔''

''یار تم تو ٹھیک ٹھاک اردو بولتے ہو۔'' میں نے اس کو بیچ میں ٹوک دیا۔

''اردو میں نے کراچی میں ایک مدرسے کے استاد سے سیکھی پھر میری شادی اردو بولنے والوں میں ہوئی میری اردو اور بھی اچھی ہو گئی۔ میری زبان فارسی ہے میرے لیے اردو سیکھنا آسان تھا۔ میری بیوی اور مجھ میں دو باتیں ہی مشترک ہیں۔ ایک تو مذہب اور دوسرے ہجرت ورنہ ہمارا رہن سہن' رسم و رواج سب مختلف ہیں۔ دراصل میری بیوی کی بہت خواہش ہے آپ لوگوں سے ملنے کی' یہاں کراچی والے آپ ہی تو ہیں۔'' وہ روانی سے بولتا چلا جا رہا تھا۔

لیکن بات دراصل یہ نہیں تھی' کراچی والا ہونے کے علاوہ ایک اور چیز باعث کشش تھی۔ میری بیوی کو کرکٹ کا بہت شوق تھا اور آپ کے یہاں سنا ہے ڈش لگی ہے۔'' اس نے اب جا کے اپنی بات مکمل کی' میں نے کہا۔

''ہاں ہے تو اور آج کل میچ بھی چل رہے ہیں۔ میری بیوی یہاں ہی ہے' تمہاری بیگم جب چاہیں آ سکتی ہیں' دونوں کی ملاقات بھی ہو جائے گی۔''

''مجھے تو بالکل شوق نہیں ہے' یہ کھیل میری سمجھ میں بھی نہیں آتا۔ کل کے میچ کے لیے میں ساجدہ کو صبح آپ کے یہاں چھوڑ دوں گا' اگر آپ کی اجازت ہو تو؟ مجھے اپنا کاروبار بھی دیکھنا ہے' شام کو آ کر لے جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر گویا اس نے اپنا اگلے روز کا پروگرام فائنل کر دیا۔

ڈش اس زمانے میں نئی چیز تھی اور کم ہی گھروں میں نظر آتی تھی۔ شبیر جان اور ساجدہ نے آنا جانا شروع کر دیا۔ ہم دونوں بھی دو چار بار اُن کے یہاں گئے اور اس طرح بہت جلد یہ تعلقات کرکٹ سے بالاتر ہو گئے۔

اولاد کا موضوع ہم نے کبھی چھیڑا نہیں لیکن اندازہ ہو گیا کہ ان کی خواہش شدید ہے۔ جب شبیر جان نے خود ذکر کیا اس بات کا تو میں نے بھی اظہار خیال کر دیا کہ تم دونوں ہی ڈاکٹر سے مشورہ کرو' کہنے لگا۔

''کمی مجھ میں ہے' ساجدہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہم دونوں نے چیک اپ کرا لیا ہے۔'' غنیمت تھا کہ اس نے اپنا چیک اپ بھی کرا لیا تھا اور اپنی اس کم مائیگی اور کمزوری کو قبول بھی کر چکا تھا ورنہ مردوں کی انا تو ان کو اس پر تیار ہی نہیں ہونے دیتی۔ سب حقیقتیں تسلیم کر لی جاتی ہیں لیکن عام طور پر اس معاملے میں عورتیں ہی دار پر لٹکائی جاتی ہیں۔

خیال ہوا کہ شاید وہ لوگ اس محرومیت کو اللہ کی مرضی سمجھ کر صبر و شکر سے بیٹھ رہے لیکن انہیں اولاد کی طلب شدید تھی اور بیوی کی طلب کچھ زیادہ ہی شدید۔ جب ہی تو اس مہنگے علاج کو آزمانے کا فیصلہ ہوا۔ آس پاس جاننے والے دوستوں اور ساتھیوں میں کوئی پہلی بار اس ٹرانس پلانٹ والی تکنیک کے ذریعے صاحب اولاد ہونے جا رہا تھا۔ تجسس خوف اور امید کے ملے جلے جذبات ان دونوں کے تو تھے ہم دونوں میاں بیوی اور تمام ملنے جلنے والے بھی کچھ ایسی ہی کیفیات میں غلطاں ہو گئے تھے۔

روانگی کے دس بارہ دن بعد اطلاع آئی کہ سب کچھ

ٹھیک ہوگیا ہے اور وہ لوگ اگلے دن شام تک پہنچ جائیں گے۔ میں اور عصمت اس دن شام کو ملنے گئے' شبیر جان اور ساجدہ بہت خوش اور مطمئن تھے۔ ڈاکٹروں نے بتایا تھا آئندہ تین مہینے بہت اہم ہیں۔ اگر یہ وقت خیریت سے گزر گیا تو اس کے چھ مہینے کے بعد بچے کی پیدائش ہوگی البتہ بیچ میں ایک یا دو مقامی اسپتال میں معائنہ کرانا ہوگا۔

اللہ کی مصلحت اللہ ہی جانے' تین مہینے سے پہلے ہی ساجدہ غسل خانے میں گر گئی اور حمل ضائع ہوگیا۔ ساری امیدیں خاک میں مل گئیں سب خواب چکناچُور ہوئے۔ کہاں وہ اولاد کے سکھ اور بے پایاں خوشیوں بھرے مستقبل کی آس اور کہاں یہ محرومیاں اور اندھیرے۔ مقامی اسپتال سے واپسی پر ساجدہ خاموش سی ہوکر رہ گئی تھی اور شبیر جان بھی مایوسی اور بے بسی کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔

ایک دن انجان سی امید کی کرن ایک اچانک خیال نے ان کو چونکا دیا۔ فوراً جدہ والے اسپتال کو فون کر کے ساری بات بتائی تو پتا چلا ایک موقع ابھی باقی ہے۔ پندرہ دن تک وہ لوگ دوبارہ اسپتال پہنچیں اس طرح کے معاملات میں بہت سی احتیاطی تدابیر ذہن میں رکھی جاتی ہیں' کئی چیزیں محفوظ کرلی جاتی ہیں کہ اگر ٹرانس پلانٹ کا عمل دوبارہ کرنا پڑے تو کوئی دقت نہ ہو۔ دونوں میاں بیوی میں جیسے زندگی کی لہر دوڑ گئی ہو۔

شبیر جان پھر اپنی تمام تر تیاری مع گاڑی اور بستر روانہ ہوئے سب کچھ جیسے پہلے والے مناظر کاری چلے تھا۔ پندرہ دن کے بعد ان کی واپسی کی اطلاع ملی' ہم نے رات کو روانگی کے حساب سے اگلے دن اُن کی آمد کا اندازہ لگایا۔ دوپہر میں یہ اندوہناک خبر ملی کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آیا ہے' منزل سے کوئی پونے دو سو کلومیٹر پہلے۔ پھر شبیر جان نے خود فون کر کے خبر کی تصدیق کی' ساجدہ اب اس دنیا میں نہیں تھی۔ شبیر جان جائے حادثہ سے قریب ترین شہر میں اپنے رشتہ دار کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور بیوی کی لاش مقامی اسپتال کے سرد خانے میں جانچ پڑتال اور تفتیش کے بعد پاکستان روانگی کے لیے رکھی تھی۔ میں اور عصمت خبر سنتے ہی روانہ ہوگئے' ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد وہاں پہنچے اور شبیر جان کو ڈھونڈ ہی لیا ان کی کمر اور کندھے میں بہت تکلیف تھی۔ بقول ان کے پتا ہی نہیں چلا کب اور کیسے گاڑی الٹ گئی جب ان کو ہوش آیا تو دو چار قلابازیاں کھانے کے بعد گاڑی سیدھی ہوچکی تھی آنے جانے والے کار سواروں نے ان کو گھیرا ہوا تھا اور بیوی کا بستر خالی تھا۔

کسی نے بتایا کہ کوئی سو گز پیچھے ایک عورت کی لاش پڑی ہے اندازہ لگایا گیا کہ گاڑی الٹنے کے بعد یا حادثے کے دوران دروازہ کھل گیا ہوگا اور ساجدہ باہر نکل کر کسی چٹان سے ٹکرائی ہوگی۔ پیٹ میں چوٹ آنے سے موت واقع ہوگئی۔ اب لاش اسپتال میں ہے اور شبیر جان وہاں کے قانون کے مطابق زیر تفتیش کہ کہیں نشے کے عادی تو نہیں تھے' بیوی سے تعلقات تو کشیدہ نہیں تھے۔ وہ سب شکوک جو ان حالات میں کسی بھی شکی انسان یا پولیس کو ہو سکتے ہیں۔

دو ہفتے بعد شبیر جان کی پولیس سے جان چھوٹی اور بالآخر وہ ساجدہ کی تجہیز و تکفین پاکستان میں کر کے واپس ہوئے۔ خالی ہاتھ ناامیدی اور شکست خوردگی کی تصویر بنے' ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کرلی۔ کاروبار اور مالی نقصان الگ' اللہ تعالیٰ کو ان کے گھر اولاد منظور ہی نہیں تھی' اس کی رضا میں راضی رہنا چاہیے تھا اس جھمیلے میں پڑے ہی کیوں؟

ساجدہ کی وجہ سے جو بڑا مکان انہوں نے لے کر سجایا تھا وہ اب بھی ان کے پاس تھا۔ کمرے میں بیٹھے اس کے بستر اور سامان کو تکا کرتے اور پھر برابر کے ویران کمرے میں جا کر سو جاتے۔

سب نے ان کو حالت عمومی میں لانے کی کوشش کی پھر معاملہ وقت پر چھوڑ دیا کہ وہی سب سے اچھا مرہم ہے اور آہستہ آہستہ بہت گہرے زخم بھی بھر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کی طاقت و برداشت سے زیادہ اس پر مصیبت نہیں ڈالتا۔ اس نے انسان کو غم بھلانے کی جو اہلیت اور طاقت بخشی ہے اس سے دنیا میں سب نے ہی فائدہ اٹھایا ہے' کبھی نہ کبھی زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں زندگی اور غم کا چولی دامن کا ساتھ جو ٹھہرا۔

عصمت دو مہینے کے لیے بچوں کے پاس پاکستان چلی گئیں جیسے کہ وہ ہر تین چار ماہ کے بعد جایا کرتی تھی ادھر شبیر جان بھی چند روز کے لیے پاکستان گئے اور واپس بھی آ گئے تھے۔ واپسی پر عصمت نے بتایا کہ شبیر جان نے ایک عورت کو ریاض ائر پورٹ پر ریسیو کیا اس عورت نے پاکستان سے عصمت کے ساتھ سفر کیا تھا' وہاں مقامی ائر پورٹ پر میں نے نظریں دوڑائیں کہ شاید شبیر جان مجھے نظر آ جائے۔ آگے دو سو کلو میٹر کا سفر باقی تھا' اس کو بھی ساتھ لے لیا جائے وہ دونوں اگر ریاض سے جہاز میں آئے تھے تو آخر کہاں غائب ہو گئے؟ ممکن ہے وہ لوگ پہلے نکل گئے ہوں یہ سوچ کر میں نے اور عصمت نے اپنا سفر شروع کر دیا۔

اگلے دن میں نے شبیر جان کو فون کیا تو ذرا ہکلاتے ہوئے انہوں نے اطلاع دی کہ ان کی دوسری شادی ہو چکی ہے اور ہمیں اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔

نیلوفر کو اردو آتی تھی لیکن لہجہ ذرا نامانوس سا محسوس ہوا' شبیر جان کی ہم وطن اور ہم زباں پڑھی لکھی کم سے تھی لیکن خوب صورت بلکہ بہت خوب صورت تھی' ساجدہ سے کہیں زیادہ۔ شبیر جان بہت خوش تھے گھر کا فرنیچر بدل دیا گیا' پرانی یادوں کو انہوں نے ذہن کی پچھلی اندھیری کوٹھری میں بند کر دیا تھا۔

چند مہینے کے بعد ان کا فون جو آیا تو ذرا مختلف سا تھا' کچھ مشورہ کرنا تھا جب ملے تو معلوم ہوا کہ مسئلہ واقعی گمبھیر تھا۔ انہوں نے بتایا کہ نیلوفر کا مزاج روز بروز بدلتا جا رہا ہے' غصہ بہت بڑھ گیا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر رونے بیٹھ جاتی ہے۔ میں نے کہا ہو سکتا ہے گھر والے یاد آئے ہوں کبھی کبھی ماں باپ سے دوری کی عادت پڑنے میں کچھ دیر لگتی ہے' ذرا سا وقت دو' سب ٹھیک ہو جائے گا' کہنے لگے بات وہ نہیں ہے۔ اس کو اولاد چاہیے۔

''تم نے ان لوگوں سے کچھ چھپایا تو نہیں تھا؟ میرا مطلب ہے ان کو پتا ہے کہ تم باپ نہیں بن سکتے؟'' میں نے دو سوال داغ دیئے۔

بخدا بتایا تھا' ساجدہ کا سارا قصہ ان کو معلوم ہے' شبیر جان نے وضاحت کر دی۔ آپ کہیں گے کہ اس کو سمجھاؤ میں آپ کو بتاؤں میں نے ہر طرح سے سمجھایا مگر وہ کہتی ہے کچھ بھی کرو مجھے تو بچہ چاہیے۔ مجھے ماں بنا دو اس اسپتال سے رابطہ کرو جہاں ساجدہ کا آپریشن ہوا تھا۔ میں نے کہا کہ اب نہیں بالکل بھی نہیں۔ میں اللہ سے مزید ضد نہیں کروں گا' میں نے صبر کر لیا ہے۔ پر وہ کوئی بات ماننے کو تیار نہیں' کہتی ہے تو پھر مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا' مجھے واپس بھیج دو۔ سنا ہے شبیر جان اب بھی وہاں ہے لیکن اکیلے۔ ان کی بیوی پاکستان میں ہیں اپنے والدین کے پاس۔



مانوبھار

راوی: وسیم قریشی
تحریر: حسام بٹ

دنیا میں کون ایسا نہیں ہوگا جسے اپنے آنے والے کل کی فکر نہ ہو۔ ہر شخص یہ جاننے کا شیناقی رہتا ہے کہ آنے والا کل اس کے لیے کیا لائے گا حالانکہ اس کا گزرا ہوا کل اور گزرتا ہوا آج چلا چلا کر بتا رہا ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ ہورہا ہے اس کے نتیجے میں اسے کیا حاصل ہونے والا ہے۔
ایک ماہر آسٹرولوجسٹ کی ڈائری کا ایک روق
ناآسودہ جذبوں کا احوال‘ پھولوں کے ساتھ لگے کانٹوں کی روداد۔
ان لمحوں کا فسانہ جب جذباتی فیصلے زندگی بھر کا آزار بن جاتے ہیں۔
نئے افق کے قارئین کے لیے بطور خاص

جس طرح ہر دن ایک جیسا نہیں ہوتا بالکل ایسے ہی ہر روز انسان کا مزاج ایک جیسا نہیں ہوسکتا۔ اس روز میرا موڈ بھی خاصا خراب بلکہ برہم تھا۔ آج صبح ہی صبح ایک کلائنٹ سے اچھی خاصی بدمزگی ہوگئی تھی اور میں نے بھی نہ چاہتے ہوئے اسے کھری کھری سنادی تھی کلائنٹ تو پاؤں پٹک کر میرے آفس سے نکل گیا اور میں اس وقت خاصی کوفت محسوس کررہا تھا آگے بڑھنے سے پہلے میں اپنا تعارف کرادوں تو بہتر ہوگا۔

میں پیشے کے اعتبار سے ایک آسٹرولوجسٹ ہوں یہ تعارف اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کہانی کے توسط سے یہ میرا آپ سے پہلا رابطہ یا پہلی ملاقات ہے اور قوی امید ہے کہ نئے افق کے ان صفحات میں اب ہر ماہ آپ سے میری ملاقات ہوا کرے گی اور میری پیشہ ورانہ زندگی کے نت نئے اور دلچسپ واقعات آپ تک پہنچتے رہیں گے۔

آسٹرولوجی میرا اوڑھنا بچھونا اور رزق روزگار ہے۔ بدقسمتی سے ہم ایک علم دشمن قوم ثابت ہوئے ہیں اس ملک میں لگ بھگ ہر علم کے ساتھ بہت ظلم اور ناانصافی ہوتی رہی ہے اور ہورہی ہے عالم کو بے وقوف اور علم کو فضول سمجھنے کا رواج عام ہے اور اس رویے کے ہولناک نتائج بھی سب کے سامنے ہیں۔ پاکستان کی معیشت اور معاشرت بڑی تیزی سے ترقی معکوس کی راہ پر گامزن ہے۔

دوسرے علم وفنون سے فی الوقت صرف نظر کرتے ہوئے میں اپنے پیشے کی بات کروں گا آسٹرولوجی یا علم نجوم کے ساتھ پاکستان میں سب سے زیادہ زیادتی خود اس علم کے نام نہاد ماہرین نے کی ہے۔ ان چند کالی بھیڑوں نے علم نجوم کو عوام الناس میں کچھ ایسے انداز میں پیش کیا ہے کہ یہ قابل تحسین ہونے کے بجائے قابل مذمت ہوکر رہ گیا ہے جبکہ اس سائنسی علم کی حقیقت اس کے بالعکس ہے۔

علم نجوم کوئی غائب یا غیب کا علم نہیں، یہ ایک حسابی سائنس ہے۔ سیارے اور ستارے، چاند اور سورج نہ کسی کے دوست ہیں اور نہ ہی دشمن۔ یہ اجرام فلکی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ راستوں پر محوسفر



Aratus Cilix
Ursa maior
Ursa minor
Leo
Virgo
Bootes
Libra
Scorpio
Sagittarius
Capricornus
Aquarius
Pegasus
Andromeda
Cassiopea
Cepheus
Draco
Lyra
Hercules
Ophiuchus
Aquila
Delphinus
Telum
Corona
Anguis
Perseus
Caput medusae
Deltoton
Pisces
Aries
Taurus
Erichthonius
Gemini
Cancer
M. Manili.
s Romanus

ہیں۔ ان کی گردش روز و شب سے موافق اور نا موافق حالات پیدا ہوتے ہیں۔ موافق حالات سے فائدہ اٹھانا اور نا موافق حالات میں احتیاط کی راہ اختیار کر کے خود کو نقصان سے بچانا انسان کے اختیار میں ہے علم نجوم ہمیں صرف اچھے اور برے وقت سے آگاہ کرتا ہے اس کی نشان دہی کو سنجیدگی اور قدر کی نگاہ سے دیکھنا یا پاؤں کی ٹھوکروں میں اڑا دینا انسان کی مرضی پر منحصر ہے۔

انٹر کام کی گھنٹی نے مجھے چونکا دیا میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ دوسری جانب میری سیکرٹری انیلا تھی۔ میری سماعت سے انیلا کی آواز ٹکرائی۔

''سر، کوئی مسز خالدہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔''

''ٹھیک ہے، انہیں میرے کمرے میں بھیج دیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

میرا آفس طارق روڈ پر ایک شان دار کثیر المنزلہ عمارت میں واقع ہے۔ یہ دو کمروں کا ایک خوب صورت دفتر ہے۔ داخلی کمرے میں میری سیکرٹری انیلا موجود ہوتی ہے اور کلائنٹس کے لیے آرام دہ صوفے بھی رکھے ہیں۔ یہ کمرا استقبالیہ اور انتظار گاہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے جبکہ اس سے ملحقہ دوسرا کمرا میرے لیے مختص ہے جہاں میں کلائنٹ سے ملاقات کرتا ہوں۔

تھوڑی دیر کے بعد میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور دو خواتین اندر داخل ہوئیں۔ انیلا نے کسی مسز خالدہ کی آمد کی اطلاع دی تھی بہر حال میں نے مخصوص پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا اور انہیں بیٹھنے کے لیے کہا جب وہ میری میز کے سامنے کرسیوں پر براجمان ہو چکیں تو میں نے باری باری سوالیہ نظر سے ان کی طرف دیکھا اور کہا۔

''مسز خالدہ؟'' میرے انداز میں سوال تھا۔

''جی، مسز خالدہ یہ ہیں۔'' ایک نے دوسری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

''میں انہیں آپ کے پاس لے کر آئی ہوں میرا نام عالیہ بیگم ہے وہ فاروقی صاحب کو تو آپ جانتے ہیں نا، آپ کے بارے میں فاروقی صاحب ہی نے مجھے بتایا تھا۔''

''کون سے فاروقی صاحب؟'' میں نے استفسار کیا پھر کہا۔

''دراصل میرے تعلق داروں میں تین چار فاروقی صاحب ہیں میں سمجھ نہیں پایا آپ کا اشارہ کن فاروقی صاحب کی طرف ہے۔''

''وہ فاروقی صاحب جو محکمہ تعلیم میں ایک اعلیٰ افسر ہیں۔'' عالیہ بیگم نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔

''وہ آپ کے اور آپ کے علم کے بہت مداح ہیں۔''

''اوہ، تو آپ نجم فاروقی کی بات کر رہی ہیں۔'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔

''کیا آپ کا تعلق بھی ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ ہی سے ہے؟''

''جی بالکل۔ میں ایک اسکول کی ہیڈ مسٹریس ہوں۔'' عالیہ بیگم نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

عالیہ بیگم نے اپنے اسکول کا نام بھی بتایا تھا لیکن میں یہاں اس اسکول کا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھتا کیوں کہ زیر نظر کہانی سے مذکورہ اسکول کا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔

''جی عالیہ صاحبہ۔'' میں نے ہیڈ مسٹریس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

''قریشی صاحب میں دراصل خالدہ کے ایک نجی مسئلے کے لیے حاضر ہوئی ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

''یہ شادی کرنے جا رہی ہیں اور اسی سلسلے میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتی ہیں آپ ان کا زائچہ بنا کر اپنے علم کی روشنی میں راہنمائی کر دیں۔''

''جی ضرور۔'' میں نے کاغذ قلم سنبھال لیا پھر خالدہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ اپنی اور ان صاحب کی تاریخ پیدائش نوٹ کرادیں جن سے آپ شادی کی خواہاں ہیں۔''

اس نے میری مطلوبہ تواریخ پیدائش نوٹ کرا دیں۔ اس ڈیٹا کو دیکھ کر مجھے حیرت تو ہوئی تاہم میں نے اس حیرت کا ان خواتین پر اظہار نہیں کیا حیرت کا سبب عمروں کا تفاوت تھا۔ خالدہ کی عمر پچاس سال بنتی تھی جبکہ کاشف محض تیس سال کا تھا۔ کاشف اس شخص کا نام تھا جس سے خالدہ شادی کا ارادہ رکھتی تھیں۔ میری حیرت کا ایک زاویہ بھی تھا کہ خالدہ بس واجبی سی شکل وصورت کی مالک تھیں یہ نہیں سوچا جا سکتا تھا کہ اس کی خوب صورتی اور دل کشی سے متاثر ہو کر اس سے بیس سال چھوٹا ایک شخص اس سے شادی کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

میں ان دونوں کے ہارواسکوپ (زائچے) بنانے کے لیے اپنے کمپیوٹر کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ کسی زمانے میں جب کمپیوٹر نہیں ہوا کرتا تھا یا یوں کہہ لیں کہ جب کمپیوٹر کی دنیا میں آسٹرولوجی کے سافٹ ویئر متعارف نہیں ہوئے تھے تو کسی شخص کا درست زائچہ بنانے کے لیے دو تین گھنٹے صرف ہو جاتے تھے جبکہ اب یہ کام دو تین منٹ کا رہ گیا ہے۔ لمبی چوڑی ضرب تقسیم اور پلس مائنس سے کمپیوٹر کے طفیل نجات مل گئی ہے۔ کمپیوٹر کسی شخص کا زائچہ بنانے کے سلسلے میں وہی آسانی فراہم کرتا ہے جو کسی کچن میں رکھا ہو چوپر، جوسر یا بلینڈر مگر یہ حقیقت ہے کہ ٹیکنالوجی انسان کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ جس طرح تمام مسالے آسانی سے پس جانے کے باوجود بھی ایک ماہر کھانا پکانے والی/ والے کی ضرورت رہتی ہے بالکل اسی طرح کمپیوٹر سے زائچہ بنانے کے بعد اس کی اسٹڈی کے لیے ایک ماہر علم نجوم کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

''خالدہ صاحبہ۔'' میں نے اپنی کلائنٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا ایک کاروباری اصول ہے میں تنہائی میں کلائنٹ سے ڈسکس کرتا ہوں تا کہ وہ کھل کر اپنی زندگی کا ہر معاملہ ڈسکس کر سکے کیا آپ عالیہ صاحبہ کی موجودگی میں بات کرنا چاہیں گی۔''

خالدہ کے جواب دینے سے پہلے عالیہ بول اٹھی۔ ''خالدہ میری پڑوسن اور بہت اچھی دوست ہے اس کا کوئی معاملہ مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے لیکن پھر بھی اگر یہ آپ سے علیحدگی میں بات کرنا چاہے گی تو میں باہر انتظار گاہ میں بیٹھ جاؤں گی، یہ کوئی ایشو نہیں ہے۔''

''وسیم صاحب۔'' خالدہ نے مجھے میرے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے عالیہ کی موجودگی پر کوئی اعتراض نہیں آپ ہر پہلو پر مجھ سے بات کر سکتے ہیں۔''

میں نے دونوں زائچوں پر نگاہ دوڑاتے ہوئے بولنا شروع کیا۔

''پہلے آپ کے زائچے کی بات ہو جائے کاشف صاحب کا نمبر بعد میں آئے گا۔ آپ کے زائچے میں زہرہ اور مریخ کا قران ہے جو ایک سے زیادہ شادیوں کو ظاہر کرتا ہے علم نجوم کی اصطلاع میں ایسے زائچے

کے حامل شخص کو منگلا/منگلی کہا جاتا ہے اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو یہ آپ کی دوسری شادی ہے؟''

''آپ کا علم سچا ہے قریشی صاحب۔'' عالیہ بیگم نے دبے دبے جوش کے ساتھ کہا۔

''خالدہ کے شوہر شوکت حسین کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہوگیا تھا واقعی یہ دوسری شادی کرنے جا رہی ہیں۔''

''میرا علم یہ بھی بتاتا ہے کہ پہلے شوہر سے آپ کی کوئی اولاد نہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اس سلسلے میں آپ نے کافی علاج معالجہ بھی کرایا تھا لیکن مراد بر نہیں آئی لیڈی ڈاکٹر نے آپ کے اندر ایک ایسی نسوانی خرابی بتائی ہے جس کی موجودگی میں یا تو اولاد ہوتی نہیں یا بہت مشکل سے البتہ ابارشن اور مس کیرج کا قوی امکان موجود رہتا ہے۔''

''وسیم قریشی صاحب آپ کے علم نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔'' خالدہ توصیفی نگاہ سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ پھر اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''ویسے میری قسمت میں اولاد ہے تو نا؟''

مجھے ان لمحات میں خالدہ پر بہت ترس آیا میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''یہ بتائیں کہ آپ کی اور میری تقدیر کا مالک کون ہے؟'' وہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گئی پھر بولی۔

''ظاہر ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کی تقدیر کا مالک ہے۔''

''بس تو پھر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا؟

''وہی کاتب تقدیر ہے ہم سب کی قسمت وہی لکھتا ہے اور اپنے لکھے کو مٹا کر دوبارہ بھی وہ جو جی چاہے لکھ سکتا ہے اس کی ذات سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے امید ہے کہ وہ ضرور آپ پر کرم کرے گا۔''

اس کی آنکھوں میں تمناؤں کے جگنو سے چمک اٹھے۔ احسان مندی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''میری صحت تو ٹھیک رہے گی نا؟''

''آپ کی صحت کے ساتھ نسوانی امراض کے علاوہ صرف ایک ایشو ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا آپ کے مریخ اور عطارد میں بڑی خراب نظر ہے۔ آپ کو پائلز (بواسیر) کی تکلیف ہوسکتی ہے۔''

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''کافی عرصہ پہلے میرے ساتھ یہ مسئلہ تھا پھر ڈاکٹر کے مشورے پر میں نے اس کا آپریشن کرالیا اس کے بعد سے آرام ہے۔''

''آپ نے آپریشن کرایا۔ اچھی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن آپریشن کے بعد بے حد احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ غفلت اور بداحتیاطی کے باعث یہ مرض لوٹ کر بھی آجاتا ہے اس کا شافی علاج صرف ہومیو پیتھک ہی میں ہے۔''

اس وقت میرے اور خالدہ کے بیچ گفتگو کا سلسلہ جاری تھا اس دوران میں عالیہ بیگم کئی بار پہلو بدل چکی تھیں میں خاموش ہوا تو اس نے کہا۔

''قریشی صاحب کاشف کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟''

عالیہ بیگم نے بہت ہی اہم سوال کیا تھا یہی وہ نکتہ تھا جس تک رسائی کے لیے وہ دونوں میرے سامنے موجود تھیں۔ مجھ تک پہنچنے کے لیے پہلے میری فیس ادا

کرنا ہوتی ہے اس کے بعد ہی میری سیکرٹری انیلا کسی کلائنٹ کو میرے کمرے میں بھیجتی ہے۔

''آپ کاشف کو کتنے عرصے سے جانتی ہیں؟'' میں نے براہ راست خالدہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی۔

''چند ماہ سمجھ لیں۔''

''کیا کاشف چشمہ لگاتے ہیں، نظر کا چشمہ؟'' میں نے کاشف کے زائچے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ان کے زائچے کے آٹھویں گھر میں شمس خاصی خراب پوزیشن میں ہے جس سے آنکھوں کی صحت متاثر ہوسکتی ہے۔''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے وسیم صاحب خالدہ نے بڑی رسان سے جواب دیا۔

''کاشف نظر کا چشمہ لگاتا ہے۔''

''دیکھیں، آپ میرے پاس رہنمائی کے لیے آئی ہیں اور اس مقصد کے حصول کے لیے آپ نے میری بھاری فیس ادا کی ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے اپنے علم کی روشنی میں آپ دونوں کے زائچوں کا جو تقابلی جائزہ لیا ہے اس کے نتیجے میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ لوگوں کا میچ مناسب نہیں ہے۔ مجھے کہیں کوئی گڑ بڑ محسوس ہو رہی ہے۔''

''کیسی گڑ بڑ قریشی صاحب؟'' عالیہ نے چونکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ میں نے بتایا۔

''کاشف کا عطارد بری طرح متاثر ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اس کے اندر دروغ گوئی کی عادت پائی جاتی ہے۔ یہ کافی شاطر اور چالاک قسم کا انسان ہے جو اپنے فائدے کی خاطر کچھ بھی کرسکتا ہے۔'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''کاشف کا شماران افراد میں کیا جاسکتا ہے جو اپنے مقصد کے حصول کے لیے کسی کو بھی دھوکا دے سکتے ہیں۔ ایسے لوگ قابل بھروسا نہیں ہوتے۔''

''تو آپ کا کہنا یہ ہے کہ خالدہ کو کاشف سے شادی نہیں کرنا چاہیے؟'' عالیہ نے دوٹوک انداز میں استفسار کیا۔

''میں آپ کو مجبور نہیں کرسکتا کہ آپ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔'' میں نے کہا۔

''میرا کام اپنے علم کی مدد سے مشورہ دینا ہے۔ اس مشورے پر عمل کرنا یا نہ کرنا آپ کی صوابدید پر ہے ایک بات ذہن میں رہے۔''

''میں تھوڑی دیر کے لیے رکا تو وہ اضطراری انداز میں میری طرف تکنے لگیں۔ میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔

''میں نے خالدہ اور کاشف کے زائچے کا جو تجزیہ کیا ہے اس کا انحصار اس ڈیٹا پر ہے جو آپ نے مجھے مہیا کیا تھا۔ اگر کسی کی تاریخ پیدائش میں کوئی خامی ہے تو پھر میری باتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔''

''میری تاریخ پیدائش تو بالکل درست ہے۔'' خالدہ نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

''اور آپ نے میرے بارے میں ساری باتیں صحیح بتائی ہیں البتہ کاشف کی تاریخ پیدائش کے بارے، میں کوئی دعویٰ نہیں کرسکتی۔ جو تاریخ اس نے مجھے بتائی، میں نے وہی تاریخ آپ کو نوٹ کرادی ہے آگے جو اللہ کو منظور۔''

''تاریخ پیدائش کسی بھی انسان کی زندگی کا ''پاس

ورڈ'' ہوتا ہے۔'' میں نے ان کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''دو تاریخ کے، دو مہینے اور چار سال کے ڈیجیٹ کل ملا کر آٹھ ڈیجیٹ بنتے ہیں اگر ان میں سے ایک ڈیجیٹ بھی درست نہ ہو تو پھر وہ آپ کا نہیں کسی اور کی زندگی کا اکاؤنٹ کھل جاتا ہے آسٹرولوجی میں درست تاریخ پیدائش کی بڑی اہمیت ہے۔ انسان اپنا نام تبدیل کرسکتا ہے اپنا حلیہ، لباس، اسٹائل کلچر سب کچھ بدل سکتا ہے حتیٰ کہ اگر وہ چاہے تو اپنا مذہب بھی تبدیل کرسکتا ہے لیکن اپنی تاریخ پیدائش کو بدلنا اس کے بس کی بات نہیں کیونکہ تاریخ پیدائش کو بدلنے کے لیے دوبارہ پیدا ہونا پڑے گا جو کسی بھی طور ممکن نہیں ہے۔''

''قریشی صاحب، آسٹرولوجی تو بہت ہی زیادہ حسابی اور سائنسی علم ہے۔'' میرے وضاحتی انداز پر عالیہ بیگم نے کہا۔

''اگر کسی کی درست تاریخ پیدائش آپ کے ہتھے چڑھ جائے تو اس بے چارے کا کیا ہو گیا کام۔ اس کی زندگی کا ہر گوشہ آپ کے سامنے عیاں ہو جائے گا۔''

''بالکل ایسا ہی ہے۔'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے سر کو اثبات جنبش دی۔

''جیسے اگر کسی کا اے ٹی ایم کارڈ یا کریڈٹ کارڈ اس کے پاس ورڈ کے ساتھ آپ کے ہاتھ لگ جائے تو آپ اس کے اکاؤنٹ کے ساتھ جو چاہیں کرسکتے ہیں۔''

''وسیم صاحب آپ کا علم تو بہت خطرناک ہے۔'' خالدہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آسٹرولوجی تو کسی ایکسرے کی مانند ہے۔''

''علم کوئی بھی خطرناک نہیں ہوتا خالدہ جی۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''اس کی تاثیر کا انحصار اس کے استعمال پر ہے جس طرح ایک چھری کی مدد سے آپ سبزی، پھل اور مرغی بھی کاٹ سکتی ہیں اور کسی انسان کی گردن بھی۔ ہر دو صورت میں چھری کا کوئی قصور نہیں، سارا کھیل اس شخص کی نیت کا ہے وہ چھری جس کے ہاتھ میں ہے۔''

وہ دونوں مزید پندرہ منٹ تک میرے پاس بیٹھی رہیں پھر میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت ہوگئیں۔

خالدہ نے ایک لحاظ سے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ آسٹرولوجی ایک خطرناک علم ہے یہ واقعی انسانی زندگی کے بعض ایسے زاویوں کو اجاگر کر دیتا ہے جنہیں بیان کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ کاشف کے زائچے میں بہت سی منفی چیزیں مجھے دکھائی دے رہی تھیں۔ لیکن میں نے ہر زاویے کا کھل کر اظہار نہیں کیا تھا۔ اسی طرح خالدہ کے زائچے میں بھی کافی ٹیڑھیں تھیں۔ اگر ان دونوں کے زائچے نہیں بھی بنائے گئے ہوتے تو بھی یہ جوڑی کسی بھی لحاظ سے مناسب یا موزوں نہیں تھی۔

اگلے روز عالیہ بیگم نے مجھے فون کیا رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔

''وسیم قریشی صاحب سچی بات تو یہ ہے کہ میں بھی اس شادی کے حق میں نہیں ہوں اسی لیے میں خالدہ کو آپ کے پاس لے کر آئی تھی اور آپ کے تجربہ کارانہ تجزیے نے میرے خیال کو تقویت بخشی ہے لیکن......!''

''لیکن یہ کہ خالدہ کاشف سے شادی کا حتمی فیصلہ کرچکی ہے۔'' عالیہ بیگم کے ادھورے جملے کے جواب میں، میں نے کہا۔

''آپ یہی کہنا چاہ رہی ہیں نا؟''

''جی بالکل، کچھ ایسی ہی صورت حال ہے۔''

عالیہ بیگم نے کہا۔
''آپ نے اپنی دوست کو سمجھانے کی کوشش نہیں کی۔'' میں نے پوچھا۔
''جس حد تک ممکن تھا میں نے کوشش کر کے دیکھ لی۔'' وہ قدرے مایوسی سے بولی۔
''اب میں اس کے ساتھ زبردستی تو نہیں کر سکتی اور...... یہ میرا حق بھی نہیں بنتا۔''
''آپ ٹھیک کہتی ہیں کسی کو سمجھانے بجھانے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔'' میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا آپ کاشف سے مل چکی ہیں؟''
''جی نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولی۔
''حالانکہ میں نے خالدہ سے اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا مگر وہ ٹال گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ کاشف سے ملوانا نہیں چاہتی ہاں، البتہ اس نے مجھے کاشف کی ایک تصویر دکھائی ہے۔''
''تصویر میں وہ آپ کو کیسا لگا؟''
''جوان...... ہینڈسم...... اسمارٹ......!'' اس نے جواب دیا۔
''اور میرے خیال میں کاشف کے انہی اوصاف نے خالدہ کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔
''اگر کسی پچاس سالہ واجبی سی شکل وصورت والی بیوہ کو اپنی عمر سے بیس سال کم خوبرو مرد مل جائے تو پھر اس عورت کا دماغ اور کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہتا۔ اسے اس مرد میں کوئی عیب واقعی بھی دکھائی نہیں دیتا۔ خالدہ کو بالکل اس بات کا اندازہ نہیں کہ وہ جس جھولے پر جھول رہی ہے اس کے نیچے کتنے خطرناک گڑھے ہیں۔''
''آپ تو ڈرا رہے ہیں قریشی صاحب۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''میں ڈرا نہیں رہا، حقیقت بیان کر رہا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
''اس روز خالدہ کی موجودگی میں، میں نے زیادہ کھل کر بات نہیں کی تھی لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ خالدہ کی مخلص دوست اور سچی خیر خواہ ہیں لہٰذا آپ کے ساتھ تفصیل سے بات ہو سکتی ہے اگر آپ پسند فرمائیں تو۔''
''جی ارشاد، میں سن رہی ہوں۔'' وہ ہمہ تن گوش ہوگئی۔
''عالیہ جی اگر کاشف کی تاریخ پیدائش درست ہے تو میری باتیں نوٹ کر لیں۔'' میں نے سنجیدہ انداز میں کہنا شروع کیا۔
''کاشف بہت متلون مزاج اور بدکردار شخص ہے بڑی کامیابی سے جھوٹ بولنے کا عادی ہے۔ لہٰذا مجھے نہیں لگتا کہ وہ خالدہ کے ساتھ مخلص ہو۔ ہو سکتا ہے وہ کسی خاص منصوبے کے تحت اس شادی پر آمادہ ہوا ہو۔ آپ خود سوچیں آپ ہینڈسم، اسمارٹ برسر روزگار جوان مرد کو پچاس سالہ بیوہ سے شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے، اسے تو شادی کے لیے خود سے کم عمر کی ایک سے ایک طرح دار حسینہ مل سکتی ہے۔''
''میں آسٹرولوجی کی تو ابجد سے بھی واقف ہوں لیکن میرے ذہن میں بھی یہ نکتہ ہے جو ابھی آپ نے بیان کیا ہے۔'' عالیہ نے کہا۔ ''مگر کیا کروں، خالدہ کی سوئی ایک ہی مقام پر جیسے اٹک کر رہ گئی ہے۔''
''آپ اس پر زور نہ دیں تاہم حتی الامکان اسے سمجھانے کی کوشش ضرور کریں۔'' میں نے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے کہا۔
''خالدہ کا زائچہ ناخوشگوار ازدواجی زندگی کو ظاہر کرتا ہے اس کے ساتویں گھر میں زحل اور راہو بیٹھے ہیں جو شریک حیات کی موت یا علیحدگی، بدقسمت

شادی، دولت کا نقصان، قانونی مقدمات کی نشان دہی کرتے ہیں میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس شادی کے بعد خالدہ کسی بڑی مصیبت میں گھر سکتی ہے۔ وہ کسی قانونی مقدمے میں پھنس کر جیل بھی جاسکتی ہے۔ اس کے زائچے کا بارہواں گھر بری طرح متاثر ہے۔''

''اوہ، آپ نے تو خالدہ کے مستقبل کا بڑا ہول ناک نقشہ کھینچا ہے۔'' وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔

''اللہ کرے، وہ اس شادی سے باز آجائے۔''

''میں نے وہی کہا ہے جس کی نشان دہی میرا علم کررہا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''اور یہ بھی نوٹ کرلیں کہ مستقبل قریب میں کاشف کے ساتھ کوئی سنگین واقعہ پیش آنے والا ہے اس کی دولت واختیار اس کے کسی کام نہیں آسکے گا۔''

''ٹھیک ہے قریشی صاحب، اپنا قیمتی وقت دینے کا بہت شکریہ۔'' عالیہ بیگم نے احسان بھرے لہجے میں کہا۔

''میں ایک بار پھر خالدہ کو اس شادی سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہوں آپ بھی دعا کریں۔''

''جی، میں خالدہ کے حق میں ضرور دعا کروں گا۔'' میں نے کہا۔

اختتامی کلمات کے بعد ہمارے بیچ جاری ٹیلی فونک گفتگو موقوف ہوگئی۔ دعا کی اہمیت اور اثر پذیری سے انکار ممکن نہیں یہ دنیا کا سب سے زیادہ زوراثر ٹانک ہے مگر دعا کے بھی کچھ اصول ہیں کچھ تقاضے ہیں وہ تقاضے پورے کیے بغیر آپ لاکھ دعائیں مانگتے رہیں نتیجہ صفر کے برابر ہی برآمد ہوگا آپ جس مقصد کے حصول کے لیے زمینی حقائق کو نگاہ میں رکھنا بہت ضروری ہے اگر ایک عالم اور ایک موٹر مکینک کسی کشتی میں سوار ہوں اور بیچ سمندر میں کشتی میں سوراخ ہوجائے تو قدرت ان دونوں میں سے اسی شخص کو بچائے گی جسے تیرنا آتا ہوگا۔ بہرحال یہ موضوع بڑا پیچیدہ اور نازک ہے لہٰذا آگے بڑھتے ہیں۔

چند روز بعد میں اپنی پیشہ ورانہ مصروفیت کے باعث خالد اور کاشف کو بھول گیا۔ میرے پاس روزانہ ایک سے بڑھ کر ایک کیس آتے ہیں۔ سب کو یادرکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ پھر جو لوگ مسلسل رابطے میں رہتے ہیں وہ یادداشت میں محفوظ ہوجاتے ہیں۔

''یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عموماً لوگ ڈاکٹر، وکیل، پولیس یا کسی کنسلٹنٹ کے پاس اسی وقت جاتے ہیں جب ان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے۔ خوش باش زندگی میں ان شعبوں کا اور ان کے ماہرین کا انسان کو خیال نہیں آتا۔

اس واقعے کو دو تین ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک رات عالیہ بیگم نے مجھے فون کیا وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھی میرا ماتھا ٹھنکا اور فوری طور پر میرے ذہن میں یہی آیا کہ کہیں کوئی بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔

''قریشی صاحب کیا اس وقت آپ سے بات ہوسکتی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''آپ مصروف تو نہیں ہیں؟''

اتفاق سے اس وقت میں اپنے گھر میں تھا اور فری بھی تھا۔ میں عموماً گھر آنے کے بعد کلائنٹس کے معاملات ڈیل نہیں کرتا اور انہیں اگلے روز آفس آنے کے لیے کہتا ہوں لیکن یہ کوئی ہارڈ اینڈ فاسٹ رول نہیں ہے موقع محل کی مناسبت سے میں پریشان حال افراد کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتا ہوں لہٰذا میں نے عالیہ کے استفسار کے جواب میں کہا۔

''جی، میں سن رہا ہوں آپ بتائیں مسئلہ کیا ہے۔''

''خالدہ کو پولیس نے گرفتار کرلیا ہے۔'' اس کی پریشان آواز میری سماعت تک پہنچی۔

''کیا۔'' میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ''خالدہ کو پولیس نے کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟''

''قتل کے الزام میں۔'' اس نے بتایا۔

میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا ''خالدہ نے کس کو قتل کر دیا ہے؟''

''اپنے شوہر کو۔'' اس نے بتایا۔ ''میرا مطلب ہے کاشف کو۔''

''اوہ۔'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ''تو خالدہ نے کاشف سے شادی کر ہی لی۔''

''جی، وہ یہ بھیانک غلطی کرنے سے باز نہیں آئی تھی لہٰذا اب بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہے۔''

''میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟'' ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھ لیا۔

''میں اپنے ایک عزیز کے ساتھ ابھی آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''ہوسکتا ہے آپ کوئی مفید مشورہ دے دیں اور خالدہ کی مشکل میں کچھ کمی واقع ہوجائے۔''

پہلے تو میرے جی میں آئی کہ منع کر دوں اور اگلے روز اسے آفس آنے کے لیے کہوں لیکن پھر پتا نہیں کیا سوچ کر میں نے کہہ دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' آپ میرے گھر آجائیں میں آپ کے لیے تھوڑا ٹائم نکال لوں گا۔'' اپنی بات کے اختتام پر میں نے انہیں اپنے گھر کی لوکیشن نوٹ کرادی۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ قریشی صاحب۔'' وہ تشکر آمیز انداز میں بولی۔

''میں آپ کو اس ملاقات کی فیس ادا کروں گی۔''

''اوکے، آپ لوگ آجائیں۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

''میں آپ کا ویٹ کررہا ہوں۔''

جب سے میں نے عالیہ بیگم کی زبانی یہ سنا تھا کہ اس کی دوست نے اپنے شوہر کاشف کو قتل کر دیا ہے۔ خالدہ کے معاملے میں میری دلچسپی اچانک بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اس دلچسپی کو اگر سنسنی خیزی کا نام دیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد عالیہ اپنے ایک عزیز نجیب اللہ کے ساتھ میرے گھر میں موجود تھی۔ عالیہ نے نجیب کا تعارف اپنے عزیز کی حیثیت سے کرایا تھا لہٰذا میں نے پوچھنا مناسب نہ سمجھا کہ ان کا آپس میں کیا رشتہ تھا۔ ویسے یہ بات میرے علم میں تھی کہ عالیہ بیگم نے شادی نہیں کی تھی آپ اسے کنواری بڑھیا کہہ سکتے ہیں۔

نجیب اللہ پکی عمر اور پکے رنگ کا مالک ایک دراز قامت شخص تھا اس کے ہاتھ پاؤں مضبوط اور چہرے پر کرختگی پائی جاتی تھی پہلی نظر میں وہ ایک غنڈا دکھائی دیتا تھا۔ عالیہ نے بتایا کہ نجیب کا انعامی بانڈز کا بزنس ہے۔ وہ یہ بزنس اوپن مارکیٹ میں کرتا تھا اور عالیہ کے گھر کے قریب ہی رہتا تھا۔ آگے بڑھنے سے پہلے میں مختصر الفاظ میں آپ کو اس افسوسناک واقعے کا پس منظر سنادوں تاکہ آپ کا ذہن آگے چل کر کسی الجھن کا شکار نہ ہو یہ تمام معلومات مجھے عالیہ اور نجیب اللہ کی زبانی پتا چلی تھیں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں خالدہ کاشف سے شادی کی خواہاں تھی اور وہ اسی سلسلے میں مشورہ کرنے میرے پاس آئی تھی۔ میرا علم جس حد تک رہنمائی کرسکتا تھا وہ مشورہ میں نے اسے دے دیا تھا۔ میرا

مشورہ خالدہ کو پسند نہیں آیا تھا یا وہ اپنی خواہش کے سامنے مجبور ہوگئی تھی بہرحال اس نے کاشف سے شادی کرلی تھی بلکہ اب تو وہ کاشف کی قاتل کی حیثیت سے پولیس کی تحویل میں تھی۔

عالیہ کے مطابق، اس کی رہائش نارتھ ناظم آباد کے صاف ستھرے اور پرسکون علاقے میں تھی اور خالدہ اس کی پڑوسن تھی خالدہ کا گھر دو سو گز کا ایک خوب صورت ڈبل اسٹوری بنگلہ تھا جو ویسٹ اوپن ہونے کے باعث بہت ہوادار بھی تھا اس نے بالائی منزل کرائے پر اٹھا رکھی تھی اور خود زیریں منزل پر رہائش پذیر تھی۔ بالائی منزل کے کرائے سے اس کے گھر کا خرچہ چلتا تھا کیونکہ اس کی کوئی باقاعدہ آمدن نہیں تھی۔

خالدہ کا مرحوم شوہر شوکت حسین ایک کاروباری شخص تھا اور یہ شاندار بنگلہ شوکت حسین کی محنت کا ثمر تھا شوکت کے انتقال کے بعد خالدہ اس کے کاروبار کو سنبھال نہ سکی اور جو کچھ بچا اسے بینک میں ڈپازٹ کر کے خاموش ہو بیٹھی۔ بہرحال اس کا بڑا ٹھیک ٹھاک گزارہ چل رہا تھا اسے کسی قسم کی مالی مشکل درپیش نہیں تھی۔ بینک میں ایک معقول رقم موجود تھی اور بنگلے کی بالائی منزل کا کرایہ بھی آرہا تھا اس کی زندگی آرام وسکون سے گزر رہی تھی کہ اس ٹھہری ہوئی زندگی میں کاشف ایک بھونچال کی مانند آیا اور پھر سب کچھ تہہ وبالا ہوکر رہ گیا۔

کچھ عرصہ قبل ایک بہت بڑے بلڈر نے خالدہ سے رابطہ کیا تھا اور اس سے بنگلا فروخت کرنے کی درخواست کی تھی۔ وہ بلڈر خالدہ کو بنگلے کی مارکیٹ ویلیو سے کچھ زیادہ رقم دینے کو بھی تیار تھا کیونکہ خالدہ کا بنگلہ ویسٹ اوپن اور کارنر کا تھا۔ مذکورہ بلڈر اس بنگلے کو گرا کر وہاں ایک ملٹی اسٹوری شاپنگ، مال بنانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن خالدہ اس کی باتوں میں نہ آئی۔ وہ اپنے مرحوم شوہر کی اس نشانی کو فروخت نہیں کرنا چاہتی تھی لہٰذا بات آگے نہ بڑھ سکی۔

پھر خالدہ کی زندگی میں کاشف کی آمد ہوئی۔ بہت بعد میں یہ بات کھل گئی کہ کاشف اسی بلڈر کا ایک چھوٹا سا مہرہ تھا جو خالدہ سے اس کا بنگلہ خرید کر وہاں شاپنگ مال بنانا چاہتا تھا کہ جب سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو مجبوراً انگلی کو ٹیڑھا کرنا پڑتا ہے اس بلڈر نے بھی اسی فارمولے پر عمل کرتے ہوئے کاشف کو آگے بڑھایا تھا۔

کاشف نے نہایت ہی خاموشی اور چالاکی سے چند ہی روز میں خالدہ کی کمزوریوں کو بھانپ لیا پھر اس نے خالدہ کے ساتھ محبت کا کھیل شروع کردیا۔ اس نے یہی ظاہر کیا کہ اسے خالدہ سے شدید نوعیت کی محبت ہوگئی ہے وہ خود کو ایک دل گرفتہ اور محبت کے متلاشی جوان کی حیثیت سے خالدہ کے سامنے لایا اور پھر چند ہی ملاقاتوں میں وہ خالدہ کو اپنی محبت کا یقین دلانے میں کامیاب ہوگیا بہ الفاظ دیگر وہ خالدہ کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

پھر جب کاشف نے اس سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تو خالدہ کے اس انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ایک خوب رو جوان مرد جو عمر میں اس سے بیس سال چھوٹا تھا اس سے شادی کا خواہش مند تھا وہ بھلا کیسے منع کرسکتی تھی لہٰذا چند روز بعد ایک سادہ سی تقریب میں ان کی شادی ہوگئی۔

عالیہ بیگم، خالدہ کی دوست اور خیر خواہ تھی۔ اسی لیے وہ خالدہ کو میرے پاس بھی لے کر آئی تھی وہ چاہتی تھی کہ خالدہ کسی بھی صورت کاشف سے شادی نہ کرے اسی کی ایما پر نجیب اللہ بھی کاشف کی ٹوہ میں لگ گیا تھا نجیب کے چند جرائم پیشہ افراد سے بہت

اچھے مراسم تھے۔ نجیب کی رپورٹ نے عالیہ بیگم کی پریشانی میں کئی گناہ اضافہ کردیا تھا مگر خالدہ کسی کی سننے کو تیار نہیں تھی لہٰذا یہ شادی ہوکر رہی۔

شادی کے چند روز بعد خالدہ نے عالیہ کو بتایا کہ وہ اپنا بنگلہ فروخت کر کے کراچی کے کسی اور علاقے میں شفٹ ہورہی ہے۔ عالیہ بیگم کو یہ بات پسند نہیں آئی اوراس نے کہا۔

''جب آپ سے وہ بلڈر یہ بنگلہ فروخت کرنے کو کہہ رہا تھا تو آپ نے صاف انکار کردیا تھا اور وجہ یہ بتائی کہ آپ اپنے شوہر کی اس نشانی کو فروخت نہیں کریں گی۔ اب ایسا کیا ہوگیا جو آپ کہیں اور شفٹ ہورہی ہیں؟''

واضح رہے کہ خالدہ اور عالیہ کی اس گفتگو کے وقت تک یہ انکشاف نہیں ہوا تھا کہ کاشف درحقیقت اس بلڈر ہی کا ایک مہرہ تھا۔

''پہلے میں اپنے شوہر کی وجہ سے یہ بنگلہ نہیں بیچنا چاہتی تھی۔'' خالدہ نے جواب دیا۔ ''اور اب میں اپنے شوہر کی ایک خواہش کو پورا کرنے کی غرض سے یہ بنگلہ فروخت کررہی ہوں۔''

عالیہ اس کی بات کی تہہ تک پہنچ تو گئی تاہم اس کے منہ سے سننے کی غرض سے کہا۔ ''میں سمجھی نہیں آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟''

''کاشف کو سمندر کے کنارے رہنے کا بہت شوق ہے۔'' خالدہ نے بتایا۔

''ہم سی ویو پر ایک شاندار اپارٹمنٹ لے رہے ہیں۔''

عالیہ کے پاس خاموشی اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا لہٰذا خالدہ اپنا بنگلہ فروخت کر کے سی ویو کے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوگئی۔

''عالیہ خاموش ہوکر بیٹھ سکتی تھی مگر میں نہیں۔''

نجیب اللہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''انہوں نے جو کام میرے ذمے لگایا تھا اسے پایہ تکمیل تک پہنچائے بغیر میں سکون کا سانس نہیں لے سکتا تھا۔ کاشف کے بارے میں چھان بین کرنے پر عالیہ ہی نے مجھے مامور کردیا تھا لہٰذا میں نے اپنا کام جاری رکھا۔''

وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا تو میں دلچسپی سے اس کا چہرہ دیکھتا چلا گیا۔ خالدہ اور کاشف کی کہانی خاصی سنسنی خیز موڑ پر آ گئی تھی۔ نجیب اللہ نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور اپنے مخصوص لہجے میں دوبارہ بولنا شروع کیا۔

''عالیہ نے آپ کو بتایا ہے کہ میں پرائز بانڈز کا کاروبار کرتا ہوں عالیہ نے آپ کو میرے بارے میں غلط نہیں بتایا آپ اپنے علم کے ماہر ہیں لہٰذا میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا آپ بھی جانتے ہیں کہ پرائز بانڈز کے بزنس کے ساتھ جوے اور سٹے کا دھندا بھی جڑا ہوا ہے اور ظاہر ہے میں خاصی حد تک اس دھندے سے بھی وابستہ ہوں لہٰذا ہر قسم کے لوگوں سے میرے تعلقات ہیں۔ یہ سچ ہے کہ خالدہ سے میرا کوئی رشتہ نہیں لیکن ایک تعلق ضرور ہے۔ آپ اسے ہم دردی کا تعلق بھی کہہ سکتے ہیں۔ خالدہ کے پہلے شوہر شوکت حسین سے میری یاد اللہ تھی اور پھر محلے داری بھی ہے اس لیے میں اس معاملے میں کود پڑا۔''

''یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

''اللہ کے بندوں کے معاملات میں جو مدد اور تعاون کا مظاہرہ کرتا ہے اللہ اس شخص پر اپنی نوازشات کی بارش کردیتا ہے۔''

''اللہ آپ کا بھلا کرے قریشی صاحب۔'' وہ دعائیہ انداز میں بولا۔

''عالیہ بیگم کے کہنے پر میں نے اپنے طور پر کاشف کے بارے میں اچھی خاصی ریسرچ کرلی تھی اور وہ مجھے کوئی بھلا آدمی نہیں لگا تھا میں نے عالیہ کو اس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا لیکن خالدہ پھر بھی کاشف سے شادی کرنے سے باز نہ آئی۔

''جب یہ دونوں خواتین میرے پاس زائچے بنوانے آئی تھیں تو میں نے بھی انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کردیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''ظاہر ہے میرا کام صرف مشورہ دینا ہے میں اپنی بات منوانے کے لیے کسی کو مجبور نہیں کرسکتا۔''

''قریشی صاحب آپ نے اس دن کاشف کی شخصیت کا جو تجزیہ کیا تھا، نجیب بھائی کی رپورٹ اس سے لگا کھاتی ہے۔'' عالیہ بیگم نے کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ آپ کسی پر زور نہیں دے سکتے مگر میں نے اپنا فرض نبھاتے ہوئے یہ کوشش ضرور کی تھی مگر وہی آپ والی بات کہ خالدہ کی آنکھوں پر کاشف کی محبت کی پٹی بندھی تھی، اسے کاشف سچا اور سب جھوٹے دکھائی دیتے تھے آہ، سب کچھ تباہ ہوگیا۔''

''آپ کو یاد ہوگا جب آپ نے مجھے فون کیا تھا تو میں نے آپ سے اس معاملے پر کافی کھل کر بات کی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے آپ کو بتایا تھا کہ خالدہ کے زائچے کے مطابق ازدواجی خوشیاں اسے میسر نہیں آئیں گی کیونکہ اس کے زائچے کا ساتواں گھر بری طرح متاثر ہے شریک حیات کی موت یا علیحدگی ہوسکتی ہے اور خالدہ کسی قانونی مقدمے میں بھی الجھ سکتی ہے جس کے نتیجے میں اسے جیل بھی ہوسکتی ہے۔ کسی کے زائچے کا اگر بارہواں گھر متاثر ہو تو خفیہ سازشوں اور دشمنوں کا امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے اور قانونی مقدمات

سے بھی واسطہ پڑ سکتا ہے۔''

''جی آپ نے مجھے ایسا ہی بتایا تھا'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''آپ کا کہا سب کچھ سچ ثابت ہوا۔''

''قریشی صاحب آپ نے خالدہ کی ازدواجی زندگی کے بارے میں جو پیشگوئی کی تھی وہ تو دوبار پوری ہوگئی۔'' نجیب اللہ نے کہا۔''اس نے پہلی شادی کی تو تھی شریک حیات کی موت واقع ہوگئی اور دوسری شادی کی تو بھی شریک حیات اس دنیا سے کوچ کر گیا بس فرق اتنا سا ہے کہ شوکت حسین طبعی موت مرا تھا اور کاشف کی زندگی کا چراغ خود خالدہ نے اپنے ہاتھوں سے گل کیا ہے۔ دونوں صورتوں میں اس بدنصیب عورت کو ازدواجی خوشیاں راس نہیں آئیں۔''

''آپ عالیہ صاحبہ سے پوچھ لیں میں نے انہیں واضح انداز میں بتا دیا تھا کہ خالدہ منگلی ہے۔'' میں نے کہا''ان کی ایک سے زیادہ شادیاں ہوں گی۔''

''قریشی صاحب جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔'' نجیب اللہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔''اب آگے کا بتائیں خالدہ اس وقت عدالتی ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں ہے اور اس کے بچنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا اس کے لیے بہت پریشان ہیں۔ آپ کا علم اس سلسلے میں کیا کہتا ہے؟''

''میرا علم تو رہ گیا ایک طرف۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔''اس سے میں بعد میں کام لوں گا پہلے آپ کو ایک کام کی بات بتا دوں۔'' وہ دونوں ہمہ تن گوش ہوگئے۔

''مایوسی گناہ بلکہ کفر ہے۔'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔''اللہ کی ذات سے ہر وقت اچھے کی امید باندھے رکھنا چاہیے ہر فائدہ اور نقصان اسی کی طرف سے ہے۔''

''بے شک۔'' عالیہ نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔

''میں ابھی خالدہ کا زائچہ چیک کر لیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔''میرے کمپیوٹر سسٹم میں کلائنٹس کا تمام ریکارڈ موجود رہتا ہے اور یہ سسٹم گھر اور آفس دونوں مقام پر موجود ہے لیکن اس سے پہلے آپ کو ایک کام کرنا ہوگا۔''

''جی آپ حکم کریں قریشی صاحب۔'' نجیب اللہ نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

''خالدہ کی کہانی ابھی ادھوری ہے۔'' میں نے کہا۔''اس نے کاشف سے شادی کی پھر نارتھ ناظم آباد والا بنگلہ فروخت کر کے وہ سی ویو کے کسی اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوگئی اور پھر اس نے اپنے شوہر کو قتل کر دیا۔ اس شفٹنگ اور کاشف کی موت کے بیچ کی کافی کڑیاں غائب ہیں۔ میں یہ سب جاننا چاہتا ہوں تاکہ آپ کو کوئی مناسب مشورہ دے سکوں۔''

''جی بالکل میں آپ کو تمام حالات کی تفصیل بتاتا ہوں۔'' نجیب اللہ نے تعاون آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں نے اپنے ذرائع سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ خالدہ نے نارتھ ناظم آباد والا بنگلہ ایک کروڑ بیس لاکھ میں فروخت کیا تھا یہ مارکیٹ ویلیو سے کم ریٹ تھا جبکہ کچھ عرصہ پہلے بلڈر اسے مارکیٹ ویلیو سے زیادہ قیمت دینے پر تیار تھا۔ مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ کاشف اسی بلڈر کا کارندہ ہے لہٰذا یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ اس ڈیل میں کاشف نے بھی خاصا کمایا ہوگا بہر حال میں نے اپنے بندے کاشف کے پیچھے لگائے رکھے اور پھر ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا۔'' وہ لمحے بھر کے لیے تھما پھر سنسنی خیز لہجے میں اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''کاشف نے خالدہ کو یہی بتایا تھا کہ سی ویو والا عالی شان اپارٹمنٹ اس نے خریدا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔''

''اور حقیقت کیا تھی؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''''کاشف نے وہ اپارٹمنٹ کرائے پر لیا تھا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کاشف جیسے چالباز شخص کے لیے خالدہ جیسی سیدھی سادی عورت کو دھوکا دینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ خالدہ نے اس کی بات کا یقین کرلیا۔ وہ تو کاشف کی محبت کا یقین کیے بیٹھی تھی۔ یہ اپارٹمنٹ کی خریداری والا معاملہ تو بہت معمولی بات تھی۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں نجیب صاحب۔'' میں نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔''میں نے ان لوگوں کو کاشف کی خصلت اور فطرت کے بارے میں کھل کر بتا دیا تھا۔ وہ ایک بدکردار، دھوکے باز اور شاطر شخص تھا۔ ایسے لوگوں سے کسی بھلائی کی امید نہیں رکھی جا سکتی۔''

''اس کمینے نے خالدہ کو دھوکا دینے کے لیے ایک نقلی مالک مکان سے اس کی ملاقات بھی کرادی تھی۔'' نجیب اللہ نے مزید بتایا۔

''اور اس اپارٹمنٹ کے جعلی کاغذات تیار کرا کر کئی مقامات پر خالدہ کے دستخط بھی کرا لیے تھے تا کہ وہ مطمئن رہے کہ یہ اپارٹمنٹ اسی کے نام سے خریدا گیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ اپارٹمنٹ تیس ہزار روپے ماہانہ کرائے پر حاصل کیا گیا تھا۔ چھ ماہ کا ایڈوانس کرایہ اور چھ ماہ کا ڈپازٹ دے گیا تھا۔ جس پر پراپرٹی ڈیلر کے توسط سے کاشف نے وہ اپارٹمنٹ کرائے پر حاصل کیا تھا اسی ڈیلر کی مٹھی گرم کر کے اس نے خالدہ کو دکھانے کے لیے اپارٹمنٹ کی ملکیت کے جعلی کاغذات تیار کرائے تھے۔ اس پراپرٹی ڈیلر کو کاشف نے اعتماد میں لے لیا تھا آپ مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ اس نوعیت کے کام کاشف کتنی آسانی سے کر لیتا ہوگا۔''

''جی میں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔''وہ ایک بدکردار اور لالچی شخص تھا اپنے فائدے کے لیے وہ کسی بھی حد تک گر سکتا تھا۔''

''تیس ہزار ماہانہ کرائے کے حساب سے اس نے اپارٹمنٹ کے مالک کو ایک چھ ماہ کا کرایہ چھ ماہ کا ڈپازٹ تین لاکھ ساٹھ ہزار روپے ادا کیا تھا اور بنگلے کی فروخت سے حاصل ہونے والے ایک کروڑ بیس لاکھ روپے وہ ہڑپ کر گیا تھا۔''

''اور جب خالدہ کو اس کے دھوکے کا پتا چلا تو وہ طیش میں آ گئی اور اس نے کاشف کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔'' میں نے کہا۔''کیا میرا اندازہ درست ہے؟''

''ففٹی ففٹی۔'' وہ سپاٹ آواز میں بولا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔''یہ ٹھیک ہے کہ خالدہ نے طیش کے عالم میں کاشف کو موت کی نیند سلا دیا لیکن اس طیش کا سبب وہ اپارٹمنٹ یا اس کی ملکیت کے جعلی کاغذات نہیں تھے۔''

''پھر کیا وجہ تھی؟'' میں نے سوال کیا۔

''کاشف کی دوسری شادی۔'' عالیہ بیگم نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب۔'' میں چونک اٹھا۔''کیا کاشف پہلے سے شادی شدہ تھا؟''

''نہیں۔'' عالیہ نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے

بتایا۔

''دوسری شادی اس نے چند روز پہلے شبانہ نامی ایک لڑکی سے کی تھی شبانہ نہایت ہی حسین و جمیل اور کم عمر لڑکی ہے۔''

''کاشف نے صرف شبانہ سے شادی ہی نہیں تھی بلکہ وہ شبانہ کے ہمراہ ملک سے فرار بھی ہو رہا تھا۔'' نجیب اللہ نے بتایا۔ ''ان کا ارادہ کسی یورپی ملک کی طرف پرواز کرنے کا تھا لیکن اس سے پہلے ہی کاشف کی موت کا پروانہ آ گیا۔''

''میں سمجھ نہیں سکا۔'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ بات تو طے ہوگئی کہ کاشف نے خالدہ سے شادی محض اس کا بنگلہ ہتھیانے کی غرض سے کی تھی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی رہا۔ خالدہ کو اس نے اپارٹمنٹ کی خریداری کے جعلی کاغذات دکھا کر مطمئن کردیا اور بنگلے کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم کو حوالے (ہنڈی) کے ذریعے یورپ کے کسی ملک میں منتقل کردیا۔ اس کی نیت میں شروع سے ہی فتور تھا۔ شادی کرکے اسے شبانہ ہی کے ساتھ یورپ جانا تھا خالدہ کو اس نے ایک سیڑھی کے طور پر استعمال کیا تھا اسے جھوٹی محبت کا جھانسا دے کر سب کچھ ہتھیالیا۔ یہ سارا کام اس نے باقاعدہ پلاننگ سے کیا تھا لیکن اسے فرار ہونا نصیب نہ ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ شبانہ کے ساتھ یہاں سے روانہ ہوتا اس کی سازش بے نقاب ہوگئی۔ میں نے اپنے جن بندوں کو کاشف کے پیچھے لگا رکھا تھا جب انہوں نے مجھے بتایا کہ کاشف نے کسی کم عمر لڑکی سے شادی کرلی ہے اور وہ اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ یورپ جانے کے لیے پر تول رہا ہے تو میں نے اپنے ذرائع استعمال کرکے یہ بھی معلوم کرلیا کہ چند روز پہلے اس نے ہنڈی کے ذریعے ایک تگڑی رقم بھی یورپ منتقل کی ہے اس کی چال میری سمجھ میں آ گئی اور میں نے یہ ساری تفصیل عالیہ کو بتادی۔''

''میں نے نجیب بھائی سے کہا کہ کچھ بھی ہو، کاشف کو پاکستان سے فرار نہیں ہونا چاہیے۔'' عالیہ نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ نے خالدہ کو صورت حال سے آگاہ کردیا تھا۔''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''وہ کبھی میری بات کا یقین نہیں کرتی جو کچھ بھی کرنا تھا ہمیں خود ہی کرنا تھا۔''

''پھر آپ لوگوں نے کیا کیا؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں نے کاشف کی سرگرمیوں پر کڑی نگاہ رکھی،'' نجیب اللہ نے بتایا۔ ''میں نے یہ معلوم کرلیا تھا کہ وہ شبانہ کے ساتھ طارق روڈ پر ایک فلیٹ میں رہ رہا تھا۔ مطلب، اس نے شبانہ کو اس فلیٹ میں ٹھہرایا ہوا تھا اور خود خالدہ کے ساتھ سی ویو والے اپارٹمنٹ میں رہ رہا تھا۔ دن میں وہ کچھ وقت شبانہ کے ساتھ بھی گزارتا تھا۔ شبانہ، اسی میں بہت خوش تھی کہ وہ بہت جلد کاشف کے ساتھ یورپ کی ٹھنڈی ٹھار فضاؤں میں جانے والی ہے۔ پھر وہ لمحات آن پہنچے جب شبانہ اور کاشف کو ائرپورٹ کی طرف روانہ ہونا ہے۔ وہ خالدہ کی دولت لوٹ کر شبانہ کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرنے یورپ جارہا تھا اور ہم اسے ایسا ہرگز نہ کرنے دیتے۔ میں عالیہ کے ساتھ خالدہ کے پاس پہنچ گیا اور اسے صورت حال سے آگاہ کردیا۔''

''کیا خالدہ نے آپ لوگوں کی بات کا یقین کرلیا؟'' میں نے پوچھا۔

"پہلے تو اسے یقین نہیں آیا۔" عالیہ نے بتایا۔ "لیکن جب میں نے اس سے کہا کہ وہ خود اپنی آنکھوں سے جا کر دیکھ لے کاشف ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد شبانہ کے ساتھ ائرپورٹ کی طرف روانہ ہونے والا ہے۔ خدا کا شکر کہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ ایک فوری فیصلے کے تحت اس نے کہا۔ آپ لوگ نیچے گاڑی میں بیٹھو میں آ رہی ہوں میں اور نجیب بھائی گاڑی میں آ گئے۔ ٹھیک دس منٹ بعد خالدہ بھی ہمارے ساتھ تھی اور ہماری گاڑی طارق روڈ کی جانب بڑھ رہی تھی۔"

"گاڑی میں آپ کی خالدہ سے کیا گفتگو ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی نہیں۔" نجیب اللہ نے جواب دیا۔ "وہ بالکل خاموش بیٹھی رہی تھی۔ جیسے اسے چپ سی لگ گئی ہو۔"

"مجھے اس کی خاموشی سے ڈر لگ رہا تھا۔" عالیہ بیگم ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔ "مجھے شک ہوا کہ کہیں وہ اپنا ذہنی توازن ہی نہ کھو بیٹھے۔"

نجیب اللہ نے مجھے بتایا کہ کاشف نے شبانہ کو جس فلیٹ میں رکھا ہوا تھا وہ طارق سینٹر کی ایک عقبی گلی میں واقع تھا اور یہ بھی کرائے ہی کا فلیٹ تھا جو آج خالی ہو جانا تھا جب وہ لوگ خالدہ کو لے کر مذکورہ فلیٹ پر پہنچے تو گلی میں داخل ہوتے ہی انہیں وہائٹ کیب نظر آ گئی۔ سفید رنگ کی یہ گاڑی عموماً ائرپورٹ آنے جانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ نجیب نے خالدہ کو بتایا کہ وہائٹ کیب جس بلڈنگ کے نیچے کھڑی ہے اس کے تھرڈ فلور پر شبانہ والا فلیٹ ہے۔

نجیب کی گاڑی جب وہائٹ کیب کے نزدیک پہنچی تو ساری صورت حال عیاں ہو گئی۔ اسی لمحے کاشف اور شبانہ بلڈنگ کے زینے سے نمودار ہوئے۔ کاشف کے ہاتھ میں ایک بڑا سا سفری سوٹ کیس تھا جبکہ شبانہ نے اپنے پرس کے علاوہ ایک چھوٹا ہینڈ بیگ اٹھا رکھا تھا۔ اس امر میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی کہ کاشف شبانہ کے ساتھ کہیں جا رہا تھا۔

وہ کاشف جو خالدہ کا شوہر تھا خالدہ کے ذہنی ریکارڈ میں شبانہ نامی کوئی عورت موجود نہیں تھی وہ کاشف کو ایک وفادار اور محبت کرنے والا شوہر سمجھتی تھی۔ عالیہ نے بارہا اسے کاشف کے بارے میں منفی باتیں بتائی تھیں لیکن اس نے کاشف کے خلاف کسی کی بھی بات پر کان نہیں دھرا تھا اسے یقین تھا کہ کاشف اس سے سچی محبت کرتا ہے اور لوگ ان کی محبت سے جلتے ہیں۔ آج تھوڑی دیر پہلے اپارٹمنٹ پر نجیب اللہ نے اسے کاشف کی تمام تر جعلسازیوں کے بارے میں بتایا تو بھی اس نے یقین نہیں کیا تھا پھر ایک فیصلے کے ساتھ گھر سے نکل پڑی تھی اور اب جو منظر اس کی نگاہ کے سامنے تھا اس نے خالدہ کے دماغ کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

سب کچھ اس کے سامنے تھا کاشف اس کا شوہر...... اس کی محبت کسی غیر عورت کے ساتھ وہائٹ کیب کے پاس کھڑا تھا اب تب میں وہ دونوں وہاں سے روانہ ہونے والے تھے۔ آنکھوں دیکھی اس حقیقت کو وہ جھٹلا نہیں سکتی تھی۔

"اس نے تحکمانہ انداز میں نجیب سے کہا۔

"گاڑی روک دیں۔"

نجیب نے اپنی گاڑی وہائٹ کیب کے قریب روک دی، گلی میں اپنے نزدیک ایک گاڑی رکتے دیکھ کر کاشف چونک اٹھا۔ اس وقت وہ ڈرائیور کی مدد

سے گاڑی کی ڈگی میں سوٹ کیس رکھ رہا تھا جبکہ شبانہ وہائٹ کیب کے اندر بیٹھ چکی تھی۔

قبل اس کے کہ نجیب اللہ کی سمجھ میں کچھ آتا خالدہ نے ایک جھٹکے سے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اگلے ہی لمحے وہ گاڑی سے باہر کاشف کے روبرو کھڑی تھی۔ اس کے تیور خطرناک دکھائی دیتے تھے جیسے اس کا دماغ الٹ گیا ہو نجیب اللہ بھی بڑی سرعت کے ساتھ گاڑی سے نکل آیا لیکن بہت دیر ہو چکی تھی اس کی سرعت کسی کام نہ آسکی۔

کاشف شبانہ کے ساتھ فرار ہو رہا تھا اور عین موقع پر خالدہ کو اپنے سامنے دیکھ کر بوکھلا گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کس طرح اس صورت حال کی وضاحت کرے اور خالدہ اسے کسی وضاحت کا موقع دینے کے موڈ میں نظر بھی نہیں آتی تھی۔ اس سے پہلے کہ کاشف کے منہ سے ایک لفظ بھی نکلتا خالدہ نے اپنے پرس سے پستول نکال لیا اور پے در پے تین گولیاں کاشف کے سینے میں اتار دیں۔

گلی میں فائرنگ کی آواز گونجی تو بھگدڑ مچ گئی۔ وہ دن کا وقت تھا اور اس وقت طارق روڈ کے اس حصے میں خاصی گہما گہمی ہوتی ہے۔ دن دہاڑے نصف درجن سے زیادہ افراد نے قتل کی ایک واردات ہوتے دیکھی۔ گلی ماتمی منظر پیش کر رہی تھی۔

کاشف اپنے لہولہان سینے کو دباتے ہوئے زمین بوس ہو گیا شبانہ ایک چیخ مارتے ہوئے وہائٹ کیب سے نکلی اور کاشف کی جانب دوڑی لیکن وقت اپنی چال چل چکا تھا کاشف نے خالدہ کو اس کی تمام تر جائیداد سے محروم کر دیا تھا اور اس کی محبت کو قتل کر کے کسی اور عورت کے ساتھ یورپ فرار ہو رہا تھا اب وہی کاشف گلی کی گندی زمین پر مردہ حالت میں پڑا تھا۔

خالدہ نے پسٹل کاشف کی لاش پر پھینکتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''کاشف یہ پستول تم نے مجھے میری حفاظت کے لیے لا کر دیا تھا نا میں دن بھر اپارٹمنٹ میں اکیلی ہوتی تھی اور مجھے ڈر لگتا تھا تم نے مجھے یہ پستول لا کر دیا تھا کہ کسی ایمرجنسی میں استعمال کروں دیکھ لو، میں نے ایمرجنسی میں اس پستول کو استعمال کر ڈالا۔'' اس کا انداز دیوانوں ایسا تھا۔

''میرے لیے سب سے قیمتی چیز جان سے بھی قیمتی چیز میری محبت تھی میں یہ کس طرح گوارا کر سکتی تھی کہ کوئی لٹیرا میری محبت کو مجھ سے چھین لے میں نے اس لٹیرے کو ختم کر دیا میری محبت بچ گئی میری محبت کا قاتل اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ اب میرا جو بھی انجام ہو، مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔''

''قریشی صاحب، یہ سب کچھ آناً فاناً میں ہو گیا تھا۔'' نجیب اللہ نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

''اگر مجھے ایک لمحہ پہلے بھی اس بات کا اندازہ ہو جاتا کہ خالدہ کیا کرنے جا رہی ہے تو میں کسی طرح بھی اسے روکنے کی کوشش کرتا۔''

''میں تو یہی سمجھی تھی کہ کاشف اور خالدہ میں گرما گرمی ہوگی۔'' عالیہ بیگم نے افسردگی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''لیکن اس نے تو ہم سب کو حیران کر دیا کہاں تو وہ کاشف کے خلاف ایک لفظ سننے کو تیار نہیں تھی اور پھر اس نے اپنے ہاتھوں سے کاشف کی جان لے لی۔''

''اگر آپ خالدہ کے الفاظ پر غور کریں گی تو پھر آپ کو کوئی حیرت یا الجھن محسوس نہیں ہوگی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''خالدہ کے نزدیک اس کی سب سے قیمتی چیز اس کی محبت تھی۔ اس کا بنگلہ گیا، سو گیا اپارٹمنٹ کے کاغذات جعلی تھے سو ہوا کریں۔

اسے اس بات کا اطمینان اور مان تھا اس کی محبت...... کاشف اس کے پاس ہے لیکن جب اسے یقین ہوگیا کہ اس کی محبت چھن رہی ہے تو پھر اسے اپنے حواس پر قابو نہ رہا کوئی بھی انسان اپنی متاع عزیز کو چھیننے نہیں دیتا۔ خالدہ کی سمجھ میں جو آیا وہ اس نے کیا۔ اسے وقتی اشتعال بھی کہہ سکتے ہیں اور خالدہ کا پاگل پن بھی بہر حال۔'' میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے تھوڑا توقف کیا پھر کہا۔

''خالدہ اس وقت پولیس کسٹڈی میں ہے اور میری پیشگوئی کے عین مطابق اسے یہ شادی بھی راس نہیں آئی آہ...... ایک اور بدقسمت شادی...... شریک حیات کی موت...... اور قانونی معاملات کا آغاز۔''

''قریشی صاحب خالدہ نے نصف درجن افراد کے سامنے کاشف کا خون کیا ہے۔'' نجیب اللہ نے بتایا اور پوچھا اب آپ کا علم کیا کہتا ہے خالدہ کی بچت کے آگے کیا امکانات ہیں؟''

''امکانات پر بات کرنے سے پہلے میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہوں گا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''جی ضرور آپ کی ہر بات ہمارے لیے بہت اہم ہے۔'' عالیہ نے کہا۔

''پہلی فرصت میں آپ خالدہ کے لیے کوئی تجربہ کار وکیل کرلیں۔'' میں نے کہا۔ ''قتل کی یہ واردات دن دہاڑے ہوئی ہے اور اس واقعے کے نصف درجن عینی شاہد بھی ہیں لہٰذا اگر وکیل تگڑا ہوگا تو خالدہ کے حق میں بہتر صورت نکل آئے گی۔''

''قریشی صاحب یہ کام میں نے کر ڈالا ہے۔'' نجیب اللہ نے بڑے فخر سے بتایا۔

''ایک بہت ہی قابل وکیل سے میری یاد اللہ ہے میں نے خالدہ کا کیس اسی وکیل کے حوالے کردیا ہے۔''

''کیا آپ نے ان وکیل صاحب کو خالدہ کے حالات سے پوری طرح آگاہ کردیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''خالدہ کا پس منظر اور قتل کا محرک وکیل صاحب کے علم میں لانا بہت ضروری ہے۔''

''جی میں نے ساری تفصیل وکیل صاحب کو بتا دی ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''وہ بہت سمجھدار وکیل ہیں انہیں خالدہ سے ہمدردی ہے۔''

''بس تو آپ ان وکیل صاحب کو خوش رکھیں۔'' میں نے کہا۔ ''خالدہ کو اس کیس سے وہی شخص نکال سکتا ہے جو اس سے دلی ہمدردی رکھتا ہو جیسا کہ آپ دونوں بھی اس کے سچے خیر خواہ ہیں۔''

''وسیم صاحب خالدہ کا زائچہ کیا کہتا ہے؟'' عالیہ نے استفسار کیا۔ ان لوگوں سے گفتگو کے دوران میں، میں نے خالدہ کے زائچے کا ایک پرنٹ آؤٹ نکال لیا تھا اور اس وقت میری نگاہ اسی پر جمی ہوئی تھی۔ چند لمحات کے ارتکاز کے بعد میں نے بولنا شروع کیا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ خالدہ کے زائچے کا ساتواں اور بارہواں گھر بری طرح متاثر ہے جن کے نتیجے میں اس نے دو بار شادی کی اور دونوں ہی مرتبہ وہ ازدواجی خوشیوں سے محروم رہی۔ بے اولادی کا دکھ اس کے علاوہ ہے جائیداد اور پیسے کی بربادی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور بالآخر وہ قانونی مقدمے میں بھی الجھ چکی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی زائچے میں کچھ اچھی اور حوصلہ افزا باتیں بھی موجود ہیں۔''

میں نے توقف کیا تو وہ دونوں امید بھری نظروں سے مجھے تکنے لگے میں نے سلسلہ گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ایک مسلمان ہونے کے ناتے ہمیں کسی بھی حال میں اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ گھپ اندھیرے میں سے ہی روشنی کی کرن پھوٹتی ہے۔ خالدہ کے زائچے کی ہزار خرابیوں کے باوجود مشتری اس کے لیے بہت معاون ہے۔ مشتری اپنے گھر میں بہت طاقت ور ہوتا ہے اور وہ اپنے گھر میں رہتے ہوئے قمر سے پوری نظر قائم کر رہا ہے یہ نظر بہت سعد ہے جسے آسٹرولوجی کی اصطلاح میں ٹرائن (ثلیث) کہا جاتا ہے۔ مشتری اور قمر خوش بختی کے سیارے ہیں لہٰذا میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مشتری اور قمر کی یہ سعد نظر خالدہ کو اس طوفان سے بھی نکال دے گی۔ وہ کیا کہتے ہیں

تدبیر کنند بندہ...... تقدیر کنند خندہ

بس انسان کو مثبت انداز میں تدبیر کرتے رہنا چاہیے پھر قدرت بھی مدد کرتی ہے اور اگر انسان منفی راہوں کی طرف نکل جائے تو پھر تقدیر انسان کے احمقانہ اقدام پر مسکراتی ہے جیسا کہ کاشف کے معاملے میں ہوا وہ یکسر منفی سوچ کا حامل تھا لہٰذا اپنے عبرتناک انجام کو پہنچا انسان کو ہر حال میں مکافات عمل سے ڈرنا چاہیے۔

تو منکر قانون مکافات عمل تھا

لے دیکھ ترا عرصہ محشر بھی یہاں ہے

''قریشی صاحب میں تو سمجھ رہی تھی آپ صرف ایک آسٹرولوجسٹ ہی ہیں۔'' عالیہ توصیفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ تو اچھے خاصے شاعر بھی ہیں۔''

''میں شاعر نہیں ہوں۔'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرے نہیں کسی اور کے شعر ہیں۔ بس، آپ اسے میرے حافظے کا کمال کہہ سکتی ہیں۔''

''شعروں کو یاد رکھنا بھی بڑی بات ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

''قریشی صاحب آپ شاعر ہیں یا نہیں یہ الگ بحث ہے لیکن میں آپ کے بارے میں ایک بات بڑے دعوے سے کہہ سکتا ہوں۔'' نجیب اللہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا ہوا بولا۔ میں نے پوچھا۔ ''کون سی بات نجیب صاحب؟''

''آپ روحانی ڈاکٹر ہیں۔'' وہ مجھ سے خاصا متاثر دکھائی دے رہا تھا۔

''آپ کی باتوں میں ایک جادو ہے آپ کے الفاظ دکھی دل کو سہارا دیتے ہیں لہٰذا آپ سے میری ایک درخواست ہے۔''

''جی فرمائیں میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟'' میں نے دریافت کیا۔

''میرے لیے نہیں، خالدہ کے لیے۔'' وہ بولا۔ ''میں چاہتا ہوں آپ اس سے ایک ملاقات کر لیں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے۔'' میں نے کہا ''وہ تو پولیس کسٹڈی میں ہے۔''

''میں پولیس والوں کی مٹھی گرم کر کے اس کام کو ممکن بنا لوں گا۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ آپ چند منٹ نکال کر حوالات میں خالدہ سے ایک مختصر سی ملاقات کر لیں وہ بری طرح ٹوٹ چکی ہے۔ اسے یقین ہو چلا ہے کہ اسے پھانسی ہو جائے گی کچھ پولیس والوں نے اسے زیادہ ہی ڈرا دیا ہے۔''

''کیا کہتے ہیں پولیس والے؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک اہلکار نے اس سے کہا ہے کہ اگر وہ پانچ لاکھ کا بندوبست کر دے تو چالان میں اس پر ہلکی دفعہ لگائی جائے گی اور اسے بس ایک دو سال کی قید کی سزا

ہوگی۔" نجیب اللہ نے بتایا ورنہ یہ تو قتل عمد کا کیس ہے اسے پھانسی سے کم سزا ہو ہی نہیں سکتی۔"

"پولیس والے زیر حراست لوگوں سے اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں۔" میں نے برا سامنہ بناتے ہوئے کہا۔" کیا آپ نے خالدہ کے وکیل سے اس بارے میں مشورہ کیا ہے؟"

"جی، میں نے وکیل صاحب کو اس بارے میں بتادیا ہے۔"

"پھر انہوں نے کیا کہا؟" میں نے پوچھا۔

"وکیل صاحب نے سختی سے منع کردیا ہے۔" نجیب اللہ نے بتایا۔" ان کا کہنا ہے کہ کسی کو ایک روپیہ بھی دینے کی ضرورت نہیں پولیس والے جو کہتے ہیں انہیں کہنے دیں میں کورٹ میں سب سنبھال لوں گا۔"

"وکیل صاحب خاصے سمجھدار انسان ہیں۔" میں نے کہا۔" انہوں نے بالکل ٹھیک مشورہ دیا ہے۔"

"جناب میں وکیل صاحب کے مشورے کی تردید تھوڑی کر رہا ہو۔" وہ ملتجیانہ انداز میں بولا۔ "اصل میں، میں خالدہ کی ذہنی کیفیت سے پریشان ہوں اسے اپنی موت کا یقین ہو چکا ہے یہ نہ ہو کہ وہ حالات کے اندر ہی اللہ کو پیاری ہو جائے میں روزانہ اس کی تسلی تشفی کے لیے وکیل صاحب کو اس سے ملوانے نہیں لے جا سکتا مجھے آپ کی صلاحیت پر یقین ہے کہ اگر آپ ایک بار اس سے مل کر چند تسلی بھری باتیں کر دیں گے تو اس کے اندر زندگی کی چمک لوٹ آئے گی۔"

"ٹھیک ہے، میں کل آفس سے اٹھنے کے بعد آپ کے ساتھ خالدہ سے ملاقات کے لیے جانے کو تیار ہوں۔" میں نے کہا۔" اگر میرے وہاں جانے سے اس کا بھلا ہوجاتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں حالانکہ میں ایک بات پورے وثوق سے جانتا ہوں۔"

"کون سی بات قریشی صاحب۔" عالیہ نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے خالدہ کے زائچے پر نگاہ دوڑاتے ہوئے جواب دیا۔

"خالدہ کی اس وقت جو ذہنی کیفیت ہے وہ وقتی ہے اگر آپ سمجھ رہے ہیں کہ یہ موت کا خوف ہے وہ کہیں حوالات میں دم نہ توڑ دے تو میں آپ لوگوں سے مکمل اختلاف کروں گا اللہ کے فضل و کرم سے خالدہ کا زائچہ فی الحال اس کی موت کی نشان دہی نہیں کر رہا یہ سب کچھ دلی صدمے کا نتیجہ ہے۔ اپنی محبت کی بے توقیری کا صدمہ۔"

انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہو گئے۔

میں ان کے جانے کے بعد کافی دیر تک خالدہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ بڑی عجیب قسمت پائی تھی اس عورت نے بھی دو ناکام شادیاں، بے اولادی اور پھر قتل کا مقدمہ قدرت کے کھیل بھی بڑے عجیب اور نرالے ہوتے ہیں وہ کسی کو سب کچھ دے کر آزماتی ہے اور کسی کو محروم رکھ کر اور کسی کو سب کچھ عطا کرنے کے بعد یک دم چھین کر قدرت کے بھید، قدرت والا ہی جانتا ہے انسان کو بس یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ ذات پاک جو بھی کرتی ہے اس کے بھلے کے لیے ہی کرتی ہے۔

ہاں...... یہ بتاتا چلوں کہ نجیب اللہ نے اس میٹنگ کے لیے میری فیس ادا کی تھی میں نے انکار کرنا چاہا تو اس نے زبردستی ایک لفافہ میری جیب میں ٹھونس دیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے لفافہ کھول کر دیکھا تو اس کے اندر میری فیس کے برابر رقم موجود تھی۔

اگلے روز آفس سے فارغ ہونے کے بعد میں

نجیب اللہ کی معیت میں اس تھانہ پہنچ گیا جہاں خالدہ کو عدالتی ریمانڈ پر رکھا گیا تھا مجھے بتایا گیا کہ پولیس نے خالدہ کا سات روز کا ریمانڈ لے رکھا ہے۔ ریمانڈ پر ملزم سے ملاقات عموماً بہت مشکل کام ہوتا ہے لیکن بھلا ہوا قائد اعظم کا ان کی تصویر ہمارے ملک میں بہت سے مشکل کاموں کو آسان بنا دیتی ہے۔ نجیب اللہ نے کسی پولیس اہلکار سے ''گٹھ جوڑ'' کر کے مجھے خالدہ سے ملنے کے لیے دس پندرہ منٹ کی مہلت حاصل کر لی تھی۔

یہ میری خالدہ سے دوسری ملاقات تھی پہلی مرتبہ وہ میرے آفس میں آ کر مجھ سے ملی تھی تب عالیہ بیگم بھی اس کے ہمراہ تھی۔ اس خالدہ اور اس خالدہ میں مجھے نمایاں فرق نظر آیا۔ اس خالدہ کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑتے ہوئے تھے جیسے وہ کئی راتوں کی جاگی ہوئی ہو، چہرے پر ویرانی اور مایوسی تھی وہ سپاٹ نظر سے ہماری طرف دیکھنے لگی۔

''خالدہ یہ اپنے قریشی صاحب ہیں، وسیم قریشی۔'' نجیب نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ ان کے آفس میں ان سے ملاقات کر چکی ہیں۔''

''کیا قریشی صاحب بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟'' وہ میرے چہرے پر نگاہ جما کر نا شناسا لہجے میں بولی لیکن اب مجھ سے شادی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں میرے پاس کچھ باقی نہیں بچا ایک بنگلہ تھا وہ بک گیا۔ اب مجھ سے کوئی شادی کیوں کرے گا۔''

اس بات میں کسی شک کی گنجائش نہیں تھی کہ خالدہ مجھے پہچان نہیں پائی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ اس سانحہ نے اس کی یادداشت کو بری طرح متاثر کیا تھا مجھے اس کی دماغی حالت پر رحم آیا۔

اچھی بات

اگر لوگ تم سے متاثر ہو رہے ہیں تو تکبر نہ کرو شکر ادا کرو اپنے ربّ کا جس نے تمہارے عیب چھپا کر تمہیں لوگوں میں معزز بنا رکھا ہے۔

کسی کا عیب تلاش کرنے والے کی مثال اس مکھی کی جیسی ہے جو خوب صورت جسم چھوڑ کر زخم پر بیٹھتی ہے۔

خلوص اور عزت

خلوص اور عزت بہت نایاب تحفے ہیں، اس لیے ہر کسی سے ان کی امید نہ رکھو کیونکہ بہت کم لوگ دل کے امیر ہوتے ہیں۔

سید اعجاز علی......نوابشاہ

''خالدہ ہوش میں آئیں۔'' نجیب اللہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''قریشی صاحب ایک نجومی ہیں انہوں نے آپ کا زائچہ بنایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ آپ باعزت بری ہو جائیں گی۔''

''مگر وہ پولیس والا تو کہہ رہا تھا مجھے پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔'' وہ ویران نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''پولیس والا بکواس کرتا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''یہ لوگ اپنی کمائی کے چکر میں ملزموں کو اسی طرح ڈراتے ہیں۔''

اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی، سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''ہاں'' وہ پولیس والا کہہ رہا تھا اگر میں کسی طرح پانچ لاکھ کا بندوبست کر دوں تو یہ لوگ ہلکا کیس بنائیں گے۔''

''سب فضول باتیں ہیں خالدہ جی۔'' میں نے

ہم دردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”پولیس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے یہ لوگ چاہے جیسا بھی چالان تیار کریں۔ کیس کو عدالت میں لگنا ہوتا ہے۔ سزا اور بریت کا فیصلہ جج سناتا ہے آپ مجھے ایک بات بتائیں۔“ میں نے دانستہ توقف کیا تو وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی لیکن زبان سے خاموش رہی میں نے اس کے ذہن پر زیادہ دباؤ ڈالنا مناسب نہ جانا اور پوچھا۔

”آپ کے خیال میں اللہ بڑا ہے یا پولیس۔“

”ظاہر ہے جی، اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔“ وہ قدرے توانا لہجے میں بولی۔

اس کے بدن اور سوچ میں توانائی کی لہر دوڑتے دیکھ کر مجھے خاص اطمینان حاصل ہوا میں کسی حد تک اسے ذہنی صدمے سے باہر لانے میں کامیاب رہا تھا میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”میری بات دھیان سے سنیں زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس ذات کریم نے انسان کے ہاتھوں میں اسی کی زندگی کا خلاصہ لکیروں کی صورت لکھ دیا ہے۔ بس، کوئی ان لکیروں کو پڑھنے والا ہونا چاہیے۔“ لمحاتی توقف کر کے میں نے قدرے تحکمانہ انداز میں کہا۔

”لائیں اپنے ہاتھ مجھے دکھائیں۔“

اس نے یکبارگی دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں میرے سامنے کھول دیں میں نے چند سیکنڈ تک اس کے ہاتھوں کی لکیروں کا جائزہ لیا پھر کہا۔

”پولیس کیا اس دنیا کی کوئی طاقت آپ کی زندگی نہیں چھین سکتی ہیں آپ کی جیون ریکھا (لائف لائن) کو بہت مضبوط اور صحت مند دیکھ رہا ہوں اور دونوں ہاتھوں میں زندگی کی یہ لکیر بے داغ ہے اس پر کوئی کٹنگ یا جزیرہ نہیں ہے اور اس کی لمبائی بھی خاص ہے میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ ابھی بیس پچیس سال تک آپ کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں۔“

میری باتوں سے اس نے کرنٹ پکڑا اور اس کا چہرہ چمک اٹھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ زندگی کی جانب لوٹ رہی تھی۔ میں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”البتہ دماغ کی لکیر پر ایک ہلکا سا جال ہے جو وقتی ذہنی پریشانی کو ظاہر کرتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ آپ اس وقت ذہنی الجھنوں کا شکار ہیں۔“

”اوہ...... تو اس کا مطلب ہے میری زندگی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں۔“ وہ ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”میری بری ہو جاؤں گی۔“

”بالکل صد فیصد آپ باعزت بری ہو جائیں گی۔“ میں نے پر وثوق انداز میں کہا۔

”جو وقتی پریشانی ہے۔ وہ آپ ہی کو جھیلنا پڑے گی کیونکہ آپ کے ہاتھوں ایک انسانی جان کا قتل ہوا ہے۔“

”آپ اسے انسان نہ کہیں۔“ وہ اچانک پھٹ پڑی۔ ”وہ انسان کی شکل میں درندہ تھا مجھے بنگلے کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم لے جانے کا دکھ نہیں ہے۔ اس کمینے شخص نے میری محبت کا خون کیا ہے میں ایسے کیسے زندہ چھوڑ دیتی۔“ بات کے اختتام پر اس کی آواز بھرا گئی پھر وہ ہلکی ہلکی ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی۔

وہ غلط کہہ رہی تھی یا درست اس سے بحث نہیں ہے۔ مجھے اس بات کا اطمینان تھا کہ اس کے ذہن کو ایک گہرے صدمے سے باہر لانے میں کامیاب ہو گیا تھا یا آنسو بہہ جانا ہی اس کے لیے مفید تھا۔ اس کے سینے کا غبار ڈھل جاتا تو اس کا من ہلکا ہو جاتا۔

انسان کی پشت پر اگر ٹنوں وزن بھی لدا ہو تو وہ اتنی تکلیف نہیں دیتا جتنا سینے پر رکھا ہوا ایک کنکر اذیت ناک ہوتا ہے من کا بوجھ سوہان روح ہوتا ہے یہ مر مر کر جینے اور جی جی کر مرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔
اس کی حالت قدرے سنبھلی تو میں نے تشفی بھرے لہجے میں کہا۔
''نجیب صاحب نے آپ کے لیے بہت چوٹی کا وکیل کیا ہے مجھے یقین ہے کہ وہ وکیل سارے معاملے کو سنبھال لے گا آپ نے اس وکیل سے پورا پورا تعاون کرنا ہے وہ جو بھی پوچھے، سچ سچ بتانا ہے اور وہ جو جو کہے وہی کرنا ہے۔''
''جی قریشی صاحب۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
اس کے چہرے پر شناسائی کی چمک دیکھ کر میں نے پوچھا۔''اس کا مطلب ہے آپ نے مجھے پہچان لیا ہے۔''
''جی، مجھے سب کچھ یاد آ گیا ہے۔'' وہ قدرے ندامت سے بولی۔''ان حالات میں، میں اپنے آپ کو بھولی ہوئی تھی اور کس کس کو یاد رکھتی۔''
''کوئی بات نہیں، یہ سب زندگی کا حصہ ہے۔'' میں نے کہا۔
''انسان زندگی دکھ اور دکھ کا امتزاج ہے جو شخص صبر و استقامت سے دکھ کو جھیل جاتا ہے پھر اس کی زندگی میں سکھ کی آمد کو کوئی روک نہیں سکتا، کاش آپ نے میری بات ملی ہوتی۔''
''قریشی صاحب مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ میں نے آپ کے مشورے پر عمل نہیں کیا تھا۔'' وہ شرمندگی بھرے انداز میں بولی۔''کاش، میں نے آپ کی بات مان لی ہوتی۔''
''انسان کے نصیب میں جو لکھا ہوتا ہے، وہ ہو کر

بکھرے موتی

☯ مجھے بتاؤ کہ تمہارے دوست کون ہیں، میں تمہیں بتاؤں گا تم کون ہو (سروانٹس)
☯ انسان آنسوؤں اور مسکراہٹوں کے درمیان لٹکا ہوا پنڈولم ہے (بائرن)
✦ اچھا انسان وہ ہے جو کسی کا دیا ہوا دکھ تو بھول جائے پر کسی کی دی ہوئی خوشی نہ بھلا۔
✦ کسی کو اپنی صفائی نہ دو کیونکہ جو آپ سے پیار کرتا ہے اس کو ضرورت نہیں اور جو نفرت کرتا ہے وہ یقین نہیں کرے گا۔
✦ دوست پیار کے لیے ہوتے ہیں اور چیزیں استعمال کے لیے، بات تب بگڑتی ہے جب چیزوں سے پیار اور دوستوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔

انتخاب: زین عرفان......اورنگی ٹاؤن کراچی

رہتا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔''نصیب کو صرف دو چیزیں بدل سکتی ہیں۔''
''کون سی دو چیزیں قریشی صاحب۔'' نجیب اللہ نے میکانکی انداز میں استفسار کیا۔
''دعا اور صدقہ۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا ''دعا اور صدقہ لکھے کو بدل دیتے ہیں کیونکہ جس ذات پاک نے انسان کا نصیب رقم کیا ہے اسے یہ دونوں چیزیں بہت پسند ہیں۔''
اسی لمحے کانسٹیبل کی آواز ابھری۔''صاحب آپ کی ملاقات کافی طویل ہوگئی ہے۔'' اب بس کریں اگر انچارج صاحب ادھر آ گئے تو میری پیٹی اتر جائے گی۔''
''یہ پیٹ یا وردی اترنے کا معاملہ نہیں ہے جناب۔'' میں نے کانسٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے

طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''یہ پریپیڈ کا قصہ ہے۔''

''پریپیڈ؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''جس طرح آپ اپنے موبائل فون میں پریپیڈ بیلنس لوڈ کراتے ہو نا۔'' میں نے بدستور تیکھے لہجے میں کہا۔

''جب بیلنس ختم ہو جاتا ہے تو موبائل میں دوبارہ بیلنس لوڈ کرانا پڑتا ہے۔''

''جی، وہ تو ہے مگر پریپیڈ کا اس ملاقات سے کیا تعلق؟'' اس کی حیرت دوچند ہوگئی۔

''بہت گہرا تعلق ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''نجیب صاحب نے اس ملاقات کو ممکن بنانے کے لیے آپ کی جیب میں پری پیڈ لوڈ ڈالا تھا۔ اب آپ سگنل دے رہے ہیں کہ وہ بیلنس ختم ہو چکا لہٰذا اور لوڈ ڈالیں۔ انچارج صاحب کا تو محض بہانہ ہے۔''

وہ باچھیں پھیلا کر ہنسنے لگا پھر بولا۔ ''آپ کافی سمجھدار انسان ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہمارا کام ہوگیا ہے لہٰذا مزید بیلنس نہیں ڈال سکتے اب آپ ایس ایم ایس پر گزارا کرو، اللہ حافظ۔''

ہم باہر آکر گاڑی میں بیٹھے تو نجیب اللہ نے کہا۔

''قریشی صاحب میں جس مقصد سے آپ کو اپنے ساتھ لے کر یہاں آیا تھا وہ پورا ہوگیا آپ نے خالدہ کی برین واشنگ کردی ہے۔''

''مجھے خوشی ہے کہ ہماری یہ حوالات یاترا سود مند ثابت ہوئی ہے۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

''میں اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''کہہ تو آپ بہت کچھ سکتے ہیں مگر نہ کہیں تو آپ کی مرضی۔'' وہ کرید نے والی نگاہ سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''آپ چھپے رستم ہیں قریشی صاحب۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' میں نے الجھن زدہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''میں آپ کو ایک آسٹرولوجسٹ کی حیثیت سے جانتا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''پھر جب آپ کے گھر پر ملاقات ہوئی تو پتا چلا کہ آپ ماہر نفسیات بھی ہیں لہٰذا میں خالدہ کی تسلی و تشفی کے لیے آپ کو یہاں لے آیا اور یہاں آکر یہ انکشاف ہوا کہ آپ دست شناس بھی ہیں اور کون کون سے گن چھپے ہوئے ہیں آپ میں۔ دین کے معاملے میں آپ کی معلومات کو دیکھ کر میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ داڑھی رکھ لیں تو اچھے خاصے دینی عالم بھی بن جائیں گے۔''

''نجیب صاحب پہلی بات یہ کہ کسی بھی علم کا داڑھی سے کوئی تعلق نہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ ضروری نہیں کہ ہر عالم کی داڑھی بھی ہو اور ہر داڑھی والا عالم ہی ہو اور جہاں تک ہاتھ کی لکیروں اور سیاروں ستاروں کا معاملہ ہے تو میں آسٹرولوجی اور پامسٹری کو دو الگ علوم نہیں سمجھتا بس ٹرمنالوجی کا فرق ہے۔''

''آپ سے باتوں میں کوئی نہیں جیت سکتا۔'' وہ ہتھیار پھینکتے ہوئے بولا۔

''ان شاءاللہ جلد ملاقات ہوگی۔''

''ان شاءاللہ۔'' میں نے تہہ دل سے کہا۔

خالدہ کا کیس لگ بھگ ایک سال تک عدالت میں رہا۔ نجیب اللہ اور عالیہ گاہے بگاہے مجھے عدالتی کارروائی سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ خالدہ کو وکیل بہت قابل اور تگڑا مل گیا تھا۔ اس نے کیس کو اس انداز میں آگے بڑھایا کہ خالدہ ایک بے بس، لاچار اور مظلوم عورت کی شکل میں ابھر کر سامنے آئی۔ اس

بات میں بھی شک نہیں کہ خالدہ نے اپنے شوہر کو نصف درجن افراد کی موجودگی میں گولیاں مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ تاہم وکیل نے اس قدر مدلل انداز میں کیس لڑا کہ ایک سال بعد متعلقہ عدالت نے خالدہ کو دو سال قید محض کی سزا سنا دی۔ ایک سال چونکہ یہ مقدمہ چلتا رہا تھا اور اس دوران میں خالدہ جوڈیشل ریمانڈ پر جیل کسٹڈی میں رہی تھی۔ لہٰذا اس کی سزا میں سے ایک سال کو نکال دیا گیا گویا اب سے صرف ایک سال مزید جیل میں گزارنا تھا۔

عدالتی فیصلے کے اگلے روز عالیہ بیگم نجیب اللہ کے ہمراہ میرے آفس آئی اور کہا۔

''قریشی صاحب ہم لوگ آپ کا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں۔ آپ کے مشوروں نے خالدہ کی بہت مدد کی ہے۔ اب ایک سال ہی کی تو بات ہے پھر وہ باہر آجائے گی۔''

''اللہ کے ہر کام میں کوئی مصلحت ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''آپ کو شکر ادا کرنا ہی ہے تو اپنے اللہ کا شکر ادا کریں میں نے اپنے جس علم کی روشنی میں آپ کو یا خالدہ کو جو بھی مشورے دیے وہ علم اسی ذات پاک کا عطا کردہ ہے۔''

''آپ بہت عظیم ہیں قریشی صاحب۔'' وہ جذبات سے مغلوب آواز میں بولی۔

''یہ لفظ ''عظیم'' بھی میرے مالک کی ذات پر ہی جچتا ہے۔'' میں نے انکسار سے کہا۔

''وسیم صاحب کیا آپ کا علم میرے بزنس میں کوئی مدد نہیں کرسکتا۔'' نجیب اللہ نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''یہ علم زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کو اپنے بزنس میں کسی قسم کی رہنمائی چاہیے۔''

''آپ جانتے ہیں کہ میں پرائز بانڈز کا بزنس کرتا ہوں۔'' وہ بدستور سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''اس کے علاوہ سٹے والے بھی مجھ سے منسلک رہتے ہیں۔ کیا کسی طرح آپ کا علم یہ نہیں بتا سکتا کہ اس بار کون سا بانڈ کھلنے والا ہے۔''

''بالکل بتا سکتا ہے مگر میں ان چکروں میں نہیں پڑتا۔'' میں نے کہا۔

''وہ کیوں جناب؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ اس لیے کہ دولت کمانے کے یہ سارے راستے منفی ہیں۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''اور منفی راستے ہمیں تاریکی اور تباہی کی طرف لے جاتے ہیں پھر ان راستوں کے مسافروں کا وہی انجام ہوتا ہے جو کاشف کا ہوا۔''

''آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

مجھے یقین تھا کہ نجیب اللہ کو میرا جواب پسند نہیں آیا تھا لیکن حق سچ بات کہنے میں مجھے کسی کی پسند یا ناپسند کی پروا نہیں تھی۔

انسان کو صرف اللہ کی پسند اور ناپسند کا خیال رکھنا چاہیے لوگوں کا کیا ہے یہ تو روٹھتے مانتے ہی رہتے ہیں۔



ویران شام

ساحل ابڑو

اس شام کا فسانہ' جو خون رنگ تھی۔ جب خون پانی کی طرح گلیوں میں بہہ رہا تھا۔معصوم لڑکیوں کی عزتوں سے کھیلنا ایک کھیل بن کر رہ گیا تھا۔ پاک وطن میں آکر بھی اس شام کی ویرانی ختم نہیں ہوئی۔ بس کردار بدل گئے۔ پہلے اس کھیل کے کھلاڑی سکھ اور ہندو تھے مگر آج ہم سب کلمہ گو اس کھیل میں شامل ہوگئے ہیں۔

تقسیم کے کرب سے دوچار ہونے والی ایک خاتون کی روداد' وہ آج بھی چھلنی دل کے ساتھ سنہری صبح کی منتظر ہے۔

میرا جنم ایک زمیندار گھرانے میں ہوا تھا' میں گھر بھر کی لاڈلی اور چہیتی تھی۔گاؤں میں بڑی سی حویلی تھی اور کئی مربع زمین تھی۔ میرے والد جوانی کے عالم میں دنیا سے کوچ کر گئے۔میرا ایک ہی بھائی تھا امیر علی! اب وہ ہی خاندان بھر کی آنکھوں کا تارا تھا۔ ہمارے گھر میں گودام سارا سال غلے سے بھرے رہتے تھے۔حویلی کے آنگن میں بھینسوں اور مویشیوں کا میلہ سا لگا رہتا غرض کہ کسی بھی چیز کی کمی نہ تھی۔حویلی کے اوپر والے حصہ میں میرے چچا رہتے تھے۔

دادا جان بھی اس دنیا میں نہ تھے' دادی جان ہمارے ساتھ رہتی تھیں۔ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ شہر کی سیٹھانی تھیں' دادا جان انہیں شہر سے بیاہ کر لائے تھے۔زیورات کی انتہائی دلدادہ اور شوقین تھیں' دادا جان کی یہ دوسری شادی تھی اور ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ ہماری دادی جان وفات پاچکی تھیں جن سے تین اولادیں تھیں۔

ابھی میں نے ڈھنگ سے اٹھنا بیٹھنا بھی نہ سیکھا تھا کہ ابا جان نے میری شادی اپنی ہی برادری کے ایک نوجوان کمال دین سے کردی۔شکر والے کو خدا شکر ہی دیتا ہے جیسے میری طبیعت سیدھی سادی اور دھیمی دھیمی تھی۔میرا شوہر بھی ویسا ہی تھا ایک برس پلک جھپکتے گزر گیا۔

ان دنوں برصغیر فسادات کی زد میں تھا' پاکستان بننے کا خواب پورا ہونے کے قریب تھا۔ ہر روز کہیں نہ کہیں شدید قسم کے بلوے فسادات ہوتے اور خون کی ندیاں بہہ جاتیں۔ ہر طرف خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی پھر اس آگ نے ہمارے قصبے راجن گڑھ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

ایک شام ہمارے گاؤں میں زبردست افراتفری پھیل گئی سب مسلمانوں کو ایک جگہ جمع ہونے کو کہا گیا۔ ہمارے سب عزیز جو اس گاؤں میں مقیم تھے ہماری حویلی میں جمع ہوگئے۔ ہماری ایک بیوہ پھوپی اور ان کی ایک جوان بیٹی تھی اور دیگر رشتہ دار بھی۔

ان دنوں گاؤں میں بجلی نہ تھی سرِ شام گلیاں اور بازار ویران ہوجاتے۔ایک قسم کی یاسیت اور اداسی فضا میں پھیل گئی تھی' جس نے تاریکی کو اور بھیانک بنا دیا تھا۔شام سے ہم لوگ دم سادھے دل گرفتہ سے بیٹھے تھے۔اس دن بڑے تو کجا بچے بھی بھوک پیاس بھلا بیٹھے تھے۔اس رات کسی گھر میں چراغ بھی روشن نہ ہوا اس ویرانی میں آدھی رات بیت گئی کہ اچانک شور مچ گیا۔

''آ گئے..... آ گئے.....''

دل تو جیسے خوف سے دھڑکنا بند ہوگئے پھر دروازے پیٹنے کی آواز آئی اور تھوڑی دیر بعد باہر سے کنڈی چڑھانے کی آواز آئی۔اوپر کی منزل کے لیے باہر کی طرف سے لکڑی کی سیڑھی لگائی گئی تھی۔ کچھ لوگوں کے تیز تیز اوپر چڑھنے کی آوازیں آئیں اس کا مطلب تھا ہم لوگ اپنے ہی گھر میں بند ہوگئے تھے۔مردانے کا ایک دروازہ پچھلی طرف کھلتا تھا۔ میں نے تھوڑا سا کھول کے جھانکا تو دو سکھ کرپان پکڑے دروازے کے پاس کھڑے تھے' خوف سے لرزہ طاری ہوگیا۔کمرے کے روشن دان کے پاس پیپل کی شاخیں تھیں'

میں نے کوشش کی کہ نکل کے درختوں کی شاخوں میں چھپ جاؤں لیکن روشن دان میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں اس لیے کامیابی نہ ہوسکی۔ لمحہ بہ لمحہ خطرہ بڑھتا جارہا تھا اور یہ خطرہ موت کا نہ تھا کہ مسلمان عورت کے لیے اس کی عصمت ہی اس کی زندگی ہے۔ کوئی راستہ دکھائی نہ دیا تو میرا بھائی پچھلا دروازہ کھول کر بھاگا بھائی کو ایک ایک سکھ نے کرپان ماری تو وہ اس کی ٹانگ کو کاٹتی نکل گئی پھر وہ مجھے اندھیرے میں نظر نہ آسکا۔ میری طرف انہوں نے ایک بڑا سا پتھر لڑھکا دیا جو مجھ کو رگڑتا ہوا گزر گیا۔

تھوڑی دیر بھاگنے کے بعد میں خود بخود گڑھے میں گر گئی، وہاں بھی پکڑے جانے کا خوف سر پر سوار تھا کیونکہ ان کے پاس ٹارچ تھی۔ حویلی میں سے وحشت ناک قسم کی چیخیں اور آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔ کچھ دیر سانس بحال کر کے میں نے پھر بھاگنا شروع کر دیا تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں ایک درخت پر چڑھ گئی اور دبک کر بیٹھ گئی۔ آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو ایسا محسوس ہوا کہ میرے علاوہ بھی کوئی درخت پر ہے۔ دو تین گھنٹے گزر گئے تو اترنے کی ہمت پیدا کی۔

یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہاں میرے ایک عزیز کی بیوی بھی اپنی بچی کو لیے چھپی بیٹھی تھی، ہمارے درمیان تھوڑی سی گفتگو ہوئی اور ہم ابھی دونوں درخت سے نیچے اترنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھیں کہ پھر سے صدائیں بلند ہونا شروع ہوگئیں جس کو جدھر راہ ملی بھاگ گیا۔ کھانے کی پلیٹیں بھری رہ گئیں، لوگ بلند ہمت اور زندہ دل بھی نکلے۔ کچھ تو اپنے مویشی بھی لے کر بھاگے اور کھیتوں میں گھس گئے گرتے پڑتے آگے بڑھتے رہے۔

میں سوچ رہی تھی کہ اچانک میری نظر درخت کی اوپر والی شاخ پر پڑی، جہاں ایک بڑا سا سانپ لپٹا ہوا تھا میرے ساتھ والی عورت نے جب سانپ کو دیکھا تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی جسے سن کر چند سکھ نہ جانے کہاں سے کرپانیں لے کر اودھر آن نکلے۔ اب اوپر جان کا دشمن شاخ سے لپٹا ہوا تھا اور نیچے سکھوں کی صورت میں ہماری موت کھڑی تھی۔ عزت اور جان میں سے کسی ایک کو قربان کرنے کا وقت آپہنچا تھا۔ نیچے سکھ شور مچا رہے تھے اور اوپر چڑھنے کی کوشش بھی کررہے تھے۔ ہم دونوں عورتوں نے خوف کے مارے آنکھیں بند کرلیں اور خود کو خدا کی رضا پر چھوڑ دیا پھر اللہ نے اپنا رنگ دکھایا، درخت کی شاخ سے لپٹا جان کا دشمن درخت کے نیچے کھڑے عزت کے لٹیروں کے لیے موت کا پیغام بن گیا۔ یوں لگتا جیسے کسی ہاتھ نے سانپ کو پکڑ کر نیچے گرادیا ہو۔ سانپ نے نیچے گرتے ہی دو سکھوں کو ڈس لیا۔ باقی کے دو سکھ اسے خدا کا عذاب سمجھ کر بھاگ گئے۔

اس کے بعد ہم دونوں عورتیں معصوم بچی کے ہمراہ درخت سے اتریں اور لرزتے قدموں سے گھر کی جانب چل دیں۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا مگر اتنا پتا چل گیا کہ زندگی اور موت کا کھیل ختم ہوچکا ہے۔ حویلی پر ایسا ہولناک سناٹا طاری تھا کہ اندر جانے کی ہمت ہی پیدا نہ ہوئی اور ہم دونوں پھر اسی پناہ گاہ کی طرف چل دیں اور صبح ہونے کا انتظار کرنے لگیں۔ خدا خدا کر کے سپیدہ سحر نمودار ہوا تو پھر حویلی کا رخ کیا۔ وہاں جو دلدوز مناظر دیکھے ان کی کسک آج بھی دل میں محسوس ہوتی ہے۔ جوان عورتیں مردہ پڑی تھیں، سب عورتیں کو جان سے مارنے کے بعد ان کی بے حرمتی کی گئی تھی جن میں میری ماں بھی شامل تھیں۔ پھوپی کی جوان بیٹی کو نہ جانے کیسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا کہ اس کی زبان دانتوں میں آنے سے کٹ گئی تھی اور باہر لٹک رہی تھی۔ اماں کو دونوں کنپٹیوں پر چھری یا خنجر سے شدید زخمی کیا گیا تھا۔ اندھیرے میں درندگی کا جو کھیل کھیلا گیا اس میں ماؤں، بیٹیوں، بہنوں اور بیویوں کا ایک ہی رنگ تھا۔ لہو بھی ایک ہی رنگ کا تھا جس نے کمرے کے فرش پر عجیب انداز میں گلکاری کی تھی۔

چند گھنٹوں بعد دادی اماں اور چچا کا خاندان رات کھیتوں میں گزارنے کے بعد واپس آگیا۔ چچی جان ہمیں لے کر میکے چلی گئیں جو حویلی سے تین کوس پر تھا۔ ایک رات وہاں بسر کی تو وہاں بھی خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں، زندگی میں کبھی ایسی کسمپرسی سے واسطہ نہ پڑا تھا۔ کچھ سجھائی نہ دیا تو دوبارہ اپنے گاؤں چل دیئے، میرے چچا سسر کا گھر ابھی حملہ سے محفوظ

تھا۔ انہوں نے ہمارے لیے چاول اور کھیتوں سے کدو توڑ کر پکائے۔ صبح سے فاقہ تھا' ابھی کھانے کے لیے بیٹھے ہی تھے کہ پھر وہی دہشت ناک آوازیں آنی شروع ہوئیں تو پھر وہاں سے بھی بھاگنا پڑا۔ رات دن ہوا لیکن یہ سلسلہ چلتا رہا۔ بھوک لگتی تو چری اور جوار کے بھٹے چبا لیتے' پانی بھی کم کبھی کبھار میسر آیا۔ یوں ہی جیتے مرتے پہاڑی علاقے کی طرف نکل گئے۔ کچھ لوگ پیچھے رہ گئے' کچھ راستہ بدل گئے۔ مجھے پتا نہ چل سکا کہ دادی اماں اور چچی جان کا خاندان کس طرف نکل گیا۔ زیور سے بھرا ہوا ٹفن کیریئر دادی اماں کے ساتھ تھا اب میں بالکل چچا سسر کے خاندان کے رحم و کرم پر تھی۔

یہ ریاست ٹیری کا پہاڑی علاقہ تھا بہت سے مویشی راستے میں ساتھ چھوڑ گئے' تاہم کچھ اب بھی ساتھ تھے۔ مسلسل چلنے اور تین تین دن کے فاقے سے ہماری حالت ابتر ہو چکی تھی۔ سردی کی مصیبت نے الگ تنگ کر رکھا تھا' چلے تھے تو گرمی کے مہین کپڑے تن پر تھے جو اب تار تار ہو چکے تھے۔ پاؤں چپل سے بے نیاز تھے اور سردی سے واسطہ تھا نہ در' نہ ٹھکانہ۔ یہ فوجی علاقہ تھا اور جان ہتھیلی پر تھی' زندگی رُک سی گئی تھی اور زبردست خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا۔ شیر خوار بچوں کے والدین سخت اذیت میں مبتلا تھے' ان کے رونے کی آواز سب کے لیے موت کی آواز تھی۔ قافلے والوں کے دباؤ سے تنگ آ کر بہت سی ماؤں کو اپنے جگر گوشے راستوں اور ویرانوں میں پھینکنا پڑے۔

ایک واقعہ جو میری چچی ساس کی بہو کے ساتھ پیش آیا آج تک دل پر نقش ہے' زینب امید سے تھی۔ مسلسل فاقوں' تھکاوٹ اور سردی نے اسے بالکل پژمردہ کر دیا تھا۔ قبل از وقت درد زہ میں مبتلا ہو گئی اور یم بے ہوشی کے عالم میں پتھروں پر گر گئی۔ بہو بیٹیوں کا ارزاں خون راستوں میں بہتا رہا۔

اسے بمشکل اٹھا کے ایک کھنڈر (پتھروں کی بنی ہوئی قدرتی خفیہ جگہ) میں لے گئے جہاں کئی گھنٹے موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد اس نے ایک بچے کو جنم دیا۔ مردوں نے شدید سردی کے باوجود اپنی سوتی چادریں اتار کر اسے دیں لیکن اسے کوئی قربانی نہ بچا سکی۔ دوا اور غذا کے بغیر تڑپتے ہوئے وہ اس دنیا سے منہ موڑ گئی۔

محبت کی جانچ شاید ایسے ہی موقعوں پر کی جاتی ہے' اس کے شوہر کی گریہ زاری سے سینے شق ہو رہے تھے۔ وہ اپنی بیوی کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا' جب مائیں اپنے زندہ بچے چھوڑنے پر مجبور تھیں۔ وہ مرد بیوی کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا' بزرگوں نے بڑی مشکل سے اسے چلنے پر آمادہ کیا۔ بچے کی پیدائش قبل از وقت تھی اسی لیے وہ بہت کمزور تھا' اسے چادروں میں لپیٹ کر ہم لوگ آگے چل دیئے۔ بھوک کے لیے بلکتا تو چچی اپنی چھاتی سے چمٹا لیتیں' خدا مسبب الاسباب ہے۔ کیڑے کو پتھر میں رزق فراہم کرتا ہے اس اوپر والے کی شان کہ چوتھے دن چچی کا دودھ اتر آیا' جس نے بے کسی اور لاچاری کے اس عالم میں بچے کو سیراب کر دیا۔ وہ بچہ تنومند جوان بنا اور پھر کئی بچوں کا باپ بھی بنا۔

آخر کار ہم لوگ گرتے پڑتے نکھیر گاؤں جا پہنچے' میری ننھیال وہاں تھی۔ حیرت کی بات ہے کہ ماں کے بغیر نانی اور ماموں کسی نے مجھے دل سے آسرا نہ دیا۔ چند روز اسی کشمکش میں گزارے تو میرا شوہر اچانک وہاں پہنچ گیا۔ ناتجربہ کاری اور کم عمری کی وجہ سے میں اس نعمت کی قدر نہ کر سکی اور ہر وقت ماں اور بھائی کو یاد کر کے روتی رہتی۔ وہ مجھے اپنے ماموں کے پاس لے گیا' یہاں بھی معاملہ چوپٹ تھا۔ کہاں ممانی اور کہاں ممانی کی ساس' اس نے ظلم کی انتہا کر دی۔ سارا دن چکی پیستی اور رات کو ایک روٹی بغیر سالن کے ملتی۔

میری پرورش بہت ناز و نعم میں ہوئی تھی' اتنی اذیت کیسے برداشت کرتی۔ صبح سے شام تک گندم کے ساتھ اپنے آنسو بھی پیتی رہتی۔ آخر دو ماہ بعد اس جاں گسل عذاب سے بھاگ کر نجات پائی۔ میں امید سے تھی اور میرا شوہر بیمار' سونے پر سہاگہ والی بات تھی۔ ہر وقت پاکستان جانے کے لیے دل تڑپتا مگر کوئی راہ سجھائی نہ دیتی۔ چار و ناچار دوبارہ اپنے گاؤں واپس آ گئے۔ اپنے گھر جانے کی ہمت پیدا نہ ہوئی' ہمارے کچھ عزیز ایک محلے میں رہائش پذیر تھے۔ ہم نے بھی وہاں ایک کچا کوٹھا ڈالا اور سر چھپا لیا' بدقسمتی نے

یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔
میرے شوہر کی طبیعت خراب رہنے لگی' اس کے خاندان میں تپ دق موروثی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ میرا سسر اور دیور پہلے ہی اس بیماری کا نشانہ بن چکے تھے۔ نا مساعد حالات میں اس کی بیماری شدت اختیار کرتی گئی۔ کسمپرسی اور عسرت اسے موت کے منہ میں دھکیل رہی تھی۔ نفسا نفسی کا عالم تھا' خانماں برباد لوگ روٹی اور چھت کے لیے مارے مارے پھر رہے تھے۔ ایسے میں کسی کو کون پوچھتا؟ میں اتنی باہمت اور حوصلہ مند نہ تھی کہ حالات سے نبرد آزما ہو سکتی۔ نہ دوا نہ علاج...... الٹا ہر وقت پیٹ کے لالے پڑتے رہتے۔
آخر ایک اجڑی اور ویران شام کو وہ خون تھوکتا ہوا اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے روٹھ گیا۔ اس سوگوار شام کو جب گھر میں چراغ جلانے کو تیل نہ تھا میرے سر سے ہمیشہ کے لیے چادر کھسک گئی۔ روتی پیٹتی پڑوسیوں کی طرف دوڑی جو چند دور دراز کے عزیز تھے۔ وہ کمال دین کو اس کی آخری آرام گاہ تک چھوڑ آئے دو چار دن بعد اپنے آپ کو سنبھالا تو احساس ہوا اب میں اس کچے کوٹھے میں بھی نہیں رہ سکتی۔ اپنے بھائی اور اماں کو بے طرح یاد کیا' ایک تو بالکل جوان' دوسری بات یہ کہ حاملہ' جاؤں تو جاؤں کہاں؟
ایک ہمسائی مجھے اپنے گھر لے گئی' وہ بے چاری کتنے دن پناہ دے سکتی تھی۔ اس نے کچھ گت ودو کی اور میرے لیے ایک رشتہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئی۔ حالات کے پیش نظر نکاح ممکن نہ تھا اور وہ مجھے کچھ دینے سے قاصر تھی مجبوراً مجھے ایسی حالت میں ہی ہونے والے شوہر کے ساتھ جانا پڑا۔
وہ ایک ادھیڑ عمر سخت گیر شخص تھا' پہلی بیوی فوت ہو چکی تھی۔ گھر میں اس کے علاوہ بوڑھی ساس اور ایک دیور تھا۔ اکثر اوقات یہ لوگ گھر نہ ہوتے تو مجھے اپنے ہونے والے شوہر کی زیادتی برداشت کرنی پڑتی' مرتی کیا نہ کرتی انہوں نے بہر صورت مجھے آسرا دیا تھا۔
اور پھر اللہ نے میری گود بھر دی' تو مجھ میں زندگی کی کچھ رمق نظر آنے لگی۔ بچہ دو ماہ کا ہوا تو میرا نکاح نذر علی سے ہو گیا۔ زندگی کا ایک اور دردناک دور شروع ہو گیا۔ اس کا ساتھ دیتے ہوئے میں نے اس طرح بن باپ کے بچے کی پرورش کی یہ ایک الگ داستان ہے۔
ان حالات میں اماں جی اور بھائی بے حد یاد آتے۔
اچانک پانچ سال کے بعد خبر ملی کہ اماں اور بھائی پاکستان میں زندہ سلامت ہیں' اماں کو پتا چلا تو کہنے لگی۔
''کنویں میں چھلانگ لگا لیتی لیکن نذر علی سے شادی نہ کرتی۔''
بھائی پاسپورٹ بنوا کر مجھے لینے آیا لیکن شوہر نے پاکستان جانے کی اجازت نہ دی۔ تین سال کی منت سماجت کے بعد بمشکل اسے آمادہ کروایا۔
قافلے ان دنوں بھی پاکستان جا رہے تھے جودھ پور اور میر پور خاص کے راستے ہم کھوکھرا پار سے ہوتے ہوئے سندھ حیدر آباد پہنچے۔ ریت ریت پر کئی دن چلنے کے بعد سفر ختم ہوا تو ہم حیدر آباد ریلوے اسٹیشن آئے' جہاں سے ریل گاڑی پر لاہور پہنچے۔

......☆......

ہم جو کبھی حویلی میں رہتے تھے۔ اب جھگی میں آ گئے تھے اور جھگی والے مشہور ہو گئے تھے لیکن جلد ہی بھائی نے کلیم حاصل کر لیا اور پھر جتنا ہم نے کھویا تھا اس سے دگنا حاصل کر لیا تھا لیکن آج جب میں اخبار دیکھتی ہوں۔ قومیت کے نام پر خوب خرابہ کی خبریں پڑھتی ہوں تو لگتا ہے کہ وہ ویران شام اب تک ختم نہیں ہوئی۔ آج بھی ''وہ آ گئے'' کے نعرے کانوں میں گونجنے لگتے ہیں۔



ذوق آگہی

سباس گل

قارئین کرام آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ نئے افق میں شائع ہونے والا کالم ذوق آگہی اس ماہ سے ملک کی معروف مصنفہ اور شاعرہ سباس گل اپنی نگرانی میں مرتب کریں گی۔ سباس گل کا مختصر تعارف حاضر خدمت ہے۔

اسلام علیکم قارئین "ذوق آگہی" میں تھوڑی سی آگہی سباس گل کے بارے میں ہوجائے' پیدائش اور رہائش رحیم یار خان ہے۔ لکھنے کا شوق بچپن سے ہی تھا' 15سال سے ڈائجسٹ میں لکھ رہی ہیں۔ 200 سے زیادہ ناول، افسانے لکھ چکی ہیں' الحمدللہ 8 ناولز مارکیٹ میں آچکے ہیں۔ 9ویں کتاب انشاءاللہ ایک ماہ تک مارکیٹ میں دستیاب ہوگی' شاعری' کالم' آرٹیکل' بھی لکھتی رہی ہیں' تعلیم جاری ہے اور سیکھنے اور سکھانے کا عمل بھی' اور سیکھا یہ ہے کہ صبر سے بڑی طاقت کوئی نہیں ہے' اور سچ سے بڑا اطمینان کوئی نہیں ہے' خوش رکھیے' خوش رہیے۔

zooqeaagahi@gmail.com
www.facebook.com/naeyufaqonlinemagzine

آج سے ہمیشہ کیلئے سچ بولنے کا پکا ارادہ کرلیں

حدیث:۔

تم ہمیشہ سچائی اختیار کرو، کیونکہ سچ نیکی کی طرف لے جاتا ہے اور نیکی جنت میں لے جائے گی۔

آدمی سچ بولتا رہتا ہے اور سچ بولنے کا عادی ہوجاتا ہے تو اللہ کے نزدیک بہت سچا لکھ دیا جاتا ہے۔

(ابوداؤد، حدیث 4989 کتاب' الادب' باب: جھوٹ بولنے کی مذمت، راوی: ابن مسعود رضی اللہ عنہ)

مفتی ارسلان نواب.....کراچی

خوبصورت باتیں

☆ الفاظ کے دانت نہیں ہوتے لیکن جب کاٹتے ہیں تو درد بہت ہوتا ہے۔

☆ کبھی زخم اتنے گہرے ہوجاتے ہیں کہ زندگی ختم ہوجاتی ہے لیکن زخم نہیں بھرتے۔ اس لیے زندگی میں جب بھی بولو میٹھا بولو مدھر بولو۔

☆ بات کرنے میں سختی اللہ کو بھی پسند نہیں ہے اسی لیے زبان میں ہڈی نہیں دی ہے۔

☆ زبان پیدائش سے لے کر موت تک رہتی ہے کیونکہ وہ نرم ہوتی ہے۔

☆ دانت پیدائش کے بعد میں آتے ہیں اور مرنے سے پہلے ختم ہوجاتے ہیں کیونکہ وہ سخت ہوتے ہیں۔

☆ چھوٹا بن کے رہوگے تو بڑی رحمت ملے گی کیونکہ بڑا ہونے پر تو ماں بھی گود سے اتار دیتی ہے۔

☆ قسمت اور بیویاں گرچہ پریشان کرتی ہیں لیکن جب ساتھ دیتی ہیں تو زندگی بدل دیتی ہیں۔

☆ رشتے مفت نہیں ملتے، مفت تو ہوا بھی نہیں ملتی، ایک سانس بھی تب آتا ہے جب ایک سانس چھوڑا جاتا ہے۔

زبیر احمد خان.....نیوجرسی' امریکا

مسجد نبوی کی تعمیر' عقیدت کی معراج

ترکوں نے جب مسجد نبوی کی تعمیر کا ارادہ کیا تو انہوں نے اپنی وسیع عریض ریاست میں اعلان کیا کہ انہیں عمارت سازی سے متعلق فنون کے ماہرین درکار ہیں، اعلان کرنے کی دیر تھی کہ ہر علم کے مانے ہوئے لوگوں نے اپنی خدمات پیش کیں، سلطان کے حکم سے استنبول کے باہر ایک شہر بسایا گیا جس میں اطراف عالم سے آنے والے ان ماہرین کو الگ الگ محلوں میں بسایا گیا، اس کے بعد عقیدت اور حیرت کا ایسا باب شروع ہوا جس

کی نظیر مشکل ہے، خلیفہ وقت جو دنیا کا سب سے بڑا فرمانروا تھا، شہر میں آباد اور ہر شعبے کے ماہر کو تاکید کی کہ اپنے ذہین ترین بچے کو اپنا فن اس طرح سکھائے کہ اسے یکتا و بے مثال کر دے، اس اثنا میں ترک حکومت اس بچے کو حافظ قرآن اور شہسوار بنائے گی، دنیا کی تاریخ کا یہ عجیب و غریب منصوبہ کئی سال جاری رہا، ۲۵ سال بعد نوجوانوں کی ایسی جماعت تیار ہوئی جو نہ صرف اپنے شعبے میں یکتا روزگار تھے بلکہ ہر شخص حافظ قرآن اور باعمل مسلمان بھی تھا، یہ لگ بھگ ۵۰۰ لوگ تھے، اسی دوران ترکوں نے پتھروں کی نئی کانیں دریافت کیں، جنگلوں سے لکڑیاں کٹوائیں، تختے حاصل کئے گئے اور شیشے کا سامان بہم پہنچایا گیا، یہ سارا سامان نبی کریم کے شہر پہنچایا گیا ادب کا یہ عالم تھا کہ اسے رکھنے کے لئے مدینہ سے دور ایک بستی بسائی گئی تاکہ شور سے مدینہ کا ماحول خراب نہ ہو، نبی علیہ ﷺ کے ادب کی وجہ سے اگر کسی پتھر میں ترمیم کی ضرورت پڑتی تو اسے واپس اسی بستی بھیجا جاتا، ماہرین کو حکم تھا کہ ہر شخص کام کے دوران باوضو رہے اور درود شریف اور تلاوت قرآن میں مشغول رہے، حجرہ مبارک کی جالیوں کو کپڑے سے لپیٹ دیا گیا کہ گرد غبار اندر روضہ پاک میں نہ جائے، ستون لگائے گئے کہ ریاض الجنہ اور روضہ پاک پر مٹی نہ گرے، یہ کام پندرہ سال تک چلتا رہا اور تاریخ عالم گواہ ہے ایسی محبت ایسی عقیدت سے کوئی تعمیر نہ کبھی پہلے ہوئی اور نہ کبھی بعد میں ہوگی۔

ریان عدیل.....شارجہ، یو اے ای

دسترخوان جھاڑنا بھی ایک فن ہے

حضرت مولانا سید اصغر حسین رحمتہ اللہ علیہ جو حضرت ''میاں صاحب'' کے نام سے مشہور تھے بڑے عجیب و غریب بزرگ تھے۔ ان کی باتیں سن کر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے زمانے کی یاد تازہ ہو جاتی۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں ان کی خدمت میں گیا۔ انہوں نے فرمایا۔ کھانے کا وقت ہے آؤ کھانا کھالو۔ میں ان کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ جب کھانے سے فارغ ہوئے تو میں نے دسترخوان کو لپیٹنا شروع کیا تاکہ میں جا کر دسترخوان جھاڑوں تو حضرت میاں صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا۔

''کیا کر رہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''حضرت دسترخوان جھاڑنے جا رہا ہوں۔''

حضرت میاں صاحب نے پوچھا۔ ''دسترخوان جھاڑنا آتا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''حضرت! دسترخوان جھاڑنا کون سا فن یا علم ہے جس کے لیے باقاعدہ تعلیم کی ضرورت ہو۔ باہر جا کر جھاڑ دوں گا۔''

حضرت میاں صاحب نے فرمایا۔ ''اسی لیے تو میں نے تم سے پوچھا تھا کہ دسترخوان جھاڑنا آتا ہے یا نہیں؟ معلوم ہوا کہ تمہیں دسترخوان جھاڑنا نہیں آتا۔''

میں نے کہا۔ ''پھر آپ سکھا دیں۔''

فرمایا۔ ''ہاں! دسترخوان جھاڑنا بھی ایک فن ہے۔''

پھر آپ نے اس دسترخوان کو دوبارہ کھولا اور اس پر جو بوٹیاں یا بوٹیوں کے ذرات تھے ان کو ایک طرف کیا اور ہڈیوں کو جن پر کچھ گوشت وغیرہ لگا ہوا تھا ان کو ایک طرف کیا اور روٹی کے جو چھوٹے چھوٹے ذرّات تھے ان کو ایک طرف جمع کیا۔ پھر مجھ سے فرمایا۔

''دیکھو! یہ چار چیزیں ہیں اور میرے یہاں ان چاروں کی علیحدہ علیحدہ جگہ مقرر ہے۔ یہ جو بوٹیاں ہیں ان کی فلاں جگہ ہے بلی کو معلوم ہے کھانے کے بعد اس جگہ بوٹیاں رکھی جاتی ہیں وہ آکر ان کو کھا لیتی ہے۔ اور ان ہڈیوں کیلئے فلاں جگہ مقرر ہے۔ محلے کے کتوں کو وہ جگہ معلوم ہے وہ آکر ان کو کھا لیتے ہیں اور جو

روٹیوں کے ٹکڑے ہیں‘ ان کو میں اس دیوار پر رکھتا ہوں‘ یہاں پرندے‘ چیل کوّے آتے ہیں اور وہ ان کو اٹھا کر کھا لیتے ہیں اور یہ جو روٹی کے چھوٹے چھوٹے ذرات ہیں‘ تو میرے گھر میں چیونٹیوں کا بل ہے ان کو اس بل میں رکھ دیتا ہوں‘ وہ چیونٹیاں اس کو کھا لیتی ہیں۔

پھر فرمایا۔ ”یہ سب اللہ جل شانہ کا رزق ہے‘ اس کا کوئی حصہ ضائع نہیں جانا چاہیے۔“

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے تھے کہ اس دن ہمیں معلوم ہوا کہ دسترخوان جھاڑنا بھی ایک فن ہے اور اس کو بھی سیکھنے کی ضرورت ہے۔

انیس الرحمٰن...... جدہ‘ سعودی عرب

تاریخ کی سب سے متاثر کن شخصیت

مائیکل ہارٹ ایک عیسائی منصف تھا۔ اس نے ایک کتاب لکھی جو بہت مشہور ہوئی۔ کتاب کا نام تھا ”تاریخ کی سب سے متاثر کن شخصیات کی درجہ بندی“ اس نے اپنی کتاب میں تاریخ کی تمام نام ور اور متاثر کن شخصیات کی درجہ بندی کی ہے۔ اس درجہ بندی میں اس نے سب سے پہلے رسول اللہ صلی علیہ وسلم کا مبارک نام لکھا ہے۔ اس کی کتاب میں ابتدائی جملہ بہت عجیب ہے۔ وہ لکھتا ہے‘ میرے بعض قارئین حیران ہوں گے کہ میں محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم کو تاریخ کی سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والی شخصیت پر کیوں فوقیت دی‘ اس کے لیے وہ بڑی دلیل دیتا ہے۔ لکھتا ہے‘ دنیا میں جتنے بھی نام ور لوگ آئے‘ اگر ان کی زندگی کے حالات کا آپ عمیق مطالعہ کریں تو وہ اپنے لڑکپن اور جوانی کے دور میں اپنے وقت کے بہترین تعلیمی اداروں میں کسی استاد کے پاس تعلیم حاصل کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی اکثریت اپنے وقت کے بہترین تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرتی نظر آتی ہے‘ مگر جب اس نقطہ نظر سے ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمہ جہت شخصیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایک ایسی مقتدر شخصیت تھے جو پوری زندگی بحیثیت شاگرد کسی استاد کے سامنے نہیں بیٹھے پھر بھی انہوں نے انسانیت کو علم کے ایسے زیور سے آراستہ کیا جو ایک قطعی ان پڑھ اور دنیاوی علم سے نابلد انسان کے لئے ممکن نظر نہیں آتا۔ اس حقیقت نے مجھے مجبور کر دیا کہ اس درجہ بندی میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلا درجہ دوں۔

احسن احمد...... کراچی

ہیرے جواہرات

ایک مرتبہ ایک بزرگ نے ایک محفل میں اپنی بند ہتھیلی کو سب کی طرف کر کے دریافت فرمایا میرے ہاتھ میں کیا ہے؟

کچھ نے جواب دیا شاید آپ کے ہاتھ میں ہیرے جواہرات ہیں۔

پھر ایک صاحب سے پوچھا انہوں نے بھی کچھ سوچ کے بعد جواب دیا۔ شاید سونا ہے۔

پھر پوچھنے پر ایک نے جواب دیا کہ آپ کے ہاتھ میں اگر ہیرے جواہرات نہیں اور سونا بھی تو یقیناً چاندی یا کوئی قیمتی چیز ہوگی۔

تب ان بزرگ نے اپنے ہاتھ کو کھولا تو ان کے ہاتھ پر چند کنکریاں تھیں سب حیران رہ گئے۔

ارشاد کیا۔ عورت کی مثال اس بند مٹھی کی طرح کی ہے اگر وہ بند ہے۔ (یعنی باپردہ) ہے تو ہیرے جواہرات، سونا چاندی اور اس کی بیش بہا قیمت ہے لیکن اگر وہ مٹھی کی طرح کھل جائے (بے پردہ ہو جائے) تو وہ بے وقعت پتھر اور کنکریوں کی مانند ہے جس کی کوئی عزت اور قیمت نہیں۔

صدف رانا...... چکوال

موت کے بعد کون سی چیزیں کتنی دیر تک زندہ رہتی ہیں؟

دل...... ۱۰ منٹ

دماغ.....۲۰ منٹ

آنکھیں.....۴ گھنٹے

جلد.....۵ دن

ہڈیاں.....۳۰ دن

لیکن

نیک عمل ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

محتشم احمد.....کراچی

نصیحت

ماضی ہمارے نزدیک صرف اچھی یادوں کو دہرانے اور غلطیوں سے سبق سیکھنے کا ذریعہ ہونا چاہیے، اس کی تلخیاں، اس کی کڑواہٹیں ہمیں حال میں شامل نہیں کرنی چاہئیں۔

ضبطِ عشق از مہوش افتخار

طوبیٰ صمصام.....کراچی

دکھ بھری داستان

بس بچہ! اللہ دکھ بھری داستان کو بڑے دھیان سے سنتا ہے۔ کچھ غم مٹا بھی دیتا ہے۔ کچھ الجھنیں سلجھا بھی دیتا ہے لیکن اگر سارے ہی غم سلجھ جائیں تو آدمی اور اس میں بات چیت بند ہو جاتی ہے۔ بیماری نہ ہو تو کوئی ڈاکٹر کے پاس کیوں جائے؟ جھگڑا نہ ہو تو وکیل کس کام کا؟ بس خود ہی مصیبت بھیجتا ہے اور خود ہی ثالث بن جاتا ہے۔ اگر زندگی میں راحت ہی راحت ہو چین ہی چین ہو تو کون اس کا در کھٹکھٹائے کون اس سے باتیں کرے۔

بانو قدسیہ دست بستہ سے اقتباس

انتخاب: صدف آصف

محبت کا شجر

''زندگی میں کوئی ایک ہاتھ ایسا ضرور ہونا چاہیے جسے گرتے وقت تھامنے کے لیے آپ کسی اجازت کے محتاج نہ ہوں..... آپ کو پوری دنیا میں کوئی ایک محبت بھرا دل ضرور محبت میں سمیٹنے کو تیار ہو..... ایک گھر ہو جو عافیت ہو..... محبت کا شجر کہتے ہیں کبھی خزاں سے نہیں سوکھتا۔ ہر موسم میں امید کی ایک کونپل ضرور اسے زندگی سے جوڑے رکھتی ہے اور پھر زندگی بن جانے سے اسے کون روک سکتا ہے۔''

تحریر: دیپ تھا یا تارا، مصنفہ: سعدیہ عزیز آفریدی

پریشے اسد شاہ.....قطر

امید کی کونپل

کچھ لوگ دنیا سے اور دنیا کے کاموں سے اتنے بھرے ہوتے ہیں کہ انہیں دیکھ کے ترس آتا ہے۔ ان کے اندر کوئی خلا کوئی کونا خالی ہی نہیں ہوتا۔ جو شخص اتنا بھرا ہوا اتنا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو وہ آزاد کس طرح سے ہو سکتا ہے۔ جس کے اندر ذرا سی بھی جگہ موجود نہ ہو اس کے اندر خدا کہاں سے آ سکتا ہے اور کیسے سما سکتا ہے۔ دیکھو آزادی کے لیے اندر جگہ چاہیے باہر نہیں۔

میں تو اکثر یہ بھی کہتا ہوں کہ اپنے آپ کو خدا سے بھی نہ بھرو۔ بس خالی جگہ چھوڑ دو۔ وہ خود بخود سما جائے گا تمہیں کوشش نہیں کرنی پڑے گی۔ جب بارش ہوتی ہے تو خالی گڑھے بارانِ رحمت سے خود بخود بھر جاتے ہیں اور موٹے موٹے اونچے ٹیلے ویسے کے ویسے سوکھے ہی رہ جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو خالی رکھو کیونکہ خالی جھولی ہی بھری جاتی ہے۔

(باباصاحب سے اقتباس)

مسکان احزم.....فیصل آباد



خوشبوسخن

نوشین اقبال نوشی

قارئین کرام آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ خوشبوسخن کے کالم اس ماہ سے ملک کی معروف شاعرہ نوشین اقبال نوشی اپنی نگرانی میں مرتب کریں گی۔ ان کا مختصر تعارف حاضر خدمت ہے۔

میرا حوالہ، پہچان نوشین اقبال نوشی ہے، نک نیم بھی نوشی ہے۔ میرا تعلق کھاریاں سے ہے میں نے ایم اے اردو کیا ہے اور اب گھر پر ہی ہوتی ہوں، کام کاج، ساتھ لکھنا لکھانا بھی ہوتا رہتا ہے۔

گو کہ میرا تعلق ادب کے اس قبیلہ سے ہے جو لفظوں کو اشعار کی شکل میں ڈھال کر کبھی غزل کہتا ہے اور کبھی نظم، لیکن یہ سمجھ نہیں آتی کہ میں اس قبیلے کی فرد کب سے بنی، شاید میری حساس طبیعت کا اثر ہے کہ آس پاس کے ماحول کا اثر لیا یا پھر ادبی تخلیقات میرے خون میں شامل ہوگئیں۔ اب مدیر نئے افق نے ایک ذمہ داری ڈال دی ہے کہ میں نئے افق کا کالم خوشبوسخن مرتب کروں تو میں انکار نہیں کرسکی اس لیے اب ہم ہوں گے اور آپ کا پسندیدہ کالم۔

kushbooshukan@gmail.com

www.facebook.com/naeyufaqonlinemagzine

نظم

نہ درد ہو
نہ جدائی ہو
نہ شرک ہو
نہ بے وفائی ہو
نہ ہجر ہو
نہ تنہائی ہو
نہ بے چینیاں ہوں
نہ دکھ سے آشنائی ہو
نہ زخم ہوں
نہ مسیحائی ہو
نہ خوب پھیلے شہرت
نہ گلی گلی رسوائی ہو
نہ اپنوں کے
لہجے ہوں خنجر
نہ دشمن ساری خدائی ہو
نہ کوئی لیلیٰ جلے صحرا میں
نہ کوئی قیس سودائی ہو
نہ کسی قہقہے کا دم گھٹے
نہ کسی کی آنکھ بھر آئی ہو
نہ کسی کو عشق نچائے
نہ کوئی آنکھ تماشائی ہو
نہ راکھ بنے کوئی پروانہ
نہ کسی نے شمع جلائی ہو
نہ گالوں کے بھنور ہوں
نہ آنکھوں کی گہرائی ہو
نہ کاسہ آرزو ہو خالی
نہ روح کی گدائی ہو
نہ جنوں ہو ہم نفس کا
نہ کسی میں کسی کی
دہن سمائی ہو
تو رحیم ہے مولا
تو کریم ہے مولا
سبھی پہ تیرے کرم ہیں مالک
عشق والوں پہ بھی
یہ احسان کردے
یہ ساری مشکلیں لے کر واپس
محبت کو ذرا آسان کردے

شاعرہ: گل ارباب...... پشاور

دردِ دل

اے دردِ دل
تو نے کیا ہمیں
یوں دربدر
کبھی اِس نگر، کبھی اُس نگر
کبھی عرش پر، کبھی فرش پر
اے دردِ دل
تو نے کبھی نکھار دیا
کبھی سنوار دیا
کبھی رُلا دیا، کبھی ہنسا دیا
اے دردِ دل
تو نے غمِ ہجراں میں
شب بھر جلنا سکھا دیا
اے دردِ دل
پھر بھی خوش ہوں میں
تو نے محبت کرنا سکھا دیا
مے عشق کا جام پلا دیا
ریحانہ سعیدہ...... لاہور

قطعہ

ہر روز کھیلتے ہیں انساں کے خوں سے ہولی
اوقات کیا یہی ہے انساں کی زندگی کی
جب جس کے جی میں آئے انساں کی جان لے لے
انساں ہے کہ گویا تصویر بے بسی کی
راؤ تہذیب حسین تہذیب...... رحیم یار خان

غزل

دھوپ چھاؤں کا موسم بدل بھی سکتا ہے
یہ غم کا سورج ہے آخر کو ڈھل بھی سکتا ہے
کسے خبر ہے قسمت کہاں سنور جائے؟
جو بیچ بھنور میں ہے، بھنور سے نکل بھی سکتا ہے
ڈوب رہا ہے نگاہوں کے سامنے وہ شخص
رحیم چاہے تو باہر اچھل بھی سکتا ہے
کسی کی مات پر خوشیاں منانا ٹھیک نہیں
گرنے والا گر کے سنبھل بھی سکتا ہے
یہ چار سو جو تعصب کا شور ہے برپا
ہم دل سے چاہیں تو یہ خطرہ ٹل بھی سکتا ہے
اب اعتبار وفا گل کسی پہ کیسے ہو؟
جو آج ساتھ ہے، کل کو بدل بھی سکتا ہے
سباس گل...... رحیم یار خان

غزل

جو زباں اپنی پہ نہ لاگو ہو وہ صداقت ڈوب جاتی ہے
گر نگاہیں قابو نہ رہ پائیں شرافت ڈوب جاتی ہے
میں کروں تعریف تو کیسے دور حاضر کے رفیقوں کی
کہ جن کے پاس رکھ دو تو امانت ڈوب جاتی ہے
مقام حیرت کہ بنے پھرتے ہیں پارسا زمانے کے
دیکھ کر تنہائیاں جن کی غلاظت ڈوب جاتی ہے
میں کیسے مان لوں تیرے نازک اندام حسینوں کو
کہ میرے محبوب سے مل کر نزاکت ڈوب جاتی ہے
چپ کروا دے ڈانٹ کر جسے بیٹا یقین مانو
اس بوڑھے باپ کی ساری ریاضت ڈوب جاتی ہے
دیکھا ہے رسوا ہوتے بڑے تابع فرمانوں کو
جب لمحہ لغزش کام آ جائے سعادت ڈوب جاتی ہے
نکالا ہے نچوڑ فاروق عمر بھر کی مشقت کا
کہ جب ناراض ہو تقدیر مہارت ڈوب جاتی ہے
عمر فاروق ارشد...... فورٹ عباس

غزل

ایسے میں کوئی ہجر کی صورت نہیں رہتی
جب طالب دیدار کو حاجت نہیں رہتی
گل کر دیا یہ سوچ کے ہر ایک دیے کو
وہ ہوں تو چراغاں کی ضرورت نہیں رہتی
جس دور میں نفرت کی زباں عام ہو یارو
اس دور کے لوگوں میں محبت نہیں رہتی

موسم کی طرح لوگ بدلتے ہیں یہاں پر
اک جیسی ہر اک شخص کی عادت نہیں رہتی
اب دیکھتے ہیں دور کا سلطان ہے کیسے
پابند سلاخوں میں محبت نہیں رہتی
ہر شخص کی فطرت میں بدل جانا ہے ساحل
تا دیر کسی سے بھی عداوت نہیں رہتی

خالد ایاز ساحل......حافظ آباد

غزل

بدل رہا ہے مزاج اپنا
کہاں رہا وہ اناج اپنا
وہی ہے دنیا وہی زمانہ
نہ کل تھا اپنا نہ آج اپنا
نہ پہلے جیسی رہی محبت
بگڑ گیا ہے سماج اپنا
وہ بھوک سے مر رہا ہے دیکھو
کرائے کیسے علاج اپنا
کسی در کے فقیر ہم ہیں
نہ تخت اپنا نہ تاج اپنا
وہ شہر اس کا عجب ہے رانا
وہاں کا دیکھا رواج اپنا

قدیر رانا......راولپنڈی

غزل

داستان غم سنائی رو پڑے
اس نے جب ٹھوکر لگائی رو پڑے
ہوگئے ہیں اس قدر ہم زود رنج
بات جب خوشیوں کی آئی رو پڑے
جس نے بھی دیکھا ہے کلیوں کا چلن
جب کلی بھی مسکرائی رو پڑے
عمر بھر جس کے رہے ہم راز داں
اس نے جب انگلی اٹھائی رو پڑے
آشنائے درد دل نے جب کبھی
غیر کی محفل سجائی رو پڑے
بھا گیا طیور کو کنج قفس
اس لیے وقت رہائی رو پڑے
درد فرقت کس طرح سہتے بھلا
ہم قمر وقت جدائی رو پڑے

ریاض حسین قمر......منگلا ڈیم

غزل

ایک تاریک سی بستی کو سجا آیا ہوں
میں اجالوں کے لیے خود کو جلا آیا ہوں
تو نے سی رکھا تھا ہونٹوں کو بڑی مدت سے
میں تیرے پاس تیرا بن کے صدا آیا ہوں
اب جو لوٹوں گا تو میں بن کے ہی کچھ لوٹوں گا
اپنے گھر والوں کو یہ بات بتا آیا ہوں
اک سمندر کو سمانا تھا مجھے کوزے میں
ان سے جو وعدہ کیا تھا وہ نبھانے آیا ہوں
چند آنسو ہی بچے ہوں گے نگاہوں میں میری
ایک ہی دل تھا میرے پاس لگا آیا ہوں

رانا حنیف عاطر......راولپنڈی

غزل

سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے بہاروں کا
کس نے مقام پرکھا ہے تاروں کا
حوصلہ دیتے نہیں آج کل کے یار بھی
وہ پہلے سا جلوہ نہ تھا نظاروں کا
یادوں کے سفر میں ہمیشہ سے تھا تنہا
بیگانوں سے پوچھ لیتا ہوں رستہ رہگزاروں کا
ہاتھ ملا کے بھی لوگ چھوڑ جاتے ہیں یہاں
زندگی رستہ ہے پھر سے خار زاروں کا
بے رخی سے تیری یہ زخم ملے ہیں ہم کو
وہ پہلے سا جذبہ نہیں رہا اب سہاروں کا

قسمت میں اپنی کچھ آنسو اور آہیں ہیں جاوید
موسم بدل گیا ہے آج پھر سے شراروں کا
محمد اسلم جاوید......فیصل آباد

غزل

قطرہ قطرہ لہو پلاتے ہوئے
میں مرا عشق کو بچاتے ہوئے
آنکھ آئینے میں گنوا آیا
تشنگی عکس کی بجھاتے ہوئے
ڈھلتے سائے میں ڈھل گئی آخر
دھوپ، سایہ مرا جلاتے ہوئے
تیری جانب ہے اب سفر میرا
اپنا رستہ بھی خود بناتے ہوئے
غم کی قندیل بھی بجھا آئے
ہم ترا ظرف آزماتے ہوئے
ہاتھ اس کے بھی جل گئے ہوں گے
آشیانہ مرا جلاتے ہوئے
کتنے امکان بن گئے قیصر
ایک دیوار کو اٹھاتے ہوئے
شاعر: زبیر قیصر......باہتر اٹک

غزل

خالق نئے سرے ہی تشکیل کر مجھے
جوہڑ سا ہو گیا ہوں کبھی جھیل کر مجھے
آخر مری بھی کوئی انا ہے مرے غنیم
کپڑوں کی طرح روز نہ تبدیل کر مجھے
مجھ میں گناہ کرنے کی طاقت بھی رکھ ذرا
میں نے یہ کب کہا ہے کہ جبریل کر مجھے
تیرے بغیر جینے کی عادت مجھے نہیں
جانے سے پہلے آ ذرا تبدیل کر مجھے
محدود ہو گیا ہوں پھر اپنی ہی ذات میں
لوگوں کے سامنے کبھی تفصیل کر مجھے

فاخر رضوی......جرمنی

غزل

حق جس کا تھا نہیں وہی حق دار ہو گیا
سولی پہ چڑھ گیا ہوں میں غم دار ہو گیا
مرہم بنا ہوا تھا جو زخموں کے واسطے
یہ کیا ہوا کہ آج وہ آزار ہو گیا
میں نے طلب یہ کی تھی کہ اک پھول تو کھلے
لیکن یہاں الٹ ہوا سب خار ہو گیا
کافی تھا ایک حادثہ جو مجھ کو مار دے
کتنے ہی حادثات سے دو چار ہو گیا
گھبرا کے اپنے سائے سے داخل ہوا تھا میں
رکھنا قدم تھا میرا کہ گم غار ہو گیا
پہلے پہل میں پیار تھا کہتا اسے مگر
آخر کو میرے عشق میں وہ یار ہو گیا
سر کو جھکائے بیٹھا تھا میں ان کے سامنے
وہ بادشاہ ہوا تو میں دربار ہو گیا
چہرے پہ میرے دِکھتی ہیں اب رونقیں سبھی
غم اپنے میں چھپا کہ لو فنکار ہو گیا
تنہائیاں جہان کی ہیں مجھ کو ڈھونڈتی
سارے غموں کا جیسے میں سالار ہو گیا
اک بار یوں ہوا کہ مجھے پڑھ رہے تھے وہ
افسانہ زندگی تھی میں کردار ہو گیا
بخشا ہے اِک دوام مجھے عشقِ یار نے
اِس پار کی خبر نہیں اس پار ہو گیا
اپنے قلم سے خوب میں لکھتا ہوں سارے غم
واللہ اب تو میں بھی قلمکار ہو گیا
ہر سال مجھ کو ڈھونڈنے آتے ہیں لوگ کیوں
اظفر ہوا نہ میں کوئی تہوار ہو گیا
فیصل اظفر علوی......اسلام آباد
☺

قسط نمبر3

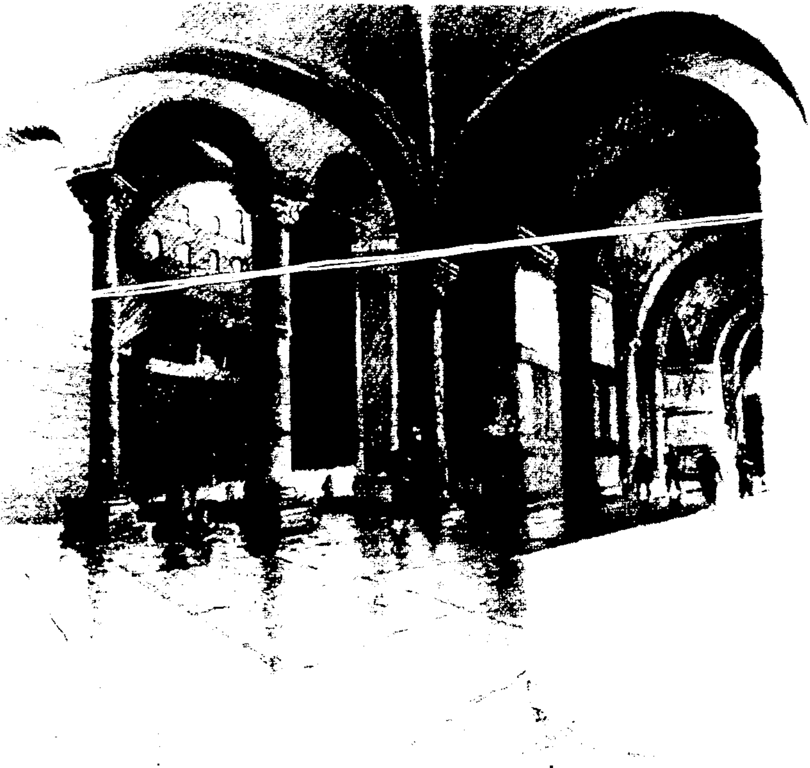
فلسطین

الماس ایم اے

بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ اول' وہ شہر جہاں سے ہمارے پیغمبر حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ والہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے۔ وہ شہر جسے سیکڑوں نبیوں نے اپنی آخری آرام گاہ کے طور پر چنا۔ وہ شہر جو تین مذاہب کے ماننے والوں کے لیے مقدس ترین ہے۔

اسی تاریخی شہر کے پس منظر میں لکھا جانے والا ایک ایسا ناول جسے آپ بار بار پڑھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

الماس ایم اے کے قلم سے تاریخی کہانیاں پسند کرنے والوں کے لیے بطور خاص۔





مثل مشہور ہے کہ جویندہ یابندہ۔ یعنی تلاش کرنے والے کو آخراپنی تلاش کا پھل مل جاتا ہے۔
فادرولیم کا یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی قافلہ آتا تو وہ صدر دروازے کے قریب ایک اونچی جگہ کھڑے ہو جاتے جہاں سے وہ سرائے میں داخل ہونے والے ہر شخص کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ ایک شام ایک بڑا قافلہ سرائے میں داخل ہوا۔ آنے والے قافلہ کا غلغلہ سن کر فادرولیم اپنی مخصوص اونچی جگہ پر آ کر کھڑے ہو گئے اور ہر داخل ہونے والے کا چہرہ بڑے غور اور انہماک سے دیکھ رہے تھے۔
آدھا قافلہ سرائے میں داخل ہو چکا تھا مگر فادر ولیم کی نظریں اب بھی خالی خالی تھیں کہ یکا یک ایک شخص کو سرائے میں داخل ہوتا دیکھ کر فادرولیم چونک پڑے۔ وہ ایک لمبے قد کا نیم فوجی معلوم ہوتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی فادرولیم اپنی جگہ سے ہٹ کر اس آنے والے کے پیچھے لگ گئے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ جگہ بناتے ہوئے آخر اس کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ پھر فادرولیم نے اس شخص کے ساتھ چلتے ہوئے سرگوشی کی۔
''بارکتش! میں سرائے کے صدر دروازے کے باہر تمہارا انتظار کروں گا۔''
بارکتش امیرِ عمادالدین زنگی کا خواجہ سرا غلام تھا۔ زنگی اس پر بہت اعتماد کرتے تھے اور اس سے بہت ہی اہم کام لیا کرتے تھے۔ فادرولیم کو ان باتوں کا علم تھا۔ پس انہوں نے بارکتش کو فوراً پہچان لیا تھا اور ان کے دماغ میں فوراً یہ خیال آیا تھا کہ امیر زنگی نے اس کی تلاش میں بارکتش کو الرہا بھیجا ہے۔ کیونکہ فادر ولیم (جعفر) نے پچھلے کئی دنوں سے کوئی رپورٹ یا اطلاع نہ بھیجی تھی۔
بارکتش سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا اور فادرولیم اپنے کمرے میں آ گئے۔
فادرولیم نے اپنے کمرے میں آ کر شمع روشن کی اور کاغذوں کے پلندے میں سے ایک لمبا خط نکالا۔ یہ خط نہیں بلکہ الرہا کی پوری تفصیل تھی۔ اس زمانے میں خفیہ اطلاعات بھیجنے کا یہی طریقہ تھا۔ ملک ملک کے جاسوس سرائے میں جا ٹھہرتے تھے اور رات کو خفیہ رپورٹ لکھتے تھے۔ پھر جب موقع ملتا تو وہ یہ تفصیل جو ایک خط کی صورت میں ہوتی تھی آگے کی طرف روانہ کر دی جاتی تھی۔
فادر ولیم نے اپنے خط یا رپورٹ میں کچھ اور باتوں کا اضافہ کیا اور کاغذ لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا۔ بارکتش کے آنے کی فادرولیم کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ یہ رپورٹ بھیج کر وہ الرہا سے کچھ دنوں کے لیے باہر بھی جا سکتا تھا۔
پھر صبح کے دھندلکے میں بارکتش اور فادرولیم ایک دوسرے سے ملے۔
بارکتش نے مسکرا کے کہا۔ ''میں فادرولیم کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہوں۔''
''وقت ضائع نہ کرو بارکتش! کچھ آقائے محترم کے بارے میں بتاؤ'' جعفر نے آہستہ سے کہا۔
بارکتش نے بتایا۔ ''آقا بالکل خیریت سے ہیں اور دیار بکر میں قیامت برپا کیے ہوئے ہیں۔ تمام امیروں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور ہمارے زنگی آقا کی پناہ میں ہیں۔''
''فتوحات مبارک ہوں بارکتش!'' یہ کہتے ہوئے فادرولیم نے رپورٹ بارکتش کے حوالے کر دی۔ بارکتش نے رپورٹ سنبھال کے اندر کی جیب میں رکھ لی اور پھر کہا۔
''ایک دلچسپ خبر ہے۔ سنو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔''

''ضرور سناؤ۔ میں تو کسی اہم خبر کی تلاش میں ہوں۔''

''خبر یہ ہے کہ ہمارے امیر کے حرم میں آرمینیا کی ایک شہزادی کا......'' اور بارکتش کہتے کہتے رک گیا۔

فادر ولیم نے اسے حیران نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''خبر تو دلچسپ ہے مگر یہ ہمارے امیر کو کیا سوجھی؟ ان کی عمر ساٹھ سے اوپر ہے اور دو بیٹے جوان ہو چکے ہیں۔''

''آقا کی باتیں آقا ہی جانیں۔'' بارکتش نے منہ بنایا۔ ''ان کی چالوں کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ کسی کو تہہ تیغ کرتے ہیں تو کسی کو پہلو میں بٹھاتے ہیں۔ یہ بھی ایک سیاسی شادی ہے۔ والی آرمینیا خودسری پر آمادہ تھا۔ امیر نے اسے تلوار سے زیر کرنے کی بجائے اس کی بیٹی کے لیے اپنا پیغام بھیج دیا اور والی آرمینیا مع اپنی بیٹی کے امیر کا ہمیشہ کے لیے حلقہ بگوش ہو گیا۔

فادر ولیم سر ہلا کے بولا۔ ''امیر جس قدر سخت دل ہیں اتنے ہی نرم دل بھی ہیں۔ میدان جنگ میں بھی ان کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ میں نے کئی کمزور حکمرانوں کو گلے لگاتے دیکھا ہے اور کئی خودسروں کا سر قلم کرتے بھی دیکھا ہے۔ ایسے عالی دماغ اور شہ زور حکمران کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔ خدا امیر کو سلامت رکھے۔''

فادر ولیم یعنی جعفر نے امیر کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ ایک تاریخی حقیقت تھی جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اب صبح کی روشنی ابھرنا شروع ہو گئی تھی۔ بارکتش نے فکرمند لہجے میں کہا۔ ''کوئی پیغام دینا ہے امیر کو؟''

''میں نے سب کچھ اس رپورٹ میں لکھ دیا ہے۔'' ولیم نے جواب دیا۔ ''ہاں! امیر نے کوئی حکم دیا ہو تو بتاؤ۔''

''تمہارے لیے یہی حکم ہے کہ تم تاحکم ثانی الرہا میں ہی رہو گے۔''

''تمہارا دوسرا چکر کب لگے گا؟''

''یہ بات میرے اختیار میں نہیں۔''

فادر ولیم نے اسے بتایا۔ ''میں شاید یہ جگہ چھوڑ دوں۔'' پھر سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

''فادر ولیم کسی جگہ بھی رہے مگر اس کا پتا یہیں سے ملے گا۔ سرائے کا مالک تمہارے فادر ولیم کا بہت معتقد ہے۔ تمہیں اس سے میرا پتا معلوم ہو جائے گا۔''

''فادر ولیم!......'' بارکتش مسکرایا۔ ''میں تمہیں نہیں پہچان سکا تھا۔

دوسرے دن شام کے وقت بارکتش کا قافلہ اسے لے کر آگے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب اسے ترن کوزی کو تلاش کرنے کے لیے کافی وقت مل گیا تھا۔ اب تو وہ لارنس سے بھی ملنے کا خطرہ مول لے سکتا تھا۔

چنانچہ دوسرے دن اس نے بڑے گرجا کا رخ کیا۔ گرجے کی چہار دیواری کے اندر لوگوں کا ہجوم تھا اور درجنوں پادری ادھر ادھر پھرتے نظر آ رہے تھے۔ پس فادر ولیم بھی ان میں شامل ہو گیا اور لارنس کو ڈھونڈنے لگا۔

لارنس ایک عشرت پسند انسان تھا۔ اس لیے فادر اسے ڈھونڈنے بڑے گرجا گھر میں آئے تھے۔ انہیں یہاں آ کے مایوسی نہیں ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی لارنس انہیں نظر آ گیا۔ فادر ولیم بڑھ کے اس کے برابر پہنچ گئے۔ انہوں نے نرمی سے کہا۔

''نیک بیٹے! میری مدد کرو۔''

لارنس کے قدم اس آواز پر رک گئے۔ پھر وہ فادر ولیم کے برابر آ گیا۔ ''فرمایئے فادر! میں آپ کی

کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''بیٹے! کیا تمہارا تعلق اسی عبادت گاہ سے ہے؟'' فادر ولیم نے سوال کیا۔

''جی...... یہی سمجھ لیجیے۔'' لارنس نے مختصر جواب دیا۔ ''آپ اس شہر میں اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔''

''تم نے ٹھیک اندازہ لگایا بیٹے!'' فادر ولیم بولے۔ ''مجھے دراصل بعلبک کے فادر فلپ کی تلاش ہے۔''

فادر فلپ کے نام پر لارنس کے کان کھڑے ہو گئے مگر اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا اور یوں بن گیا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ دوسری طرف فادر ولیم محتاط ہونے کے باوجود لارنس کو اعتماد میں لینے کے لیے کہہ رہے تھے۔

''میں فادر فلپ کی تلاش میں دمشق سے بعلبک پہنچا تھا مگر وہاں کے تمام عبادت خانے برباد ہو گئے ہیں۔ وہاں مجھے بتایا گیا کہ فادر فلپ بعلبک چھوڑ کر الرہا میں آباد ہوئے ہیں۔ میں ایک ہفتہ سے سرگرداں ہوں مگر مجھے کسی عبادت خانے سے بھی ان کا اتا پتا نہ معلوم ہو سکا۔''

لارنس تذبذب میں گرفتار ہو گیا۔ آخر اس نے پوچھا۔ ''فادر!...... کیا فادر فلپ سے آپ کی عزیز داری ہے؟''

''میرے بیٹے! قریبی تعلق، رشتہ داری اور عزیز داری سے زیادہ بلند ہوتا ہے۔'' فادر ولیم نے بے پروائی سے جواب دیا۔ حالانکہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ لارنس اسے شبہ کی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ ''فادر فلپ مجھ ناچیز کے بزرگ اور رہنما ہیں۔ میں جب بھی شمال کا سفر اختیار کرتا ہوں تو بعلبک کی عبادت گاہ کو نہیں بھولتا۔ فادر فلپ کے مشفقانہ سلوک اور احسانات کو میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔''

لارنس کو شاید کچھ اطمینان ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے کہا۔

''فادر ولیم! آپ فادر فلپ سے ملنا چاہتے ہیں مگر وہ ابھی تک یہاں نہیں پہنچے۔''

''یہ تو میں جانتا ہوں بیٹے!'' فادر ولیم نے سنجیدگی سے کہا۔ ''سوال یہ ہے کہ وہ ہیں کہاں؟ بعلبک کی تباہی کو ایک سال ہونے کو آیا ہے۔ پھر وہ راستے میں کہاں رہ گئے۔''

''وہ اس وقت تل باشر میں ہیں فادر!'' لارنس نے آخر بتا دیا۔

''تل باشر؟'' ولیم پریشان ہو گیا۔ ''مگر تم یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ تل باشر میں ہیں؟''

''میرا نام لارنس ہے اور میں ان کا قریبی عزیز ہوں فادر۔''

''اچھا تو تم فادر فلپ کے عزیز ہو۔'' فادر ولیم نے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔

''خداوند یسوع مسیح کی تم پر رحمت ہو۔ تمہاری صورت بھی کچھ کچھ فادر فلپ سے ملتی ہے۔ تمہارا رابطہ تو فادر فلپ سے ضرور ہو گا۔''

''اب تو نہیں ہے۔'' لارنس نے انکشاف کیا۔ ''میں کچھ دن پہلے ان سے تل باشر میں ملا تھا۔''

''کیا انہوں نے تم سے کہا تھا کہ وہ الرہا آئیں گے؟'' فادر ولیم نے بے چینی سے پوچھا۔

''میں نے ان سے عہد لیا تھا کہ وہ جلد از جلد الرہا پہنچ جائیں۔'' لارنس نے بتایا۔

فادر ولیم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''لارنس تمہارا کیا خیال ہے کہ میں یہاں ٹھہر کر فادر فلپ کا انتظار کروں یا تل باشر چلا جاؤں۔ میں ادھر آیا ہوں تو چاہتا ہوں کہ فادر فلپ سے مل لوں۔''

لارنس نے اداس لہجے میں جواب دیا۔ ''میں تو

یہی کہوں گا کہ آپ بھی ان کا انتظار کریں۔ میں خود ان کے لیے بے چین ہوں۔''

''کیا کوئی خاص بات ہے؟'' ولیم نے اسے ٹٹولا مگر فوراً بات پلیٹ دی۔ ''مگر یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے اور کسی کے ذاتی معاملات میں دخل دینا میں درست نہیں سمجھتا۔''

''مگر فادر...... میں سمجھتا ہوں کہ یسوع مسیح نے آپ کو میری مدد کے لیے بھیجا ہے۔'' لارنس نے جذبات سے پر لہجے میں کہا۔

''یہ تو تمہارا خلوص ہے لارنس۔'' فادر ولیم نے اسے سہارا دیا۔ ''اگر تم کچھ بتاؤ تو میں شاید تمہاری مدد کر سکوں۔''

''لارنس ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''فادر! آپ نے کہا تھا کہ فادر فلپ آپ کے رہنما ہیں۔''

''ہاں ہاں، اس میں شک ہی کیا ہے۔'' فادر ولیم نے پورے وثوق کے ساتھ جواب دیا۔

''فادر فلپ آپ کی بات بھی مانتے ہوں گے۔'' لارنس نے زیادہ جذباتی لہجے میں پوچھا۔

''لارنس! میں نے آج تک فادر فلپ سے اپنے لیے کچھ نہیں مانگا۔ مگر دوسروں کے لیے دعائیں اور سفارشیں ضرور کرائی ہیں۔'' فادر ولیم نے لارنس کو جیسے پوری تسلی دی۔

''تو کیا آپ ایک سفارش میرے لیے بھی کرا دیں گے؟'' یہ کہہ کر لارنس بڑی امیدوں سے فادر ولیم کا منہ دیکھنے لگا۔

''لارنس! تم اس قدر اظہار انکساری کیوں کر رہے ہو؟'' فادر ولیم نے اسے دوبارہ تسلی دی۔ ''تم تو میرے اپنے ہو۔ میں تمہاری سفارش کیوں نہیں کروں گا؟ صرف سفارش ہی نہیں بلکہ پوری کوشش کروں گا۔ بتاؤ تمہیں فادر فلپ سے کیا کام ہے؟''

''فادر! آپ کو معلوم ہے ان کی ایک جوان لڑکی ہے۔'' لارنس نے کھلنا شروع کیا۔

فادر ولیم نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھا جیسے وہ ذہن پر زور دے رہا ہو۔ پھر سنبھل کر بولا۔ ''جوان لڑکی کو تو میں نہیں جانتا۔ مگر ایک پیاری سی بچی ضرور ان کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔''

''وہ بچی اب جوان ہوگئی ہے فادر!'' لارنس نے لہک کے کہا۔ ''اس کا نام ترن کوزی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ اب یاد آیا۔ فادر فلپ اسے کوزی کوزی کہہ کر پکارتے تھے۔'' فادر ولیم مسکرایا۔ ''وہ بچی اب جوان ہوگئی ہے اور ہمارا بیٹا اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ کیوں لارنس! ہمارا اندازہ غلط ہے کیا؟''

''غلط نہیں بلکہ بالکل درست ہے فادر!'' لارنس نے قدرے شرما کر سر جھکا لیا۔

''فکر نہ کرو لارنس! میں فادر فلپ سے تمہاری خواہش بیان کروں گا اور سفارش بھی کروں گا۔''

فادر ولیم نے کہنے کو تو کہہ دیا مگر یہ کہتے وقت جیسے اس کے دل پر چھریاں چل گئیں۔ اس کے سینے میں آگ سی لگ گئی تھی۔

اسی وقت لارنس نے افسردگی سے بتایا۔ ''فادر! شادی سے انکار ہو گیا ہے۔''

''کس نے انکار کیا ہے؟'' فادر ولیم نے دل پر جبر کر کے پوچھا۔ ''میں فادر فلپ کو راضی کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔''

''مگر فادر ولیم! انکار فادر فلپ نے نہیں بلکہ خود ترن کوزی نے کیا ہے۔'' لارنس اپنا خشک گلا سہلانے لگا۔

فادر ولیم نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر بولے۔ ''وہ بچی ہے۔ میں اس سے کہوں گا کہ تم سے بہتر اسے اور کون مل سکتا ہے؟''

''فادر......'' لارنس نے بڑی محبت سے فادر ولیم کے ہاتھ چوم لیے۔

''فکر کی ضرورت نہیں لارنس۔'' فادر ولیم نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ ''بس یوں سمجھو کہ تمہارا کام بن گیا۔ میں فادر فلپ سے ملاقات کرتے ہی تمہارے لیے ترن کوزی کو مانگ لوں گا۔''

لارنس شرمایا لجایا جارہا تھا جیسے وہ واقعی دلہا بن گیا ہو۔ اس نے شکر گزار نظروں سے فادر ولیم کو دیکھا اور بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

''فادر! میں تو بالکل ناامید ہو گیا تھا۔ آپ نے مجھے سہارا دیا تو مجھے یوں لگا جیسے میری زندگی کی روٹھی ہوئی بہاریں واپس آرہی ہیں۔ میں پہلے ہی بہت بد قسمت ہوں۔ نہ ماں، نہ باپ......میرا پورا بچپن فادر فلپ کی گود میں گزرا ہے مگر میں نے ان کی باتوں سے کوئی نصیحت نہیں پکڑی۔ بری صحبت نے مجھے تباہ کر دیا۔ پھر فادر فلپ نے بھی مجھے اپنے سے الگ کر دیا۔''

لارنس اپنی داستان سنارہا تھا اور فادر ولیم اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ آخر اس نے ترن کوزی کو ڈھونڈ نکالا۔ اس کی جانِ حیات تل باشر میں تھی اور تل باشر کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ اس وقت وہ فارغ ہی تھا۔ امیر زنگی کو اس نے ضروری اطلاعات بھجوادی تھیں اس لیے وہ کچھ دنوں کے لیے الرہا سے غیر حاضر بھی رہ سکتا تھا۔ لارنس کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ ترن کوزی اب تک اس کے انتظار میں ہے، ورنہ وہ لارنس سے انکار کیوں کرتی۔''

لارنس کی نظر فادر ولیم پر پڑی تو اس نے گھبرا کے پوچھا۔

''فادر!......آپ کیا سوچنے لگے؟''

''میں تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔'' فادر ولیم نے مسکرا کے کہا۔ ''فادر فلپ میری بات مانتے ہیں۔ میں اس نادان لڑکی سے پوچھوں گا کہ اسے کیا ہوا؟ اس نے تم سے شادی کرنے سے کیوں انکار کر دیا۔'' یہ کہتے ہوئے ولیم نے چور نظروں سے لارنس کو دیکھا مگر لارنس اس وقت گم صم کھڑا فضاؤں میں گھور رہا تھا۔ لارنس کی طرف سے جواب نہ پا کر فادر ولیم نے ایک بار پھر لارنس کو تسلی دی۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں لارنس، میں عورت کی فطرت سے واقف ہوں۔ تم بالکل بے فکر رہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں فادر۔'' لارنس فادر ولیم کی ہمدردی میں بچھا جارہا تھا۔

''تم کہیں جارہے تھے لارنس۔'' ولیم نے اسے یاد دلایا۔

''کوئی بات نہیں فادر......'' لارنس نے مسکین لہجے میں کہا۔ ''آپ کی ملاقات سے اہم کوئی چیز نہیں۔''

''نہیں، نہیں۔ تم اپنے کام پر جاؤ۔ میں بھی ذرا گھوم پھر لوں۔'' ولیم نے اسے ٹالنے کی دوبارہ کوشش کی۔

''پھر کب ملاقات ہوگی فادر؟'' لارنس نے ایک دم سوال کیا۔

''ملاقات......؟'' ولیم سوچ میں پڑ گیا۔

''میرا مطلب ہے میں خود آپ سے ملاقات کے لیے آؤں گا۔'' لارنس نے کہا۔ ''آپ کس جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔''

ولیم اس سوال پر بوکھلا گیا۔ وہ کیا بتاتا کہ کہاں ٹھہرا ہے۔ اگر سرائے کا نام بتاتا تو لارنس وہاں چوبیس گھنٹے پڑاؤ ڈالے رکھتا اور اس کے تمام منصوبے خاک میں

مل جاتے۔
آخر ولیم کو کوئی جواب تو دینا ہی تھا۔ پس اس نے کہا۔ ''بیٹے! ہمارا ٹھکانہ کیا پوچھتے ہو۔ ہم تو بے ٹھکانہ لوگ ہیں۔ جہاں شام ہوئی وہیں پڑے رہے۔ الرہا میں یوں بھی عبادت خانوں کی کمی نہیں۔ جہاں جاتا ہوں لوگ عزت سے ملتے ہیں۔''
''فادر! اگر کوئی حرج نہ ہو تو آپ میرے پاس آ جایئے۔'' لارنس نے فوراً پیش کش کی۔ ''میرے پاس ایک کمرہ نہیں بلکہ بڑا ہال ہے۔ نہایت آرام دہ اور کشادہ۔''
فادر ولیم کے لیے اس پیش کش کو قبول کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے نہایت پیار سے کہا۔
''لارنس! تم اڑتے پرندے کو سونے کے پنجرے میں قید کرنا چاہتے ہو۔ نہ بیٹے نہ۔ مجھے ایسا آرام نہیں چاہیے۔''
لارنس نے ولیم کو رام کرنے کے لیے کہا۔
''مگر فادر! کس کو پتا ہے کہ فادر فلپ الرہا کب پہنچیں گے۔ یہاں آپ کو زیادہ آرام ملے گا۔''
''تمہارے ہی پاس رہوں گا لارنس مگر کبھی کبھی۔''
فادر ولیم نے خطرہ مول نہیں لیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔
''مگر آپ جائیں گے کہاں؟'' لارنس نے بڑے پیار سے پوچھا۔
فادر ولیم کو یہ معلوم ہوتے ہی کہ ان کی جانِ آرزو تل باشر میں ہے۔ اس نے وہاں جانے کا فوراً فیصلہ کرلیا۔ اس دن ایک قافلہ تل باشر روانہ ہو رہا تھا۔ پس ولیم اس قافلے میں شامل ہو گیا۔ مشہور ہے کہ جب بات بنتی ہے تو بنتی ہی چلی جاتی ہے۔ فادر ولیم تل باشر میں داخل ہوا تو اسے تقدیر نے ایک اور تماشہ دکھایا۔ اسے ترن کوزی کی تلاش تھی اور ترن کوزی اس کے سامنے اس طرح آ گئی جیسے اسے ولیم کے آنے کی خبر پہلے ہی مل گئی ہو۔ ترن کوزی اس سڑک پر چل رہی تھی جس پر ولیم کا قافلہ رواں دواں تھا۔ ان دونوں کے درمیان دس فٹ سے زیادہ کا فاصلہ نہ تھا۔
ولیم کا دل سینے میں اچھلنے لگا۔ وہ واقعی ترن کوزی ہی تھی۔ اس کی محبوبہ۔ اس کی امیدوں کا مرکز۔ وہی چال، وہی رفتار، چہرے پر وہی سنجیدگی۔ ترن کوزی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں گم آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی۔ ادھر ولیم بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ دوڑ کر ترن کوزی کو پکڑ لے لیکن اس طرح وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو سکتا تھا۔
اب قافلہ چلتے چلتے گرجا گھر کے سامنے رک گیا۔
''اس عبادت خانے کا نام کیا ہے؟'' ولیم نے اپنے ساتھ چلنے والے ایک ساتھی سے پوچھا۔
اجنبی ساتھی نے اسے حیرانی سے دیکھا اور بولا۔
''فادر! آپ شاید پہلی مرتبہ یہاں آئے ہیں۔''
''تمہارا خیال درست ہے بیٹے۔ تل باشر میرے لیے بالکل اجنبی شہر ہے۔''
اور پھر جب اس اجنبی نے اس کلیسا کا نام بتایا تو فادر ولیم کے قدم ایک دم رک گئے۔
''کیا ہوا فادر...... آپ ایک دم کیوں رک گئے؟'' ان کے ساتھی نے پوچھا۔
''مجھے اسی کلیسا میں جانا ہے بیٹا۔ الرہا میں مجھے یہی نام بتایا گیا تھا۔'' ولیم نے اسے جواب دیا۔
اسی وقت فادر ولیم نے دیکھا کہ ترن کوزی سڑک چھوڑ کر ایک پگڈنڈی پر ہو گئی ہے جو سیدھی کلیسا کو جا رہی تھی۔ ولیم نے قدم روک لیے اور ساتھی سے کہا۔

ایمانداری

ویسے تو تقسیم ہند کے وقت پنجاب و بنگال میں درندگی اور وحشت کے ایسے ایسے شرمناک اور المناک واقعات رونما ہوئے کہ پوری انسانیت لرز اٹھی پھر مغربی پنجاب کی تقسیم نے وحشت اور ظلم کے نئے ریکارڈ قائم کر دیئے۔ جنون، دیوانگی، وحشت اور پاگل پن کا رقص جاری تھا۔ اسی دوران لوگوں نے جو فرشتہ سیرت تھے، بلا لحاظ مذہب و ملت کے اپنی جان پر کھیل کر اہل وطن کو اپنے گھروں تک پہنچانے میں عظیم کردار ادا کیا۔

ایسے وقت میں حکومت وقت نے 1947ء اگست اور بعد میں لاہور کے قریب والٹن میں بہت بڑا کیمپ مہاجراں لگایا گیا۔ لٹے پھٹے، بے حال، بے کس لوگوں کی اندرون لاہور اور دوسرے بہت سے شہروں کی الاٹ منٹ یہیں سے ہوتی تھی۔ ایسے ایسے دل گرفتہ اور مایوسی اور خاندان کے خاندان جن کے راستے میں کٹ جاتے تھے، لوگ آتے تھے کہ کیمپ کے اندر کا عملہ بھی زارو قطار رو پڑتا تھا۔ اس وقت کیمپ کے اندر کئی دفتر بنے ہوئے تھے کہ جہاں مجسٹریٹ درجہ اول، ایس ڈی ایم، اے سی، تحصیل دار عہدہ کے لوگ تعینات تھے اور یہ تمام افسران آنے والے لوگوں کی آؤ بھگت کرتے تھے بلکہ ان کے ساتھ تمام عملہ ان لوگوں کی مہمان داری، دل جوئی اور خدمت میں لگا رہتا تھا۔

ایک جہاں آباد تھا، ہزاروں لوگ یہاں سے اپنی ضرورتوں کے تحت اپنے اپنے کلیم منظور کروا کر شہر میں آباد ہوتے جاتے تھے اور ایسی ایسی مثالیں ملتی تھیں کہ انسانیت ان پر فخر کرلی تھی۔ بے یار و مددگار، اجڑے ہوئے جن کا آگے پیچھے کچھ نہ تھا ان لوگوں کی رجسٹریشن ہونے کے بعد مخیر، خدا ترس اور خدمت کے جذبے سے سرشار لوگ ان کا سہارا بنتے تھے اور ہزاروں لوگوں کا بندوبست اللہ تعالیٰ کے نیک لوگوں کے ہاتھوں ہوتا چلا جاتا تھا۔ اکثریت اس وقت اچھے لوگوں کی ہی تھی جو آہستہ آہستہ ناپید ہوئی۔

اور جب بہت سے لوگوں کو گھر الاٹ ہوئے اور وہ بے سروسامانی کی حالت میں وہاں داخل ہوئے تو اللہ سے ڈرنے والے، آخرت کی فکر کرنے والے محلہ کے تمام لوگ آتے اور چند دنوں میں وہ ویران گھر بھرپور طریقے سے بھر جاتا اور کپڑوں تک کی سپلائی آجاتی اور وہ خاندان جو اپنے پیاروں کو اپنے سامنے شہید ہوتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ انمٹ غموں پر

''اچھا بیٹا! میری منزل آگئی ہے۔ خداوند یسوع مسیح کی برکتیں تم پر نازل ہوں۔''

قبل اس کے کہ اس کا ساتھی کوئی جواب دیتا۔ ولیم قافلہ سے الگ ہوگیا اور اس پگڈنڈی پر ہولیا جس پر آگے آگے ترن کوزی جارہی تھی۔ پھر جب ولیم بالکل اس کے قریب پہنچ گیا تو ترن کوزی کو آواز دی۔

''ذرا ٹھہرو لڑکی۔''

ترن کوزی کے قدم اک دم رک گئے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور حیران رہ گئی۔

''تمہارا نام شاید ترن کوزی ہے۔'' ولیم شاید خود کو پادری ثابت کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

ترن کوزی نے اپنے سر کو ذرا سا جھٹکا دیا جیسے کوئی خواب سے بے دار ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ترن کوزی کے رخسار دہکنے لگے۔

''ارے تم...... غضب کر دیا تم نے جعفر۔'' یہ کہتے ہوئے ترن کوزی گھبرا گئی اور چاروں طرف دیکھنے لگی۔

''گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ترن کوزی۔'' جعفر نے اسے تسلی دی۔ ''مجھے اس شہر میں کوئی پہچان نہیں سکتا۔''

''مگر جعفر یہ عیسائی ریاست ہے۔ راز کھل گیا تو جان کے لالے پڑ جائیں گے۔'' ترن کوزی کی نظریں اب بھی چاروں طرف گھوم رہی تھیں اور وہ سخت گھبرائی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

''ترن! جان کی پروا ہوتی تو تمہیں ڈھونڈنے کیوں نکلتا۔'' جعفر بے پروائی سے بولا۔ ''میں کفن سر سے باندھ کے نکلا ہوں اور موت کی وادیوں سے گزر کر تم تک پہنچا ہوں۔'' جعفر کے دل میں جذبات کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ اس نے ترن کوزی کو خاموش دیکھا تو بولا۔

ان تمام چیزوں کا پھایا تھوڑا سا ئم غلط کر دیتا اور خاندان کے جوان، بڑے لوگ پھر نہ پھر کام کرنے کے قابل ہو ہی جاتے۔

ایسے کیمپ میں جہاں ظلم و ستم کی تصویر ہر وقت آنکھوں میں پھرتی اور بے حال لوگ آنکھوں کے سامنے بلکتے روتے اور پیاروں کی یاد میں بے ہوش ہو جاتے وہاں ان لوگوں کو پاکستان آزاد ملک میں پہنچنے کی خوشی بھی یہ غم ہلکے کر دیتے ہیں۔ قربانی ہی تو آزادی دلاتی ہے۔

لیکن انسان کے ساتھ ساتھ شیطان لعین بھی تو کارفرما ہے اور بہت سے لوگ کمزور ایمان کے ساتھ لوٹ مار میں بھی مشغول تھے یہ نہ صرف نئی معصوم ہجرت کرنے والوں کو دغا دیتے بلکہ الاٹمنٹ تک کا غذات ہتھیلا کر اپنے نام سے زمین مکانات، کوٹھیاں وغیرہ ہڑپ کر رہے تھے اور محسوس ہوتا تھا کہ ان لوگوں کو نہ مجبور لوگوں سے کوئی ہمدردی ہے اور نہ ہی خوف خدا اور اس طرح نہ جانے کتنے لوگوں کا حق مار دیا گیا۔

اسی جگہ جہاں لوگ مکافات عمل کو بھی بھول جاتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح؟ ندامت میں گرتے چلے جائیں گے کہ محسوس بھی نہ ہوگا اور پھر آخری وقت تو فرعون کی توبہ بھی نہ قبول کی گئی۔ اسی کیمپ میں ایک اسپیشل مجسٹریٹ بھی لوگوں کی خدمت کر رہے تھے بڑے خاندانی اور پاک صاف انسان تھے۔ انہوں نے جو یہاں طرح طرح کی غلط باتیں ہوتی تھیں بہت حد تک ختم کرنے کی کوششیں کیں، بہت سے لوگ تو الٹا انہیں ہی سنا دیتے کہ کبھی اپنی فکر کرو زیادہ وعظ نہ کرو۔ یہاں تک کہ ان کے اپنے ہم مذہب ساتھی بھی کئی ایسے تھے کہ بہتی گنگا میں خوب ہاتھ دھو رہے تھے مگر جن لوگوں کا ایمان ڈگمگایا نہیں ہوتا اور اللہ کا ہاتھ ان کے سر پر ہوا کرتا ہے۔

ایک دن چند لوگ آئے اچھے کھاتے پیتے گھرانے کے لگتے تھے۔ بزرگوں کے ساتھ تین جوان بھی تھے، ان کے پاس یعنی منظور صاحب کے پاس آئے اور کہا۔

''جناب! آپ کی اچھی شہرت سن کر حاضر ہوئے ہیں، ہجرت کرتے ہوئے تو چند دن ہو ہی گئے ہیں اب سوچا کہ اپنے کلیم بھی جمع کروا دیے جائیں۔ جناب آپ کا نام سنا تو حاضر ہو گئے۔'' جناب منظور نے کاغذات لیے اور بغور

''تم نے میرے لیے کیا سوچا ہے؟''

''میں نے سوچا تو بہت کچھ تھا مگر اب حالات بدل گئے ہیں۔'' ترن کوزی نے درد بھری آواز میں جواب دیا۔

''حالات بدل گئے ہیں کہ تم بدل گئی ہو؟'' جعفر چڑ کے بولا۔

''جعفر!...... میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔''

ترن کوزی بے چین ہو رہی تھی۔

''بعلبک اسلامی علاقہ تھا۔ میں نے بابا سے تمہارے ساتھ جانے کی اجازت بھی لے لی تھی۔ مگر یہ بعلبک نہیں ہے۔ یہ الرہا کا علاقہ ہے۔ اور یہاں شاہ جوسیلین کا ڈنکا بجتا ہے۔ ہم سرحد تک کیسے پہنچیں گے؟ کمینے لارنس نے مجھے بہت بدنام کیا ہے۔ تمہارے ساتھ اگر فرار ہوئی تو کہیں نہ کہیں ضرور پکڑی جاؤں گی۔''

''مجھے ہاں یا ناں میں جواب چاہیے۔ تم میرے لیے تکلیف نہیں اٹھا سکتیں تو کوئی بات نہیں۔ میں جیسے آیا ہوں ویسے ہی چلا جاؤں گا۔''

شاید یہ جعفر کی دھمکی تھی۔ ترن کوزی تڑپ اٹھی۔

''تم مجھے بزدل سمجھتے ہو۔ بے وفائی کا الزام لگا رہے ہو؟''

جعفر نے سنا۔ مگر کوئی جواب نہیں دیا۔

''میں تم سے پھر بات کروں گی۔'' ترن کوزی نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

پھر ترن کوزی جعفر کو اپنی ایک سہیلی کے پاس لے گئی۔

''ششی! تم جعفر کا خیال رکھنا اور انہیں باہر نہ جانے دینا۔'' یہ تاکید کر کے ترن کوزی باہر چلی گئی۔

جعفر کو ایک جائے پناہ تو مل گئی تھی مگر وہ گھبرایا ہوا تھا۔

''تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو۔'' ششی نے جعفر کو تسلی دی۔ ''میں تمہارے ناشتے کا انتظام کرنے جا رہی

مطالعہ کرنے کے بعد کہا۔
"آپ لوگ دو دن کے بعد تشریف لائیے گا' ان شاء اللہ کلیم پاس ہو جائے گا۔"
وہ لوگ دو دن کے بعد حاضر ہو گئے' منظور صاحب نے کاغذات مکمل کروا لیے تھے اور تصدیق بھی ہو گئی تھی۔ امیر لوگ تھے بہر حال شاہ عالمی کے رہائشی علاقے میں بڑی سی حویلی (8 کمروں والی) اور ساتھ ایک اور مکان (9 کمروں والا) الاٹ ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی دو کارخانے اور تقریباً دو مربع زمین بھی ان کے حصے میں لائی گئی۔ سب لوگ بے حد خوش تھے اور منظور صاحب کے بے حد مشکور تھے۔
منظور صاحب نے کہا کہ آپ لوگوں کے جانے کے بعد اس دن کچھ اور صاحبان بھی آئے تھے اور آپ سے بھی بڑا کاروبار تھا اور 20,20 کمروں والی کئی حویلیوں کے مالک تھے۔ بہر حال مجھے مشکوک سلسلہ لگا اور وہ کلیم لینے سے انکار کر دیا تھا ان لوگوں نے بھی تصدیق کی کہ یہ تو چھوٹے سے کاروباری تھے اور بس۔
دوسرے لوگوں نے کھانے کھلانے والے افسران سے کلیم تقریباً 80 فی صد پاس کروالیا۔ اب اتفاق یہ ہوا کہ ان لوگوں کو چھ چھ کمروں کا گھر ملا وہ شاہ عالمی میں پہلے والوں کے ساتھ ہی ملا۔ یہ حویلی نما گھر پرانا تھا اور مرمت طلب بھی تھا۔
تقریباً ایک ماہ کے بعد منظور صاحب کے پاس وہ لوگ آئے جن کا کلیم انہوں نے محنت سے اور پورا تقریباً پاس کروایا تھا۔ وہ بزرگوں اور بیٹوں کے ساتھ تھے۔ بیٹھے اور گرمجوشی سے ملے۔ ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ اپنا اندرونی جوش قابو کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہے' چائے وغیرہ کے بعد منظور صاحب نے پوچھا۔
"جی شاہ صاحب کیسے آنا ہوا' کیوں تکلیف کی؟ کوئی مسئلہ پیدا ہوا ہو تو بتائیں تا کہ حل کیا جا سکے؟"
شاہ صاحب بولے۔ "جناب آپ کے احسانات پہلے ہی بہت ہیں' کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بڑی راز داری والی بات

ہوں۔ ہاں تم باہر نکلنے کی کوشش نہ کرنا۔ شاہ جوسیلین الرہا تشریف لا رہے ہیں۔"
جعفر کے دل میں پنکھے لگے ہوئے تھے۔ اسے کسی پہلو چین نہ آ رہا تھا۔ شاہ جوسیلین کے آنے کی خبر اس پر ایک اور بجلی بن کر گری تھی۔ وہ الرہا سے چند دن کے لیے اس لیے آیا تھا کہ ترن کوزی کا پتہ لگائے گا اور اگر وہ مل گئی تو "تجدید محبت" کرے گا مگر اب سارا عشق رفو چکر ہو گیا تھا۔ جعفر نے سامنے کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے امیر زنگی اس کے سامنے کھڑا کہہ رہا ہے۔
"او نمک حرام! تجھے الرہا بھیجا تھا کہ وہاں کے حالات سے برابر مطلع کرتا رہے مگر تو ایک لڑکی کے عشق میں اپنا فرض بھول گیا۔ الرہا کی مضبوط چوکی اپنے حکمران سے خالی ہو رہی ہے اور تو اپنی محبوبہ سے شادی رچانے کے چکر میں ہے۔ تجھے اس کا اندازہ نہیں کہ جوسیلین کی الرہا سے غیر حاضری تیرے آقا کے لیے کس قدر خوش کن خبر ہو سکتی ہے۔ اپنے فرض کو پہچان۔ محبوبہ چھوٹ کر پھر مل سکتی ہے۔ مگر الرہا دوبارہ خالی نہیں ہو سکتا۔ فوراً اپنے مالک کے پاس پہنچ اور کہہ۔ "اے میرے امیر! وہ وقت آ گیا ہے کہ جس کا مسلمان ایک سو سال سے انتظار کر رہے تھے۔ سو سال پہلے عیسائیوں نے الرہا کی مسلم ریاست میں مسلمانوں کا جس قدر خون بہایا تھا اس کا انتقام لینے کا وقت آ گیا ہے۔ آج الرہا میں کوئی مسجد نہیں۔ کوئی مدرسہ نہیں، کوئی خانقاہ نہیں۔ کسی طرف سے بھی "اللہ اکبر" کی صدا بلند نہیں ہوتی۔ الرہا کی مٹی میں دبی ہوئی مسلمانوں کی ہڈیاں تیرے امیر کو آوازیں دے رہی ہیں۔"
جعفر کو جذبات اور خیالات کا طوفان گھیرے ہوئے تھا۔ ایک طرف ترن کوزی کی محبت اس کے پیروں سے لپٹی جا رہی تھی تو دوسری طرف فرض کی پکار اس کے دل و دماغ میں ہتھوڑے چلا رہی تھی۔ جعفر نے سر کو زور سے جھٹکا دیا اور ترن کوزی کی محبت کو کچلتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے سوچا کہ دنیا اور دنیا والوں کی

ہے اور آپ کو بتانے آئے ہیں کہ 9,8 کمروں والی حویلی جو الاٹ ہوئی تھی ہم لوگوں نے اس کی مرمت کروانی شروع کی ہوئی ہے آخر میں نسبتاً چھوٹا کمرہ ہے اس کے فرش کو ہم نے اکھیڑنا شروع کیا تا کہ باقی کمروں کی طرح اس میں بھی بہترین سیمنٹ کے نقش و نگار والا فرش کروا سکیں۔ ہم نے کھدائی کے لیے نہایت ایماندار اور نیک لوگ لگائے ہوئے ہیں۔ میں بیٹھا تھا بڑے کمرے میں کہ میرا بیٹا آ کر جوش میں مجھے لے کر کمرے کی طرف چل پڑا کہ وہاں دونوں مزدوروں نے کہا کہ کھدائی کرتے ہوئے یہ دیگ ملی ہے اور آپ کے بیٹے نے جب دیکھا تو وہ سونے کی اینٹوں سے بھری پڑی تھی۔ خیر ہم نے یہ خبر سب سے چھپائی اور آج آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں کہ یہ کروڑوں کی مالیت والی دیگ میں ہم نے صاف صاف آدھا حصہ آپ کا رکھ دیا ہے۔ ہمیں حکم دیں ہم کب یہ آپ کے گھر پہنچا دیں۔'' منظور صاحب کو تو جیسے شاک لگا' بولے۔

''شاہ صاحب تو بہ نعوذ باللہ! آپ کے نام کی چیز' آپ کو سرکاری اور ہر طرح سے حوالے کر دی گئی تھی۔ یہ تو آپ لوگوں کی خوش قسمتی ہے جس کو اللہ دے۔'' شاہ صاحب اور بیٹوں نے بڑی منت کی' اصرار کیا اور کہا۔

''ہم گھر جائیں گے ہی نہیں جب تک آپ ہاں نہ کریں۔'' آخر کار منظور صاحب اس شرط پر مانے کہ جو حصہ بھی میرا آپ سمجھتے ہیں بنتا ہے وہ یتیم خانوں اور طالب علموں کو دے دیا جائے۔ شاہ صاحب لوگ حیران ہو کر اس پیکر جود و سخا کو دیکھتے رہے آخر ہامی بھر کے چلے آئے۔

دوسری طرف ان کا پڑوسی لالچ میں آ کر چھوٹے کلیم کی حفاظت بھی نہ کر سکا اور کچھ عرصہ کے بعد جوان اولاد نے اپنے والد کو بے گھر کر دیا اور تمام جائیداد بیچ کر جھگڑوں میں اڑانی شروع کر دی' آخر بے ایمانی اور حرام کی چیز تو بے دردی سے ہی اڑا دی جاتی ہے۔

ادھر شاہ صاحب اور ان کا گھرانا صحیح معنوں میں نیک نام رہا تھا' ان کا رابطہ منظور صاحب سے مضبوط ہو گیا۔ چند سالوں کے بعد حکومت نے منظور صاحب کو بطور سفیر لگا دیا اور ان کے بیٹے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہو گئے۔ انتہائی آسودہ زندگی گزارنے لگے۔

صحیح ہے کہ لالچ کا انجام بُرا' حرام اور ناجائز حصول دولت آخر کار گلے کا ہار بن کر ڈس لیتا ہے۔ اس طرح کی نہ جانے کتنی مثالیں ہوں گی' اللہ حفاظت میں رکھے۔

جاوید احمد صدیقی

محبت تو آنی جانی چیز ہے۔ اس سے دل لگانا ریت کی دیوار کھڑی کرنے کے مترادف ہے۔ وقت لوٹ کر نہیں آیا کرتا اور نہ وقت کسی کا انتظار کرتا ہے۔ آج اگر یہ موقع گنوا دیا تو عمر بھر پچھتائے گا اور تیرا ضمیر ہمیشہ ملامت کرتا رہے گا۔ پھر تیری آنکھ اپنے امیر کے سامنے کبھی نہ اٹھ سکے گی۔

جعفر پادریوں کا چوغہ سنبھالتا ہوا دروازے کے پاس آیا۔ اس نے درز سے جھانکا۔ ششی اس کا ناشتہ بنا رہی تھی۔ اس کے ارادے ایک دم متزلزل ہو گئے۔ ناشتہ کیے بغیر اس کا باہر نکلنا ممکن نہ تھا۔ ششی اندر آئی تو اس نے ناشتہ جعفر کے آگے لگا دیا اور وہ کھانا زہر مار کرنے لگا۔ اس نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا کہیں جانے کا ارادہ ہے؟'' ششی نے گھبرا کے سوال کیا۔

''ارادے اپنے اختیار میں نہیں ہوتے ششی۔'' جعفر نے کہا۔ ''میں ذرا سرائے تک جا رہا ہوں۔ میرے ساتھی انتظار کر رہے ہوں گے۔ انہیں مطمئن کر کے ابھی واپس آ جاؤں گا۔'' اتنا کہہ کر جعفر باہر نکل گیا۔

جعفر سرائے پہنچا۔ وہاں شاہ جوسیلین کی آمد کا اعلان ہو چکا تھا۔ ہر شخص اس کے استقبال کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ جعفر جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس نے سرائے سے معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ ایک قافلہ اسی وقت الرہا روانہ ہو رہا ہے جعفر آج ہی الرہا سے آیا تھا اور اسے آج ہی واپس جا

بڑ رہا تھا۔ اسے جلد از جلد ''عمید'' پہنچ کر امیر زنگی کو یہ خبر سنانا تھی کہ شاہ جوسیلین اس وقت الرہا چھوڑ کر گرمیاں گزارنے تل باشر جا رہا ہے۔

جعفر کو جس قدر جلدی تھی اسی قدر راستے دیر ہو رہی تھی۔ کیونکہ پوری سڑک کو شاہ جوسیلین کے ہراول دستے گھیرے ہوئے تھے۔ شاہ جوسیلین کا جلوس ان راستوں سے بہت پیچھے تھا۔ جعفر کو مجبوراً سڑک چھوڑنا پڑی۔ پھر شام کے وقت شاہی جلوس نمودار ہوا۔ زرق برق لباس میں شاہی باڈی گارڈ پرچم اٹھائے اور ڈھول تاشے بجاتے آگے آگے چل رہے تھے۔ ان کے پیچھے چار گھوڑوں والا شاہی رتھ تھا۔ گھوڑوں کے ساز چاندی اور سونے کی چمک سے جگمگا رہے تھے۔

شاہ جوسیلین رتھ میں اکیلا تھا۔ دونوں طرف پائیدان پر اس کے جنرل تلواریں بلند کیے کھڑے تھے۔ رتھ کے اوپر ایک زرنگار سائبان آویزاں تھا۔ شاہی بیگمات کی سواریاں شاہ کے رتھ کے پیچھے تھیں۔ پھر ان کے پیچھے وہ چاق و چوبند فوجی دستے تھے جن پر شاہ کو بڑا ناز تھا۔ اس پورے جلوس کے گزر جانے پر ہی الرہا جانے والے قافلہ کو روانگی کی اجازت ملی۔

جعفر نے اب اس قافلہ کو چھوڑ دیا تھا۔ اس کا رخ سیدھا قلعہ عمید کی طرف تھا جہاں اس کا امیر محاصرہ کیے ہوئے مقیم تھا۔

جعفر تیز گھوڑا بھگا رہا تھا اور جلد از جلد عمید پہنچنا چاہتا تھا۔ مسلم علاقے میں پہنچ کر اس نے اپنا چوغہ اتار دیا اور اب وہ ایک مسلمان سوار کے لباس میں اپنے مرکب پر بیٹھا آگے بڑھ رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا اور جعفر مع اپنے گھوڑے کے پسینے میں نہا گیا تھا۔ پھر بھی وہ گھوڑا معمولی رفتار سے بھگاتا ہوا امیر زنگی کے خیمے کے سامنے پہنچ گیا۔

امیر کے پہرے دار نے جعفر کو گھوڑے سے اترتے دیکھ کر اندر جا کر امیر کو اس کے آنے کی اطلاع دی۔ امیر جعفر کا نام سن کر غصہ سے بلبلا اٹھا۔ پہرے دار کو جواب دینے کی بجائے وہ تلوار بے نیام کرتے ہوئے خیمہ سے باہر آ گیا۔

جعفر نے امیر کو ادب سے سلام کیا۔

امیر زنگی جواب میں شیر کی طرح دہاڑا۔

''او بدذات! تجھے اپنے امیر کے سامنے آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ کیا تو عمادالدین کا قہر و جلال بھول گیا تھا؟''

''غلام کا سر حاضر ہے آقا......'' جعفر نے بے تکلف سر جھکا دیا۔

''او نابکار...... یہ بتا تجھے ہماری اجازت کے بغیر اپنا مقام چھوڑنے کی جرأت کیسے ہوئی؟'' امیر کا غصہ کچھ اور تیز ہو گیا تھا۔

''غلام اس گستاخی کے لیے موت کا سزا وار ہے۔'' جعفر نے بڑی جرأت سے جواب دیا۔ ''مگر میرا سر قلم کرنے سے پہلے مجھے وہ خبر سنانے کی اجازت دی جائے جس نے مجھے میرے امیر کی حکم عدولی پر مجبور کیا ہے۔''

اسی وقت امیر زنگی کے سپہ سالار شیرکوہ نے دخل دیتے ہوئے جعفر سے کہا۔ ''او نادان! اپنی بے وقت کی موت کو آواز نہ دے اور جلد وہ بات بتا جس نے تجھے موت سے بھی بے پروا کر دیا تھا؟''

پس جعفر نے نہایت ادب سے سپہ سالار کو جواب دیا۔ ''سردار محترم! میں وہی بات کہنا چاہتا ہوں۔ براہِ کرم مجھے امیر سے اجازت دلوائیے۔''

امیر زنگی زور سے دہاڑا۔ ''او نابکار! بولتا کیوں نہیں۔ تیری زبان کس نے پکڑ رکھی ہے؟''

''مجھے تخلیہ چاہیے آقائے محترم۔'' جعفر نے ایک

نئی درخواست پیش کردی۔
سپہ سالار شیر کوہ جعفر کی اس بات پر چونکا۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ ''جعفر! کیا تو کوئی اہم خبر لایا ہے؟''
''صرف اہم نہیں بلکہ بہت اہم خبر ہے سردار محترم!'' جعفر نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔
اسی وقت شیر کوہ نے آگے بڑھ کر امیر عمادالدین زنگی سے کچھ سرگوشی کی اور امیر زنگی خیمے کے اندر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد شیر کوہ نے جعفر کو ساتھ لیا اور وہ بھی امیر کے خیمے میں داخل ہوئے۔ شیر کوہ نے اندر پہنچ کر جعفر سے کہا۔
''جعفر! اب تو امیر کو بتا کہ وہ کیا خبر ہے جس نے تجھے اس قدر گستاخی پر آمادہ کر دیا تھا؟''
واضح رہے کہ اس وقت امیر زنگی کو بھی یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اس کا خاص ہرکارہ اس قدر گستاخ تو نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس نے اس وقت اپنا رویہ اس قدر سخت کر لیا تھا۔
پس جعفر نے سر جھکا کر اس راز سے پردہ اُٹھایا۔ اُس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''اے امیر محترم، میں یہ خبر لے کر حاضر ہوا ہوں کہ الرہا اس وقت بالکل خالی ہے۔''
امیر زنگی اور سپہ سالار دونوں ہی اپنی جگہ سے اُچھل پڑے۔ امیر نے بے یقینی سے کہا۔ ''تو..... تو کیا کہہ رہا ہے؟ ہوش بھی ہے تجھے؟''
''میں بالکل سچ عرض کر رہا ہوں امیر عالی مقام۔'' جعفر نے اور زیادہ مضبوط لہجہ اختیار کیا۔ ''امیر محترم، اس بات کا یقین کریں کہ شاہ جوسیلین اپنے بہترین دوستوں کے ساتھ الرہا چھوڑ کر تل باشر میں گرمیاں گزارنے چلا گیا ہے۔''
''جعفر، پھر سوچ لے تو کیا کہہ رہا ہے؟'' امیر زنگی کو اب بھی یقین نہیں آیا تھا۔
''اے امیر.....'' جعفر نے تفصیل بتانا شروع کی۔ ''میں شاہ جوسیلین کو تل باشر پہنچا کے یہ خبر دینے آپ کے پاس آیا ہوں۔''
امیر جو فوراً ہی اس خبر سے متاثر ہو کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا، اُس نے سر اُٹھایا اور جعفر سے نرمی سے پوچھا۔ ''الرہا میں اس وقت کتنی فوج ہے؟''
''اس وقت الرہا میں صرف عارضی فوج ہے۔'' جعفر نے مزید انکشاف کیا۔ ''الرہا کا انتظام شاہ جوسیلین، ارمنی اور کالدی تاجروں کے حوالے کر گیا ہے۔''
''الرہا..... میرے خوابوں کی تعبیر.....'' یہ کہتے ہوئے امیر زنگی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''اے مظلوموں کی سرزمین میں آ رہا ہوں، میں آ رہا ہوں۔ مجھے اپنا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا محسوس ہو رہا ہے۔''
اب امیر کی آنکھوں میں ان دیکھے سنہرے خواب لہرا رہے تھے اور جعفر سکوت کے عالم میں سر جھکائے کھڑا تھا۔
امیر زنگی جعفر کی لائی ہوئی خبر سے اس قدر خوش ہوا تھا کہ اُس نے رات کے کھانے پر جعفر کو اپنے دستر خوان پر جگہ دی۔ دوسری طرف سالار لشکر کو حکم ہوا کہ ضروری انتظام میں فوراً مصروف ہو جائے۔
کھانا ختم ہوتے ہی خیمہ گاہ کا سامان سمیٹا جانے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے چند ساعتوں کے بعد امیر زنگی کا پورا لشکر بڑی خاموشی اور نظم وضبط کے ساتھ الرہا کی طرف روانہ ہو گیا۔ امیر زنگی اپنے ساتھ صرف خیمہ گاہ کا سامان لے گیا تھا اور خیموں کو اسی طرح ایستادہ چھوڑ دیا گیا تھا۔ امیر زنگی نے الرہا جانے کے لیے بڑا ٹیڑھا راستہ اختیار کیا۔ یہ راستہ جنگلوں اور ویرانوں سے گزرتا تھا۔ دراصل امیر زنگی جلد از جلد الرہا پہنچنا چاہتا تھا اور

یہ بھی چاہتا تھا کہ اُس کے لشکر کی نقل وحرکت کی خبر زیادہ نہ پھیلنے پائے۔ اس احتیاط کا یہ نتیجہ ہوا کہ امیر کے لشکر کی خبر عام نہ ہوئی اور لوگوں کو اسلامی لشکر کی خبر اُس وقت ملی جب لشکر الرہا کی فصیلوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔

الرہا عیسائیوں کی ایک مضبوط چوکی تھی۔ اُس کی فصیلیں اس قدر بلند اور مضبوط تھیں کہ انہیں توڑنا ناممکن نظر آتا تھا۔ قلعہ کے اندر غیر مستقل فوج تھی جسے پورے سال کی تنخواہ پیشگی دے کر قلعہ میں روک لیا گیا تھا۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ امیر زنگی اس مضبوط قلعہ کو توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے قلعہ والوں کو پیغام بھیجا۔

''اگر قلعہ حوالے کر دیا جائے تو یہاں کے باسیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔''

مگر ارمنی تاجروں کو قلعہ کی فصیلوں پر پورا اعتماد تھا اور ان کے خیال میں بلکہ یقین میں یہ بات تھی کہ قلعہ ناقابل تسخیر ہے۔

امیر نے احتیاطاً قلعہ والوں کو اوپر تلے کئی پیغام بھیجے مگر قلعہ والوں نے قلعہ حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ محاصرہ طول کھینچ رہا تھا اور امیر زنگی کو قلعہ پر فوری قبضے کی ضرورت تھی۔ پس امیر نے قلعے کی دیواروں کے نیچے سرنگیں کھدوائیں اور ان میں بارود بھر کر آگ لگا دی۔ یوں وہ مضبوط دیواریں رُوئی کے گالوں کی طرح اُڑ گئیں اور اسلامی لشکر قلعہ میں داخل ہو گیا۔ ایسے موقعوں پر فاتح لشکر بے قابو ہو جاتا ہے۔ جوسیلین اور عیسائی حکمرانوں نے مسلمانوں پر جو ظلم و ستم ڈھائے تھے اس کا انتقام لینے کا موقع آ گیا تھا۔ چنانچہ امیر زنگی کے لشکر نے دل بھر کے انتقام لیا اور قلعے کے لشکر کا بیشتر حصہ قتل کر دیا گیا۔ خوب صورت عمارتیں مٹی کا ڈھیر بن گئیں۔ جواں عمر عیسائی لڑکوں اور لڑکیوں کو غلام و کنیز بنانے کے لیے گرفتار کر لیا گیا۔

پھر امیر زنگی قلعہ کے اندر گیا تو قلعہ کی خوب صورتی دیکھ کر حیران ہو گیا۔ امیر نے حکم دیا کہ قتل و غارت گری فوراً بند کی جائے۔ لوگوں کو امان دی جائے اور لوٹا ہوا مال واپس کر دیا جائے۔ الرہا میں کافی نقصان ہوا مگر امیر زنگی نے اُس کی رونق بحال کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ اس کا اعتراف خود مغرب کے مؤرخین نے کیا ہے۔

ترن کوزی اور فادر فلپ تل باشر چھوڑ کے الرہا آ گئے تھے۔ الرہا میں ترن کوزی کا دشمن لارنس بھی موجود تھا۔ ترن کوزی کو یقین تھا کہ جعفر کی گرفتاری میں لارنس کا ہاتھ تھا۔ مگر الرہا پہنچ جانے کے بعد وہ لارنس یا جعفر کسی کو نہ پا سکی۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ فادر فلپ اور ترن کوزی ایک عبادت گاہ میں داخل ہوئے کہ اچانک ان کا سامنا جعفر سے ہو گیا۔ اُنہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا مگر قدرت کو اُن کا ملاپ منظور تھا اس لیے دو بچھڑے ہوئے دل ہمیشہ کے لیے ایک جان دو قالب ہو گئے۔

ترن کوزی اور جعفر کا اسلامی طریقے سے نکاح ہوا جس میں امیر زنگی نے بھی شرکت کی اور امیر نے جعفر کو اُس کی خدمات کے صلہ میں الرہا میں ایک چھوٹی سی جاگیر عطا کی۔ شادی کے اختتام پر فادر فلپ نے انکشاف کیا کہ ترن کوزی دراصل ایک مسلمان خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی ماں ترن کوزی کو جنم دینے کے بعد فادر فلپ کی عبادت گاہ میں فوت ہو گئی تھی۔ جعفر کی سفارش پر فادر فلپ کو الرہا کی سب سے بڑی عبادت گاہ کا لارڈ پادری بنا دیا گیا۔



الرہا میں عیسائیوں کا تسلط ختم کر دیا گیا۔ گزشتہ ایک صدی سے کچلے ہوئے مسلمانوں نے سکھ کا

سانس لیا۔ نصرانی جھنڈا سرنگوں اور اسلامی پرچم سر بلند ہوا۔ عیسائیوں نے کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق اپنی شکست کی حسب مرضی تعبیریں شروع کر دیں۔

کسی نے کہا، شاہ جوسیلین، الرہا میں موجود نہ تھا اس لیے شکست ہوئی۔

کسی نے شکست کا یہ عذر پیش کیا۔

الرہا کی بہترین فوج تل باشر چلی گئی تھی اس لیے الرہا کو شکست ہوئی۔

ایک وجہ یہ بھی پیش کی گئی کہ الرہا کے عیسائی تاجر مسلمانوں سے مل گئے تھے اس لیے شکست ہوئی۔

الرہا کے عیسائیوں نے یہ الزام لگایا کہ امیر زنگی نے الرہا میں قتل عام کیا۔ عورتیں، بچے اور بوڑھے تک قتل کر دیے گئے۔ صلیبیں توڑ دی گئیں اور عبادت گاہوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔

مگر شکوہ کرنے والے اور الزام لگانے والے یہ بھول گئے کہ صرف ساٹھ سال پہلے جب عیسائیوں نے مسلمان علاقوں پر قبضہ کیا تھا تو عیسائی سورماؤں نے مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دیا تھا۔ انہوں نے وہاں کوئی مسجد نہ چھوڑی تھی۔ مسلمانوں کو زرق برق لباس پہننا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔

قلعہ والے اس حقیقت کو بھول گئے کہ چند سال پہلے ہی امیر زنگی نے عیسائیوں کے متحدہ لشکر کے سامنے جس میں شہنشاہ قسطنطنیہ کا لشکر بھی شامل تھا۔ اپنے خیمے لگائے تھے جنہیں دیکھ کر شہنشاہ ''کامنی کس'' امیر زنگی کی جرأت سے اس قدر خائف ہوا کہ رات کے اندھیرے میں میدان میں سامانِ حرب چھوڑ کے چپکے سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

بہرحال یہ ایک عام روش ہے کہ شکست کھانے والے، فاتح کو ہمیشہ درندہ صفت کہتے ہیں اور اسے طرح طرح کے برے ناموں سے پکارتے ہیں۔

فاتح بیت المقدس

سلطان صلاح الدین ایوبی کو فاتح بیت المقدس کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ یہ لقب اسے واقعی زیب دیتا ہے۔ کیونکہ مؤرخ عام طور سے صلاح الدین پر کچھ اس طرح تبصرہ کرتے ہیں۔

خدا کی راہ میں لڑنا صلاح الدین کا ایک دلی جذبہ تھا۔ اس کا دل ہمیشہ اس میں لپٹا رہتا تھا اور اسی میں اس نے جان و تن کو کھپا دیا تھا۔ آخری تین سالوں میں تو سوائے جہاد کے اور کوئی خیال اس کے دل میں آتا ہی نہ تھا۔ سوائے جہاد کے وہ کسی موضوع پر بات ہی نہ کرتا۔ اس نے ہر عیش و آرام اور بال بچوں میں رہنے کی خوشی کو اس خدمت پر قربان کر رکھا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے دوست سے پوچھا۔ موتوں میں سب سے شان دار موت کون سی ہے؟ اس کے دوست نے جواب دیا۔ خدا کی راہ میں جان دینا سب سے بہتر موت ہے۔ صلاح الدین مسکرایا اور کہا۔ میں اُسی شان دار موت کے دروازے کی طرف جا رہا ہوں۔''

آپ جانتے ہیں کہ خدا کی راہ میں جہاد کا یہ شوقین اور اس شان دار موت کا خواہش مند کون تھا۔ یہ سر فروش اور اسلام کا نام ور مجاہد صلاح الدین ایوبی تھا۔ ایسا مجاہد جسے نہ صرف مسلمان محبت سے یاد کرتے ہیں بلکہ اس کے دشمن بھی اس کا نام عزت اور احترام سے لیتے ہیں۔

فاتح بیت المقدس سلطان صلاح الدین ایوبی، کردوں کے ایک بڑے قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے دادا کا نام شادی تھا۔ شادی کے دو بیٹے تھے۔ نجم الدین ایوب اور شیرکوہ۔ چنانچہ شادی اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر وطن سے نکلا اور بغداد پہنچا۔ وہاں سے

تکریت گیا اور وہیں بس گیا۔ تکریت اس وقت کافی مشہور قلعہ تھا۔ شادی کے انتقال کے بعد نجم الدین ایوب اور شیر کوہ تکریت سے چل کر موصل کے حاکم عمادالدین زنگی کے پاس پہنچے۔ اس وقت مسلمانوں کی کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو چکی تھیں۔ ان میں موصل کافی بڑی ریاست تھی اور یہاں کا حاکم بڑا نیک اور بہادر تھا۔ اس نے قلعہ بعلبک کی حفاظت کا انتظام نجم الدین کے سپرد کر دیا۔ عمادالدین کے قتل کے بعد نجم الدین نے دمشق کے سلطان کی ملازمت قبول کر لی اور اس کا بھائی شیر کوہ، عمادالدین کے بیٹے نورالدین زنگی کی خدمت میں جا پہنچا جو اس وقت حلب کا والی تھا۔

سلطان صلاح الدین کی پیدائش اس رات ہوئی جب اس کا باپ نجم الدین تکریت سے نکل کر عماد الدین زنگی کے پاس جا رہا تھا۔ سلطان نورالدین زنگی نے جب دمشق فتح کیا تو نجم الدین نے بھی اس کی ملازمت اختیار کر لی۔ صلاح الدین اس وقت سولہ برس کا تھا۔ باپ اور چچا کے ساتھ اس نے بھی سلطان نورالدین زنگی کی خدمت میں جانا شروع کر دیا۔ نورالدین نے اسے دیکھتے ہی اندازہ لگالیا کہ یہ نوجوان ذہین اور سمجھ دار ہے۔ وہ اپنے عام درباریوں سے زیادہ صلاح الدین کی عزت کرتا۔ صلاح الدین نے بھی دیکھ لیا کہ اس کے آقا میں کس قدر خوبیاں ہیں۔ وہ شریف ہے، عالی حوصلہ ہے، نیک و ہم درد اور بڑا دلیر اور بہادر ہے۔ اس نے (صلاح الدین نے) بھی کوشش کی کہ وہ ان خوبیوں کو اپنے اندر جذب کر لے۔

ہمیں صلاح الدین کے بچپن کے حالات زیادہ معلوم نہیں۔ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اسے دینیات، حدیث اور فقہ کے مطالعہ کا بہت شوق تھا۔

بد قسمتی

وہ دیر سے بار میں بیٹھا بھرے گلاس کو گھور رہا تھا۔ قوی الجثہ ٹرک ڈرائیور بھی اسے دیکھ رہا تھا وہ اٹھا اور اس کے سامنے پڑا گلاس اٹھا کر ایک ہی گھونٹ میں چڑھا گیا۔ نوجوان اچانک بلک بلک کر رونے لگا۔ ڈرائیور سے دیکھا نہ گیا بولا کچھ بتاؤ تو سہی کیوں رو رہے ہو؟ میں نیا پیگ بنوا دیتا ہوں۔

نوجوان بولا نہیں یہ بات نہیں ہے۔ میرے لیے آج کا دن ہی منحوس ہے۔ صبح دیر سے اٹھا، دفتر میں باس برس پڑا اور نوکری سے نکال دیا۔ باہر نکلا تو گاڑی غائب تھی پولیس والے بھی فوری ایکشن نہ لے سکے ٹیکسی لے کر گھر پہنچا۔

اندر داخل ہوا تو اچانک معلوم ہوا کہ کریڈٹ کارڈ سمیت اپنا پرس ٹیکسی میں بھول آیا ہوں۔ گھر میں گھس کر دیکھا تو وہاں میری بیوی میرے مالی کے ساتھ فری ہو رہی تھی۔

یہ سب میرے لیے ناقابل برداشت تھا میں ایک نکما اور بے کار نوجوان تھا جس کی بیوی بھی بے وفا نکلی۔ میں اپنی زندگی کو ختم کرنے کے لیے یہاں آ گیا میری بدقسمتی تمہاری صورت میں نازل ہوگئی۔ میں نے اپنا پیگ خالی کر کے اس میں زہر ڈال دیا تھا اور میرے سے پہلے وہ بھی تم جلدی میں آ کر اسے پی گئے۔

جاوید احمد صدیقی......راولپنڈی

شاعری سے بھی اسے عشق تھا۔ اس نے کئی استادوں کی شاگردی اختیار کی تھی لیکن اس کا سب سے بڑا استاد نورالدین زنگی تھا۔

صلاح الدین فطرتاً تنہائی پسند تھا۔ سلطان نورالدین زنگی نے کئی بڑی لڑائیاں لڑیں جن میں شیرکوہ برابر شریک رہا مگر ہم صلاح الدین کا نام کہیں نہیں دیکھتے۔ سب سے پہلی جنگ جس میں وہ شامل ہوا وہ ہے جب شیرکوہ نے مصر پر حملہ کیا۔ یہ واقعہ ۱۱۶۴ء کا ہے۔ اس وقت مصر پر خلیفہ السعامند کی حکومت تھی مگر وہ کم زور اور دوسروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ پھر عیسائی وہاں حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ سلطان نورالدین کے لیے جو عیسائیوں کو اپنے ملک سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا، یہ ضروری تھا کہ اُس کا مصر پر قبضہ ہو جاتا۔ اسے اس کوشش میں کامیابی ہوئی۔ شیرکوہ وہاں کا وزیرِاعلیٰ مقرر ہوا اور اس کے انتقال کے بعد یہ عہدہ صلاع الدین کے ہاتھ آیا۔

سلطان نورالدین کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے عباسی خلافت جس کا دبدبہ کبھی دور دور تک پھیلا ہوا تھا، کمزور ہو چکی تھی اور کئی حصوں میں بٹ چکی تھی۔ عیسائی جو مسلمانوں کے پرانے دشمن تھے، اس موقع کی تاک میں تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کا آپس میں اتفاق نہیں ہے اور وہ غیر منظم ہیں تو انہوں نے ایک دم ایشیاءِ کوچک پر حملہ کر دیا۔ وہ فتح پر فتح حاصل کرتے ہوئے ملک شام تک آ پہنچے اور بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے یہاں چار ریاستیں قائم کیں۔ الرہا، انطاکیہ، طرابلس اور بیت المقدس۔

بیت المقدس کی فتح سے مسلمانوں کو سخت دھچکا لگا۔ تاریخ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی ان لڑائیوں کو ''صلیبی لڑائیاں'' کہا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ پہلی صلیبی جنگ تھی۔ بیت المقدس کا حاکم گاڈ فرے [illegible] اور باقی تین ریاستوں کو بھی اس کے ماتحت کر دیا گیا مگر مسلمانوں کی یہ شکست عارضی تھی۔ عیسائیوں کے اس حملے سے اسلامی دنیا کے ستون ہل گئے مگر وہ گرے نہیں تھے۔ مسلمانوں کو یقین تھا کہ کوئی خدا کا بندہ ضرور اُٹھے گا اور انہیں متحد کر کے عیسائیوں کو اسلامی سرزمین سے باہر نکال دے گا۔ اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ کئی اللہ کے شیر پیدا ہوئے جنھوں نے عیسائیوں کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے۔ ان میں پہلا نمبر عماد الدین زنگی کا ہے۔ جس نے ۱۱۴۲ء میں عیسائیوں کو شکست دے کر اُن کی ریاست الرہا پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد سلطان نور الدین زنگی اُٹھا جس نے اپنی ساری زندگی جہاد کے لیے وقف کر دی۔

الرہا کی شکست کے بعد عیسائیوں نے دوسری صلیبی جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ آپ کو یہ علم ہو چکا ہے کہ اس میں (صلیبی جنگ) یورپ کے بڑے بڑے بادشاہ اپنی فوجیں بھیجتے تھے اور عیسائیوں کا مذہبی پیشوا پوپ بھی ان کی مدد کرتا تھا۔ چنانچہ دوسری صلیبی جنگ کے لیے بھی انہوں نے بہت بڑا لشکر جمع کر لیا تھا۔ مگر سلطان نورالدین زنگی نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ اُس نے عیسائیوں کا طوفان پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ ایک طرف اُس نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر دی اور دوسری طرف صلیبیوں کو روک کر اُن کی فتوحات کا سلسلہ ختم کر دیا۔ سلطان کی وفات ایک بڑا سانحہ تھا۔ اُس میں بے شمار خوبیاں تھیں۔ واقعی وہ خدا کی راہ میں مجاہد تھا۔

مورخ لکھتے ہیں:۔

''خلفاء راشدینؓ اور عمر بن عبدالعزیز کے سوا نورالدین سے بہتر کوئی اور فرمانروا اُن کی نظر سے نہیں گزرا۔''

سلطان نورالدین زنگی کی وفات پر عیسائیوں میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ انہوں نے اپنی کوششیں پھر شروع کر دیں۔ چنانچہ شام کی طرف سے اُن کی فوجیں حرکت میں آئیں اور دمشق کے قریب پہنچ گئیں۔ یہاں نورالدین کے بیٹے اور ان کے وزیر کمزور تھے۔ انہوں نے اُن سے صلح کر لی۔ اس سے عیسائیوں کے حوصلے اور بڑھ گئے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے مصر پر حملہ کر کے اسے ختم کر دینا چاہیے۔ پس انہوں نے ایک بڑا بحری بیڑہ جس میں ۲۸۲ جہاز تھے جمع کیا اور مصر کی بندرگاہ اسکندریہ پر دھاوا بول دیا۔ صلاح الدین نے جو وہاں کا وزیر اعظم اور مختارِ کل تھا یہ خبر سنی تو جلدی سے وہاں ایک لشکر بھیج دیا۔ عیسائیوں کو شکست ہوئی اور اُن کے کئی جہاز ڈوب گئے۔

سلطان نورالدین زنگی کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں اور رشتے داروں نے الگ الگ حکومتیں قائم کر لیں۔ اسکندریہ کے واقعہ کے بعد صلاح الدین کو اس بات کا سختی سے احساس ہوا کہ جب تک ساری ریاستوں کو ایک ایک کر کے ان کا اندرونی نظام ٹھیک نہیں کر لے گا اس وقت تک عیسائیوں کے مقابلے پر مشکل ہو گی مگر دقت یہ تھی کہ کئی ریاستوں کے حاکم اُس کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ تھے۔ وہ اکثر دشمن سے بھی مل جاتے تھے اس لیے صلاح الدین کو مجبور ہو کے اُنہیں اپنے قبضہ میں کرنا پڑا۔ کسی کو ڈانٹ ڈپٹ کی، کسی سے مروت کا سلوک۔ پس ۱۱۷۴ء سے ۱۱۸۸ء یعنی تقریباً چودہ سال اس کوشش میں صرف ہوئے۔ یہ بات نہیں کہ اس طویل عرصے میں اُس کی عیسائیوں سے ایک لڑائی بھی نہیں ہوئی۔ اس عرصہ میں کئی چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوئیں۔ ان میں کہیں صلاح الدین کو فتح ہوئی اور کہیں عیسائیوں کو۔ مگر صلاح الدین نے اس طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ اُس کا پہلا مقصد یہ تھا کہ ایک مضبوط حکومت قائم ہو جائے اور مدافعت اور حفاظت کا پورا پورا انتظام کیا جائے۔ اس مقصد میں بالآخر وہ کامیاب ہوا۔

چناں چہ اس نے ایک بڑی متحدہ سلطنت قائم کر لی۔ اس حکومت کی حدیں جنوب میں سوڈان کی آخری سرحد تک، مغرب میں برقہ تک، شمال میں آرسینیا تک اور مشرق میں موصل تک پہنچی تھیں۔

اب ادھر صلاح الدین تھا۔ اُدھر دشمنوں میں طرابلس شام کا حاکم ریجنڈ بڑا لائق اور بہادر تھا۔ کرک کا حاکم ولی ریجی نالڈ بھی بڑا دلیر تھا۔ مگر اُس میں خرابی یہ تھی کہ خواہ مخواہ لڑائی مول لیتا تھا اور معاہدوں کی پابندی نہ کرتا تھا۔ سلطان صلاح الدین کو خون بہانے کا شوق نہیں تھا مگر وہ مجبور تھا۔ حالات ایسے تھے کہ اُس کے لیے لڑنا ضروری تھا۔ جب وہ ہر طرح سے مضبوط ہو گیا تو اُس نے فیصلہ کیا کہ عیسائیوں کو دوسرے کنارے پر جسے وہ عبور کر کے آئے تھے، دھکیل دے۔ دوسری جانب عیسائی اس کوشش میں تھے کہ اپنے اس نئے دشمن کو کچل کر رکھ دیں۔ ان میں ریجی نالڈ پیش پیش تھا۔ اُس میں اور صلاح الدین میں چار سال کے لیے یعنی ۱۱۸۴ء سے ۱۱۸۸ء تک عارضی صلح ہو چکی تھی۔ مگر ریجی نالڈ اس عارضی صلح سے اُکتا چکا تھا۔ پس اس نے معاہدہ کے خلاف ایک قافلہ کو جو کرک کے قریب سے گزر رہا تھا، لوٹ لیا۔ بہت سے لوگ قید ہو گئے کئی قتل کر دیے گئے۔ صلاح الدین کو خبر ملی تو وہ بہت جز بز ہوا اور اس نے قسم کھائی کہ ریجی نالڈ اُس کے ہاتھ آیا تو وہ اُسے اپنے ہاتھ سے قتل کرے گا۔

۱۱۸۷ء میں گرمیوں کے مہینے میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے جہاد کی عام منادی کرا دی اور اپنے

ماتحت حاکموں اور بادشاہوں کو حکم دیا کہ وہ اپنا اپنا لشکر لے کر اُس کے پاس پہنچ جائیں۔ چنانچہ چند دنوں میں ایک بڑا لشکر جمع ہو گیا۔ اُدھر عیسائیوں نے بھی خوب خوب تیاریاں کر لی تھیں۔ پچاس ہزار عیسائی صفوریہ کے مشہور شہر میں مسلمانوں کے مقابلے کے لیے جمع ہوئے۔ سلطان نے صفوریہ کا رخ کیا۔ یہ جمعہ کا دن تھا اور وہ اکثر جمعہ کے دن کو جنگ کے لیے مناسب سمجھتا تھا۔ راستہ میں عیسائیوں کا ایک بڑا مرکز طبریہ پڑتا تھا۔ مسلمانوں نے شہر پر قبضہ کر لیا مگر طبریہ کا قلعہ فتح نہ کر سکے تھے۔ جب عیسائیوں نے سنا کہ طبریہ کا شہر ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہے تو وہ صفوریہ سے قلعہ والوں کی مدد کے لیے روانہ ہوئے۔ ادھر سلطان صلاح الدین نے پھرتی سے طبریہ کو چھوڑ کر دشمن کا رخ کیا۔ لشکر کو پانی کے کنارے اتارا اور اس کے سامنے جو پانی کے تالاب تھے وہ سب خشک کروا دیے۔ اس وقت بڑی شدید گرمی پڑ رہی تھی۔

عیسائیوں کو پانی کی بڑی دشواری پیش آئی مگر وہ کسی نہ کسی طرح اسلامی لشکر کے قریب پہنچ کر ٹھہر گئے۔ مسلمانوں نے کچھ رات عبادت میں اور کچھ آرام کرنے میں گزاری۔ اس دوران صلاح الدین نے انہیں ضروری ہدایات اور احکامات دیے۔

دوسرے دن عیسائیوں کی یہ کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح پانی تک پہنچ جائیں۔ صلاح الدین کو پہلے یہ علم تھا کہ ایسی کوشش ہو گی چنانچہ اس نے اس کوشش کو ناکام کرنے کی ٹھانی۔ اس نے انہیں چکر دے دلا کر ایک دائرے میں جکڑ لیا ان کے لیے اس دائرے سے نکلنا بہت مشکل تھا۔ انہوں نے لڑ بھڑ کر بحیرۂ طبریہ کی طرف نکل جانا چاہا لیکن صلاح الدین خود ان کے سامنے جم گیا۔ عیسائیوں نے بھی پورا زور صرف کر دیا۔ بڑی خون ریز جنگ ہوئی صلاح الدین نے فوج کے ہر حصے میں جا کر سپاہیوں کو جوش دلایا اور انہیں ضروری ہدایات دیتا رہا۔ جب عیسائیوں نے دیکھا کہ بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے تو انہوں نے آخری مقابلے کے لیے جان کی بازی لگا دی۔ ان کے لگاتار حملوں سے مسلمانوں کی صفیں درہم برہم ہو گئیں مگر ہر حملے میں عیسائیوں کی کافی تعداد قتل ہو جاتی تھی اور ان کی قوت برابر گھٹتی جا رہی تھی۔ آخر مسلمانوں نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا۔ انہوں نے کوہ حطین میں پناہ لینے کی کوشش کی مگر راستہ ہر طرف سے بند تھا۔ صرف تھوڑی سی فوج کوہِ حطین کی سمت جا سکی۔ مسلمانوں نے چاروں طرف سے حملہ کر کے مقدس صلیب کو جو حضرت مسیح کی سولی کی شکل میں بنی ہوئی تھی ان سے چھین لی۔ اس سے عیسائیوں میں بڑی بے دلی پھیل گئی اور انہوں نے آخری کوشش کی مگر وہ مسلمانوں کے حملے کو نہ روک سکے۔ مسلمان یلغار کرتے ہوئے شاہ بیت المقدس گائی کے خیمے تک جا پہنچے اور اس کو گرا دیا۔ عیسائیوں نے جب دیکھا کہ ان کی قوت بالکل جواب دے چکی ہے اور جنگ جاری رکھنے میں موت کے سوا کچھ حاصل نہیں تو انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

مسلمانوں نے بادشاہ گائی، ریجی نالڈ اور کئی بڑے بڑے امیروں کو گرفتار کر لیا۔ قیدیوں کی اس قدر کثرت تھی کہ ان پر نظر پڑتی تو خیال گزرتا جیسے سارا عیسائی لشکر پکڑا گیا ہے۔ ادھر میدان جنگ میں پڑی ہوئی لاشیں نظر آئیں تو اندازہ ہوتا جیسے کوئی زندہ نہ بچا ہو گا۔

جنگ ختم ہونے کے بعد معزز قیدی، سلطان کے سامنے پیش کیے گئے۔ بادشاہ گائی کو سلطان نے اپنے پہلو میں جگہ دی۔ باقی امیروں کو بھی ان کے مراتب کے مطابق بٹھایا گیا۔ یہ بیان ہو چکا ہے کہ سلطان

صلاح الدین نے قسم کھائی تھی کہ اگر ریجی نالڈ اس کے قبضے میں آیا تو اسے اپنے ہاتھ سے قتل کرے گا۔ چنانچہ سلطان نے پہلے اس کے سامنے سلام پیش کیا۔ اس کے انکار پر اپنے ہاتھ سے اس کا سر اڑا کر اپنی قسم پوری کی۔ ریجی نالڈ کا انجام دیکھ کر گائی ڈر گیا۔

سلطان نے اسے اطمینان دلایا اور کہا۔

''بادشاہوں کا یہ دستور نہیں کہ وہ دوسرے بادشاہ کو قتل کریں۔ ریجی نالڈ کو تو خود اپنی زیادتیوں کی وجہ سے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔''

''حطین'' کی شکست سے عیسائیوں کی قوت بہت کمزور پڑ گئی۔ اسلامی فوجوں نے حطین کی فتح کے بعد صرف ایک دن آرام کیا اور پھر ایک زبردست سیلاب کی طرح ملک میں پھیلنا شروع کیا۔ اب فوجوں کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ کسی شہر کے سامنے آئیں اور اس کی دیواریں گر پڑیں۔ اور شہر کی فوج اپنے ہتھیار ڈال دے۔ صرف چند مضبوط قلعے ایسے تھے جنہوں نے کچھ ہمت کی۔ لیکن ان میں سے کوئی قلعہ ایسا نہ تھا جس نے ایک ہفتہ سے زیادہ مقابلہ کیا ہو۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے طبریہ پر قبضہ کیا گیا جس نے ایک ہفتہ سے زیادہ مقابلہ کیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے طبریہ پر قبضہ کیا گیا۔ پھر فلسطین کی بندرگاہ اور تجارت کی منڈی عکہ پر حملہ ہوا۔ وہاں کے باشندوں نے اطاعت قبول کر لی۔ سلطان نے انہیں اجازت دی کہ وہ اگر چاہیں تو عکہ رہ سکتے ہیں اور چاہیں تو اپنا مال لے کر چلے جائیں۔ عکہ کی جامعہ مسجد کو عیسائیوں نے گرجا بنالیا تھا۔ تقریباً ایک سو سال بعد صلاح الدین نے اسے پھر مسجد بنایا اور وہاں جمعہ کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد کئی اور چھوٹے چھوٹے شہر فتح ہوئے اور ان کے بعد فلسطین کے خوب صورت اور مضبوط شہر بیروت پر قبضہ کیا۔

بیروت کے بعد ساحلی شہروں میں صور اور عقلان دو بڑے شہر رہ گئے تھے۔ صور کا حاکم کونریڈ تھا۔ اس کے پاس زبردست فوج تھی۔ اسے فتح کرنے کے لیے کچھ وقت چاہیے تھا۔ اس لیے سلطان نے پہلے عقلان کا رخ کیا اور اس کا محاصرہ کرلیا۔ مگر شہر والوں نے چند روز بعد جان کی امان چاہی اور شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔

عقلان کی فتح کے بعد بیت المقدس کا راستہ صاف ہوگیا مگر اس پر قبضہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ وہاں بہت سے شکست کھائے ہوئے فوجی جمع ہو گئے تھے جن کی تعداد ساٹھ ہزار سے بھی زیادہ تھی۔ بیت المقدس مسلمانوں کے لیے اتنا ہی مقدس تھا جتنا عیسائیوں کے لیے۔ اس لیے سلطان وہاں خونریزی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پس اس نے عیسائیوں کو پیغام بھیجا کہ شہر میرے حوالے کر دو۔ اس کے معاوضہ میں تم کو اتنا علاقہ دوں گا کہ جتنا تم سنبھال سکو۔ مگر عیسائیوں نے انکار کر دیا۔ اب سلطان مجبور تھا کہ جنگ کرے۔

پس جنگ شروع ہوگئی اور کئی روز تک پرزور مقابلہ ہوتا رہا۔ مسلمان سپاہی شہر پناہ کو توڑنا چاہتے تھے مگر اس کے اوپر سے تیر چلائے جا رہے تھے۔ باہر بھی عیسائی سپاہی لڑ رہے تھے اس لیے مسلمان شہر تک نہ پہنچ سکے تھے۔ آخر ایک مرتبہ مسلمانوں نے یلغار کر کے عیسائیوں کو اندر کی طرف دھکیل دیا اور بڑھتے ہوئے شہر پناہ تک پہنچ گئے اور بھاری پتھر مار کر اسے توڑ ڈالا۔ جب عیسائیوں نے دیکھا کہ وہ شہر کو نہیں بچا سکتے اور ان کی موت یقینی ہے تو وہ شہر حوالے کرنے پر تیار ہو گئے۔ پہلے تو سلطان نے انکار کیا پھر اس خیال سے کہ کہیں شہر کی بے حرمتی نہ ہو وہ مان گیا۔ شرط یہ قرار پائی کہ بیت المقدس کے تمام عیسائی فی مرد دس

دینار، فی عورت پانچ دینار اور فی بچہ دو دینار ادا کریں گے۔ اور چالیس دن کے اندر جن کا فدیہ ادا نہ ہو گا وہ غلام شمار کیے جائیں گے۔ اس طرح پورے اکیانوے سال بعد خدا کا یہ گھر پھر مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ اتفاق دیکھیے کہ وہ تاریخ معراج نبویؐ کی ہے۔

آپ کو شاید معلوم ہو کہ جب عیسائیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کیا تو انہوں نے مسلمانوں پر بڑے ظلم ڈھائے تھے۔ سلطان چاہتا تو اس کا بدلہ لے سکتا تھا مگر اس نے عیسائیوں سے بڑی فیاضی اور شرافت کا سلوک کیا۔ اس بات کو عیسائی بھی مانتے ہیں۔

عیسائیوں نے پچھلے ایک سو سال میں بیت المقدس کی حالت بگاڑ دی تھی۔ سلطان نے وہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک کر دیا۔ مسجد اقصیٰ کو نجاستوں سے پاک کیا اور اس میں وہ خوب صورت منبر رکھوایا جو سلطان نور الدین زنگی نے اپنے عہد میں بنوایا تھا کہ وہ بیت المقدس فتح کر کے اسے مسجد میں رکھوائے گا۔

بیت المقدس پر مسلمانوں کے قبضہ نے ساری عیسائی دنیا میں ایک تہلکہ برپا کر دیا اور تیسری صلیبی جنگ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اس کے لیے پادریوں نے یورپ کا دورہ کر کے اپنی پرجوش تقریروں سے مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کے دلوں میں آگ لگا دی۔ پوپ نے فتویٰ دیا۔

''جو شخص اس مقدس جنگ میں شریک ہو گا اس کے سارے گناہ دھل جائیں گے۔''

غرض تھوڑے عرصہ میں ایک بڑا لشکر تیار ہو گیا۔ فرانس، جرمنی، اٹلی اور سسلی کے بادشاہ اس میں شریک تھے۔ اتنے بہت سے بادشاہوں نے پہلے کبھی حصہ نہ لیا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ پیش پیش انگلستان کا بادشاہ رچرڈ تھا۔ اس عظیم الشان لشکر نے سب سے پہلے عکہ کا محاصرہ کیا۔ سلطان صلاح الدین نے پورے تین سال تک بڑی بہادری کے ساتھ یورپ کی اس متحدہ قوت کا مقابلہ کیا۔ اس مدت میں سو سے زیادہ لڑائیاں ہوئیں اور نوے بڑے معرکے۔ آخر سلطان نے شہر کو چند شرطوں پر عیسائیوں کے حوالے کر دیا۔

عکہ پر قبضہ کرنے کے بعد عیسائیوں نے ''یافا'' جسے مسلمانوں نے خالی کر دیا تھا۔ اپنے قبضہ میں کر لیا۔ چونکہ سلطان، عقلان کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا اس لیے اسے برباد کر دیا گیا۔ اب عیسائی بیت المقدس کی طرف بڑھے مگر سلطان نے اس کی حفاظت کا ایسا اعلیٰ انتظام کیا تھا کہ عیسائی ذرہ برابر کامیابی نہ حاصل کر سکے۔ اِدھر اُدھر لڑائیاں ہوتی رہیں جو بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔ ان لڑائیوں سے تنگ آ کر کئی بادشاہ اور امیر یورپ واپس چلے گئے مگر شاہ رچرڈ برابر میدان میں ڈٹا رہا۔ رچرڈ بیت المقدس فتح کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا مگر ناکام رہا۔ آخر تنگ آ کر اسے صلح کرنی پڑی۔

صلح کی شرط یہ تھی کہ عکہ سے لے کر یافا تک کے ساحل پر عیسائی قابض رہیں گے اور وہاں سے لے کر جنوب کا ساحلی علاقہ صلاح الدین کے قبضہ میں رہے گا۔

اس جنگ میں یورپ کے لاکھوں سپاہی، کئی بادشاہ اور سیکڑوں امیر کام آئے اور بے اندازہ دولت برباد ہوئی۔ اس کے مقابلہ میں عیسائیوں کو حاصل کچھ نہ ہوا۔ مسلمانوں کو بھی کافی نقصان اٹھانا پڑا لیکن ان کو اس کے بدلے میں فلسطین کا تقریباً پورا علاقہ مل گیا۔ اس تیسری صلیبی جنگ میں تمام مسیحی دنیا کی طاقت مقابلہ کرنے آئی مگر سلطان صلاح الدین کی قوت کو ٹس سے مس نہ کر سکی۔

صلح کے بعد سلطان نے فوجوں کو آرام دینے کے

لیے ان کو وطن واپس کر دیا اور خود چند ماہ کے لیے فلسطین میں ٹھہر گیا اور انتظام کرنے کے بعد دمشق واپس آ گیا۔ کئی سال سے اس کی صحت بگڑ رہی تھی مگر وہ جہاد میں اس قدر مصروف تھا کہ آرام کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ بیماری کی وجہ سے رمضان کے بہت سے روزے قضا ہو گئے تھے۔ طبیب نے روکا کہ صحت پر برا اثر پڑے گا۔

سلطان نے جواب دیا۔ ''معلوم نہیں، آئندہ کیا پیش آئے۔''

اور پھر کل قضا روزے پورے کیے۔ اس سے اس کی صحت مزید بگڑ گئی اور بخار آنے لگا۔ آخر منگل کے دن ۴ مارچ ۱۱۹۲ء فجر کے وقت سلطان نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت کل ۵۷ سال کی عمر تھی۔ غسل کے بعد عصر کے وقت اسی مکان میں جس میں بیمار ہوئے تھے، اس مجاہد اعظم کو سپردِ خاک کیا گیا۔ میت کے ہمراہ وہ تلوار بھی رکھ دی گئی جو ہمیشہ خدا کی راہ میں بے نیام رہی اور اب اس کو چلانے والا ہاتھ باقی نہ رہ گیا تھا۔

سلطان صلاح الدین کی موت سے اسلامی دنیا میں صف ماتم بچھ گئی۔ کوئی دل ایسا نہ تھا جو اس غم میں رنجیدہ نہ ہوا ہو اور کوئی آنکھ نہ تھی جو اس کے ماتم میں نہ روئی ہو۔ میت کو دفن کر کے سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے آئے اور دروازے بند کر کے بیٹھ گئے۔ گلی کوچوں میں کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ قبر پر لوگ قرآن پڑھتے اور رو رو کے خدا سے دعائیں مانگتے کہ جو شخص یہاں سویا ہوا ہے اس پر ہمیشہ خدا کی رحمت برستی رہے۔

سلطان صلاح الدین بہت بہادر اور نڈر انسان تھا۔ کیسا ہی خطرناک مرحلہ کیوں نہ ہو وہ بالکل نہ گھبراتا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ عیسائیوں کی بہت بڑی تعداد ہے اور ان کی امدادی فوجیں لگاتار آ رہی ہیں لیکن سلطان صلاح الدین پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ بلکہ اس سے اس کا حوصلہ بڑھ جاتا تھا۔ وہ ہر سال موسم سرما میں فوجوں کو ان کے وطن واپس بھیج دیتا تھا اور خود تھوڑی سی فوج کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرتا رہتا تھا۔

جنگ کے زمانہ میں دشمنوں کی طاقت اور حالات معلوم کرنے کے لیے خطرے کی پروا کیے بغیر ان کے گرد ایک دو مرتبہ ضرور چکر لگاتا تھا۔ عین جب لڑائی زور وشور سے ہو رہی ہوتو فوجوں کی صفوں میں گھوم پھر کر ان کی ترتیب قائم کرتا اور سپاہیوں کو ضروری ہدایات دیتا تھا۔ وہ اس سلسلے میں دشمنوں کی فوجوں کے بالکل قریب پہنچ جاتا تھا۔ اس نے کبھی پروا نہیں کی کہ دشمن کی تعداد زیادہ ہے اور اس کو کبھی اہمیت نہ دی۔ مگر اس کے باوجود وہ جنگی چالوں سے غافل نہ رہتا تھا۔ وہ اپنے فوجی افسروں کی رائے توجہ سے سنتا اور جو اچھی ہوتی اس پر عمل کرتا تھا۔

صلاح الدین کی ساری عمر میدانِ جنگ ہی میں گزری۔ کئی بار سخت بیمار ہوا لیکن اس کے جہاد میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ ہمیشہ اور ہر وقت جہاد ہی میں مصروف رہتا تھا۔ اس کو جہاد کا اس قدر شوق تھا کہ اس کے دل ودماغ پر دن رات جہاد ہی چھایا رہتا تھا۔ جہاد کے سوا نہ وہ کسی موضوع پر بات کرتا اور نہ کسی کی کوئی اور بات سنتا تھا۔ غرض یہ کہ جہاد اس کا اوڑھنا بچھونا تھا اس لیے اس نے اپنے بیوی بچے، وطن، گھر بار اور آرام کے سارے سامان چھوڑ دیے تھے۔ بس خیمے کی زندگی اختیار کر لی تھی جس کے گرد اگرد تیز ہوا کے جھکڑ چلتے۔ صلاح الدین کو جہاد میں جس قدر دقتیں اور مشکلات پیش آئیں اتنا ہی اس میں صبر واستقلال بڑھتا گیا۔ جو لوگ اس کے زیادہ قریب

رہنا چاہتے تھے وہ جہاد کو اس کا وسیلہ بناتے تھے۔ اس کا یہ حال اور جہاد میں اس کی محبت دیکھ کر کئی علماء نے جہاد پر مختلف انداز سے کتابیں لکھیں۔ جنہیں سلطان صلاح الدین نہایت دلچسپی اور انہماک سے پڑھا کرتا تھا۔

سلطان کی ہمت اور استقلال کا یہ عالم تھا کہ جس زمانہ میں وہ عکہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا تو اس کے نچلے دھڑ میں بہت سے پھوڑے نکل آئے تھے۔ اس قدر تکلیف بڑھ گئی تھی کہ دسترخوان پر نہ بیٹھا جاتا تھا لیکن اس عالم میں بھی صبح سے ظہر تک اور عصر سے مغرب تک برابر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا رہتا تھا۔ جب لوگوں نے اس کے اس صبر اور برداشت پر حیرانی کا اظہار کیا تو اس نے کہا۔

''جب میں گھوڑے پر سوار ہو جاتا ہوں تو تکلیف ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن گھوڑے سے اترتا ہوں تو پھر وہ (تکلیف) واپس آجاتی ہے۔''

ایک بار سلطان بیمار تھا۔ عیسائیوں کو اس کی خبر ملی تو وہ ایک اسلامی شہر کی جانب بڑھے۔ سلطان اسی بیماری کی حالت میں ان کے مقابلہ پر نکل کھڑا ہوا۔ گرمی بہت سخت تھی۔ سلطان نے دھوپ سے بچنے کے لیے چہرے پر رومال ڈال لیا تھا۔ وہ تھوڑی دور چل کر ٹھہر جاتا تھا۔ اس طرح اس نے سارا سفر طے کیا اور عیسائیوں کے قریب پہنچ کر ان کی تدبیر ناکام بنادی۔

اسی طرح ایک اور شہر کے محاصرے کے دوران سخت سردی پڑ رہی تھی۔ بارش ہونے سے سردی اور چمک گئی تھی۔ اس حالت میں اس نے پوری رات جاگ کر اپنے سامنے پانچ منجنیقیں لگوائیں۔

پھر ایک جنگ کے دوران سلطان کو اس کے نوجوان بیٹے اسمٰعیل کی موت کی خبر ملی۔ سلطان نے یہ واقعہ کسی دوسرے سے بیان نہیں کیا اور نہ یہ ظاہر ہونے دیا کہ اس پر کیسا افسوس ناک واقعہ گزرا ہے۔ البتہ جب وہ بیٹے کے انتقال کا خط پڑھتا تو آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ اسی طرح نوجوان بھتیجے تقی الدین کی موت کی خبر آئی تو اتنا رنج ہوا کہ ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ تقی الدین سے اسے بے حد محبت تھی۔ مگر اس نے صرف چند خاص لوگوں کو یہ خبر بتائی اور انہیں تاکید کردی کہ خبر عام نہ ہونے پائے۔ سلطان کو اپنے بچوں سے بڑی محبت تھی مگر خدا کی راہ میں سب کو چھوڑ دیا۔

سلطان صلاح الدین صرف مجاہد ہی نہیں بلکہ اخلاق و کردار کا بھی مکمل نمونہ تھا۔ بیماری کی حالت میں بھی امام کو گھر سے بلا کر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتا تھا۔ ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ سلطان صلاح الدین ایوبی نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کی تمدنی اور علمی زندگی کے لیے بہت سے کام کیے۔ اس نے اپنی ساری سلطنت میں مدرسے اور کالج قائم کیے۔ بڑے بڑے شہروں میں مسافر خانے، شفاخانے اور مسجدیں اور سرائیں تعمیر ہوئیں۔ صوفیوں کے لیے خانقاہیں بنوائیں۔ سلطان پر خدا کی لاکھ لاکھ رحمتیں ہوں۔ آیئے اس کے حق میں دعائے خیر کریں کیونکہ اس عظیم فاتح نے اپنی پوری زندگی اسلام کے پھیلانے میں صرف کردی۔

''بیت المقدس۔ عظمت اور قدامت''

دنیا کی تمام زبانوں کے مؤرخین اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ دنیا کا کوئی شہر بیت المقدس (یروشلم) سے زیادہ قدیم نہیں ہے اور شاید تاریخ اس کے قدیم دور کی داستان محفوظ نہ کر سکی۔ بہرحال جس حد تک تاریخ بتاتی ہے اس کے مطابق یہاں پہلے پہل آل سام ۲۵۰۰ یعنی ڈھائی ہزار سال قبل مسیح آباد

ہوئے۔

آل سام کے یہ قبائل جزیرۃ العرب سے ہجرت کر کے یہاں پہنچے تھے۔ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہ قبائل کنعانی یا فونیقی تھے۔ان قبائل کی ایک شاخ مجوسیوں کے نام سے بھی مشہور تھی۔

۲۰۰۸ (ق۔م) میں شاہ لیم یا شالیم بادشاہ کی حکومت تھی اور سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ شہرار جو دریائے دجلہ اور فرات کے سنگم پر واقع تھا، سے ہجرت کر کے اس علاقے میں پہنچے تھے اور حبرون کے مقام پر قیام کیا تھا۔یہی حبرون بعد میں ''الخلیل'' کے نام سے مشہور ہوا تھا۔ اس علاقے میں برآمد ہونے والی تختیوں اور مقدس کتابوں کی روایات سے یہ پتا چلتا ہے کہ یہاں کا حاکم بھی حضرت ابراہیمؑ کی طرح ہی عبادت کرتا اور خود کو خدا کا بھیجا ہوا فرشتہ بتاتا تھا۔

کتاب پیدائش اور ابن کثیر کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ حضرت ابراہیمؑ خاص قوت اور طاقت کے مالک ہو گئے تھے۔

پھر جب دمشق کے بادشاہوں نے جناب لوطؑ سے جو وادئ اردن میں مقیم تھے، گستاخی کی تو حضرت ابراہیمؑ اپنے آدمیوں کو لے کر دمشق والوں سے برسر پیکار ہوئے اور انہیں شکست سے دو چار کر کے دمشق تک ان کا تعاقب کیا تھا۔

اس سلسلے میں ابن کثیر کا بیان ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ اس فتح کے بعد لوٹے تو بیت المقدس کے بادشاہ نے جو مصر کا باجگزار تھا، شہر سے باہر نکل کر حضرت ابراہیمؑ کا استقبال کیا۔ یہ بادشاہ یبوسی تھا۔ کتاب پیدائش اور قدیم عرب مؤرخین کی روایت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اسی وادی سے حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو وادی فاران میں چھوڑ گئے تھے اور حضرت ابراہیم نے ۱۷۵ سال کی عمر میں انتقال کیا تو اس شہر کی وادی حبرون میں مدفون ہوئے۔ان کی وفات کے چالیس سال بعد حضرت یعقوبؑ نے بیت المقدس کے ایک مقام پر ''بیت ایل'' پر ایک مذبح تعمیر کیا جس کے کھنڈرات پر صدیوں بعد حضرت سلیمانؑ نے ہیکل کی عمارت بنائی۔

چنانچہ کتاب پیدائش میں ہے۔

یعقوب ان سب لوگوں سمیت جو ان کے ساتھ تھے، لوز پہنچا۔ بیت ایل یہی ہے اور ملک کنعان میں ہے۔ وہاں اس نے مذبح بنایا اور اس کا نام ایل ''بیت ایل'' رکھا۔

اور جب حضرت یعقوبؑ عرصہ دراز تک جلا وطنی گزارنے کے بعد واپس آئے تو ان کا نام ''اسرائیل'' ہو گیا۔ ان کی یہ جلاوطنی اپنے بڑے بھائی اُدوم کے خوف سے تھی۔ جب وہ بھائی سے مطمئن ہو گئے اور واپس آئے تو بھائی اُدوم نے ایثار کرتے ہوئے ''اُدومیا'' کی طرف پسپائی اختیار کی۔ حضرت ایوب اُدوم کے بیٹے تھے اور حضرت ابراہیم کا دور بائیسویں صدی قبل مسیح بیان کیا جاتا ہے۔

ایل بیت ایل (یعنی بیت ایل کا خدا) کی اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں کہ حضرت یعقوبؑ نے بیت ایل میں خدا کو ''عالم رویا'' میں دیکھا تھا اور اس کی یاد میں وہاں ایک مذبح بنایا تھا۔

حضرت یعقوبؑ کے صاحب زادے حضرت یوسفؑ جب مصر پہنچے اور بادشاہ ہوئے تو حضرت ابراہیم کے پوتے اسرائیل (یعقوب) کی اولاد اپنے جدامجد کی وفات سے ڈیڑھ سو سال بعد مصر منتقل ہو گئی اور اسے خوب عروج حاصل ہوا۔لیکن حضرت یوسفؑ کے انتقال کے بعد یہ قوم معتوب ہوئی۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا اور مصر میں آمد سے چار سو سال بعد

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس میں معبوث فرمایا جنہوں نے اسے فرعون کے ظلم واستبداد سے نجات دلائی اور بنی اسرائیل دریائے نیل پار کرکے وادی سینا میں داخل ہوگئے۔

یہ قوم اپنے نبی کی نافرمان اور احسان فراموش ثابت ہوئی اور بتوں کی پوجا کرنے لگی اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اسے ڈانٹ پلائی تو وہ ان پر چڑھ دوڑی۔ مگر اللہ نے اپنے کلیم (موسیٰ) کی حفاظت فرمائی۔ اس کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو بیت المقدس میں داخل ہونے کا حکم دیا تو یہ قوم فرمانِ پیغمبر کی تعمیل سے گریزاں ہوئی اور صاف کہہ دیا۔

''تو اور تیرا رب جائے۔ ان سے لڑے۔ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔''

بنی اسرائیل کی یہ گستاخی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ناگوار گزری۔ انہوں نے یہ سزا دی کہ جب تک موجودہ نسل کے تمام بالغ مر نہیں جاتے وہ وادیٔ ''تیہ'' میں ہی بھٹکتی پھرے۔

طبری کے مطابق یہ عرصہ چالیس سال پر محیط ہے۔ اس عرصہ میں ہلاک ہونے والے یہودیوں کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ بتائی گئی ہے۔ بیت المقدس میں وہ دوسو سال بعد داخل ہوئے۔

تواریخ میں درج ہے کہ یشوع بن نون نے ۱۴۵۱ قبل مسیح میں بیت المقدس پر حملہ کیا تھا۔ اس زمانہ میں ''اَدونی صدق'' یروشلم کا بادشاہ تھا۔ حبرون، یرموت، لکیس اور عجلون کے بادشاہ اس کے معاون و مددگار تھے اور وہ سب کے سب عموری تھے۔ یشوع نے انہیں جبعون کے مقام پر شکست دی۔ پانچوں بادشاہ مارے گئے اور کنعان پر بنی اسرائیل کا قبضہ ہوگیا۔

بائبل کے مطابق یروشلم اس وقت بھی مقدس شمار ہوتا تھا۔ اسرائیل نے کامیابی کے بعد ''حبرون'' کو اپنا دارالحکومت قرار دیا اور ان کی سلطنت اردن، شام اور یمن کی سرحدوں تک جا پہنچی۔ آثارِ قدیمہ کی کھدائی بتاتی ہے کہ یشوع بن نون کی آمد سے پانچ سو سال قبل برنجی دور شروع ہو چکا تھا۔ اور مقامی لوگ تانبے اور ٹین ڈھال کر نئی دھات کا استعمال کرتے تھے۔

بائبل گواہ ہے کہ جب بنی اسرائیل فراعنہ مصر کے تحت ذلت کی زندگی گزارنے اور چالیس سال تک وادی تیہ میں بھٹکنے کے بعد فلسطین میں داخل ہوئے تو اس وقت حضرت ابراہیمؑ کو انتقال کیے تقریباً پانچ سو سال گزر چکے تھے اور اس وقت بنی اسرائیل حد درجہ خدا پرست ہوگئے تھے۔

یشوع بن نون نے ارض فلسطین کی تقسیم میں یروشلم، یہوداہ کو دیا۔ لیکن بائبل کا بیان ہے کہ یہوداہ نے اپنے بھائی شمعون کی مدد سے لڑکر اس شہر پر قبضہ کیا اور یہ واقعہ ۱۴۰۰ قبل مسیح کا ہے۔

بائبل گواہی دیتی ہے کہ باوجود اس کے کہ یہوداہ نے یروشلم میں لوگوں کو تہہ تیغ کرنے اور شہر تباہ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ بنی بنیمین جنہیں یہوداہ آگے بڑھتے ہوئے شہر کی نگرانی سونپ گیا تھا۔ یبوسیوں کو جو یروشلم میں رہتے تھے۔ انہیں نہ نکال سکے۔ پھر جب بنی اسرائیل طاقت کے زور پر راہِ ہدایت سے بھٹک گئے اور انہوں نے احکامِ الٰہی کو پسِ پشت ڈال دیا اور وہ جذبہ جس نے انہیں فاتح بنایا تھا، دم توڑ گیا تو وہ ذلیل ہوگئے۔ البتہ کبھی کبھی ان میں سے کسی کی غیرتِ ایمانی جوش مارتی اور ان کے جذبہ کو ہوا دیتی تو وہ وقتی طور پر اُبھر آتے لیکن اس کی موت کے ساتھ پھر ذلت و رسوائی میں ڈوب جاتے تھے۔ یہاں تک کہ یبوسیوں نے انہیں وہاں سے

نکال دیا اور یروشلم ان کے لیے اجنبی شہر بن گیا۔
اس دور میں ان پر قاضی حکومت کرتے تھے لیکن ان کی قومی زندگی طوائف الملو کی کا شکار تھی کہ ہر شخص اپنی مرضی کا مالک تھا۔ خود قاضی اور کاہن اپنی قوم کی بداعمالیوں میں برابر کے شریک تھے۔ اللہ نے سموئیلؑ نبی کو جو یہودیوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد دوسرے نبی شمار ہوتے ہیں، معبوث فرمایا۔
سموئیلؑ نبی نے یہودیوں کو صنم پرستی سے چھٹکارا اور فلسطینیوں کی غلامی سے نجات دلوائی۔ چنانچہ اللہ کی شریعت پر عمل کرنے سے اسرائیلیوں پر ماضی کی شان و شوکت لوٹ آئی۔ حضرت سموئیلؑ جب اپنی آخری منزل پر پہنچے تو انہوں نے بنی اسرائیل کی منشا کے مطابق ان پر حضرت طالوت کو بادشاہ مقرر کر دیا۔ ان کے حاکم ہونے کے تیس سال قبل یعنی ۱۰۵۰ ق۔ م شدودی، بنی اسرائیل کو شکست دے کر تابوت سکینہ لے گئے تھے جو سات ماہ بعد انہوں نے خود ہی واپس کر دیا تھا۔
۱۰۲۰ ق۔م میں طالوت کو بادشاہت ملی اور اس کا سارا عرصہ فلسطینیوں سے لڑائیوں میں گزرا۔ ان جنگوں میں ایک نوجوان نے تلوار کے خوب جوہر دکھائے اور مشرکین کا سالار اعلیٰ جالوت بھی اس جوان کے ہاتھ سے مارا گیا۔ یہ نوجوان حضرت داؤدؑ تھے۔
یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ سموئیلؑ نبی کی آمد تک یہود باقاعدہ قوم کی حیثیت حاصل نہیں کر سکے تھے بلکہ ان کے قبائل کی انفرادیت برقرار تھی اور وہ ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ اس صورت حال نے انہیں شدید نقصان پہنچایا تھا۔ حضرت سیموئیلؑ آئے تو ان کی قبائلی انفرادیت ختم کر کے اسے ایک متحد قوم کی صورت دے دی۔
سیموئیلؑ ایک روحانی آمر تھے۔ وہ ایک وقت میں بادشاہ بھی تھے اور رہنما بھی اور انہیں قاضی القضات، استاد اور ایک پیغمبر کے فرائض انجام دینا پڑے۔ اگرچہ انہوں نے مخالف قبائل کو اکٹھا کر دیا لیکن ساؤل (طالوت) کے عہد میں بھی ان کی قبائیلی عصبیت نہ ختم ہو سکی۔ پھر حضرت داؤدؑ کا زمانہ آیا۔ یہود کا پہلا دارالحکومت حبرون تھا۔ طالوت کی تخت نشینی اسی شہر میں ہوئی اور وہ یہیں سے فوجی جنگوں اور شہری مہموں کی نگرانی کرتا رہا۔ طالوت شاہی آداب کا حامل تھا۔
انسائیکلوپیڈیا میں اس شہر مقدس کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔
یہ ۳۳ صدیاں پرانا شہر ہے۔ اس نے قدرت اور انسانوں کے ہاتھوں تکلیفیں ہی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ یہ شہر کئی بار اجڑا اور بسا اور کئی بار زلزلوں نے اسے کھنڈر بنا دیا۔ بیت المقدس کا بیس مرتبہ محاصرہ کیا گیا اور اٹھارہ مرتبہ یہ اجڑ کے دوبارہ تعمیر ہوا۔
ہادریان اور بخت نصر کے عہد میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تھی۔ اس مقدس شہر پر مذہب کی تبدیلی کے چھ دور گزرے ہیں۔ بیت المقدس پر وہ وقت بھی آیا کہ اسے برباد کر کے زمین کے برابر کر دیا گیا۔ اس کے گلی کوچے اور عمارتیں برباد اور شہری جلا وطن ہوئے۔
''مختلف نام''
اس شہر مقدس کو مختلف قوموں نے مختلف ناموں سے نوازا۔ یہودی اور عیسائی آج بھی بڑے فخر سے ''یروشلم'' کہتے ہیں۔ اس کا سب سے پرانا نام جیبوس (Jebus) ہے۔ یروشلم کا نام حضرت داؤدؑ کے عہد مبارک میں اختیار کیا گیا لیکن یہودی ربیوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منسوب کرنے کے لیے یہ کہا کہ آپ نے اسے جریح (Jereh) کہا

تھا اور ''شلم'' کا اضافہ ''شیلم یا شالیم'' نے کیا جو ۲۰۰۰ ق۔م میں یہاں کا حاکم تھا۔ مگر رینالڈ اور ایوالڈ کا کہنا ہے کہ یہ دو طبرانی الفاظ ''یرو'' اور ''شلم'' کا مرکب ہے جس کے معنی ورثہ امن Inheritrence of Peace ہے۔ ایک دوسرے یورپی مؤرخ نے اس کے معنی ''اساس امن'' قرار دیئے ہیں۔ اس طرح بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دو شہر جبلس اور سلم تھے جو ایک ہو گئے اور نام بھی مرکب ہو گیا۔ جو لوگ اسے دو طبرانی لفظوں کا مرکب قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک اصل لفظ نام ''جروزلم'' ہے۔ بعض اسے عبرانی زبان کا مرکب قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ یاقوت نے ''بری شلم'' بغیر تشدد کے لکھا ہے جو یہودیوں کے زمانے میں مروج تھے لیکن مسلمانوں نے ہمیشہ اسے ''بیت المقدس'' یا ''پاک ترین مقام'' کے نام سے پکارا ہے۔

قیصر ہادریان نے یہودیوں سے خالی کرانے کے بعد ۱۳۰ میں شہر کو ''ایلیا کاپی تولی نا'' کے نام سے پکارا ہے۔ اس کا پہلا جز ''الیا'' کی شکل میں عربی میں محفوظ رہا۔ عربوں کے لیے یہ بے معنی لفظ تھا لہٰذا طرح طرح کے افسانے مشہور ہو گئے۔

یاقوت لکھتا ہے۔

کعب کی سند سے روایت کی جاتی ہے کہ اس مقدس شہر کا نام ''الیا'' اس لیے ہوا کہ اسے ایک عورت الیا نے آباد کیا تھا۔ ایک اور جگہ لکھا ہے کہ الیا کے معنی بیت اللہ کے ہیں۔ ایک روایت میں یہ بھی نقل ہے کہ یہ اپنے بانی الیا کے نام پر ہے جو روم بن سام بن نوح کا بیٹا تھا اور دمشق، حمص اور فلسطین اس کے بھائیوں کے نام تھے۔

شعرائے کرام نے یروشلم کو کہیں کہیں ''البلاط'' کے نام سے بھی یاد کیا ہے جس کے معنی دربار یا شاہی محل ہے۔ اس کے علاوہ اسے ''گولڈن سٹی'' یعنی سنہری شہر بھی کہا جاتا ہے جو اب تک رائج ہے۔ یہ اس لیے کہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کی کرنوں سے سنہری پتھروں سے بنے مکانات جگمگا اٹھتے ہیں۔

بیت المقدس کو امن کا شہر (City of) Peace بھی کہتے ہیں لیکن جب اس کو اس نام سے پکارا جاتا ہے تو تاریخ اس نام کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتی ہے کیونکہ اس شہر کی قدیم تاریخ میں مشکل سے بیس سال ایسے ملیں گے جن کے دوران یہاں کے باشندوں کو امن و سکون دیکھنا نصیب ہوا ہو۔ ورنہ نوع انسانی کی خونچکاں تاریخ یہاں اپنے آپ کو بار بار دہراتی ہے۔

ان واقعات کو اگر یکجا کیا جائے تو یہاں کی لڑائیوں کی فہرست مکمل نہیں ہو سکتی۔ مجروح ہونے والوں اور مرنے والوں کی گنتی انسان کو تھکا دیتی ہے اور یہاں کی لڑائیوں کی فہرست مرتب کرنے کے لیے عمریں درکار ہیں۔ اس کے باوجود یروشلم یا بیت المقدس اپنی جگہ موجود ہے۔ اس کی تقدیس میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔

یہ کرۂ ارض کی مختلف اقوام کے لیے آج بھی امن کا شہر ہے۔ یہودیوں نے اسے اس وقت مقدس قرار دیا جب انہوں نے ''اِنٹی اوکس اپی فینس'' کو شکست دی۔ یہ دو سو قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ عیسائیوں کے نزدیک یہ اس لیے مقدس ہے کہ ''صلیب المصلوب'' اسی جگہ تھی۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی شہر میں مصلوب ہوئے لیکن مسلمانوں کے دین نے روزِ اول ہی سے اسے مقدس قرار دیا ہے۔ اس کی بنیاد یبوسی بادشاہ صادق ملیک نے رکھی، جو ایک عرب تھا۔

جب حضرت یعقوبؑ عرصہ دراز جلاوطنی میں

گزارنے کے بعد واپس آئے تو اس کا نام ''اسرائیل'' ہو گیا۔ ان کی جلاوطنی اپنے بڑے بھائی ادوم کے خوف سے تھی۔ جب وہ بھائی مطمئن ہو گئے اور واپس آئے تو بھائی ادوم نے ایثار کرتے ہوئے ادومیا کی طرف پسپائی کی۔ حضرت ایوبؑ نے بیت ایل میں خدا کو رویا میں دیکھا اور اس کی یاد میں وہاں ایک مذبح بنا دیا۔

حضرت یعقوبؑ کے بیٹے حضرت یوسفؑ جب امتدادِ زمانہ میں مصر پہنچے اور بادشاہ ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ کے پوتے اسرائیل (یعقوبؑ) کی اولاد اپنے جدِ امجد کی وفات سے ڈیڑھ دو سو برس بعد مصر میں منتقل ہو گئی اور اسے خوب عروج حاصل ہوا۔ لیکن حضرت یوسفؑ کے انتقال کے بعد یہ قوم معتوب ہوئی۔ حتیٰ کہ اللہ نے رحم فرمایا اور مصر میں آمد کے چار سو سال بعد حضرت موسیٰ کو اس میں معبوث کیا۔ جنہوں نے اسے فرعون کے پنجہ ظلم و ستم سے نجات دلائی اور بنی اسرائیل دریائے نیل پار کر کے وادی سینا میں داخل ہو گئے۔

یہ قوم اپنے نبی کی نافرمان اور احسان فراموش ثابت ہوئی اور بتوں کی پوجا کرنے لگی۔ اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اسے ڈانٹ پلائی تو ان پر چڑھ دوڑی۔ مگر اللہ نے اپنے کلیمؑ کی حفاظت فرمائی۔ اس کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو بیت المقدس میں داخل ہونے کا حکم دیا تو یہ قوم ان کے حکم کی تعمیل سے نافرمان اور گریزاں ہوئی اور صاف کہہ دیا۔

''تو اور تیرا رب جائے۔ ان سے لڑے۔ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔''

بنی اسرائیل کی یہ گستاخی خداوند اور موسیٰ علیہ السلام کو ناگوار گزری اور انہیں یہ سزا دی کہ جب تک موجودہ نسل کے تمام بالغ مر نہیں جاتے وہ وادیٔ ''تیہ'' میں ہی بھٹکتی رہی۔

طبری کے مطابق یہ عرصہ چالیس سال پر محیط ہے۔ اس عرصہ میں ہلاک ہونے والے یہودیوں کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ بتائی گئی ہے۔ بیت المقدس میں وہ دو سو سال بعد داخل ہوئے۔

تاریخ کے مطابق یشوع بن نون نے ۱۴۵۱ قبل مسیح میں بیت المقدس پر حملہ کیا۔ اس زمانہ میں ''اُدونی صدق'' یروشلم کا بادشاہ تھا۔ حبرون، یرموت، لکیس اور عجلون کے بادشاہ اس کے معاون و مددگار تھے اور وہ سب کے سب عموری تھے۔ یشوع نے انہیں جبعون کے مقام پر شکست دی۔ پانچوں بادشاہ مارے گئے اور کنعان پر بنی اسرائیل کا قبضہ ہو گیا۔

بائبل کے مطابق یروشلم اس وقت بھی مقدس شمار ہوتا تھا۔ اسرائیل نے کامیابی کے بعد ''حبرون'' کو اپنا دارالحکومت قرار دیا اور ان کی سلطنت اردن، شام اور یمن کی سرحدوں تک جا پہنچی۔

آثارِ قدیمہ کی کھدائی بتاتی ہے کہ یشوع بن نون کی آمد سے پانچ سو سال قبل برنجی دور شروع ہو چکا تھا۔

''حضرت داؤدؑ''

حضرت داؤدؑ نے اسرائیلیوں کی متحدہ طاقت کے ساتھ جنوب کی طرف سے ''بیت المقدس'' پر حملہ کیا۔ زیریں حصہ با آسانی فتح ہو گیا مگر بالائی حصے کے مکین ڈٹے رہے اور حضرت داؤدؑ کی یوں تضحیک کی کہ لولے لنگڑے لوگوں کو فصیل پر چڑھا کر کھڑا کر دیا اور پیغام بھجوایا کہ پہلے انہیں قابو میں لایئے۔

اس پر حضرت داؤدؑ نے زبردست حملہ کیا اور آخر بالائی شہر فتح ہو گیا۔ حضرت داؤدؑ کی فوج تقریباً اسی

ہزار تھی۔ شہر پر قبضہ کے بعد حضرت داؤدؑ نے یبوسیوں کو شہر بدر کر دیا۔ اس سے پورے فلسطین پر ان کی حکومت قائم ہوگئی اور ان کی عظمت میں بے حد اضافہ ہوا۔

ہمسایہ سلطنتیں خوف زدہ ہو کر متحد ہوگئیں اور حضرت داؤدؑ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا لیکن وہ یروشلم تک نہ پہنچ سکیں بلکہ اثنائے راہ میں شکست کھا کر پسپا ہوگئیں جس کے بعد حضرت داؤدؑ کی طاقت سے مرعوب ہو کر بہت سے ہمسایہ حکمرانوں نے ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔

جنگ اور صلح کے اسی دور میں حضرت داؤدؑ نے بالائی اور زیریں شہر کو ایک کر دیا اور شہر کے گرد ایک مضبوط فصیل تعمیر کرائی۔ اس کے علاوہ جبل زیتون پر شاہی محل اور وادی میں شاہی باغ تعمیر کرایا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بنی اسرائیل نے یروشلم پر قبضہ کیا۔

حضرت داؤدؑ کو اپنے بقیہ دورِ حکومت میں سکون نہ مل سکا۔ البتہ ان جنگوں کا نتیجہ ان کے حق میں مفید نکلا۔ بنی اسرائیل جو اب تک قبائلی عصبیت کا شکار تھے اور مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے وہ سب ایک قوم بن گئے اور بنی اسرائیل کی عزت و وقار میں اضافہ ہوا۔ مالِ غنیمت اور دوستی کے خواہاں حکمرانوں کے نذرانوں سے خزانہ بھر گیا۔ شہر کی دولت میں اضافہ ہوا اور لوگ خوش حال ہوگئے۔

”تابوت سکینہ“

اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی ہڈیاں اور کپڑے بند تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے اپنے ہمراہ لائے تھے اور حضرت داؤدؑ سے قبل فلسطینی اسرائیلیوں کو شکست دے کر اسے اپنے ساتھ اشدود لے گئے تھے۔

حضرت داؤدؑ کی زبردست خواہش تھی کہ وہ اس کے لیے ایک مستقل گھر بنائیں تاکہ یہ چیزیں محفوظ رہ سکیں۔ مگر اسرائیلیات کے مطابق اللہ نے انہیں بتایا کہ اللہ کا مستقل گھر ان کے بیٹے کے عہد میں تعمیر کیا جائے گا۔ اس سے وہ بددل نہیں ہوئے بلکہ وہ اس کی تعمیر کے لیے ضروری سامان جمع کرتے رہے۔ انہوں نے لبنان سے دیودار کی لکڑی منگوائی۔ آرائش کے لیے مختلف علاقوں سے قیمتی پتھر حاصل کیے۔ الغرض وہ اپنے بیٹے کا کام آسان بنانے کے لیے متواتر مصروف رہے۔ یہاں تک کہ آخری ایام میں اپنے بیٹے سلیمانؑ کو اس گھر، معبد یا ہیکل کا وہ خاکہ بھی تفصیلاً سمجھا دیا جسے انہوں نے عالم رویا میں دیکھا تھا۔

۱۰۱۵ ق۔م میں ان کا انتقال ہوا اور حضرت سلیمانؑ تخت نشین ہوئے۔ ان کی سلطنت ایک طرف یمن اور دوسری طرف فرات تک پھیل گئی تھی۔ چنانچہ ۱۰۱۲ ق۔م میں انہوں نے ہیکل کی تعمیر شروع کرائی۔

ہیکل اسی جگہ تعمیر ہوا جسے حضرت داؤدؑ نے منتخب کیا۔ مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہودی کبھی بھی اچھے معمار نہیں رہے۔ اس لیے حضرت سلیمانؑ نے ہیکل کی تعمیر کے لیے لبنان اور مصر سے معمار منگوائے۔ ہیکل کی تعمیر سات سال تک جاری رہی اور دو لاکھ آدمی کام کرتے رہے۔ بے شمار دولت خرچ ہوئی۔ حضرت داؤدؑ وراثت میں ایک کروڑ تیس ہزار پونڈ سونا اور ۱۲۷۰ ہزار پونڈ چاندی چھوڑ گئے تھے۔ اس دولت کے علاوہ شہزادوں کے نذرانے اور دنیا کے زرخیز ترین خطہ کا سات سالہ ریونیو بھی اس میں خرچ ہوا۔

بائبل کی کتاب سلاطین میں دی گئی تفصیل کے مطابق ہیکل سلیمانی بلاشبہ فن تعمیر کا ایک عظیم شاہکار تھا۔ اس کی لمبائی ۹۰ فٹ، چوڑائی ۳۰ فٹ اور اونچائی

پینتالیس فٹ تھی اور اس کے اندر پاک ترین جگہ بنائی گئی تھی جہاں خداوند کے عہد کا صندوق (تابوت سکینہ) رکھا گیا۔

تابوت سکینہ بخت نصر کے حملے کے بعد ایسا غائب ہوا کہ آج تک اس کا سراغ نہ لگایا جا سکا۔ ہیکل سلیمانی کی عمارت کوہ موریہ پر قبۃ الصخرہ سے مغرب میں کچھ دور واقع تھی۔

کہا جاتا ہے کہ ہیکل سلیمانی اس دور کے فن تعمیر کا شاہکار تھا۔ اس وقت تک اس سے بہتر اور کوئی عمارت نہ تھی۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ربیوں اور خادموں کے لیے بھی رہائش گاہیں بنائیں۔ اس طرح آئندہ آنے والا ہر بادشاہ اس کی بارہ دریوں اور برآمدوں میں اضافہ کرتا رہا۔ حتیٰ کہ ''تابوت سکینہ'' کا کمرہ ان مختلف ادوار کی عمارتوں میں چاروں طرف سے گھر گیا۔

''حضرت سلیمانؑ کا محل''

حضرت سلیمانؑ نے اپنے لیے بھی ایک عظیم محل تیار کرایا تھا جو ہیکل سلیمانی کے بعد دوسری عمارت تھی۔ اس کی تعمیر پر تیرہ سال کا عرصہ لگا تھا اور اس کی اہم عمارت ۱۵۰ فٹ لمبی، ۷۵ فٹ چوڑی اور ۴۵ فٹ اونچی تھی۔ اس عمارت کی تین منزلیں تھیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی شان و شوکت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ خادموں اور نجی ملازموں کی تعداد ہزاروں کے اوپر تھی۔ کھانے کی میز اور برتن سونے کے تھے۔ ان کی اس شان و شوکت نے ساری دنیا کو حیران کر دیا تھا۔

چنانچہ ''ملکہ بلقیس سبا'' بھی متاثر ہوئی اور ایک عظیم فوج کے ساتھ شاہانہ وقار سے یروشلم میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے کارواں میں سیکڑوں اونٹ تھے جو خوشبوؤں سے لدے ہوئے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بیت المقدس نے اس کے بعد آج تک کہیں ایسی خوشبوئیں نہیں دیکھیں۔ مزید برآں سونا اور بیش قیمت جواہرات تھے اور ایک اندازے کے مطابق ملکہ ۱۲۰ قنطار سونا لائی تھی۔

جوفیس لکھتا ہے کہ حضرت سلیمان نے شہر پناہ کو اور مضبوط کیا اور ہیکل کی پہاڑی کو فصیل کے اندر لے لیا۔ شہر کو پانی کی فراہمی کے لیے دور کی وادیوں سے نہریں کھودی گئی تھیں۔ چشمے اور حوض بنائے گئے تھے۔ ان میں سے کنواری کا چشمہ آج بھی دور سلیمانی کے فنِ تعمیر کا عظیم شاہکار ہے۔

انہوں نے دوسری عمارتیں بھی بنائیں۔ سڑکوں کو پختہ کرایا۔ چنانچہ بیت المقدس اپنے دور کا خوب صورت ترین شہر بن گیا اور عظیم تجارتی کارواں اس شہر تک آنے لگے۔

حضرت سلیمانؑ نے ایک بحری بیڑہ بنایا تھا جو ہرکولیس کے روایتی شہر اور برطانیہ تک جاتا تھا۔ کولمبس نے جب شمالی امریکا دریافت کیا تو اس کا خیال تھا کہ حضرت سلیمانؑ کی دولت کا خزانہ ویسٹ انڈیز میں ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سلیمانی بحریہ نہایت فعال تھی اور دور دور تک پہنچتی تھی۔ مختصر یہ کہ حضرت سلیمانؑ کے دور میں سلطنت اسرائیل اپنے عروج پر تھی۔

حضرت سلیمانؑ علیہ السلام کا انتقال ۹۷۵ ق۔م میں ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ان کی سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ جنوبی سلطنت یہودا تھی جس میں روم اور جنوبی فلسطین شامل تھا اور اس کا صدر مقام یروشلم تھا۔

دوسری شمالی سلطنت اسرائیل جو شمالی فلسطین اور شرق اردن پر مشتمل تھی۔ اس کا دارالسلطنت سامرہ (نابلس) قرار پایا۔ جنوبی حکومت کا بادشاہ رحعام بن

سلیمان اور شمالی کا پربعام تھا۔ دونوں ریاستوں میں ٹھن گئی اور یہودا نے خدا کے حضور بدی کی اور گناہوں سے اس کی غیرت کو للکارا کیونکہ انہوں نے اپنے لیے ہر اونچے ٹیلے پر، ہر درخت کے نیچے، اونچے مقام، ستون اور یسیرتیں بنائیں یعنی غیراللہ کی پرستش شروع کی۔ اس ملک میں لوطی بھی تھے۔ وہ ان سب سے مکروہ کام کرتے تھے جن کو خداوند نے بنی اسرائیل کے سامنے سے نکال دیا تھا۔

پانچویں سال شاہ مصر سی ساق (سی شاک) نے یروشلم کی طرف پیش قدمی کی اور بغیر کسی مزاحمت کے شہر میں داخل ہو گیا۔ اس نے ہیکل سلیمانی اور شاہی خزانوں کو لوٹا اور عبادت گاہ کی تمام قیمتی چیزیں لے گیا۔

یہ بیت المقدس کے سترہ محاصروں میں سے پہلا اور سب سے کم نقصان دہ حملہ تھا۔ سلیمان کا بیٹا مصر کا باجگزار بن گیا۔ پھر ایسی افتاد شروع ہوئی کہ سلیمان سے ہیرودس اعظم تک بیت المقدس کئی حملہ آوروں کا نشانہ بنا۔ بار بار اندرونی انتشار کا شکار ہوا اور اس پر اتنی مصیبتیں آئیں کہ اس کی ہیئت ہی بدل گئی۔ گہری وادیاں ملبے سے اٹ گئیں اور ان کی حالت اس قدر بگڑ گئی کہ اگر پہلے کا کوئی باشندہ اسے دیکھتا تو پہچان نہ پاتا۔

یہ دونوں ریاستیں آپس میں برابر لڑتی رہیں۔ یہی نہیں بلکہ بنی اسرائیل میں حرام کاری، عیاشی اور بدمعاشی اس قدر بڑھی کہ وہ کم زور ہو گئے اور توحید سے منحرف ہو کر کنعان کے قدیم قبائل کی طرح بت پرستی پر بھی مائل ہو گئے۔ وہ اپنے خدا یہودا کی مورتیاں بنانے اور دیوی دیوتاؤں کی طرح ان مورتیوں سے عجیب و غریب روایات منسوب کرنے لگے۔ انہوں نے توریت میں اپنی حسب منشاء ردوبدل کر لیا۔ ولی اور کاہن اپنے مفادات کے تحت توریت کی عبارتیں تک مسخ کر دیتے۔

اس دور میں جو بھی ان کی اصلاح کے لیے جدوجہد کرتا بنی اسرائیل اس کا مذاق اڑاتے، اذیتیں دیتے اور اسے قتل کرنے سے بھی گریز نہ کرتے۔ پس قدرت نے انہیں سزا دی اور ذلت و رسوائی ان کا مقدر ہو کر رہ گئی۔

جب بنی اسرائیل باہم متصادم اور متحارب تھے اور خدا کے بجائے بتوں کی پرستش کرنے لگے تو ۸۹۹ ق۔م میں جبکہ یہودا کا بادشاہ یہولرام تھا تو فلسطینیوں اور عربوں کی متحدہ طاقت نے یروشلم پر حملہ کیا۔ انہوں نے ہیکل کو لوٹا اور شاہ کے گھر میں گھس کر جو کچھ ملا، لے گئے۔ یہاں تک کہ شاہ، اس کی بیویاں اور بچے سوائے سب سے چھوٹے بچے کے، سب کو قیدی بنا کر لے گئے۔

یہ حملہ محض لوٹ مار کی خاطر تھا۔ اس لیے حملہ آوروں نے شہر کو نقصان نہیں پہنچایا۔ مگر اس حملے کے فوراً بعد شاہ اسرائیل یروشلم پر حملہ آور ہوا۔ اس نے ہیکل کے سونے چاندی کے برتنوں کو سمیٹا اور سامرہ واپس چلا گیا۔

پھر ایک عرصہ تک یہودا کی سلطنت سنبھل نہ سکی بلکہ مقامی باشندوں نے شاہ یہودا ''امصیاہ'' کے خلاف بغاوت کر کے اسے قتل کر دیا اور یوں بیت المقدس بنی اسرائیل کے قبضے سے نکل گیا لیکن امصیاہ کا بیٹا عزیاہ یہودا کا وارث ہوا۔ وہ سولہ برس کا تھا جب تخت سلطنت پر بیٹھا۔ چونکہ وہ خدا کا طالب ہوا اس لیے خدا نے اسے کامیاب کیا اور وہ یروشلم پر اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے معبد اور شکستہ فصیل کی مرمت کرائی۔ اسرائیلی فوج کو از سر نو منظم کیا اور کھیتی باڑی پر بھی توجہ دی۔ لیکن جب

وہ زور آور ہوا تو بہک گیا اور اپنے خدا کی نافرمانی کرنے لگا۔ چنانچہ ایک زلزلہ آیا جس کے جھٹکوں سے شہر کی بنیادیں ہل گئیں۔ شاہی باغ تباہ ہو گیا اور فصیل میں بھی دراڑیں پڑ گئیں۔

عزیاہ کے بعد اس کا بیٹا ''یوتام'' تخت نشین ہوا۔ یوتام انبیاء کی بتائی ہوئی راہ پر قائم رہا اور سولہ برس تک کامیابی سے حکومت کرتا رہا۔ اس کے مرنے کے بعد اضر بادشاہ ہوا۔ وہ انتہائی مکار اور گمراہ تھا۔ اس کے دورِ حکومت میں ۷۴۰ق۔م میں شامی فوجوں نے یروشلم پر حملہ کر دیا۔ شدید جنگ ہوئی اور آخر شام کا مطیع ہو گیا۔ لیکن شامی فوجوں کے لوٹتے ہی شمالی بادشاہت نے حملہ کر دیا۔ یہودا کی کمزور سلطنت مقابلہ نہ کر سکی۔ حملہ آوروں نے شہر کو لوٹا اور دو لاکھ عورتوں کو گرفتار کر کے ساتھ لے گئے۔ لیکن سامرہ پہنچتے ہی انہیں آزاد کر دیا۔ آخر بادشاہ نے ادومیوں اور فلستیوں کے مقابلہ کے لیے شاہ اشد تگلت پلنا سے مدد طلب کی۔ یہ دعوت اس کے لیے خطرناک ثابت ہوئی۔ کیونکہ تگلت پلنا آیا تو سہی لیکن اس کی مدد کرنے کی بجائے ہیکل کا قیمتی سامان لوٹ کر اشوریہ لے گیا۔

اضر کے بعد اس کا بیٹا حزقیاہ پچیس برس کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ اس نے ۷۴۰ق۔م سے ۷۰۰ق۔م تک حکومت کی۔ حزقیاہ نے قوم کو بت پرستی سے نجات دلائی اور ہیکل سلیمانی کی عظمت کو بحال کیا۔ اس کے عہد میں آشوری بادشاہ سنحرب نے یروشلم پر حملہ کیا لیکن ابھی محاصرہ جاری تھا کہ ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑی جس سے اس کے سردار اور جنرل مرنے لگے اور وہ محاصرہ اٹھا کر چلا گیا۔

حزقیاہ کے بعد اس کا بیٹا منسی بارہ برس کی عمر میں تخت سلطنت پر بیٹھا اور یروشلم پر پچپن برس تک حکومت کی۔ اس کے عہد میں بنی اسرائیل پھر راہِ حق سے بھٹک گئے اور بت پرستی نے زور پکڑا اور بدمعاشی اور عیاشی کا غلبہ ہوا۔ جس کے نتیجے میں ۶۶۷ق۔م میں آمور کے سپہ سالاروں نے اس پر حملہ کیا تو یروشلم والے مقابلہ نہ کر سکے۔ حملہ آور منسی کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر بابل لے گئے اور چند سال قید رکھنے کے بعد اسے واپس بھیج دیا۔ پھر بادشاہ ہونے کے بعد منسی نے کچھ تعمیراتی کام کرایا اور بیت اللہ کو بتوں سے پاک کیا۔

منسی کا جانشین بائیس سالہ رمون صرف دو سال حاکم رہا۔ پھر اس کے غلاموں نے اسے قتل کر دیا۔ اس کا بیٹا یوسیاہ ۶۴۳ق۔م میں بادشاہ ہوا۔ اس نے ۳۱ سال تک یروشلم پر حکومت کی۔ اس کے عہد میں ہیکل کی عظمت بحال ہوئی مگر یہ بادشاہ مصری بادشاہ نکوہ سے مقابلہ کرتا ہوا مارا گیا۔ اس کا بیٹا یہواس کا جانشین ہوا۔ پھر فرعون مصر نکوہ نے اسے بھی شکست دی اور تاوان میں ایک سو قنطار چاندی، ایک قنطار سونا وصول کر کے اور یہوآضر کو قید کر کے ساتھ لے گئے اور اس کے بیٹے یقیم کو اپنے باجگزار کے طور پر بیت المقدس میں سلطنت یہودا کا بادشاہ بنایا۔

یہویقیم کی بادشاہت کو گیارہ سال گزرے تھے کہ ۷۹۸ق۔م میں قاہر اور جابر بخت نصر نے حملہ کیا اور یہویقیم کو گرفتار کر کے بابل لے گیا اور اس کے بیٹے یہویاکین کے نام سے اپنے باجگزار کے طور پر یروشلم کا بادشاہ بنایا۔ مصر کے سازشی ربیوں اور کاہنوں کے کہنے پر یہویاکین نے فرعون مصر سے ساز باز کر کے بخت نصر کے خلاف بغاوت کر دی۔ جب بخت کو اس کی خبر ملی تو وہ طیش کے عالم میں بابل سے نکلا اس نے پہلے اس مصری فوج کو جو یہویاکین کی مدد کو آ رہی تھی، شکست دی پھر یروشلم کا محاصرہ کر لیا۔ اس جنگ میں

بے شمار یہودی مارے گئے۔ بادشاہ گرفتار ہو کر قتل ہوا اور دس ہزار گرفتار یہودیوں کے ساتھ بابل پہنچایا گیا۔ بخت نصر نے ہیکل کے قیمتی برتنوں کو سمیٹا اور یہویاکین کے بھائی صوقیاہ سے وفاداری کا حلف لے کر اسے تخت نشین کیا اور خود بابل واپس ہو گیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ صرف چند سال وہاں سکون رہا مگر یہودیوں نے پھر شرارتیں شروع کر دیں۔ موجودہ بادشاہ صوقیاہ، بخت نصر سے باغی ہو گیا۔ یہ تیسری بدعہدی اور بغاوت تھی۔ بخت نصر یہودیوں سے تنگ آ گیا تھا اور اب اس نے فیصلہ کیا کہ وہ یہودی قوم ہی کو ختم کر دے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے لشکر کو یہودیوں کے قتل عام کا حکم دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یروشلم کی گلیاں خون کی ندیاں بن گئیں۔ انہوں نے خدا کے گھر کو بھی پھونک دیا اور اسے زمین کے برابر کر دیا۔ یہاں تک کہ پورا یروشلم خاک کا ڈھیر بن گیا۔ ہر طرف دھواں چھایا ہوا تھا۔

پھر بخت نصر نے یہودیوں کے تمام صحیفے نذر آتش کر دیے اور پچاس ہزار مرد و زن یہودیوں کو قیدی بنا کر واپس ہوا اور انہیں دوسرے علاقوں میں بھاگ جانے کو کہا اور انہیں مار بھگایا۔ یہ یہودیوں کی پہلی قومی تباہی اور بربادی تھی۔ اس الٹ پھیر میں ہیکل سلیمانی کا نام و نشان مٹ گیا اور توریت بھی غائب ہو گئی۔ اس بیان میں ہے کہ بابل کے زمانہ اسیری میں یہودی توریت کو یاد کر کے رویا کرتے تھے اور آج تک اس تباہی کی یاد میں ''سلیمان کے روزے'' رکھتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بابل میں یہودی غلاموں کو دریائے فرات کے کنارے آباد کیا گیا اور انہوں نے اس بستی کا نام ''تل ابیب'' رکھا۔ یعنی یہ اس دور کی یاد تازہ کرتی ہے۔

یہ واقعہ ۵۸۸ ق۔م میں پیش آیا تھا۔ اس کے بعد پچاس سال تک یہ شہر تباہ اور برباد پڑا رہا۔ یہودی زائر ضرور آتے۔ وہ یروشلم کے کھنڈرات پر اسرائیل کی واپسی کے لیے دعائیں مانگتے تھے۔ جو وہاں پہنچ نہ پاتے وہ فرات کے کنارے بیٹھ کر یروشلم کی یاد میں رویا کرتے تھے۔

اس دورِ غلامی میں ''دانیال'' اور ''عزیر'' نبی یہودیوں کی رہنمائی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ صیہونیت کی پہلی تحریک کا آغاز ہوا۔

صیہونیت کا لفظ صیہون سے نکلا۔ صیہون دراصل بیت المقدس کی اس پہاڑی کا نام ہے جہاں حضرت داؤدؑ نے یروشلم فتح کرنے کے بعد جشن منایا تھا۔ بنی اسرائیل اسی نسبت سے صیہون کو مقدس سمجھتے اور یروشلم کو ''دخترِ صیہون'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ صیہونی تحریک کا مقصد یروشلم کو دوبارہ حاصل کرنا اور ہیکل سلیمانی کو از سر نو تعمیر کرنا تھا۔ ایک طویل زمانہ کے بعد ۵۳۹ ق۔م میں جب ایران کے کسریٰ خسرو نے بابل کو فتح کیا تو اس نے عام اعلان کرا دیا کہ یہودی اپنے وطن فلسطین واپس جا سکتے ہیں۔ یوں یہودیوں کے قافلے فلسطین جانے لگے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ سارے یہودی تو واپس نہ جا سکے پھر بھی چالیس پنتالیس ہزار افراد واپس چلے گئے۔ ان جانے والوں کو بخت نصر کے لوٹے ہوئے برتن بھی دے دیئے گئے تھے۔ اس وقت ان کا قائد تھا ''شیس نصر''۔

یہودیوں کی واپسی کے چھ ماہ کے بعد ہی ''ہیکل'' کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ مگر معمار بے دلی سے کام کرتے تھے۔ چنانچہ یہ تعمیر بیس سال میں مکمل ہوئی۔ اس کی تعمیر کا سال ۵۱۶ ق۔م بتایا جاتا ہے۔ اس وقت یہودی فقیہ عزرا نے اپنی یادداشت کی بناء پر ''توریت'' تالیف کی۔ اس توریت میں ردوبدل بھی کیا گیا اور

کچھ باتیں بھی اپنی طرف سے شامل کی گئیں۔

ہیکل اور شہر کی تعمیر کے بعد فصیل شہر کی تعمیر کی اجازت شاہ ایران اردشیر وانی نے نشہ کے عالم میں دی اور یہ فصیل ۴۴۵ق۔م میں مکمل ہوئی۔ پھر جب ۳۳۲ق۔م میں سکندر اعظم نے ایران کے بادشاہ دارا کو شکست دی اور یروشلم کی طرف بڑھا تو چالاک یہودیوں نے سکندر کا مقابلہ کرنے کی بجائے شہر سے تیس میل باہر جا کر اس کا استقبال کیا۔ چنانچہ سکندر نے شہر کو کوئی نقصان نہ پہنچایا۔ یہاں یہ خیال بھی رکھیے کہ سکندر اعظم کا اسی شہر میں انتقال ہوا اور اس کی لاش کو سونے کے تابوت میں بند کر کے اسکندریہ پہنچایا گیا۔

سکندر اعظم کی موت پر اس کی سلطنت کے حصے بخرے ہوئے تو یروشلم مصر کے یونانی حکمرانوں کے حصے میں آیا اور اس دور میں بہت سے یہودی مصر کے دربار میں ملازم ہوئے تھے۔ یہودیوں نے بہت جلد اثر ورسوخ پیدا کر لیا۔ یوں یونانی تہذیب نے یہودیوں کی نجی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔

پھر یروشلم پر ۲۰۳ق۔م میں انطوخیوس اعظم شامی نے حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے صرف چار سال بعد سکندر اعظم کا جنرل ''سکوپس'' پھر یروشلم پر قابض ہو گیا۔ اس نے اپنے مفادات کے لیے شہر میں مستقل طور پر فوج کی چھاؤنی قائم کر دی۔ لیکن شامی بادشاہ نے حملہ کر کے مصریوں کو شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ یہودیوں نے اس وقت انطوخیوس کی مدد کی تھی لیکن یہ بادشاہ یہودیوں کا دوست ثابت نہیں ہوا بلکہ اس نے یہودیوں کے داخلی انتشار کو اور ہوا دی۔

اس کے بعد ۱۷۰ق۔م میں اس شہر کو اپی فین یونانی نے تباہ کیا۔ محلات جلا دیے۔ عبادت گاہیں لوٹ لیں اور لوگوں کو ان کے مذہب سے منحرف کرنے کی کوشش کی۔ جو قانون الٰہی کی کتاب پڑھتا اسے سخت سزا دی جاتی۔

اس زمانہ میں حکابی نام کا ایک کاہن تھا۔ اس نے اپنی تحریک چلائی۔ اس تحریک نے تقریباً اسی ہزار یہودیوں کو قتل کر ڈالا اور جشن فتح منایا۔ اس کی یاد میں آج بھی یہودی ''عید ہوکہ'' کے نام سے مناتے ہیں۔

پھر انطوخیوس مصری نے ۱۶۸ق۔م میں چڑھائی کر کے شہر فتح کر لیا۔ لیکن ۶۵ق۔م میں اندرونی خلفشار پیدا ہوا اور رومیوں نے مداخلت کی اور ارسٹوبوس روم کا باجگزار ہو گیا۔ مگر اس نے خراج ادا نہ کیا اس لیے رومی جنرل پومپائی نے ۶۳ق۔م میں شہر کا محاصرہ کر کے ہیکل تباہ کر دیا۔ مزید یہ کہ بارہ ہزار قیدی اس کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ پھر آئندہ تیئس سال تک شہر قدرے محفوظ رہا۔ پھر ۴۰ق۔م میں جولیس سیزر نے پارتھیں فوجوں کی مدد سے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ اس کی وفات پر اس کا بیٹا ہیرود اعظم یہاں کا بادشاہ بنا۔ اس کے بعد یروشلم کی تاریخ کا وہ دور شروع ہوا جو عظیم دور بھی تھا اور خوفناک بھی۔ ہیرود اعظم کے دور میں بیت المقدس نے دوبارہ سلیمانؑ کے عہد کی عظمت حاصل کر لی۔ اس نے شہر کے گرد تیسری مرتبہ فصیل بنائی اور ہیکل سلیمانی کو از سر نو عظمت بخشی۔ ہیرود نے شہر کی وادیوں میں تھیٹر، سیر گاہیں اور سرکس کے لیے ہال تعمیر کرائے۔

ہیرود کے توسیع شدہ ہیکل کا رقبہ ایک ہزار مربع فٹ تھا مگر شان وشوکت میں سلیمان کے ہیکل سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اس نے ہیکل رعایا کے دل جیتنے کے لیے بنوایا تھا۔ لیکن وہ رعایا کے دل نہ جیت سکا۔

رعیت اس سے نفرت کرتی تھی اور یہودی ربیوں نے کبھی ہیکل کی تعمیر کے سلسلے میں ہیرود کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا۔

ہیرود نے بھی سلیمانؑ کی طرح شہر میں فن تعمیر کے کئی شاہکار قائم کیے۔ ان دنوں (سکندر اور ہیرود) شاہوں پر بیرونی اثرات تھے اور دونوں تعمیر شدہ عمارتیں غیر ملکی فن تعمیر کا نمونہ تھیں۔ حضرت سلیمانؑ نے اس سلسلے میں مصر سے اثر لیا تھا تو ہیرود نے یونان اور روما کی نقل اتاری تھی۔ دونوں نے شہر کے گرد فصیل بنائی اور کوہ حوریہ کو ہیکل سے زینت بخشی۔ حضرت سلیمانؑ نے معبد یہودا سے عقیدت اور اس کی رضا کے لیے تعمیر کیا تھا۔

حضرت سلیمانؑ کے عہد میں شہر مذہبی تھا مگر اس کے بعد ایسے لوگ سامنے آئے جن کی شخصیت عوام کی گمراہی کا سبب بنی۔ انہی لوگوں میں ''یشوع'' تھا جس نے ''ابی اعظم'' ہونے کا دعویٰ کیا اور اپنا نام ''جاسو'' رکھا تھا۔ اس نے ہیکل کے باہر سرکس، اسٹیڈیم اور تھیٹر وغیرہ قائم کیے۔ ہیرود کی سرپرستی میں ان تفریحات کو فروغ حاصل ہوا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ہیرود نے اپنی بھتیجی سے دوسری شادی کی تو حضرت یحییٰ علیہ السلام نے اسے خلاف شرع بتایا اور احتجاج کیا۔ ہیرود نے غصے میں آ [illegible] حضرت [illegible] کا سر کاٹ کر بیوی کو نذر کیا۔ ہیرود کے وقت [illegible] پر تھیں۔ چنانچہ اس کی موت کے [illegible] تین حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ مگر یہ تینوں ریاستیں رومیوں کی باجگزار رہیں۔

''مسیح ناصری''

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت مسیح ہیرود اعظم کے عہد میں پیدا ہوئے۔ ہیرود یہودی نہ تھا بلکہ اہل روم کا باجگزار تھا۔ ہیرود دراصل اودی تھا جو حضرت یعقوبؑ کے بڑے بھائی لیمو کی اولاد تھے۔ یہودی ان سے ناراض تھے مگر انہوں نے پہلے تو کاہن سردار کی لڑکی سے شادی کی پھر بے شمار دولت خرچ کر کے ہیکل کی ازسرنو تعمیر و تزئین کی۔ یہ شخص بڑا ظالم اور سفاک تھا۔ جب اسے ناصرہ میں حضرت عیسیٰؑ کے پیدا ہونے کی خبر ملی تو اس نے ان تمام لڑکوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جن کی عمر دو سال سے کم تھی۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ مرنے سے کچھ وقت پہلے اسے خیال ہوا کہ لوگ اس کی موت کی خبر سن کر خوش ہوں گے تو اس نے فوراً حکم جاری کیا کہ شہر کے تمام سرداروں اور معززین کو بلا کر ایک مکان میں قید کر دیا جائے اور اس کی موت کے بعد ان سب کو قتل کر دیا جائے۔ تاکہ اس کی موت پر لوگ خوش ہونے کی بجائے سرداروں اور معززین شہر کا سوگ منائیں۔

یہ شخص حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے کچھ دنوں بعد مر گیا تھا اور اس کی سلطنت اس کے فرزندوں میں تقسیم کر دی گئی تھی۔ یہودیہ ملک شام کا ایک صوبہ ٹھہرایا گیا اور ''ارخلاؤس'' باپ کی جگہ یہودیہ کا حکمران بنا۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ اس وقت شہر میں دو مذہبی گروہ ''فریسی'' اور ''فقیہ'' تھے۔ ''فریسی'' قدیم یہودیت کی نمائندگی کرتے تھے اور ''فقیہ'' لبرل تھے مگر یہ دونوں گروہ اپنے عقائد میں شدت پسند تھے۔ ان دو کے علاوہ ایک گروہ ایسا بھی تھا جس میں مذہب کا فقدان (لامذہب) تھا۔ وہ انسانی جذبات کو اہمیت دیتے تھے اور عیش و عشرت کو مقصد زندگی کہتے تھے۔ یہ بیت المقدس کے تھیٹروں اور کلبوں کی سرپرستی کرتے تھے۔ پہلے دو طبقوں میں نیک اور سادہ لوگ شامل تھے جبکہ تیسرے طبقہ کی سرپرستی بادشاہ اور اس کے درباری کرتے تھے۔

اس طبقاتی تقسیم کی وجہ سے شہر میں مختلف زبانیں رائج تھیں۔

ا۔ عبرانی۔ یہ زبان صرف ربی اور کاہن، ہیکل کی عبادت کے دوران استعمال کرتے تھے۔

۲۔ آرامی۔ یہ عام فلسطینیوں کی زبان تھی۔ حضرت عیسیٰ اور ان کے حواری آرامی زبان بولتے تھے۔

۳۔ یونانی۔ یہ سادہ زبان شاہی دربار اور کمپ میں رائج تھی۔

ربی اور کاہن دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے اور ان سے نفرت کرتے تھے۔ ان کے خیال میں جو شخص عبرانی نہیں بول اور سمجھ سکتا وہ ''بے روح'' تھا۔

تاریخ کے مطابق حضرت عیسیٰ بارہ سال کی عمر میں بیت المقدس تشریف لائے اور انہوں نے لوگوں کے سامنے خود کو اللہ کا فرستادہ یعنی نبی ہونے کا دعویٰ کیا۔ لوگوں نے ان کے دعوے کو جھٹلایا۔ اس پر حضرت عیسیٰ نے ہیکل کی طرف انگلی اٹھائی اور تباہی کی خبر دیتے ہوئے فرمایا۔

''اس کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ نہیں رہے گی۔''

اس کے بعد وہ ناصرہ لوٹ گئے۔ پھر ۲۹ء میں انہوں نے پانچ مرتبہ وہاں کا دورہ کیا اور ہر مرتبہ انہوں نے یہودیوں کو دعوت حق دی لیکن انہوں نے حق کو تسلیم کرنے کی بجائے انہیں ستانا شروع کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے رومیوں کے ساتھ مل کر حضرت عیسیٰ کو سولی پر چڑھانے کی سازش کی۔ اس زمانے میں بیت المقدس کا حکمران پنطش پلاطس تھا۔ اس نے حضرت عیسیٰ پر الزام لگایا کہ وہ قیصر روم کے خلاف بغاوت پھیلا کر خود بادشاہ بننا چاہتے ہیں۔

حتیٰ کہ انجیل کے مطابق پنطش نے یہودی کاہنوں کے پرزور اصرار پر حضرت عیسیٰ کو صلیب دی جائے، انہیں جواب دیا۔

''میں اس راست باز انسان کے خون سے بری ہوں۔''

مگر اس کے باوجود یہود کے مطالبے ماننے پر مجبور ہو گیا اور حضرت عیسیٰ کو ۱۶ اپریل ۳۰ء کو صلیب پر چڑھا کر ہلاک کر دیا۔ ہمارے عقیدے کے مطابق قرآن پاک نے حضرت عیسیٰ کو مصلوب یا قتل کیے جانے کی تردید کی ہے اور کہا ہے۔

''نہ انہیں قتل کیا گیا نہ مصلوب، بلکہ وہ شبہ میں ڈال دیے گئے اور انہیں اللہ نے اپنی طرف اٹھالیا۔



یروشلم اور دوسری مسلم ریاستیں اور حکومتیں

دنیا کے نقشے اور تاریخ عالم پر اگر نظر ڈالی جائے تو ہمیں معلوم ہو گا کہ بیسویں صدی عیسوی میں اسلامی سلطنتوں کی تعداد ۲۵ بنتی ہے۔ اس لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس دور سے ہمارا ناول تعلق رکھتا ہے اس دور کی اسلامی سلطنتوں کے نام اور اس کے مختصر احوال سے آگاہی حاصل کی جائے۔

بیسویں صدی عیسوی کی اسلامی سلطنتوں کے نام اس طرح ہیں۔

ا۔ البانیہ، ۲۔ ترکی، ۳۔ مصر، ۴۔ سوڈان، ۵۔ لیبیا، ۶۔ تیونس، ۷۔ الجیریا، ۸۔ مراکش، ۹۔ نائیجریا، ۱۰۔ جبوتی، ۱۱۔ صومالیہ، ۱۲۔ تنزانیہ، ۱۳۔ چاڈ، ۱۴۔ ماریٹانیا، ۱۵۔ سعودی عربیہ، ۱۶۔ چھ عرب ریاستیں، اومان، کویت، یمن، قطر، بحرین، متحدہ عرب، ۱۷۔ فلسطین، ۱۸۔ اردن، ۱۹۔ لبنان، ۲۰۔ شام، ۲۱۔ عراق، ۲۲۔ ایران، ۲۳۔ وسط ایشیا کی اسلامی جمہوری ریاستیں، ۲۴۔ افغانستان، ۲۵۔ ملائیشیا۔

مختصر احوال

ا۔ البانیہ

پورے براعظم یورپ میں البانیہ واحد اسلامی ریاست ہے۔ اس کا رقبہ گیارہ ہزار مربع میل سے زیادہ اور اس کی آبادی تقریباً ۲۱ لاکھ ہے۔ جس میں ۷۰ فی صد مسلمان ہیں۔ اس ریاست کا پایۂ تخت ''ترانہ'' اور سرکاری زبان البانوی ہے۔ اس کی زرعی پیداوار گندم، زیتون، مکئی اور تمباکو ہیں۔ معدنیات میں تیل، خام کروم اور لوہے کی دھاتیں قابل ذکر ہیں، یہاں کی مشہور صنعتیں تیل صاف کرنے، شکر تیار کرنے اور پارچہ بافی پر مشتمل ہیں۔

البانیہ پہلے ترکی کے ماتحت تھا مگر ۱۹۱۲ء میں ترکوں نے اسے معاہدہ کے تحت ایک آزاد ریاست کا درجہ دے دیا۔ ۱۹۲۰ء میں اس ریاست نے جمہوری نظام اختیار کیا۔ پھر ۱۹۲۸ء میں اس کے حکمران احمد زوگو نے زوگ اول کے لقب سے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کیا۔ ۱۹۲۹ء میں مسولینی نے اس ملک پر قبضہ کرلیا تو زوگ اول بھاگ گیا۔ ۱۹۴۳ء میں اٹلی نے اتحادی فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ ۱۹۴۴ء میں انور ہوک کی نگرانی میں البانیہ میں نئی حکومت قائم ہوگئی۔ ۱۹۴۶ء میں البانیہ کا نیا دستور نافذ ہوا۔ ۱۹۵۵ء میں البانیہ اقوام متحدہ کا ممبر بن گیا۔ پھر ۱۹۷۰ء میں البانیہ نے چین کے ساتھ معاہدہ کرلیا۔ ایک سال بعد یوگوسلاویہ اور یونان کے ساتھ تعلقات قائم کر لیے۔ اس وقت البانیہ اقوام متحدہ اور اسلامی سیکرٹریٹ کا ممبر ہے۔

۲۔ ترکی

ریاست کا کل رقبہ تین لاکھ ایک ہزار تین سو بیالس مربع میل ہے اور آبادی ایک کروڑ بیس لاکھ آٹھ ہزار سے کچھ زیادہ ہے جن میں مسلمان ۹۹ فی صد ہیں۔ یہودی اور عیسائی بہت قلیل اقلیت میں ہیں۔ مشہور زرعی پیداوار گندم، جوار، مکئی، زیتون اور کپاس ہے۔ معدنیات میں کرومیم، تانبہ، جست، لوہا اور کوئلہ ہیں۔

یہاں کی صنعتوں میں سگریٹ سازی، پارچہ بافی، کاغذ سازی، شیشہ سازی وغیرہ ہیں۔ بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں بلقانی ریاستوں نے متحد ہوکر ترکی کے یورپی مقبوضات ہتھیا لیے تھے۔ اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کرلیا۔ آسٹریا نے بوسنیا اور ہرزیگوینا کے صوبے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے۔ خود ترکی کی سلطنت کے اندر یورپی طاقتوں کو ایسی مراعات حاصل تھیں جن کے باعث ترکی کی حاکمیت اعلیٰ پر کاری ضرب پڑتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ترکی چندروز کا مہمان ہے۔ ۱۹۱۴ء میں جب پہلی عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ چار سال ترکوں نے دادِ شجاعت دیتے ہوئے ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء میں ہتھیار ڈال دیے۔ معاہدہ ہوا کہ ترکی کو یورپی اور ایشیائی مقبوضات سے دستبردار ہونا پڑا۔ ترکی کے پاس صرف قسطنطنیہ اور اناطولیہ کا اندرونی حصہ رہ گئے مگر ترکوں نے مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں جنگ جاری رکھی۔ ۱۹۲۳ء میں معاہدہ لوزان ہوا جس کی رو سے ایڈریانوبل، تھربس اور سحرنا کے علاقے ترکوں نے واپس لے لیے۔ ۱۹۲۴ء میں مصطفیٰ کمال کی خلافت کو ختم کردیا گیا۔ ترکی نے جدید قسم کی جمہوری حکومت قائم کی اور مصطفیٰ کمال اس کے پہلے صدر ہوئے۔ حاکم اعلیٰ بننے کے بعد مصطفیٰ کمال نے ترکی کی معیشت اور معاشرت، تہذیب وثقافت اور قوانین کو مغرب کے ڈھانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی اور وہ اپنی کوششوں میں بڑی حد تک کامیاب رہا۔

۱۹۳۸ء میں مصطفیٰ کمال کا انتقال ہوگیا۔ اس کے انتقال کے بعد ان کے جانشین ان کی پالیسی پر عمل پیرا رہے۔ دوسری عالمگیر جنگ میں ترکی ۱۹۴۵ء تک غیر

جانب دار رہا۔ پھر اتحادیوں کی طرف سے محوری طاقتوں کے خلاف صف آراء ہوا۔ اس جنگ کے اختتام پر ترکی اقوام متحدہ کا ممبر بن گیا۔ آج کل ترکی ایک طاقت ور ملک ہے اور اس کی مالی ساکھ اچھی ہے۔

۳۔مصر

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں مصر کی سیاسی فضا کافی مکدر تھی۔ اس ملک پر برطانوی گرفت روز بروز سخت ہوتی جا رہی تھی۔ مگر غیر ملکی راج کے خلاف قومی جذبہ زوروں پر تھا۔ ان حالات میں ۱۹۰۵ء میں مصطفیٰ کمال پاشا نے مصر کو برطانیہ کی غلامی سے چھٹکارا دلانے کی خاطر ایک نئی قومی تحریک شروع کی جس کا مقصد حصول آزادی کے علاوہ خلافت عثمانیہ سے تعلقات مضبوط کرنا تھا۔ پس اس تحریک نے ملک بھر میں ہر دلعزیزی حاصل کر لی۔

بدقسمتی سے ۱۳ جون ۱۹۰۶ء کو چند مصری کسانوں اور برطانوی سپاہیوں کے درمیان جھڑپ ہوگئی۔ انگریز ایجنٹ لارڈ کرومر یہ خبر سن کر آگ بگولہ ہو گیا۔ اس نے بہت سے کسانوں کو گرفتار کر کے انہیں عبرت ناک سزائیں دیں اور تحریک کو عارضی طور پر دبا دیا۔

اس کے بعد ۱۹۱۳ء میں عالمگیر جنگ شروع ہوگئی۔ ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ دوسری طرف انگریزوں نے مصر پر ترکی کی سیادت کو ختم کر کے ملک کو اپنی حفاظت میں لے لیا اور عباس حلمی کی بجائے اس کے چچا حسین کامل کو سلطان بنا دیا۔ ۱۹۱۷ء میں حسین کامل مر گیا۔ اس لیے اسمٰعیل کے چھوٹے بیٹے فواد کو مصر کا سلطان بنا دیا گیا۔

پھر جب ۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہوئی تو سعد زغلول پاشا کی رہنمائی میں وفد پارٹی میدان میں آگئی۔ اس پارٹی نے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ عوام نے اس کے حق میں زبردست مظاہرے کیے اور پورے ملک میں سیاسی ہیجان پیدا ہو گیا۔ انگریزوں نے حالات پر قابو پانے کے لیے سعد زغلول اور اُن کے تین ساتھیوں کو گرفتار کر کے مالٹا میں نظر بند کر دیا۔ اس پر مصری عوام مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے ہڑتالیں اور مظاہرے شروع کر دیئے۔ انگریزوں نے مصریوں پر بے پناہ مظالم کیے مگر انقلاب کی آگ نہ بجھ سکی۔ تب برطانیہ نے ایک کمیشن مقرر کیا۔ اس کمیشن نے حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ مصر سے جلد کوئی معاہدہ کر کے اس جھگڑے کو ختم کرے۔

اس دوران یعنی ۱۹۲۲ء میں مسٹر چرچل وزیر نو آبادیات ہوئے تو اُن کی سفارش پر مصر کی آزادی تسلیم کر لی گئی لیکن خارجی معاملات اور سوڈان کے بارے میں تحفظات رکھے گئے۔ وفد پارٹی نے ان شرائط کو ماننے سے انکار کر دیا اور فسادات پھوٹ پڑے۔ سعد زغلول پاشا کو گرفتار کر لیا گیا اور فوج نے نہایت تشدد سے کام لیا اور شورش کو ایک حد تک دبا دیا اور پارلیمانی حکومت قائم کر دی گئی۔ یہ جھگڑے ۱۹۲۷ء تک چلتے رہے۔ جب زغلول پاشا کا انتقال ہوا اور نحاس پاشا نے وفد پارٹی کی قیادت سنبھالی۔

۱۹۳۶ء میں شاہ فواد کا انتقال ہوا اور نحاس پاشا کی کوشش سے مصر کا برطانیہ سے نیا معاہدہ ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ شروع ہوگئی۔

(ان شاء اللہ بلقی آئندہ ماہ)

